سب رس

(۲۰۱۴)

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۴۸ء

جلد ۲۲ شمارہ ۱، ۲



سن اجراء: ۱۹۳۸ء　　فون: ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مجلس مشاورت سب رس

صدر: پروفیسر سید علی اکبر
نائب صدر: عماد علی عباسی
رکن: گوپی چند نارنگ
" رمن راج سکسینہ
" عابد علی خاں
" محمد منظور احمد
" محمد اکبر الدین صدیقی
" سید ہاشم علی اختر
" پروفیسر سراج الدین

معتمد مجلس مشاورت و مدیر اعزازی:
ڈاکٹر مغنی تبسم

وقار خلیل معاون

جلد: ۴۲
شمارہ: ۱
جنوری ۱۹۷۹ء

زرِ سالانہ: ۱۵ روپے　ششماہی: ۸ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس پیسے

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
مقامِ اشاعت: ادارہ ادبیاتِ اُردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ترتیب

ریاست میں صنعت ترقی کر رہی ہے

ملک کے قلب میں واقع ریاست آندھرا پردیش کو قدرت نے بہ افراط وسائل عطا کئے ہیں تاریخ نے اس ریاست کے صدر مقام کو ایسا آفاقی اور ملاجلا تمدن دیا ہے جس میں قدامت کی بو باس اور جدید صنعتی دور کی اساس موجود ہے۔ بلاشبہ آندھرا پردیش امیدوں اور آرزوؤں کی سرزمین ہے۔

لگ بھگ ۲۶۰ اوسط اور بڑی صنعتیں جن میں ۸۷۴ کروڑ روپے کا متاثر کن سرمایہ مصروف ہے ریاست کو صنعتی اہمیت کا علاقہ بنانے میں موثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ گذشتہ چار برسوں کے دوران میں ادارہ جاتی مالیئے سے چار گنا استفادہ کیا گیا ہے۔ کاکیناڈا میں ۲۳۲ کروڑ روپے لاگت والی فرٹیلائیزرز فیکٹری (جس کا سنگ بنیاد صدر جمہوریہ نے ۷/جولائی ۱۹۷۶ء کو رکھا) ۱۹۸۱ء میں پیداوار دینا شروع کر دے گی۔

ترقیاتی کارپوریشنز جیسے آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (اے پی آئی ڈی سی) آندھرا پردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن (اے پی ایس ایف سی) اور آندھرا پردیش انڈسٹریل انفرااسٹرکچر کارپوریشن (اے پی آئی آئی سی) وغیرہ ریاست کی متوازن علاقہ واری ترقی میں ان تمام برسوں کے دوران ایک کلیدی کردار ادا کرتے آ رہے ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 2665/C4/32/78-79

اپنی بات

۱۹۷۹ء کو "بچوں کا بین الاقوامی سال" قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم بچوں کے مسائل پر بطورِ خاص توجہ دیں اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے فوری اور دُور رس اقدامات کریں۔ بچوں کی صحت، غذا، جسمانی اور دماغی نشوونما اور تعلیم و تربیت کے مسائل ایک اعتبار سے نوعِ انسانی کے مستقبل کے مسائل ہیں۔ پس ماندہ ملکوں میں غربی، جہالت اور معاشی و سماجی نا برابری کی وجہ سے بچوں کی اکثریت (نیم فاقہ کشی) کی زندگی بسر کرتی، جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے غیر صحت مند ماحول میں پرورش اور تعلیم و تربیت سے محروم رہتی ہے۔ ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں بچوں کے مسائل دوسری نوعیت کے ہیں۔ وہاں تیز رفتار صنعتی زندگی، دولت کمانے کا جنون، تعیش پسندی اور کئی دوسرے عوامل ایسے ہیں جن کی وجہ سے اکثر بچے ماں باپ کی توجہ اور محبت سے محروم رہتے اور نفسیاتی عوارض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اشتراکی ملکوں میں ان مسائل پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے۔ وہاں بچوں کی داخت پرداخت اور نشوونما زیادہ صحت مند ماحول میں ہوتی ہے۔ لیکن ان کے نظامِ تعلیم میں بچوں کے ذہنوں کو مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کس حد تک پسندیدہ ہو سکتی ہے یہ ایک اہم سوال ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا نظام دریافت نہیں ہوا ہے جس کے ذریعے نئی نسل کو جسمانی اور ذہنی عوارض سے محفوظ رکھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ جیتے جاگتے انسانوں کو روبوٹ بننے سے بچایا جائے۔

مغربی ملکوں میں ٹکنالوجی کی زبردست ترقی، طریقۂ تعلیم میں انقلابی تبدیلی، ریڈیو، فلم اور ٹیلیویژن اور رسل و رسائل کے ترقی یافتہ ذرائع کی وجہ سے نئی نسل زیادہ باخبر اور باشعور ہے۔ اس کی وجہ سے دو نسلوں کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔ نئی نسل اپنے اسلاف کی باغی ہے۔ اسے ان کی جنگ پسندی اور زر پرستی سے شدید نفرت ہے۔ ہپی ازم اور نیو لفٹ (NEW LEFT) تحریکیں اسی بغاوت کے دو متضاد روپ ہیں۔

ہندستان کا موجودہ سماج ہر لحاظ سے ایک انتشار اور افراتفری کے دَور سے گزر رہا ہے۔ یہ سماج معاشی، تمدنی اور تعلیمی اعتبار سے بے شمار درجوں میں بٹا ہوا ہے۔ جس کی گروہ بندی کسی ایک اساس پر ممکن نہیں ہے۔ اس کی حالت ایسے شخص کی ہے جو کثیر امراض کا شکار ہے۔ ایک مرض کا علاج کیجئے تو دوسرا مرض بڑھ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کی ذمہ داری کا بڑی حد تک سیاسی جماعتوں، مذہبی تنظیموں اور ان کے رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ ایک طرف سیاست کا

اخلاق سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہا ہے تو دوسری طرف مذہبی تحریکیں بڑی حد تک احیا پسندی اور قدامت پرستی کا شکار ہیں۔ ان کے اصلاح اخلاق اور بے لوث انسانیت دوستی کے دعوے نہایت کھوکھلے ہیں۔ حب الوطنی کا محدود تصور جس کی بنیاد پر حصولِ آزادی کی جد و جہد کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی بجائے اس کے کہ عالم گیر انسانیت دوستی سے اس کا رشتہ استوار ہوتا اپنی اصلی روح بھی کھو چکا ہے اس کی جگہ ایسی چھوٹی چھوٹی وفاداریوں نے لے لی ہے جن کی بنیاد مفاداتِ حاصلہ پر قائم ہے۔ ان حالات میں صحت مند نئی نسل کو پروان چڑھانے کا خیال بھی محض ایک احمقانہ خوش فہمی ہے۔

بچوں کا یہ بین الاقوامی سال قومی رہنماؤں، سماجی اداروں، سیاسی جماعتوں، اساتذہ، والدین اور بچوں کے سرپرستوں کے لیے لمحۂ فکر فراہم کرتا ہے۔ نئی نسل کی بہتر تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنی اصلاح کریں اور اپنے ماحول کو صحت مند بنائیں۔

کئی برس پہلے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے "بچوں کا سب رس" شائع ہوتا تھا۔ مالی مشکلات اور نامساعد حالات کی وجہ سے اس کی اشاعت بند کر دی گئی تھی۔ ہم اس رسالے کا احیا کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال "بچوں کا سب رس" ضمیمے کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے کو پسند کیا گیا اور حالات نے اجازت دی تو آئندہ اسے مستقل رسالے کی صورت دی جائے گی۔

(مغنی تبسم)

"سب رس" کا اردو نمبر

ماہنامہ "سب رس" کا پانچواں شمارہ "اردو نمبر" ہوگا۔ اس خصوصی شمارہ میں اردو کی بقاء، ترویج اور اشاعت کے مسائل پر منعقدہ سیمینار کی رپورٹ کے علاوہ ممتاز اہلِ قلم اصحاب کے مضامین شامل ہوں گے یہ خاص نمبر دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا۔ اردو دوستوں اور کتب خانوں کے سربراہوں نیز ایجنٹوں سے خواہش ہے کہ وہ اپنے آرڈر جلد روانہ فرمائیں۔ سب رس کے اردو نمبر کی قیمت تین روپے ہوگی۔ خریداروں کو یہ نمبر سالانہ قیمت ہی میں دستیاب ہوگا۔

● دفتر کی یاددہانی کے باوجود جن اصحاب نے تجدیدِ خریداری نہیں کی ہے وہ اپنے ذمہ کی بقایا رقم اور زرِ سالانہ مبلغ پندرہ روپے جلد منی آرڈر سے روانہ کریں۔ (ادارہ)

احمد جلیس

اردو میں ریڈیائی ڈراموں کا آغاز اور ارتقاء

ہندوستان میں ریڈیو نشریات کی کہانی کوئی پرانی داستان نہیں ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک خانگی ادارے انڈین براڈکاسٹنگ کمپنی لمیٹڈ نے برطانوی حکومت ہند سے ایک معاہدہ کے تحت بمبئی اور کلکتے میں کل دو ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام کی اجازت حاصل کی۔

چنانچہ ہندوستان کا پہلا ریڈیو اسٹیشن ۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو بمبئی میں قائم کیا گیا جبکہ اسی سال دوسرا ریڈیو اسٹیشن ۲۶ اگست کو کلکتے میں قائم ہوا۔ ان دونوں اسٹیشنوں کی طاقت محض ڈیڑھ کیلو واٹس تھی جو زیادہ سے زیادہ تیس مربع میل کے احاطے تک اپنی نشریات پہونچا سکتے تھے۔ اس طرح ہندوستان میں نشریات کی ابتداء کی تاریخ ۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء قرار دی جا سکتی ہے جبکہ یہاں سب سے پہلی بار بمبئی ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہوا۔ اس کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۲۸ء میں ینگ مینس کرسچین اسوسی ایشن نے لاہور میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا۔ اسی طرح ۱۹۳۵ء میں اگریکلچرل انسٹیٹیوٹ الٰہ آباد کے پرنسپل نے روزآنہ ایک گھنٹے کی نشریات کے لئے حکومت ہند سے لائسنس حاصل کر کے الٰہ آباد میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا۔ اس تفصیل سے مراد یہ ہے کہ اس صدی کے تیسرے دہے کے اختتام تک بھی حکومت ہند کے نزدیک نشریات کی اہمیت اتنی واضح نہیں تھی کہ وہ نشریات کو مفادات عامہ کی خدمت قرار دے سکے۔ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک دس سال کے عرصے کے دوران ملک کے مختلف شہروں میں خانگی کلبس اور تنظیموں نے مقامی حکومتوں اور مارکونی کمپنی لمیٹڈ کے اشتراک و تعاون سے نشریات کا کاروبار سنبھالا اور ان نشریات کا مقصد زیادہ تر اسکول کے طلبا کے لئے درسی اسباق دینا یا عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔ ہلکے پھلکے تفریحی پروگراموں میں کبھی کبھی صوتی یا سازی موسیقی شامل ہوتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے دو تین برس قبل یعنی ۱۹۳۶ء کے بعد ہی ریڈیو کے وسیلے کی حیثیت دشمن ملکوں کے خلاف ایک موثر ہتھیار جیسی ہو گئی۔ اور ہندوستان میں ریڈیو کی نشریات تازہ ترین خبروں کی وجہ سے اہمیت حاصل کرنے لگیں۔

موسیقی کے بعد ریڈیو کے پروگراموں میں سامعین کی سب سے زیادہ دلچسپی ریڈیو ڈراموں کی طرف بڑھنے لگی

اردو کا سب سے پہلا ریڈیو ڈرامہ کس نے لکھا اور وہ کب اور کہاں سے نشر ہوا؟ آل انڈیا ریڈیو کے مطبوعہ تاریخی دستاویزات کی روشنی میں بھی اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں ملتا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اُردو ڈرامہ ببلوگرافیا میں ۱۹۳۶ء کے بعد اُردو میں ریڈیائی ڈراموں کے آغاز کا تذکرہ کیا ہے۔ عشرت رحمانی نے ڈراموں سے متعلق اپنے تحقیقی مقالے میں ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں مختلف اسٹیشنوں سے نشرشدہ ریڈیائی ڈراموں کا جائزہ لیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈرامہ چیف پروڈیوسر شری جرجیت نے اپنے فیچر "کہانی ریڈیو ناٹک کی" میں یہ کہیں بھی واضح نہیں کیا کہ ریڈیو ناٹک کی یہ کہانی دراصل کس سال سے شروع ہوئی ہے۔ اِن تمام حوالوں کی روشنی میں صرف یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ ریڈیو ڈراموں کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک ان تین برسوں کے دوران ہی ہوا ہے جبکہ کلکتہ، بمبئی، دہلی، لاہور، لکھنو اور مدراس اسٹیشنوں سے اُردو ہندی انگریزی ٹامل اور بنگالی زبانوں میں ڈرامے نشر ہونے لگے۔ اردو میں ڈرامے کی صنف ابتدا ہی سے محض ایک روایت کے طور پر چلی آرہی تھی۔ لاہور میں امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع اور اشتیاق حسن قریشی، تھیٹروں کے لئے نیم تاریخی اور سماجی اصلاحی ڈرامے لکھتے تھے چنانچہ اسٹیج کے ڈراموں کو ہی ریڈیو کی ضروریات کے مطابق ڈھالا جانے لگا اور مختلف اسٹیشنوں سے شیکسپیئر کے لکھے ہوئے اور آغا حشر کاشمیری کے ترجموں پر مبنی ڈرامے نشر ہونے لگے۔ لیکن اسٹیج ڈرامے نے جب فلم کے درجے تک ترقی حاصل تو ریڈیو ڈراموں کو کوئی مقبولیت نصیب نہ ہوسکی کیونکہ اس وقت سے عام تاثر یہی تھا کہ ڈرامہ سننے کی نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز ہے۔ یہ بدبختانہ تعصب ۱۹۳۸ء کے بعد رفتہ رفتہ اس وقت کم ہونے لگا جب فلم کی تکنیک کے ساتھ ساتھ ریڈیو ڈراموں کی پیشکشی کی ٹیکنک میں بھی نکھار آنے لگا۔

ریڈیو ڈرامہ کے لئے آپ کی دو آنکھیں کسی کام نہیں آئیں بلکہ کانوں کے پردے آپ کے ذہن میں ایک تیسری آنکھ کو بیدار کردیتے ہیں جو آوازیں سننے کے ساتھ ساتھ صداکار کے چہرے کے ہر تاثر، موقع محل اور زماں و مکاں کی ہر جزوی کیفیت کا سماں کھینچ دیتی ہے۔ ریڈیو ڈرامے کی پیشکشی فنی اعتبار سے تین حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا مرحلہ ڈرامہ نگار کے مسودے کے مطابق کرداروں کے ذریعہ مکالموں کی صدابندی ہے اور دوسرا مرحلہ ہے واقعات کو موثر اور فطری بنانے کے لئے حسب ضرورت صوتی تاثرات اور موزوں موسیقی کا انتخاب۔ تیسرے اور آخری مرحلے میں مکالموں اور صوتی تاثرات کی ہم آہنگی کی جاتی ہے جس کے بعد ڈرامہ اپنی قطعی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

اُردو کے ابتدائی ریڈیو ڈراموں میں صوتی تاثرات سے زیادہ موسیقی اور برمحل گانوں کو اہمیت دی جاتی تھی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے مشہور ادیبوں نے پیشے کے طور پر یا جزوی حیثیت سے وابستگی حاصل کرلی اور ریڈیو ڈراموں کو زیادہ تر ذریعہ معاش بنالیا۔ چنانچہ شوکت تھانوی نے لاہور ریڈیو پر، کرشن چندر نے بمبئی میں، راجندر سنگھ بیدی نے دہلی ریڈیو میں ملازمت کرلی۔

ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء میں بھی کرشن چندر اپنے ریڈیو ڈراموں کے لئے ڈشوامتر عادل اور سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی سے گیت لکھواتے تھے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد بھی ہمارے ریڈیو ڈراموں پر پارسی تھیٹر کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ریڈیو ڈرامے راوی کی حکایت سے شروع ہوتے تھے، اثر آفرینی کے لئے ان میں جگہ جگہ گانے بھرے جاتے تھے اور جہاں ڈرامہ نگار کو کرداروں کے ذریعے پلاٹ کو آگے بڑھانے میں دقت ہوتی تھی وہاں ڈرامہ نگار سوئے ہوئے راوی کو دوبارہ جھنجھوڑ کر بیدار کردیتا۔ راوی بتادیتا کہ پھر کیا ہوا اور پھر یہی ہوتا کہ بستا کی

طرب وقت کے گزرنے کا اشارہ کرکے کرداروں سے مزید چند مکالمے ادا کروا دیتی۔ ملک کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء سے اُردو کے ڈرامے فن اور ٹیکنک کے لحاظ سے تیزی سے ترقی کرنے لگے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، حجاب امتیاز علی تاج، رفعت سروش اور سید عابد علی عابد نے ریڈیو کے لئے شاہکار ڈرامے لکھے اور اُن ڈراموں نے ریڈیو کے سامعین کو فلمی موسیقی اور خبروں سے ہٹا کر ڈرامے سننے کا بھی پابند کیا۔

کرشن چندر کا ڈرامہ سرائے کے باہر ملک کی غیر منصفانہ معیشت پر ایک بھرپور طنز تھا۔ ہندوستان کو انھوں نے ایک ایسی سرائے سے تعبیر کیا تھا جس کے اندر چند کمروں میں ایک مخصوص سرمایہ دار طبقہ عیش و عشرت کر رہا ہے اور سرائے کے باہر ہندوستان کے وہ لاکھوں کروڑوں ننگے بھوکے تھکے ہارے بیٹھے ہیں جن میں شاعر، ادیب، موسیقار اور ہر طرح کے فنکار شامل ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں دہلی ریڈیو سے راجندر سنگھ بیدی کا ڈرامہ "رخشندہ" نشر ہوا۔ "رخشندہ" ڈرامے سے اُردو کے ریڈیو ڈرامے کی ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ڈرامہ میں بیدی نے اپنے مخصوص انداز سے ڈرامہ کی ہیروئین رخشندہ کے کردار کی تحلیل نفسی کا تجزیہ کیا تھا۔ ڈرامہ کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ رات کے پچھلے پہر طوفان کی ایک ڈراؤنی گھڑی میں رخشندہ سوتے سوتے بیدار ہوتی ہے۔ اور اپنے شوہر کا پلنگ خالی دیکھ کر پورے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ کہ اتنی رات گئے اس کا شوہر اب تک گھر کیوں نہیں لوٹا اس کی پریشانی اور گھبراہٹ شوہر سے اٹوٹ محبت کی صورت میں بڑھتی جاتی ہے اور جب سارے گھر والے رخشندہ کے شوہر کو تلاش کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کا شوہر خود رخشندہ کے بستر کے دوسرے کونے میں پڑا سو رہا ہے۔ نقطۂ عروج کے اس حصے میں بیدی کا قلم اپنے فن کی معراج پر پہونچتا ہے۔ اور رخشندہ کا شوہر اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میری سب سے بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ میں تمہارے جتنے قریب آیا ہوں تم نے مجھے دور دور سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اوپیندر ناتھ اشک کا ڈرامہ پاپا، شوکت تھانوی کا جھوٹا خواب اور لاٹری کا ٹکٹ، سعادت حسن منٹو کے ڈرامے نیلی رگیں، کروٹ، جیب کترا، موتری اور اکیلی، عصمت چغتائی کا ڈرامہ دوزخی اور شامت اعمال اور امتیاز علی تاج کا کمرہ نمبر پانچ — یہ سارے ریڈیو ڈرامے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۲ء تک آل انڈیا ریڈیو کے دہلی، لکھنؤ، بمبئی، الہ آباد اور امرتسر سے اور اسی طرح ریڈیو پاکستان کے لاہور، کراچی، راولپنڈی، ڈھاکہ اور پشاور اسٹیشنوں سے نشر ہوتے رہے۔

ریڈیو ڈراموں کو عام مقبولیت اس وقت نصیب ہوئی جب ڈراموں کی شکل میں سلسلہ وار موضوعاتی خاکے نشر ہونے شروع ہوئے انگریزی میں FAMILY SERIAL کی اصطلاح جن معنوں میں استعمال کی جاتی ہے اس کا اُردو ترجمہ کسی ایک لفظ کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ فیملی سیریل ایک ایسا مسلسل ڈرامہ ہے جو تین یا چار مستقل کرداروں پر مشتمل ہوتا ہے یہ کردار اپنی عوامی بول چال کے ذریعہ حالات حاضرہ پر کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں ان میں سے ایک کردار سیاسی سماجی اور عام معاشرتی حالات پر نہ صرف خود گہری نظر رکھتا ہے بلکہ باقی دیگر کرداروں کو بھی مسئلہ کی نوعیت اور اس کا حل صحیح ڈھنگ سے سمجھانے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اردو کے ریڈیو ڈراموں میں سب سے پہلا کامیاب فیملی سیریل یا موضوعاتی سلسلہ سنہ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان کے لاہور اسٹیشن سے شوکت تھانوی نے قاضی جی کے نام سے پیش کرنا شروع کیا۔ قاضی جی

کا یہ خاکہ ہفتے میں دوبار یعنی پیر اور جمعرات کو ساڑھے سات بجے نشر ہوتا تھا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ملک بھر میں مقررہ وقت پر لاکھوں سامعین اپنے اپنے ریڈیو سیٹ کے اطراف جمع ہو جاتے تھے۔

خاکے میں شوکت تھانوی خود قاضی جی کا مرکزی کردار ادا کرتے تھے جو ایک خبطی، جھکی اور زندگی کی افتادہ یا قدروں پر یقین رکھنے والے بوڑھے کا کردار تھا۔ ان کی ایک بیگم صاحبہ تھیں اور ایک تھے سالے اجمل میاں۔ مسئلے کی افہام و تفہیم کا کام عام طور پر اجمل میاں انجام دیتے تھے۔ قاضی جی کا یہ موضوعاتی خاکہ ۱۹۴۹ء سے لگ بھگ ۱۹۶۴ء تک مختلف وقفوں کے ساتھ نشر ہوتا رہا۔ یعنی شروع میں ہفتے میں دوبار کچھ عرصے بعد مہینے میں دوبار اور بعد میں ہر مہینے ایک خاکہ نشر ہوتا تھا۔ قاضی جی کی مقبولیت نے اردو ڈرامے سننے کے لئے بھی سامعین کو اکسایا اور اردو کے ریڈیو ڈرامے اب باقاعدہ طور پر ایک علحدہ سیکشن کی نگرانی میں نشر کئے جانے لگے۔

شری جے سی مہرہ نے جب ۱۹۵۶ء میں ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کا عہدہ سنبھالا تو ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں کو بجا طور پر یہ امید بندھ گئی کہ مہرہ صاحب ہندی کے ایک نامور ادیب اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ریڈیو ڈراموں کی ترقی پر یقیناً توجہ دیں گے چنانچہ ہوا بھی یہی اور جے سی مہرہ صاحب نے جولائی ۱۹۵۶ء میں نیشنل پروگرام آف ریڈیو پلے کا آغاز کیا۔ نیشنل پروگرام آف پلیز کے تحت ہر ماہ ہندوستان کی کسی بھی زبان میں لکھا ہوا ایک ڈرامہ منتخب کیا جاتا ہے اور اس ڈرامہ کو اس کی اصل زبان سے ہندی میں ترجمہ کر کے آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشنوں کو ہندی مسودہ بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں اس ڈرامے کا ترجمہ کر کے اسے پیش کریں۔ اس طرح ایک ہی ڈرامہ بیک وقت آل انڈیا ریڈیو کے تمام اسٹیشنوں سے نشر ہوتا ہے۔

اردو میں نیشنل ڈرامہ آف پلیز کے تحت حبیب تنویر، القاضی، ڈاکٹر محمد حسن اور کرشن چندر کے ڈرامے نشر ہو چکے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں تمام علاقائی اسٹیشنوں سے اردو ڈراموں کے فنکاروں، مصنفین اور ان کے ہدایت کاروں کا علحدہ علحدہ تذکرہ اور تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے لیکن مجھے اس بات کا قوی احساس ہے کہ اردو ڈرامے کی تاریخ میں آل انڈیا ریڈیو کی خدمات کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

★ ★

ٹیبل لیمپ صفحہ ۳۸ سے آگے :

"اپنے عارف سے بڑھ کر نہیں ہیں، چلئے منہ ہاتھ دھو لیجئے، کھانا کھا کر بازار جائیے گا۔" اماں اور کیا کہتی رہیں، وہ کچھ نہ سن سکا، اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا، اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے، اُف، وہ کتنا احمق ہے کہ ذرا سی تکلیف کے لئے ماں باپ کو پریشان کرتا ہے، پاپا نے اگلے مہینے وعدہ کیا ہی ہے۔ انھیں بونس ملنے والا ہے، کیا وہ اتنا صبر نہیں کر سکتا؟ کیا وہ اتنا بے شرم ہو گیا ہے کہ نانی اماں کی چیزیں بیچ کر اپنی خواہش کی تسکین کرے۔ "نہیں نہیں" وہ تیزی سے گھر میں گھسا اور کچن میں بیٹھی اماں کی پشت سے لپٹ کر کہنے لگا۔ "اماں مجھے ٹیبل لیمپ نہیں چاہیے، اگلے مہینے پاپا کی تنخواہ پر لے لیں گے۔" اماں حیرانی سے اُسے دیکھ رہی تھیں، انھیں اس کی پیشانی پر سوجھ بوجھ کا سورج چمکتا نظر آیا ••

نکہت سلطانہ

غالب کی قصیدہ نگاری

اردو ادب کی ایک عظیم ہستی غالب جنھوں نے اپنی جدت طرازیوں سے ادب میں ایک نمایاں حیثیت حاصل
لی ہے۔ وہ صرف غزل ہی کی بدولت زندہ نہیں ہیں، بلکہ اپنی جدت کے ذریعہ دیگر اصناف شعری مثلاً قصیدہ رباعی، قطعہ
رہ میں بھی کافی شہرت حاصل کی۔

یہی وجہ ہے کہ غالب نے اردو نثر، غزل، قصیدہ جس چیز کو لیا، اس میں اپنے فن کے خوب جوہر دکھائے۔
ش عام پر چلنا ان کا شیوہ نہ تھا، وہ اس بات کو باعث ننگ سمجھتے تھے۔ چنانچہ اب ہم غالب کے اردو قصائد پر نظر ڈالتے
یکہ انھوں نے اس صنف میں کیا گل بوٹے کھلائے۔ قصیدہ نگاری میں بڑے بڑے استادانِ کامل پیدا ہوئے ہیں۔
رسی میں انوری، خاقانی، عرفی، قاآنی، ظہیر فاریابی ۔ اردو کے مشہور قصیدہ گویوں میں سودا، ذوق، امیر، قبول عام
ئے ہیں ان کے علاوہ اور بھی مشہور قصیدہ گو ہوئے ہیں۔ جنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً میر، غالب
من، آتش ۔ ان سب سے قطع نظر ہم غالب کی قصیدہ نگاری کا جائزہ لیتے ہیں۔

غالب نے دو قصیدے ۲۵ سال کی عمر سے قبل یعنی اپنی شاعری کے پہلے دور میں لکھے تھے۔ یہ منقبت
ہیں، جو ان مصرعوں سے شروع ہوتے ہیں۔

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ۔۔۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں۔

ان کے ان قصائد میں علو فکر، زور بیان، متانت، سنجیدگی اور عام روش سے اجتناب موجود ہے لیکن چونکہ یہ
ئی زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں اس لئے ان میں مشکل پسندی کی وجہ سے خیال و بیان میں جا بجا تکلف اور غرابت
علاوہ الجھاؤ اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ ان قصیدوں کے برخلاف دو قصیدے اور ہیں، جو انھوں نے بہادر شاہ ظفر
مدح میں لکھے، یہ ہر لحاظ سے بہترین ہیں، ان میں چھوٹی بحروں کے علاوہ علو فکر، شان و شکوہ کے ساتھ ساتھ روانی اور
جستگی بھی موجود ہے۔ اکرام نے ان کے کلام کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دورِ اول سنہ ۱۸۰۷ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۸۲۱ء
تم ہوتا ہے۔ یہ قصائد ان کے ابتدائی زمانہ کی مشق ہیں۔ جو بیدل کا دور تھا۔ لہٰذا انھوں نے بیدل کی تقلید میں لکھنا

شروع کیا۔ اسی وجہ سے ان میں اغلاق اور اشکال کسی حد تک موجود ہیں۔ اس کے بعد غالب نے اردو میں قصیدہ گوئی ترک کردی اس کی ایک تاریخی وجہ یہ بھی ہے کہ جب غالب میدانِ قصیدہ گوئی میں اترے تو ذوق کی حیثیت مسلم ہوچکی تھی ذوق کے انتقال کے بعد وہ استادِ شہ مقرر ہوئے۔ اس عہد میں انہوں نے دو قصیدے تصنیف کئے۔ اردو میں قصیدہ نگاری کی روایت بھی فارسی شاعری کے زیرِ اہتمام قائم ہوئی۔ چنانچہ غالب کے پیشروؤں اور معاصروں مثلاً سودا، انشاؔ، ذوقؔ اور یہاں تک کے مومنؔ نے بھی قصیدہ میں روایتی اسلوب، روایتی انداز، اور مقررشدہ اصولوں سے انحراف اور اختلاف نہیں کیا، لیکن غالب کی طبیعت میں بقول حالی: "ایک غیر معمولی اُپج تھی۔ وہ پٹی ہوئی پامال شدہ

عام راہوں سے الگ چلنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے قصیدہ میں بھی بت شکنی کا مظاہرہ کیا۔ اور اپنے لئے ایک الگ راہ متعین کی۔ غالب نے اپنے قصائد میں شعریت کا خون قصیدہ نگاری کی خاطر نہیں کیا بلکہ قصیدہ نگاری کو شعریت کا پابند کردیا۔ چونکہ غالب کے قصائد عام روش سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں، اس لئے انھیں زیادہ سراہا نہیں گیا۔ اور ان پر خاطر خواہ توجہ دی گئی۔ کسی نے اس بات پر غور بھی نہیں کیا کہ یہاں قصیدہ کے محاسن نہ سہی شاعری کے محاسن تو ہیں۔ جن سے قصیدے عموماً خالی ہوتے ہیں۔" اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ قصیدہ گوئی میں غالب کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں جن کی وجہ سے قصیدہ گوئی میں ان کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

غالب کے ابتدائی دو قصیدے حضرت علیؓ کی شان میں ہیں۔ ان قصیدوں میں اگر غالب کی مذہبی شیفتگی اور ندرت پسند طبیعت کو دخل نہ ہوتا تو وہ ذوق کے قصیدوں کی صف میں آجاتے۔ غالب نے اسی قدر قافیہ استعمال کئے، جس حد تک ضرورت تھی۔ برخلاف اس کے ذوق کے یہاں قافیہ پیمائی قصیدے کے بند ھے ٹکے سانچے کے لحاظ سے تھی۔ غالب کے ان قصیدوں میں ٹکنیک یا فرہنگ کی کوئی جدت نہیں ملتی، صرف تخیل کی بلندی اور بے لگامی نزاکت اور الفاظ کی شوکت نظر آتی ہے۔ البتہ ان میں ایک والہانہ انداز ملتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں خلوص اور جوش عقیدت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ خصوصاً دوسرے قصیدہ میں منقبت کا انداز بڑا والہانہ ہے۔ پہلے قصیدہ کی "تشبیب" بہاریہ ہے۔ جہاں تک تخیل کا تعلق ہے۔ اس میں بھی جدت نظر آتی ہے۔ معنی آفرینی پر نظر، خیالات کا اشکال، اسلوب کا تکلف اور تراکیب کی اہمیت زیادہ ہے۔ جو نقلید بیدلؔ اور اسیرؔ کا فیضان ہے۔ تشبیب میں خوبی یہ ہے کہ پامال اور فرسودہ خیالات کہیں نہیں ہے۔

قصیدہ کی روح "گریز" ہے یہ دراصل تشبیب اور مدح کو ملاتی ہے۔ تشبیب اور مدح دونوں کے مضامین بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ شاعر کا کمال اسی میں ہے کہ وہ دونوں میں ایسا ربط پیدا کردے۔ کہ بغیر کسی وجہ کے بات میں بات پیدا ہوجائے اور معلوم نہ ہو۔ بلکہ بدیہہ اور بے ساختہ ہو۔ غالب نے تشبیب سے ممدوح کے ذکر کی طرف نہایت پر لطف طریقہ سے گریز کیا ہے مثلاً ؎

لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ		طوطئ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

مدح کس جوش و خروش سے کی ہے اور یہی اس قصیدہ کا خاص وصف ہے ؎

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سدا — چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی — جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار

دوسرا قصیدہ بھی منقبت میں ہے۔ اس کی تشبیب فکری عنصر میں ڈوبی ہوئی ہے جس میں وحدت الوجود کا اثبات کرتے ہوئے دنیا کے وجود کی نفی کی ہے اور دنیا سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کی مدح شروع ہوتی ہے۔ یہ پہلے قصیدہ سے زیادہ جوش، شیفتگی اور عقیدت مندی کے ساتھ ہے۔ دوسرا انداز بیان پہلے کی بہ نسبت صاف ستھرا ہے۔ غالب کا یہ مخصوص 'بیدل رنگ' جو وہ آگرہ سے لے کر دہلی آئے تھے اور جس میں جذبے سے زیادہ تخیل کی کسیدہ کاری ہوتی تھی، یہاں مقبول نہ ہوا اور لوگوں نے اُن کا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ شروع شروع میں غالب اس قسم کی باتوں پر بہت جھنجھلاتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی انانیت کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ لیکن یہ نکتہ چینی غالب کے حق میں کارآمد ثابت ہوئی۔ جدت طرازی اور بیدل کی پیروی میں وہ کچھ عرصے تک دشوار گزار گھاٹیوں میں بھٹکتے رہے۔ ان کے ذوقِ سلیم نے ان کو زیادہ بھٹکنے نہ دیا اور وہ جلد ہی صراطِ مستقیم پر آگئے۔

غالب بیدل کے رنگ سے نکلنے کے باوجود ان کی رمزیت سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ انہوں نے ایسی لغو مو شگافیوں ثقیل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے احتراز کیا، لیکن مضمون کا رمزی اور طلسمی اشکال باقی رہا۔ یہ اشکال مضمون کے اچھوتے پن اور ایمائی اسلوبِ بیان کا لازمی نتیجہ تھا۔ غالب نے قصیدہ کی تکنیک میں جو جدت پیدا کی اور اس کے طرز کو بدلا، وہ وہی دو قصیدے ہیں، جو بہادر شاہ ظفرؔ کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں غالب نے نہ صرف قصیدہ کی فرہنگ اور آہنگ میں تبدیلی کی ہے بلکہ تشبیب اور مدح کا انداز بھی بدل دیا ہے۔ ان قصائد میں انہوں نے قصیدہ کے روایتی آہنگ اور اس کے فرہنگ سے انحراف کر کے آسان اور عام فہم انداز اختیار کیا ہے۔ اگرچہ قصیدہ ایسا ہی قصیدہ گوئی کے تمام اسمی محاسن سے خالی ہے لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تشبیب نے اردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے اور خود نقادانِ فن بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

غالب کے مدحیہ اشعار میں باوجود مبالغہ کے ایک وقار اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا مدح کا طریقہ دوسرے قصیدہ گو شعراء سے مختلف ہے مثلاً سوداؔ وغیرہ نہایت مبالغہ آمیز بلکہ ذلت انگیز طریقہ پر ممدوح کے تمام ساز و سامان یہاں تک باورچی خانہ تک کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ان کو سوال کرنے میں مطلق شرم و حیا نہیں آتی۔ سوداؔ اور دوسرے قصیدہ گو کے یہاں تقریباً ہر قصیدے کے اختتام میں "دستِ سوال" دراز کیا گیا ہے اور اس عاجزی و بے چارگی کے ساتھ جو غالب کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ غالب جیسے انانیت پسند اور خود پرست شخص سے اس قسم کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان کی انانیت قصیدے میں بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اگرچہ آباء کی تلوار غالب کے ہاتھ میں آتے آتے ٹوٹ کر قلم ہو گئی تھی اور "سپہ گری" کا پیشہ مؤثر کر شاعری کے فن میں ڈھل گیا۔ اقتصادی حالت نے قصیدہ گوئی پر بھی مجبور کیا تاہم مدح کے علاوہ قصیدوں میں بالکل مانگنے والے معلوم نہیں ہوتے اور افتتاحیہ اشعار دوسرے قصیدہ نگاروں کی طرح کاسۂ سائل

نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق خود اپنے خط میں لکھتے ہیں: "لیکن وں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھکو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤگے اور مدح کے شعر کمتر، نثر میں بھی یہی حال ہے۔" اب غالب کی مدح ملاحظہ فرمائیے کہ وہ مدح کس طرح کرتے ہیں۔ گو مبالغہ کا رنگ اس میں موجود ہے لیکن ان کی نوعیت اور انداز دیکھئے :-

شہسوار طریقۂ انصاف		نوبہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز !		جس کا ہر قول معنیٔ الہام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے		ایرج - تور - خسرو - بہرام

دوسرے قصیدہ کی مدح بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ اشعار کا مفہوم بھی تقریباً یہی ہے اور مثالیں بھی انھیں حضرات کی دی گئی ہیں اور مدح کے صرف ۱۵ اشعار ہیں۔ باقی گھوڑے وغیرہ کی تعریف کی ہے اور پھر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قصائد میں جو تازہ شگفتہ تشبیہوں، استعاروں اور ترکیبوں کی فراوانی ہے۔ اس میں دراصل انفرادی اُپج کی کوشش کارفرما نظر آتی ہے تجربات ایک الگ شان رکھتے ہیں۔ اس لیے انھیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے بڑی نادر اور منفرد تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں۔ ان کی ترکیبیں بعض وقت ایسے وسیع خیال کا چند لفظوں میں احاطہ کر لیتی ہیں کہ جو بیان کیا جائے تو کئی سطروں میں ادا نہ ہوں اسی طرح تشبیہیں ان کے وسیع مشاہدے کی گہرائی اور نازک خیالی کا پتہ دیتی ہیں۔ تشبیہ دیکھئے :-

موجِ گل ڈھونڈھ بخلوت کدۂ غنچۂ باغ		گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

پگڑی جب تک بند ہی ہے۔ بصورت غنچہ ہے اور جب کھل کر گر گئی تو گویا وہ گل ہو گئی۔

بہرحال! غالب کے قصائد شعری محاسن سے معمور ہیں۔ قصیدہ نویسی کی جو عام روایت قائم ہو گئی تھی، اس سے بڑی حد تک الگ نظر آتے ہیں۔ ان کے قصائد دوسروں کے قصائد کی طرح محض بیانیہ نہیں ہوتے، بلکہ ان میں استعارا اور رمز و ایما، کی جھلکیاں قدم قدم پہ اپنا جلوہ دکھاتی نظر آتی ہیں۔ دورِ اول کے قصائد میں اشکال لفظی، دقت آفرینی، اور بے لگام قوتِ متخیلہ نظر آتی ہے۔ لیکن بعد کے دونوں قصیدے اس سے کسی حد تک مختلف ہیں۔ دونوں قصائد مکالماتی اور عام فہم، انداز بیان اور سلاست کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ زبان صاف اور روزمرہ کی ہے ●● ۔

ایوان اردو کی عمارت اور سب رس کے محتویات کے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کمر ہمت باندھ لے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے، اس سے دوسرے لوگوں کو ترغیب ہونا چاہیے کہ وہ اپنے قومی سرمائے کے تحفظ کا عزم کریں۔
رما کنت رام۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۷۶ء



عزیز قیسی

غزل

بلاکشوں پہ کہاں پیاس کا عذاب نہ تھا
وہاں پہ منع تھا پانی جہاں سراب نہ تھا

نہ آستینوں پہ ملتا نہ خاکِ مقتل پر
خدا کا شکر ہمارا لہو شراب نہ تھا

شکستِ خواب کا ماتم تھا کو بہ کو لیکن
تمام شہر کی آنکھوں میں کوئی خواب نہ تھا

بکا تھا ذہن و دل و جاں سمیت منڈی میں
الگ ضمیر کے کیا دام تھے حساب نہ تھا

بطرزِ خاص تھی مقصود مجھ کو شہرتِ عام
لبوں پہ تھا، مرے سینے میں انقلاب نہ تھا

ڈاکٹر نیّر مسعود

جدید ادب اور ترقی پسند ادب

آغاز اور ارتقاء

ادب کی تاریخ میں اکثر روایت کے ساتھ ایک نہ ایک لہر انحراف کی بھی موجود رہتی ہے کبھی یہ لہر محض ایک یا چند اہلِ قلم کی انفرادیت معلوم ہوتی ہے، کبھی یہی لہر آگے بڑھ کر ایک عام رجحان بن جاتی ہے اور یہ رجحان کبھی تحریک کی شکل اور کبھی ادبی فیشن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان ارتقائی مراحل کے دوران ایک عرصے تک اس ادبی لہر کے زشت و خوب کو پرکھنے کا کوئی کارآمد اور معتبر ادبی معیار نہیں بن پاتا۔ آخر کار یہ لہر وقت کی تنقید سے دوچار ہوتی ہے۔ وقت اس لہر کے تحت تخلیق ہونے والے ذخیرے کو پرکھ کر اس کے بڑے حصے کو جن کا ادب سے کوئی خاص واسطہ نہیں ہوتا، مسترد کر دیتا ہے اور اس میں جو کچھ بچ رہتا ہے وہ ادبی روایت کی توسیع کرتے ہوئے اس کا حصہ بن جاتا ہے۔

اردو کا جدید ادب جو اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع ہے ابھی وقت کی تنقید سے دوچار نہیں ہوا ہے اس لئے کہ ابھی یہ ادب اپنی ارتقائی منزلوں میں ہے۔ اس ادب کے آغاز کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔

آج ہم جس ادب کے لئے جدید ادب اور جدیدیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اس کو ترقی پسند ادب کے حریف کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی جدید ادب کو ترقی پسند ادب کی توسیع بھی کہا گیا ہے اور ترقی پسند ادب کا ردِّ عمل بھی اور اس موضوع پر مفصل بحثیں بھی ہو چکی ہیں۔ ان بحثوں سے قطع نظر جب ہم جدید ادب کے آغاز اور ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کا آغاز نہ صرف ترقی پسند ادب کے ساتھ بلکہ ترقی پسند ادب ہی کی حیثیت سے ہوا اور اوّل اوّل ان دونوں ادبی دھاروں میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خود ترقی پسند ادب کو نیا ادب اور جدید ادب بھی کہا جاتا تھا اور ترقی پسند تحریک کو یہ دونوں نام قبول بھی تھے۔ دراصل اس وقت ہر غیر روایتی شاعر اور ادیب ترقی پسند تھا خواہ وہ جوش اور سردار جعفری کی طرح سیاسی اور سماجی انقلاب کا نقیب ہو خواہ اس پر میراجی اور ن۔ م۔ راشد کی طرح بودلیئر، ملارمے، رمبو کی مبہم اشاریت اور فرائڈ کی تحت الشعوری جنسیت کا سایہ ہے۔ چنانچہ میراجی اور راشد وغیرہ جو جدید ادب کے اوّلین معماروں میں تھے، ایک عرصے تک ان کا شمار سربرآوردہ ترقی پسندوں میں ہوتا تھا۔ کنھیا لال کپور نے "غالب ترقی پسندوں کی محفل میں" کے عنوان سے جو طنزیہ لکھا اس میں بھی ہمیں میراجی اور راشد ترقی پسند شاعروں کے دوش بدوش بیٹھے نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۰ء کے آس پاس ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں کچھ شدت پیدا ہوئی اور مخالفوں نے خاص طور پر میراجی اور راشد کے یہاں سے مثالیں دے دے کر ترقی پسندوں پر اعتراضوں کی بوچھار کی۔ اب ترقی پسند نقادوں کو احساس ہوا کہ ان کی صفوں میں بعض ایسے لکھنے والے بھی ہیں جن کے یہاں ابہام اور غیر روایتی عناصر ہیں، لیکن یہ عناصر ترقی پسند نظریات کے مطابق نہیں ہیں لہذا ان نقادوں نے معترضوں کو جواب دیتے ہوئے اپنی صفائی میں ان لکھنے والوں کو ترقی پسندی کے دائرے سے خارج کر دیا۔ مثلاً سجاد ظہیر نے ایک مضمون میں لکھا:

"ایک بڑی... عجیب بات یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کے مخالفین ہر نئے ادیب کو .... ترقی پسند کا نام دے کر پوری تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً میراجی کا کلام لے کر اس کا خوب مذاق اڑایا جاتا ہے اور تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ اگر یہی ترقی پسندی ہے تو اس سے ہمیں خدا کی پناہ ہے۔"

اسی زمانے میں رشید احمد صدیقی نے "ترقی پسند ادب" کے عنوان سے ایک اعتراضی مضمون لکھا۔ اس کے جواب میں سید احتشام حسین نے جو مضمون لکھا اس میں یہ بھی لکھا کہ رشید صاحب کے مضمون میں:۔

"ترقی پسند ادب کے متعلق بعض ایسی کمزوریاں منسوب کر دی گئی ہیں۔ جن کا تعلق ترقی پسند ادب سے نہیں۔ اگر اس مقالے کی سرخی" نیا ادب" یا "جدید ادب" وغیرہ ہوتی تو یہ عرض کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی۔"

اس مضمون میں آگے بڑھ کر احتشام صاحب نے لکھا :

"یقیناً جدید ادب کے یہ عنوانات بھی ہیں لیکن صرف اسی وقت تک کہ جدید اور ترقی پسند میں فرق ملحوظ نہ رکھا جائے۔"

اسی طرح سید اختر علی تلہری کے ایک مضمون کے جواب میں احتشام صاحب نے ترقی پسند اور جدید ادب میں تفریق کرنے پر زور دیا۔ ان جوابی مضامین سے دو اہم باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ "جدید ادب" دراصل ترقی پسندوں کا دیا ہوا نام ہے اور اس ادب کو ترقی پسند ادب سے جداگانہ حیثیت دینے لگے تھے۔ دوسری اور اہم تر بات احتشام صاحب کے اس جملے سے واضح ہوتی ہے۔

"ترقی پسندی کو جدید ادب یا موجودہ زندگی کے تمام رجحانات سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس جملے کا مطلب یہ ہوا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ معاصر زندگی کے بہت سے پہلو اور معاصر انسان کے بہت سے ذہنی مسائل تھے جو ترقی پسند ادب کے موضوعات سے خارج قرار دیئے گئے تھے۔ اور دراصل یہی عناصر ابتدا سے ترقی پسند اور جدید ادب کے درمیان خطِ فاصل کھینچتے تھے۔ سجاد ظہیر کا وہ بیان ہم پیش کر چکے ہیں جس میں انھوں نے میراجی سے ترقی پسند تحریک کی برأت کا اظہار کیا ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے میراجی کی شاعری کے جن عناصر کا معترضانہ ذکر کیا ہے وہی آگے بڑھ کر جدید ادب کے امتیازی اور اساسی عناصر بن گئے۔ سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔

"میراجی کی شاعری آج کل کے متوسط طبقے کے اس گروہ کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت کا عکس پیش کرتی ہے جو زندگی کی پیچ پیچ راہوں میں غولِ بیابانی کی طرح آوارہ و سرگرداں ہے وہ ماضی سے نالاں ہے اس کا حال محرومی کی ایک دردناک داستان ہے اور اس کا مستقبل امید سے خالی اور تاریک ہے۔"

اسی طرح میراجی اور ان کے ہم خیال لکھنے والے ترقی پسند برادری سے باہر ہو گئے۔ لاہور کا حلقۂ اربابِ ذوق انھیں لکھنے والوں کی نمائندگی کرتا تھا لیکن اس وقت کی ادبی دنیا میں حلقے کا اثر و نفوذ ترقی پسند تحریک کے سامنے نہیں کے برابر تھا اور جدید ادب بھی رو بظاہر ایک وقتی اُبال کی طرح ختم ہو گئی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور برصغیر کی آزادی اور اسی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات اور ترکِ وطن کے مسائل نے کچھ عرصے تک ادبی دنیا میں برپا کر تخلیقی سرگرمیوں کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ طوفانی صورتحال ختم ہو گئی اور اسی تناسب سے ادب کے میدانوں میں سناٹا سا پھیلنا شروع ہوا چنانچہ ۱۹۵۰ء کے بعد ایک عرصہ تک ادبی فضا میں جو تھوڑی بہت گرما گرمی تھی وہ اس موضوع پر تھی کہ اردو ادب جمود کا شکار ہو چکا ہے یا نہیں۔ لیکن کچھ دن بعد خود یہ موضوع بھی جمود کا شکار ہو گیا۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

غزلیں

عمر انصاری

اہلِ دل ہی نہیں، دل کا مرے غم جانے کون
ہوں بھری بزم میں تنہا مجھے پہچانے کون

دُور تک دل میں چراغاں سا نظر آتا ہے
ہو کے گزرا تھا اِدھر سے ابھی کیا جانے کون

تم بھی حق اپنا ادا کر لو گزرتے لمحو
جز تمہارے ہمیں آئے گا بھی سمجھانے کون

تم نہیں ہو تو یہ بتلاؤ، مری باتوں کا
اور محفل میں یہ بیٹھا ہے بُرا ماننے کون

وہ بھی بزم، جلی شمع، جلے پروانے
دل میں بیٹھا یہ سُنا کرتا ہے افسانے کون

ایک دیوانہ اور اس درجہ پتے کی باتیں
تجھ کو دیوانہ کہے گا ارے دیوانے کون

مٹنے والے رُخِ روشن پہ سرِ بزم عمر
میرے ہوتے ہوئے ہوتے ہیں یہ پروانے کون

عبدالمتین نیاز

ٹھہر! کہ دل سے ابھی حسرتِ مکاں نہ اٹھا
غموں کے خوف سے تو اس قدر زباں نہ اُٹھا

جہانِ کرب سے سب کو گزرنا پڑتا ہے
صدائے گریہ سے یوں سر پہ آسماں نہ اُٹھا

جلے تو تھے خس و خاشاک آرزو ___ لیکن
نواحِ جاں سے ہمارے کبھی دھواں نہ اُٹھا

یہ راہ تجھ کو بیاباں میں چھوڑ دے گی کہیں
شگفتگی کا ہنسی کا مری نشاں نہ اُٹھا

یقیں کی دھوپ دکھائی ہزار سورج نے
سروں سے اپنے مگر سایۂ گماں نہ اُٹھا

تری صداؤں کے سب تیر خالی جائیں گے
"جہانِ سنگ میں تو زحمتِ اذاں نہ اُٹھا"

نیاز دردکشِ دردمند ہی بن کر
بیانِ غم سے مرے لطفِ داستاں نہ اٹھا

مظفر حنفی

وہ کمرے میں آنا شب کا
پھر پتھر بن جانا شب کا
کلکاری بھرتے تاروں سے
بُنتا ہوں افسانہ شب کا
روشنیوں کے کانٹے چُن کر
چھاتی سے لپٹانا شب کا
آنکھوں سے موتی ٹپکا کر
دیر تلک جھنّانا شب کا
دن کا گنبد گونج رہا ہے
ٹوٹا تانا بانا شب کا
شبنم، تارے، طائر، غنچے
کس نے کہنا مانا شب کا
ٹوٹی کشتی، ہم خوابیدہ
ساحل پر تھرّانا شب کا
آنا سورج کا نیزے پر
سینے میں لہرانا شب کا
اور مظفر سے مت بولو
وہ تو ہے دیوانہ شب کا

نصر قریشی

دیدنی منظر ہے ساحل، ریت اور صحرا تمام
اک سمندر سے جدا ہوکر ہُوا دریا تمام

لالہ زاروں میں ہیں بھٹکے خوشبوؤں کے قافلے
پت جھڑوں کی زد میں آکر شاخ پہ پتّا تمام

نامُرادوں کی طرح اِس دَور میں جیتے ہیں ہم
زندگی کا مرثیہ، دنیا کا واویلا تمام

اس نمائش گاہ میں ہر سمت ہیں بے جسم سر
خود شناسی کرتے کرتے دیدۂ بینا تمام

ہم رہے چپ چاپ تیری آشنائی کے اسیر
جانے کیسے شہر میں اس کا ہُوا چرچا تمام

تیرے دل بہلانے کو دل سا کھلونا ہے کہاں
ڈھونڈا ہے بازار سارا، چھانا ہے میلہ تمام

تجھ سے نسبت تو برائے نام ہی باقی ہے اب
انقلابوں نے کیا ہے عشق کا سودا تمام

داستانی لوگ اک دن ہم بھی ہو جائیں گے نصر
داستاں در داستاں اپنا بیاں قصّہ تمام

محمد عبدالقادر ادیب

مُڑ کر جو دیکھا میں نے تو دل ہی دہل گیا
ماضی کو میرے، وقت کا طوفاں نگل گیا

ہاتھوں سے جام گرتے ہی ٹکڑے بکھر گئے
اتنا تو ہوش تھا کہ وہ کھوکر سنبھل گیا

میرے کمالِ ذوق کی سرگرمیاں نہ پوچھ
حائل جو راہ میں تھا، وہ پتھر پگھل گیا

پُرپیچ راہِ عشق تو پُرخار ہر نظر
منزل کو اس نے پایا جو بچ کر نکل گیا

صیّاد کی روش سے چمن لالہ گوں ہوا
پھولوں کا شوخ رنگ بھی شعلوں میں ڈھل گیا

خوابوں کے آسماں سے گرا تو پتہ چلا
موسم کے ساتھ ساتھ ستارا بدل گیا

کیا دَور آگیا ہے، سیاہی ہے ہر طرف
کیا جانے کیوں زمانہ اُجالوں سے جل گیا

کیا شہر میں سکون ملے گا ادیب کو
ہر بام و در پہ دل کا لہو کوئی مل گیا

راجہ لال راجہ

ہر ایک سانس ہے اک نامۂ الم کی طرح
ملی حیات بھی روٹھے ہوئے صنم کی طرح

کبھی کبھی مری دہلیز تک چلا آیا؟
مرا فریبِ تمنّا ترے قدم کی طرح

بدل گیا ہے کچھ ایسا مزاجِ دل اپنا!
تلاشِ عیش بھی ہے آرزوئے غم کی طرح

جبھی تو صفحۂ ہستی پہ نقش اُبھرتے ہیں!
ہماری سانس بھی چلتی ہے اب قلم کی طرح

جو اپنی ذات کے پردوں کو چھو نہیں سکتے؟
وجود اُن کا ہے آئینۂ عدم کی طرح

ہٹا کے رکھ دیا کیوں سامنے سے پیمانہ
دکھائی دیتا ہے کیا میری چشمِ نم کی طرح

تلاش کرلی ہیں راجہ تمام صحرا میں
نظر نہ آیا کہیں کوئی اس صنم کی طرح

میراجی

قندِ مکرر

پامال

سوکھے سب بال سفید ہو چکے۔ مسوڑھوں میں شاید کہیں کہیں کوئی دھندلا سیاہ خط دکھائی دیے جاتا ہے۔ دانت ایک ایک کر کے نہ جانے کہاں رہ گئے، پچکے ہوئے گال، گویا وقت کے گزرنے سے سہمے ہوئے ہیں۔ ماتھے پر گہری سوچ بچار اور دنیا کے دکھ لکیروں کی صورت میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے۔ یہاں سانس کا آنا جانا بھی کچھ اتفاق سا ہے۔ آس پاس پھیلی ہوئی دھرتی ہے لیکن یوں جیسے ایک نقطے پر کھڑا ہوں، کھڑا بھی نہیں بلکہ بیٹھا ہوا، بیٹھے گویا سستانے کے لیے ... ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔ معلوم نہیں کب یہ نقطہ بھی پیروں تلے سے پھسل جائے۔ چاروں طرف ہر آن زندگی کی گہما گہمی ہے، بادل ہوں ہر طرف ایک دھند کا چھایا ہوا ہے اور اس دھند کے بیچ سے ننھے ننھے بچے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ کوئی منہ بسور رہے، کوئی ... ہنستے ہوئے، کوئی حیرانی سے تک رہا ہے۔ کوئی.....

گھر کے سب لوگ تیار ہو چکے تھے۔ صرف ننھی کو نیا فراک پہنانا باقی تھا۔ آج سب ماموں کے ہاں جا رہے تھے۔ ماموں یہاں سے ریل کے چند اسٹیشن چھوڑ کر رہتے تھے۔ ماموں بھی ریل کے ملازم تھے اور ابا میاں بھی۔ چھوٹی ریلوے تھی، ڈھائی فٹ چوڑی پٹڑی کا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک ... کل آٹھ دس اسٹیشن۔ گویا گھر کا محکمہ تھا، ابا میاں انجینئر تھے۔ علاقے کے سب سے بڑے افسر۔

ننھی کو فراک پہنا دیا گیا۔ سب گاڑی میں بیٹھ گئے، ریل گاڑی چلی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آدھے راستے میں پڑتا تھا۔ یوں تو اس جگہ گاڑی صرف چند منٹ کے لیے رکتی تھی لیکن کچھ دیر اور ٹھہرنے سے دیر بھی ہو جائے گی تو کیا ہے۔ اوّل تو مال گاڑی، اس کی آہستہ رفتار اور کچھ ڈبوں میں تفریح کے خیال سے بیٹھے تھے۔ دوسرے زیادہ دیر رکوانا صرف ایک بات تھی۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ یہ اسٹیشن بالکل جنگل میں تھا۔ بندھیا چل کی گود میں بھیلوں کا وطن۔

سب کو پکنک کا مزہ آ گیا۔ باتوں باتوں میں کھانا کھا لیا گیا۔ کوئی جنگلی پھول توڑنے لگا۔ کوئی کئی طرح کے پیڑوں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں ابا میاں آئے۔ اب گاڑی کو زیادہ دیر روکے رہنا ٹھیک نہیں۔ دوسرے پہنچنے میں دیر بھی ہو جائے گی۔ ابھی آدھا سفر باقی ہے۔

بچے بالے بڑے بوڑھے سب سوار ہوئے۔ گاڑی چلی۔ لیکن ابھی تیز نہ ہوئی تھی کہ ماں نے دیکھا پٹڑی سے ہٹ کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس جہاں کھانا کھایا گیا تھا۔ اس کا بچہ کھڑا حیران نگاہوں سے چلتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے حیرانی اس بات کی تھی کہ اس بھرپور جنگل میں جہاں اپنا نہ پرایا یہ سب مجھے کس تقریب میں چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں۔ اسے کیا خبر کہ چلتے ہوئے بے دھیانی میں کسی کو خیال نہ رہا۔ ہر کوئی یہی سمجھتا رہا کہ بچہ دوسرے کے پاس ہو گا۔ اسے کیا معلوم کہ گاڑی یونہی چلی جایا کرتی ہے۔ بڑے بوڑھوں کا سفر

پورا پوچھا جاتا ہے اور صرف بچے ہی پیچھے رہ جاتے ہیں، اُسے کیا پتہ کے پیڑوں کے اس جھنڈ کی طرف دیکھ کر ماں کے دل میں یہ ایک لمحہ کس طرح ایک خنجر کی طرح پیوست ہو گیا۔ ماں دیکھتے ہی چلائی۔ گاڑی روکو، گاڑی روکو، بڑوں کی توجہ ہوئی۔ گاڑی رکی دوڑ کر ایک صاحب بچے کو لائے۔ ماں بھی گاڑی سے اُتر کر تھوڑی دور تک آگئیں بچے کو لے کر گلے لگایا۔ چوما چاٹا۔ ابا میاں ناراض ہوئے کہاں رہ گیا تھا، کسی نے کہا۔ وہ تو خیر ہوئی جلد مل گیا۔ جنگل بیابان نہ جانے کوئی بھیل ہی اُٹھا کے لیے جاتا۔ بڑوں نے تقدیر کے جنگل سے رہائی کی یہ مہم سر کر لی۔ پھر سے گاڑی میں بیٹھے اور از سرِ نو سفر شروع ہوا۔ لیکن آج بھی وہ بچہ آس پاس کے دھندلکے سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ گھر میں اکثر بیان کیا جاتا تھا سب وطن سے دور ابا میاں کے پاس جا رہے تھے۔ گاڑی ایک بہت بڑے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ شاید جنکشن تھا۔ بہت سے رستوں کا سنگم۔ لیکن یہاں بھی رستے الگ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ گاڑی سے کچھ ڈبے کاٹے جا رہے تھے اور کچھ اُس میں اور لگائے جا رہے تھے۔ بچہ نہ جانے کیا دیکھ کر، کیا سوچ کر، سب کی نظر بچائے چپکے سے گاڑی کے ڈبے سے پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ گاڑی کا ڈبہ پلیٹ فارم سے دور لے جایا جا رہا تھا کہ ماں کی نظر پڑ گئی۔ وہ تو خیر گذری کہ بڑے ماموں جو سب کو لئے جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ہی تھے۔ کچھ لینے کے لئے ذرا دور تک گئے تھے۔ آتے ہوئے اُن کی نظر پڑی۔ اتنے میں ٹرین کا ڈبہ پھر سے پلیٹ فارم پر رک گیا تھا اور اماں اُتر کر تیزی سے اس طرف چلی آ رہی تھیں یہ بچہ بھی مجھے گھور رہا تھا ۔ میں اس کی نگاہوں سے بچ کر دوسری طرف دیکھنے لگتا ہوں۔

ادھر ایک اور کی معصوم آنکھیں میری طرف تک رہی تھیں۔ یہ بچہ اپنے چچا کے ساتھ دلّی سے بڑے شہر میں سیر کی غرض سے آیا ہے۔ چچا کو لاہور میں اپنی دکان کے لئے سامان خریدنا ہے بچے کے لئے یہاں ایک نئی دنیا ہے، بڑے بڑے مکان، بڑی بڑی دکانیں، ہر طرف لوگوں کا ہجوم اور اس ہجوم میں بازار اتنا بڑا کہ اس عمر کے بچے کو اگر ایک کنارے پر کھڑا ہو تو اس کا دماغ احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ دوسرا کنارا کتنی دور ہے۔ چاندنی چوک کی ایک بڑی سی دکان میں چچا سامان کی خرید کے لئے داخل ہوئے۔ بچہ بھی ساتھ تھا۔ چچا تو سامان خریدنے میں مصروف ہوئے اور بچہ ذرا سی دیر میں خرید و فروخت کی غیر دلچسپ تفصیلات سے اُچٹ کر بازو میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک ایک چیچیے والا رنگ رنگ کے کھلونے لئے سامنے سے گذرا۔ بچے کی جیب میں دو چار آنے تھے۔ چچا نے بہلانے کو دے دیئے تھے۔ معلوم نہیں کون سا کھلونا پسند آیا کہ چچا کی نظر بچا کر دکان سے نکلا اور کھلونے والے کے پیچھے ہو لیا۔ اتنی سی دیر ہی میں کھلونے والا دجانے کہاں کا کہاں جا پہنچا تھا۔ بچہ سو دو سو گز تک چل کر ہجوم میں کھو گیا۔ کھلونے والا نہ ملا۔ مگر اب دکان کا رستہ بھی نہ سوجھتا تھا۔ بے بسی کی حالت میں پٹری پر کھڑا رونے لگا۔ دو ایک راہگیر جمع ہو گئے۔ اُس سے پوچھنے لگے۔ تمہیں کہاں جانا ہے۔ تمہارے ساتھ کون تھا۔ بچے کو کیا معلوم اُسے کہاں جانا ہے۔ ہاں چچا اُس کے ساتھ تھے ابھی راہگیروں کو واقعے کا سر پیر نہ معلوم تھا کہ بچے کو ڈھونڈتے ہوئے چچا آن پہنچے۔ آج کھلونے والے کو بھول کر یہ بھی مجھے دیکھ رہا ہے۔

اور یہ بچہ کچھ مختلف معلوم ہوتا ہے ابا جان ریٹائر ہوئے تو ہندوستان بھر کے سفر کے لئے انھیں آنے جانے کا ایک پاس ملا تاکہ بال بچوں کو ملازمت سے سبکدوش ہونے سے پہلے سیر و تفریح کرا سکیں۔ اماں اس سفر پہ نہ گئیں۔ گھر ہی پہ رہیں کہ بھرے پرے گھر میں ایک اور بچے کی آمد تھی۔ سب سے چھوٹے بچے کو سفر کے جھمیلوں ... میں کون سنبھالتا۔ اسے بھی گھر پر ہی رہنا پڑا۔ یہ میرا سب سے پیارا بھائی تھا چلتے وقت اُس نے ضد تو بہت کی لیکن سیدھے سبھاؤ بڑوں کے آگے چھوٹوں کی کب چلی ہے۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ پندرہ دن کے سفر کے بعد لکھنؤ بنارس نہ جانے کہاں کہاں گھوم پھر کر لوٹے۔ ہر جگہ کی دلچسپیاں دل کو جذب کر لینے والی تھیں۔ لیکن اُن کی رنگا رنگی کے باوجود ہر جگہ سب بہن بھائیوں کو اپنے چھوٹے بھائی کا خیال ہی رہا۔ کہیں سے کوئی کھلونا، کہیں سے کوئی اچھا خاصا انبار اُس کے لیے سمیٹ لائے۔ گھر پہنچ کر جب اتنے دنوں

کے بعد اماں کے آس پاس سب بھائی بہن۔ ایک جھرمٹ کی صورت اکٹھے ہوئے تو کوئی تو ایک طرف کو آرام سے بیٹھ گیا، کسی نے منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے کا رُخ کیا کوئی سفر کی کوئی دلچسپ بات بتانے لگا۔ چھوٹا بھائی یہ سب کچھ حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ یہاں آؤ۔ دیکھو تمہارے لئے کیا کچھ لائے ہیں۔ پہلے تو ایسے جیسے کچھ آگے بڑھنے کو ہو۔ پھر اچانک زور زور سے روتے ہوتے بھاگا۔ کسی نے کہا۔ ارے یہ کیا! کسی نے بکس سے کھلونے نکالنے شروع کئے۔ ماں نے ہنستے ہوتے بچے کو سینے سے لگا لیا اور بولی۔ اتنے دنوں اکیلے رہ کر اداس ہو گیا تھا۔ میرا بچہ، میرا بچہ، اور یہ بچہ ابھی مجھے اسی وحشت سے دیکھ رہا ہے۔

باغ میں بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ دو چار یہاں اور دو چار وہاں، اور اُن کی آیائیں اور انائیں ایک طرف جھرمٹ سا بنائے بیٹھی تھیں۔ کوئی [illegible] سنا رہی تھی، کوئی سن رہی تھی بہت ہی چھوٹے سے بچے، نہایت ضروری مسئلے کی طرف متوجہ تھی۔ دو ایک آپس میں علی الاعلان [illegible] کی غیبت میں مصروف تھیں۔ کچھ دُور ہٹ کر دو ایک نوجوان ان میں سے ایک آدھ پر جمالیات کے لحاظ سے غور کر رہے تھے اور کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ بچے ان سب باتوں سے بے خبر کھیل میں مصروف تھے۔ ایک بچہ کسی پودے سے ایک بڑا سا رنگ برنگا پھول توڑ لایا۔ اور دو ایک بچوں کو دکھانے لگا۔ دیکھو کتنا بڑا پھول ہے وہ بھی کھیل کو بھول کر اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک کا جی چاہا۔ یہ پھول میں لے لوں۔ بولا مجھے دے دو۔ پہلے سب نے کہا تم بھی لے آؤ۔ میں اُس پودے سے توڑ کر لایا ہوں۔ اُس نے کہا۔ میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچے گا۔ تم اپنا پھول مجھے دے دو۔ دوسرے بچے کو اب بھی انکار تھا۔ چنانچہ چھینا جھپٹی شروع ہوئی چیخ پکار مچی۔ ایک انّا نے اُسے دیکھ لیا۔ ناس مارا جائے۔ ...... بڑبڑاتی ہوئی دوڑی آئی اور سب کو الگ الگ کیا۔ اتنے میں ایک اور بچے نے جو سب میں ذرا سا بڑا تھا جا کر بہت سے ویسے ہی پھول توڑ لئے اور سب کے پاس لے آیا۔ سب بچے خوش خوش کھیلنے لگے۔ ان سے پرے ہی دور ایک بنچ پر بیٹھے ہوتے ایک نوجوان نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اور ایک آہ بھری۔ اُس کے تصور میں ایک اور ہی بچہ تھا۔ بالکل ان بچوں کا ہجولی لیکن بالکل اُس کے اپنے ہی جیسا یہ ان دیکھا، انجانا بچہ ابھی مجھے تک رہا ہے۔ میرے آس پاس پھیلے ہوئے دُھندلکے میں سے مجھے تک رہا ہے اور میرے سر کے سب بال سفید ہو چکے ہیں۔ کاش! جس نقطے پر میں دم بھر کو سستانے کے لئے بیٹھ گیا ہوں۔ وہ میرے پیروں تلے سے پھسل جائے۔ "ادبِ لطیف" لاہور، مارچ ۱۹۶۹ء

(بقیہ جدید ادب اور [illegible] صفحہ ۱۵ سے آگے)

اس الگ تحریک نے رائی تقریباً ۵۵ - ۵۲ء کے آس پاس اس جدید ادب کی نشاۃ ثانیہ ہوئی جس کی داغ بیل میراجی اور راشد وغیرہ نے ڈالی تھی اس کے ساتھ اردو غزل بھی جو تقریباً مردہ پڑی ہوئی تھی۔ ناصر کاظمی، خلیل، [illegible] اور ابن انشا وغیرہ کے ہاتھوں پھر سے زندہ ہوئی دس گیارہ برس کے اندر جدید ادب ہندوستان اور پاکستان کا سب سے گرم ادبی موضوع بن گیا ادب خصوصاً نظم اور افسانے میں موضوعاتی اور ہیئتی تجربوں کا ایک سیلاب سا آگیا تنقیدی نظریات اور ادبی معیاروں پر نظر ثانی ہونے لگی ہیئت و [illegible] کے باہمی تعلق [illegible] پر زور و شور اور بحث مباحثہ شروع ہوا اور چند لکھنے والوں کی انفرادیت سے شروع ہونے والی جدیدیت ایک پھیلتا ہوا رجحان بن گیا ترقی پسند ادب کی طرح جدید ادب کی بھی مخالفت اور حمایت دونوں میں ابھی تک افراط و تفریط کی کیفیت ہے ایک طرف اسے ادبی فیشن کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے دوسری طرف اس کو ایک غیر ادبی سازش قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا اس وقت جدید ادب اپنے ارتقائی منازل میں ہے لیکن اس وقت بھی اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ آگے بڑھ کر یہ ادب بھی ہر ادب کی طرح وقت کی غیر جانب دار تنقید سے دوچار ہوگا۔ اُس کے بعد اس میں سے جو کچھ بچے گا وہ ہماری ادبی روایت کی توسیع کرتے ہوئے اس کا حصہ بن جائے گا ــ ••

مولانا محمد علی جوہر

بادۂ کہن

ہندوستان کی تحریکِ آزادی ہو کہ خلافت تحریک، سیاست ہو کہ صحافت، شاعری ہو کہ خطابت، ہر موڑ پر مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے نمایاں نقوش روشن نظر آتے ہیں۔ برطانوی سامراج سے وہ ساری عمر معرکہ آرائی کرتے رہے۔ اپنے اخبارات "کامریڈ" (انگریزی ہفت روزہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۴ء) اور روزنامہ "ہمدرد" (۱۹۲۴ء) کے ذریعہ ملک اور صحافت کی اہم قومی خدمت انجام دی، قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ کانگریس اور خلافت کے پلیٹ فارموں سے اتحاد کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۳۰ء میں علالت کے باوجود حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور مکمل آزادی کا دو ٹوک مطالبہ کیا۔ محمد علی نے کہا تھا .... "میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا، میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ ایک آزاد ملک ہو مرنے کو ترجیح دوں گا اور اگر آپ ہم کو ہندوستان میں آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو مجھے یہاں ایک قبر دینی پڑے گی ..." بالآخر ۴ رجنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں انتقال ہو گیا اور یروشلم میں، جو اس وقت آزاد سرزمین تھی، ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مولانا محمد علی جوہر، جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے بانیوں میں تھے۔ وہ جامعہ کے پہلے شیخ الجامعہ بھی رہے۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۰ ردسمبر ۱۸۷۸ء کو) نجیب آباد (بجنور) میں پیدا ہوئے۔

ذیل میں ان کی شاعری کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ (ر۔خ)

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے	پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف	کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو	خوش ہوں کہ وہ پیغامِ قضا میرے لئے ہے
اے شافعِ محشر جو کرے تو نہ شفاعت	پھر کون وہاں میرے سوا میرے لئے ہے
کیوں ایسے نبی پہ نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے	اچھے تو سب ہی کے ہیں بُرا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے	یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر	یہ اُس کی دین ہے، جسے پروردگار دے

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں!!
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

بیٹھا ہوا تو یہ کی تو غیر منایا کر!!
ملتی نہیں جوہر اِس دیس کی برساتیں

یاں تو ہے نام عشق کا لینا!
اپنے پیچھے بلا لگا لینا!

ہم بچھڑیں تجھ سے، یہ نہ ہو یا رب،
اس سے پہلے ہمیں اٹھا لینا

آج جی بھر کے دیکھ لینے دو
کل کو دل کھول کر ستا لینا

وصل کی شب نہ چھیڑ قصۂ ہجر!
یہ کسی اور دن سنا لینا!

ان کے در سے زکوٰۃِ حسن اگر
گالیاں بھی ملیں تو کھا لینا

تم کو زیبا نہ تھا وداع کے وقت
آنکھ جوہر سے یوں چُرا لینا

روزِ ازل سے ہے یہی اک مقصدِ حیات
جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

مطلب فرات سے ہے نہ آبِ حیات سے
ہوں تشنۂ شہادت و شیدائے کربلا

جوہر مسیح و خضر کو ملتی نہیں یہ چیز
اور یوں نصیب سے تجھے مل جائے کربلا

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

اس طرح کے مرنے میں بھی جینے کا مزہ ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

کرو نہ فکر کہ یہ زندگی دو روزہ ہے
حلال ہو کے رہے گی شراب دیکھو تو

تمہیں مواخذۂ حشر کا یقیں نہ سہی!
مگر قریب ہے یوم الحساب دیکھو تو

بس آچلی ہے شبِ وعدہ اب، تو غم نہ کرو
ہوا ہے زرد رُخِ آفتاب دیکھو تو

بہارِ خونِ شہادت دکھا گئی جوہر
خزاں میں اور یہ رنگِ شباب دیکھو تو

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد!
ہے ابتدا ہماری، تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے

ایک ایک کر کے سب کے سب تنکے
ہوئے برباد آشیانے کے

دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر!
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

●●

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہندوپاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

محمد حسن عسکری

محاوروں کا مسئلہ

کم بخت ادب میں جہاں اور بلیں مصیبتیں ہیں، وہاں ایک جھگڑا یہ بھی ہے کہ اس کے ایک عنصر کو باقی عناصر سے الگ کر کے سمجھنا چاہیں تو بات آدھی ادھوری رہ جاتی ہے۔ یہاں وہ ڈاکٹروں والی بات نہیں چلتی کہ کوئی کان کے امراض کا ماہر ہو تو کوئی ناک کی بیماریوں کا۔ ادب پارہ عناصر کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ یہاں تو کل ہی اصل چیز ہے۔ کہیں سے اینٹ کہیں سے روڑا لے کے اور چاہے جو بن جائے، ادب نہیں بنتا۔ ادب کا معاملہ تو وہی ہے جو اشیا کا ہے۔

اشیا میں لمبائی ہوتی ہے اور چوڑائی بھی۔ لیکن ایک کے بغیر دوسری وجود میں نہیں آ سکتی۔ ادب کے بارے میں لکھنے بیٹھیں تو یہی الجھن پیش آتی ہے۔ ابھی ایک پہلو کے متعلق کوئی بات کہہ کے مطمئن بھی نہ ہونے پائے تھے کہ پتا چلا کہ یہ پہلو دوسرے پہلو سے جڑا ہوا ہے۔ جبھی تو ادبی تنقید کا کام ہوا سے لڑنے کے برابر ہے۔

مثلاً میں نے کچھ دن سے غل مچا رکھا ہے کہ ہمارے ادیبوں کو الفاظ پر قدرت حاصل نہیں۔ اس لیے ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ الفاظ کو قابو میں لائیں۔ اس سیدھے سادے بیان سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادیب لوگ صبح اٹھ کر نہار منہ لغت کا ایک صفحہ رٹ لیا کریں۔ یا پرانی کتابیں پڑھ پڑھ کر اچھے اچھے لفظوں کی ایک فہرست بنا لیں اور پھر اس فکر میں رہیں کہ موقع بے موقع ایک زوردار سا لفظ نکال دیں۔ اگر بفرض محال اچھی طرح اچھی نثر لکھی بھی جا سکے تو محض ایک افسانہ چھپوانے کی خاطر اتنا جھنجھٹ کون پالے گا کہ نوراللغات کی چار جلدیں ہر وقت لیے اٹھائے پھرے۔ اصل پوچھنے کی بات تو یہ ہے کہ لفظ یاد کس طرح رہتے ہیں اور لفظوں پر قابو کس طرح پایا جاتا ہے۔ آخر وہ کیا چیز تھی، جس نے اکیلے شیکسپیئر کو چھبیس ہزار الفاظ دے دیئے۔ حالانکہ ہماری پوری اردو زبان میں ملا کے چھبیس ہزار الفاظ ہیں، اور آج کل کے اردو ادیبوں کے پاس تو شاید دو تین ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے، کیا وجہ ہے؟

الفاظ اس آدمی کو یاد ہوتے ہیں جو زندہ ہو۔ یعنی جسے زندگی کے عوامل اور مظاہر سے جذباتی تعلق ہو، اس تعلق سے جھجکے یا گھبرائے نہیں، ادیبوں کو چھوڑیئے، ہم آپ جیسے عام آدمی روزانہ، جو الفاظ بولتے

ہیں' ان میں ہماری پوری جسمانی ذہنی اور جذباتی سوانح عمری بند ہوتی ہے گویا ہر آدمی دن بھر اپنی داستان اور بچپن سے لے کر آج تک کی تاریخ بیان کرتا پھرتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لفظ تو ایسے تجربات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ جنھیں ہمارے شعور نے بھی قبول کرلیا ہے۔ بہت سے لفظوں میں وہ تجربات چھپے بیٹھے رہتے ہیں جن سے شعور بچتا ہے۔ لیکن جنھیں لاشعور ہمارے اوپر ٹھونستا ہے۔ دوسری طرف ایسے بھی لفظ ہوتے ہیں۔۔' جنھیں ہم حافظے کی گولیاں کھانے کے بعد بھی یاد نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اُن کا تعلق، ایسے ناخوشگوار تجربات سے ہوتا ہے۔ جن سے ہم دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔ ہم کتنے اور کس قسم کے الفاظ پر قابو حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہمیں زندگی سے ربط کتنا ہے۔ اور ہم خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں طرح کے تجربات قبول کرنے کی کتنی ہمت رکھتے ہیں۔ جی ہاں! خوشگوار تجربے کو قبول کرنے کے لئے بھی ہمت چاہیئے۔ بقول فراق صاحب' بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی'؛ اس میں بھی نفی خودی کا کرب برداشت کئے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ خود پرست آدمی نشاط کے قابل رہتا ہے نہ غم کے۔ اگر کوئی سکڑ سمٹ کے بالکل اندر بند ہوجائے تو اُسے لفظوں کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کیونکہ الفاظ تو اس تعلق کا ذریعہ اظہار ہیں' جو ہمارے اور خارجی چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ خدا نے حضرت آدمؑ کو سب سے پہلے چیزوں کے نام سکھائے تھے۔ پھر الفاظ محض اظہار کا ذریعہ ہی نہیں ہیں' ان کے پیچھے یہ خواہش کام کرتی ہے کہ ہم دوسروں سے تعلق پیدا کریں۔ چنانچہ لفظوں کو قابو میں لانے کے لئے آدمی کے اندر دو چیزیں ہونی چاہئیں۔ ایک تو زندہ رہنے اور زندگی سے دلچسپی رکھنے کی خواہش' دوسرے انسانوں سے تعلق رکھنے کی خواہش۔ شیکسپیئر نے پچیس ہزار الفاظ لغت میں سے نقل نہیں کئے تھے۔ بلکہ چیزوں اور انسانوں کی دنیا سے پچیس ہزار طرح متاثر ہوا تھا۔ کیونکہ ایک سیدھا سادا اصطلاحات خود بھی سا لفظ "اور" استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی، شخصیت میں اتنی لچک موجود ہے کہ وہ اپنی دلچسپی کو ایک چیز سے دوسری چیز تک منتقل کرسکے۔ اس کے اندر گیرائی ہے کہ بیک وقت دو چیزوں کا احاطہ کرسکے۔ بہت سے لوگوں کی شخصیت۔ سُکڑ کے رہ جاتی ہے تو اسی لئے کہ وہ اپنی روح کی کھڑکیوں میں سے "اور" کہنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ میں شاعرانہ مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ یہ ذرا سا لفظ "اور" کتنا عظیم ہے۔ اس میں تو ایک پوری کائنات سما سکتی ہے۔

اتنی جھک سے مقصود میرا بس اتنا تھا کہ ادیبوں کے پاس لفظ کم رہ جائیں تو پورے معاشرے کو گھبرا جانا چاہیئے۔ یہ تو ایک بہت بڑے سماجی خلل کی علامت ہے۔ باعمل لوگ ادب جیسی بے مصرف چیز سے ہزار بیگانہ رہیں لیکن ادب میں ان کی نبض بھی دھڑکتی ہے۔ ادب میں لفظوں کا توڑ ہوجائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ معاشرے کو زندگی سے وسیع دلچسپی نہیں رہی یا تجربات کو قبول کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ جب ادب مرنے لگے تو ادیبوں ہی کو نہیں بلکہ سارے معاشرے کو دعائے قنوت پڑھنی چاہیئے۔

خیر اب لمبی چوڑی باتیں چھوڑ کے یہ دیکھیں کہ آج کل کے ادب میں لفظوں کے قحط کی نوعیت کیا ہے۔ فی الحال محاورے کا معاملہ لیجیئے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ محاوروں کے استعمال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر سیدھے سادے لفظوں سے کام چل جائے تو اس تکلف میں کیوں پڑیں؟ دو چار لوگ ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ محاورے استعمال ہوں

اور اس کی صورت وہ یہ بتاتے ہیں کہ پُرانا ادب پڑھا جائے۔ اگر اس طرح محاوروں کا استعمال سیکھا جا سکتا ہے تو پھر وہ لغت والا نسخہ ہی کیا بُرا ہے؟ خیر اپنی اپنی رائے تو اس معاملے میں سبھی دے لیتے ہیں۔ کوئی محاوروں کو قبول کرتا ہے، کوئی رد لیکن وجوہات پوچھنے کی ہے، وہ کوئی نہیں پوچھتا۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ محاورے کب استعمال ہوتے ہیں اور کیوں؟ اور محاوروں میں ہوتا کیا ہے؟ وہ ہمیں کیوں پسند آتے ہیں؟ ان سے بیان میں اضافہ کیا ہوتا ہے؟

خاص نظریاتی بحث تو مجھے آتی نہیں۔ ایک آدھ محاورے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں کہ اس کے کیا معنی نکلتے ہیں۔ سرشار نے کہیں لکھا ہے، "چراغ میں بتّی پڑی اور اس نیک بخت نے چادر تانی"۔ اس اچھے خاصے طویل جملے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی سرِ شام ہی سے سو جاتی ہے، تو، جو بات کم لفظوں میں ادا ہو جائے، اُسے زیادہ لفظوں میں کیوں کہا جائے؟ اس سے فائدہ؟ فائدہ یہ ہے کہ جملے کا اصل مطلب وہ نہیں جو میں نے بیان کیا، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ "شام ہونا" تو فطرت کا عمل ہے۔ "چراغ میں بتّی پڑنا" انسانوں کی دنیا کا عمل ہے۔ جو ایک فطری عمل کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے اور یہ عمل خاصا ہنگامہ خیز ہے۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے، جب سرسوں کے تیل کے چراغ جلتے، انھیں یاد ہوگا کہ چراغ میں بتّی پڑنے کے بعد کتنی چل پہل مچتی تھی۔ اندھیرا ہو چلا، اُدھر بتّی کے لیے رُوئی ڈھونڈی جا رہی ہے۔ روئی مل گئی تو جلدی میں بتّی ٹھیک طرح نہیں بٹی جا رہی، کبھی بہت موٹی ہو گئی، کبھی بہت پتلی۔ دوسری طرف بچے بڑی بہن کے ہاتھ سے روٹی چھین رہے ہیں۔ یہی وقت کھانا پکنے کا ہے۔ توے پر روٹی نظر نہیں آ رہی۔ روٹی پکانے والی الگ چلّا رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ "چراغ میں بتّی پڑنے" کے معنی محض یہ نہیں کہ شام ہو گئی۔ اس فقرے کے ساتھ اجتماعی زندگی کا ایک پورا منظر سامنے آتا ہے۔ اس محاورے میں فطرت کی زندگی اور انسانی زندگی گھل مل کر ایک ہو گئی ہے۔ بلکہ شام کے اندھیرے اور سنّاٹے پر انسانوں کی زندگی کی ہماہمی غالب آ گئی ہے۔ سرشار نے یہ نہیں کہا کہ سورج کے غروب ہوتے ہی سو جانا صحت کے لئے مضر ہے۔ انھیں تو اس پر تعجب ہوا کہ ایسے وقت جب گھر کے سب چھوٹے بڑے ایک جگہ جمع ہوں اور اتنی چہل پہل ہو رہی ہو ایک آدمی سب سے منہ موڑ کر الگ جا لیٹے۔ انھیں اعتراض ہے کہ سونے والی نے اجتماعی زندگی سے بے تعلقی کیسے برتی؟ پھر "چادر تاننا" بھی سو جانے سے مختلف چیز ہے۔ اس میں ایک اکتاہٹ کا احساس ہے۔ یعنی آدمی زندگی کی سرگرمیوں سے تھک جانے کے بعد ایک شعوری فعل کے ذریعے اپنے آپ کو دوسروں سے الگ کر کے چادر کے نیچے پناہ لیتا ہے۔ سرشار نے محض ایک واقعہ نہیں بیان کیا بلکہ عام انسانوں کے طرزِ عمل کا تقاضا دکھایا ہے۔ اس انفرادی فعل کے پیچھے سے اجتماعی زندگی جھانک رہی ہے۔ محاورے کے ذریعے پیش منظر اور پس منظر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔

اب ایک ضرب المثل لیجیے: "بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"۔ اس میں ایک عمومی تصوّر، ایک خاص واقعہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک استعارہ ہے جو بقول ارسطو، شاعری کی جان ہے تو ایسے بھی محاورے اور ضرب المثل ہوتے ہیں جو بیان سے آگے بڑھ کر شاعری بن جاتے ہیں۔ پھر مندرجہ بالا فقرے میں گھریلو زندگی کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے بعض جانوروں کی زندگی میں جو دخل ہے اس کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

غرض محاوروں میں اجتماعی زندگی کی تصویریں، سماج کے تصوّرات اور معتقدات، انسان، فطرت، اور کائنات کے

متعلق سماج کا رویہ، یہ سب باتیں جھلکتی ہیں۔ محاورے صرف خوب صورت فقرے نہیں، یہ تو اجتماعی تجربے کے ٹکڑے ہیں۔ جن میں سماج کی پوری شخصیت بستی ہے۔ محاورہ استعمال کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انفرادی تجربے کو اجتماعی تجربے کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ محاورہ فرد کو معاشرے میں گھلا دیتا ہے۔ تخصیص میں تعمیم اور تعمیم میں تخصیص پیدا کرتا ہے محاورہ ہمیں بتاتا ہے کہ فرد کے ایک تجربے کو اس کے دوسرے تجربوں سے۔ فرد کے تجربہ کو سماج کے تجربے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ محاورہ جزو کو خالی جزو نہیں رہنے دیتا، اسے کُل میں ڈبو دیتا ہے۔ ہمیں زندگی کی پیچیدگیاں اور رنگا رنگی یاد دلاتا ہے۔ اس کے ذریعہ، مختلف تجربوں کا تضاد و تقابل نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ چونکہ محاورہ فرد کو کھینچ کر پھر اجتماعی زندگی میں واپس لے آتا ہے، اس لئے اُسی وقت استعمال ہوتا ہے، جب فرد اپنے معاشرے سے تعلق برقرار رکھنا چاہے۔ یعنی محاورہ ایک مربوط اور .. منضبط محاورے کی پیداوار ہے۔ جب فرد اپنے معاشرے سے بچھڑ جائے اور وہ دوبارہ معاشرے میں گھُل مل جانے کی، خواہش بھی نہ رکھتا ہو تو پھر نہ تو محاورے استعمال ہو سکتے ہیں، نہ اُن کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

اُردو شاعری میں محاوروں سے اجتناب سب سے پہلے ہمیں غالب کے یہاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ اُن کی خواہش تو یہ تھی کہ "عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا۔" آسماں سے پرے کوئی مطلق اور مجرّد تجربہ ہوتا ہو تو ہوتا ہو، انسانوں کا، اجتماعی تجربہ نہیں ہوتا۔ اُس دنیا میں تو فرد اپنے تجربے ہی کو ایک مطلق چیز سمجھ سکتا ہے۔ اُسے اوروں کے تجربے سے اپنے تجربے کا مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ تو پھر غالب محاورے کیوں استعمال کرتے؟ اگر غالب کے خطوط موجود نہ ہوتے تو ہمیں ان کی شخصیت بڑی چھوٹی اور گھٹی ہوئی نظر آتی۔ غالب کی غزل میں اُن کی شخصیت کی عظمت چاہے آ گئی ہو، وسعت نہیں آنے پائی۔ غالب کو دو چیزوں نے مارا۔ ایک تو اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے الگ رکھنے کی خواہش دوسرے فلسفیانہ بگھارنے کا شوق۔ "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"۔ یہ بات اپنی جگہ درست سہی، مگر سچا خیال بھی اسی وقت پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب ٹھوس چیزوں پر نظر ہو۔ ارسطو نے کہا کہ نوجوان لوگ فلسفی نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان کی اصول سازی اور خیال آرائی کے پیچھے خصوصی تجربات کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے غالب اپنی فکری زندگی میں ہمیشہ لڑکے ہی رہے۔ جہاں تک مفکر ہونے کا تعلق ہے، غالب کیرکے گور کے گھٹنے تک بھی نہیں پہونچتے۔ لیکن کیرکے گور کا زبردست امتیاز یہی ہے کہ اس کا ہر خیال انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی نہ کسی ٹھوس تجربے سے نکلتا ہے۔ بہرحال غالب تو ایک ایسے رجحان کی نمائندگی کر رہے تھے جو ہمارے معاشرے میں پیدا ہو چکا تھا۔ یعنی فرد کے دل میں سماج سے الگ ہونے کی خواہش۔ جب فرد کی زندگی پرانے اجتماعی مناسبات سے واقعی الگ ہوگئی تو نیاز فتح پوری وغیرہ کا ادب سامنے آیا۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ادب کے تجربات عام انسانوں کے تجربات سے الگ اور جمالیاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ادیب تصورات کی دنیا میں رہتا ہے۔ فارسی اور عربی کے الفاظ کی تعداد زیادہ ہو جانے کے یہی معنی ہیں۔ ان ادیبوں کو تو یہی منظور تھا کہ اپنے تجربات کا اختصاص اور ندرت دکھائیں۔ اور اجتماعی تجربات کا سایہ تک اپنے اوپر نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ محاورے اسی لئے ترک کئے گئے تاکہ اجتماعی زندگی بن بلائے مہمان کی طرح نہ گھس پڑے۔

رہے سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد والے ادیب تو عقیدے کے اعتبار سے تو وہ اجتماعی زندگی کے قائل تھے۔ مگر خاندانی مذہب

جو سماجی اداروں پر یقین نہ رکھتے تھے۔ یعنی وہ موجودہ اجتماعی زندگی کو رد کر کے اپنا تعلق ایک تندہ اور خیالی اجتماعی زندگی استوار کرنا چاہتے تھے۔ پھر دوسری طرف کسی طرح کی اجتماعی زندگی سے انھیں جذباتی علاقہ نہ تھا۔ اس کے مشاہدے کی خواہش موجود تھی۔ (یہاں میں ایک عام رجحان کا ذکر کر رہا ہوں۔ انفرادی حیثیت سے احمد علی، عصمت چغتائی، انتظار حسین وغیرہ میں زندگی سے محبت نظر آتی ہے) جو لوگ اجتماعی زندگی سے اس بری طرح کٹ گئے ہوں، وہ اگر چاہیں بھی تو محاورے استعمال نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اجتماعی زندگی ان کی شخصیت میں اس طرح جذب نہیں ہوئی، جیسے سرشار، نذیر احمد اور راشد الخیری میں اس طرح بس گئی تھی۔ یہ لوگ "چراغ میں بتی پڑی" کہہ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ شام کے تصور کے ساتھ ان کے ذہن میں کسی اجتماعی زندگی کا کوئی منظر نہیں ابھرتا۔ یہ لوگ "چادر تان نا" بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ انھیں انسانوں کے چھونے سے چھوٹے فعل سے پھول جیسی نہیں، جو سرشار کو تھی۔ یہ لوگ تو ایسی جگہ محض "سونا" کہیں گے۔ یعنی ایسا لفظ استعمال کریں گے، جو جسمانی فعل تو ضرور دکھائے، مگر انسانی مناسبات سے خالی ہو۔

تو محاورے کا مسئلہ محض ادبی مسئلہ نہیں، بلکہ ہماری پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مسئلہ ہے۔ ہمارے ذہن میں محاورے اس وقت آئیں گے، جب ہم اجتماعی زندگی سے جذباتی تعلق رکھتے ہوں اور اپنے معاشرے کو قبول کریں محاورے تو اجتماعی زندگی کی شاعری ہیں۔ اجتماعی زندگی کے (MYTHS) ہیں۔ جب تک ہمیں اجتماعی زندگی میں شاعری نظر آئے گی، ہم محاورے بھی استعمال نہیں کر سکیں گے۔ اتنی بات میں مانتا ہوں کہ بہت پرانے محاورے ہمارے کام نہیں آتے کیونکہ سماجی پس منظر بدل چکا ہے۔ اور ان کے ذریعے ہمارے ذہن میں کوئی تصویر نہیں ابھرتی۔ زندگی کی تصویر بدل گئی ہے تو محاورے بھی نئے بننے چاہئیں۔ لیکن غضب تو یہی ہوا ہے کہ نئے محاوروں کی پیداوار بالکل رک گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی زندگی سے تخلیقی دلچسپی اور گہرا جذباتی تعلق باقی نہیں رہا۔ دوسرے ہماری زندگی ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ کل کا احساس غائب ہو گیا ہے۔ ہم اپنے تجربات کو ایک دوسرے میں گھلا ملا کر ایک نہیں بنا سکتے اس لئے ہمارا ذہن نئے محاورے ایجاد نہیں کرتا۔ ذہن میں یہ صلاحیت تو اس وقت آتی ہے، جب فرد اور معاشرے میں گہرا ربط ہو، جان بوجھ کر محاوروں کی لین ڈوری لگا دینے کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ ایک نقلی ربط پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ محاورے اسی وقت قابو میں آئیں گے کہ جب ادیبوں کو ہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے سب لوگوں کو اجتماعی زندگی میں ڈوب جانے کی لگن ہو اور نئے محاورے اس وقت پیدا ہوں گے، جب فرد اور جماعت کا ربط اتنا گہرا ہو کہ ہمیں اس ربط کی موجودگی کا خیال بھی نہ آئے۔۔

("ستارہ یا بادبان" سے)

—— محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صاحب کی کرم فرمائی سے "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کے معائنہ کا موقع ملا۔ اس ادارہ کی عظمت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، مگر، مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ادارہ ثقافتِ اردو کی بہترین انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اور اردو کی عظمت کی زندہ یادگار اور اس کی یادگار رکھنے کے لئے بہترین شاہکار۔

(مولانا حفظ الرحمٰن ۲۷ ڈسمبر سنہ ۱۹۴۱ء)

نقد و نظر

تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں (ادارہ)

نام کتاب:۔ پُروائی (ناول)۔ مصنف: صغرا مہدی

صفحات ۱۷۲۔ قیمت ۸ روپیے۔ ناشر: ناولستان، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

صغرا مہدی کا یہ ناول کئی صورتوں سے نیا ہے (۱) تو یہ ناول گھریلو اور شخصی الجھنوں سے پاک ہے جو کہ عموماً ہمارے نام نہاد سماجی ناولوں کا مقبول موضوع ہے دوسرے یہ کہ یہ ناول تحت شعور کو فلسفیانہ طور پر زیر بحث نہیں لاتا جو کہ جدید ناول نگار کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس ناول کے کر تبدیلیوں سے روشناس ہوتے ہیں اور ان کا ردِ عمل مختلف جہات میں ہے ایک طرف ایک کردار ماضی کی (بلکہ بچپن کی) علامت سے متاثر ہے نے اپنے قریہ کو ایک چھوٹا سے پیار بھرے جاگیردارانہ ماحول میں دیکھا اور اس کی یادیں اور نشانیاں اس کے ذہن پر منقوش ہیں۔ تقسیم ملک، زمینداری نظام کا ٹوٹ جانا۔ یکایک سے اپنے ہی گھر میں بے گھر بن جانا۔ یہ وہ المیے ہیں جو کہ ان گاؤں اور قریوں کے رہنے والوں کے لئے ایک دم اچانک تبدیلی بن کر آئے۔ وہ دلی اتحاد، وہ خلوص اور رحم جو ان گاؤں میں رہنے والوں کے لئے زندگی تھے اب اختلاف اور کشمکش میں تبدیل ہو (غالباً آزادی کا سب سے خطرناک تحفہ یہی ہے)

دوسری طرف ایک کردار وہ بھی ہے جس نے کچھ دیکھا ہی نہیں جو ایک جدید ماحول میں جیا اور رہا۔ اس کے لئے یہ باتیں غیر دلچسپ ہیں صغرا مہدی کے اس ناول میں تازگی اور نیا پن ہے۔ اس کی زبان میں زندگی کے تجربہ کی اصلیت ملتی ہے اور تصنع محسوس نہیں ہوتا۔ پورا ناول نئی زندگی سے متعلق ہے اور بچپن کی یاد اور حال کے تجربات کے ٹکراؤ کا خوب صورت اظہار ہے۔

صغرا اس ناول کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں یہ ایک اچھا ناول ہے شائقین کو ضرور پسند آئے گا۔

(مبصر: اسلم عمادی)

نام کتاب:۔ سنگِ لرزاں (مجموعۂ کلام) شاعر:۔ شہنشاہ مرزا

صفحات ۱۵۲ قیمت ۱۲ روپے ملنے کا پتہ: شہنشاہ مرزا ۸۲، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنو

اس کتاب کے "پیشِ لفظ" میں وہی باتیں کہی گئی ہیں جو اب تک کئی بار کہی جا چکی ہیں۔ مرزا نے اپنی نظم نگاری کو [illegible] کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کا انہوں نے "مقداری" تجزیہ کیا ہے کہ "اردو غزل کو بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس میں شاعری کم ملے گی اور شاعری نام پر نا شاعری کا عنصر بہت زیادہ ملے گا"۔ مقداری تجزیہ کا کیا فائدہ ہوا؟

شہنشاہ مرزا نے اپنی نظموں پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت حد تک صحیح ہے۔ "ان نظموں کے شاعر کے سامنے زندگی کا کوئی آدرش یا خواب نہیں تمام خواب شکستہ اور پامال ہو چکے ہیں۔ تمام آدرش کھوکھلے ثابت ہو چکے ہیں" اسی لئے زبان میں کہیں تلخی اور بے زاری آگئی ہے تو کہیں محرومی ا[illegible]

کا احساس ہے۔ لیکن ان تمام نظموں کو بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ان میں بیگانگی کا جذبہ اور اس کے پس پشت شدید قسم کا احتجاج ملے گا۔ "پس پشت" سے قطع نظر باتیں بالکل صحیح ہیں۔

شہنشاہ مرزا نظمیں نئے انداز کی ہیں اور اکثر نظمیں ٹوٹے ہوئے جملوں پر مبنی ہیں ان کی زبان صحافتی زبان ہے جو عوام تک پہنچتا ہے لیکن شعری کیفیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ نظمیں سادہ احساسات اور سادہ خیالات کو ایک ہلکی سی تشبیہہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایک نظم سنیں۔

تعارف

قہقہوں کا جنازہ اُٹھائے ہوئے
اجنبی شہر کی
اجنبی راہ سے
میں جو گذرا
تو میرے شناسا نے
اپنے شناسا سے
اتنا کہا —
یہ وہی بے وفا ہے
کہ جس نے
ہزاروں گناہوں کے بدلے میں
جنت کا سودا کیا ہے

شہنشاہ مرزا کی نظموں میں گہرائی کی کمی ہے اور کچھ کھلی کھلی ہیں اور کچھ نظمیں ایک ہی نشست میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

شہنشاہ کے پاس بڑی تخلیقی صلاحیت ہے ان کے ہاں جدت اور طاقتور اظہار کا شعلہ بھی ملتا ہے یہ مجموعہ ان کی شعری صلاحیت کو پیش کرتا ہے۔ اس لیے اہم بھی ہے اس مجموعہ کتاب اور طباعت دونوں خوب ہیں اور سرورق عمدہ ہے۔

(مبصّر: اسلم عمادی)

کتاب: رشتۂ کلام (مجموعۂ کلام) شاعر: محسن زیدی

ضخامت ۱۱۲ صفحات - قیمت دس روپے، تقسیم کار مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اردو غزلوں کا جب بھی کوئی مجموعہ ہاتھ لگتا ہے تو کچھ دیر تک سوچنا پڑتا ہے آج بھی یکسانیت محدود موضوعات اور مقبول لب و لہجہ کی بازگشت غزل میں یہ عالم ہے کہ کسی غزل کو کسی خاص شاعر کی غزل کی طور پر پہچاننا دشوار ہے۔

یہ مسرت کی بات ہے کہ محسن زیدی کے پاس انفرادی لہجہ ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو غزل کی صنف میں اپنی مہارت اور عبقریت کی بنا پر پیش کیا ہے۔ محسن زیدی کی شعری صلاحیت خالص شاعرانہ ہے اور ان کے پاس وہ پُر درد زبان ہے جو خیال اور منظر کو پُر جذباتی اور اسلوب میں بیان کرتی ہے محسن کے پاس ڈکشن کی انفرادیت ہی انہیں اہم معاصر شعرا میں ایک مقام عطا کرتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ محسن نے زبان اور تراکیب میں کسی قسم کا تجربہ نہیں کیا ہے ان کی زبان اور تراکیب مروجہ ادبی زبان سے جدا اور الفاظ کے انتخاب میں انہوں نے معلمانہ احتیاط کو برتا ہے۔

غزل کے پسند کرنے والوں کے لئے یہ کتاب اچھی ہے کتاب کا نام اور سرورق معمولی۔ کتابت اور گٹ اپ مناسب ہیں۔ محسن زیدی کے اشعار سنیں ـــ

مجھے اک شعلۂ احساس رکھتا ہے جدا سب سے
کہ سب کے ساتھ ہی رہنا مگر سب سے جدا رہنا

دل کو دھڑکا ہے کہ اس کا بھی پتا کوئی نہیں
پی رہا ہوں شام سے اپنی امیدوں کا لہو
جو سیڑھیاں لگا کے فلک پر پہنچ گئے
راستے کی رفاقتیں کب تک
تم چاہو انتظار سحر میں کھڑے رہو

اب کے پسپائی میں سینے میں بچا کوئی نہیں
یاس دکھتی جا رہی ہے جام بھر کے سامنے
اک دن زمیں پہ ان کو اترنا ضرور ہے
جب تعلق نہ عمر بھر کا رہا
میں اک ستارۂ سحر آثار چلا

(مبصر: اسلم عمادی)

نام کتاب: "پانچ چھے ڈرامے" مصنف: ابراہیم یوسف
ضخامت ۱۱۵ صفحات، ڈیمائی سائز قیمت ۶ روپے۔ ناشر نئی آواز۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جدید ڈرامہ کی تاریخ میں ابراہیم یوسف کا نام نیا نہیں ہے۔ وہ نئے ڈرامہ نگار ان معنوں میں کہ تکنیک میں جدت پیدا کرتے ہیں اور اس سے زیادہ انسانی نفسیات کا مطالعہ نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ پانچ چھے ڈرامے بقول ابراہیم یوسف تجرباتی ڈرامے ہیں لیکن انسانی زندگی ایسا یہ تجربہ نئے نہیں ہیں۔ ان ڈراموں کے کردار نئے زمانہ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی فکر و خیال کے اعتبار سے صدیوں پرانے ہیں ذہنی الجھن کیا انسان کا مقدر ہے سماجی پیچیدگیاں اور الجھاوے آدم و حوا کے حصے میں بھی آئے تھے اور ہمارے بھی۔ گویا ہمارا یہ اثاثہ بھی ہیں اور ورثہ بھی۔ ادب وہی اعلیٰ اور ارفع ہے جو انسان کی ان ہی الجھنوں کو اپنا موضوع بناتا ہے اور ایسا ادب یاد رکھا جانے والا ہوتا ہے پانچ چھے ڈراموں میں جو کردار ہیں مثلاً پرویز، نسوان، شیخ، ڈاکٹر ملک، شیبانی، ارچنا، کوثر، نجم، گلشن، نقوی، تبسم، حجاب، ہمدانی وغیرہ یہ سب اسی جیتے جاگتے سماج کے کردار ہیں ابراہیم یوسف نے ہماری ان تصویروں کو ڈرامہ کے پردہ پر پیش کیا ہے اور ان کا یہی کمال ہے کہ تحریر کا افسانوی انداز زندگی کی تلخیوں کو پردہ پر بے نقاب کرتا ہے (طیب انصاری)

نام کتاب: "چشمِ حیراں" مصنف: احمد جمال پاشا
قیمت ۵/۷ روپے ناشر: نئی آواز۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

"چشمِ حیراں" طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے اور ان مضامین کو پڑھ کر حیرانی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ ان کے لکھنے والے احمد جمال پاشا ہیں! احمد جمال پاشا اچھے طنز و مزاح نگار ہیں۔

چشمِ حیراں میں کوئی ۲۳ مضامین شامل ہیں۔ سڑک کے گڑھوں سے چشمِ حیراں کا باب کھلتا ہے اور زہر، رشوت، زیرو وزیر، حالات، جوتا، ادھار، ہم، کھونا و کھولنا، تھرڈ، سڑک، جس محلے میں، پورٹ فولیو، جانبداری، چینیلے، کرسی، چیونٹی، ڈھول مل، مسٹر گوسوٹو موٹو، اصغر علی سے ہوتا ہوا مسز ہاں ہاں پر بند ہوتا ہے اور زندگی کے یہ ایسے موضوعات ہیں جن سے انسان کا بہر حال ایک تعلق ہوتا ہے۔ گہرا تعلق! اس لئے بھی ان مضامین سے قاری کی ایک دلچسپ وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی چشمِ حیراں کی کامیابی بھی ہے۔

احمد جمال پاشا نے چشمِ حیراں کو اپنے ہم عصر اور آبروئے مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے نام منسوب کر کے اس مجموعۂ مضامین کی معنویت میں بھرپور طنز کا اضافہ کیا ہے (طیب انصاری)

اردو نامہ

علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

وقار خلیل

یکم ڈسمبر: بزم نارائن داس کا سالانہ
ہسالمہ بصدارت جناب راز عابدی
ند ہوا۔ قدیم مکتب سخن کے (۲۰)
روں نے کلام سنایا۔
۲، ڈسمبر: مرکز خوشنویسی ادارہ
یات اردو (زیر اہتمام ترقی اُردو بورڈ
ت) کے ایک سالہ تربیتی کورس کا آغاز
ہ سال اول کے کامیاب طلباء وطالبات
ال دوم میں داخلہ دیا گیا اور سال اول
لئے انٹرویو سے ۱۲ طلباء وطالبات
شنوئیسی کی تربیت کے لئے منتخب
ا۔
ار ڈسمبر: صاحب طرز ادیب
ل اور انسان) کے مصنف اشفاق حسین
م کی ادبی تحریروں کے مجموعہ "مرد درفتہ"
م اجراء "اردو ہال" میں جناب فضل الرحمان
ئس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
تھوں عمل میں آئی۔ جناب میر اکبر علی
سابق گورنر آندھرا پردیش نے اس تقریب
ارت کی، جناب ڈاکٹر عالم خوندمیری
، عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست"
، رشید قریشی جناب غلام عمر خاں،

جناب مصطفٰی عجاز، جناب محسن علی اور جناب
رشید الدین نے اشفاق مرحوم کی دانشورانہ
ادبی خدمات کو زبردست خراج عقیدت
ادا کیا۔ جناب احمد جلیس نے جلسہ کی کاروائی
چلائی۔ محترمہ سمیں اصغر نے شکریہ ادا کیا۔

● ۳ آندھرا پردیش اردو پیپر باڈیکلس
اسوسی ایشن کے زیر اہتمام جناب ملک محمد
علی خاں کے ایڈیٹر اردو ماہنامہ آندھرا پردیش
مقرر کئے جانے کی مسرت میں ایک
خیر مقدمی تقریب ہوئی۔ ڈاکٹر اے آر
باجی ڈائریکٹر جنرل ریاستی محکمہ اطلاعات و
تعلقات عامہ نے اس جلسہ کو مخاطب
کرتے ہوئے اس امر کا تیقن دیا کہ وہ
اُردو اخبارات ورسائل کے ساتھ ہمدردانہ
رویہ رکھیں گے۔ جناب چندر سریواستو،
جناب معین فاروقی ایڈیٹر "انگارے" اور
سیفانی جماعت کی انجمن کے صدر جناب
رحیم فریادی نے بھی مخاطب کیا۔ مقررین نے
ملک محمد علی خاں صاحب کو مبارکباد دیتے
ہوئے ان کی دیرینہ صحافتی اور سماجی
خدمات کی ستائش کی۔

● معلوم ہوا ہے کہ ریاستی وزیر تعلیم
مسٹر بی وینکٹ رام ریڈی ان دنوں اُردو
لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہیں اور جناب
عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے موصوف
کی خواہش پر ایک اُردو ٹیچر بھی فراہم کر دیا
ہے۔

۴ ر ڈسمبر: ڈاکٹر بی گوپال ریڈی سابق
گورنر یوپی نے آندھرا سرسوتی پریشد کے
جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے ہندوستانی
زبانوں میں ترجمے کی باہم ضرورت قرار دیا
اور کہا کہ اس طرح کے عمل سے باہمی سوجھ
بوجھ اور یک جہتی کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے
ڈاکٹر ریڈی نے تلگو شعری انتخاب کے کنڑ ترجمے
کی رسم اجراء انجام دی۔ مسٹر ڈی راملنگم راؤ
سکریٹری ریاستی ساہتیہ اکیڈیمی نے اس
تقریب کی صدارت کی۔

۵ ر ڈسمبر: ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ
رام ریڈی نے نیشنل اسٹوڈنٹس یونین آف
انڈیا کی شاخ حیدرآباد کے پچاس رکنی وفد
سے ملاقات کی۔ جس کی قیادت مسٹر جلیل پاشاہ
کر رہے تھے۔ وزیر تعلیم نے وفد کے مطالبات
کو سننے کے بعد ریاست میں اردو تعلیم
کے مسائل کے حل کے بارے میں مکمل
اشتراک کا وعدہ کیا اور کہا کہ اردو زبان
کے مختلف مسائل کا حل تلاش کیا جائے گا۔

۹ ر ڈسمبر: ریاستی اُردو اکیڈیمی نے
دکنی کے معروف سخنور سلیمان خطیب مرحوم
کے پسماندگان کی اعانت کے لئے دو ہزار روپیے

کی منظوری دے دی۔

۱۰ر ڈسمبر: ادارۂ مرکز ادب کے سالانہ انتخابات میں مسز تاراسان قریشی (صدر) عظیم میرزا آبادی اور عزت سلندرآبادی (نائب صدور) اور محمد عبدالکریم ماہر (معتمد عمومی) منتخب ہوئے۔

۱۱ر ڈسمبر: مولانا محمد علی جوہر صد سالہ تقاریب کمیٹی کے زیر اہتمام مشہور سماجی کارکن مسز درگا بائی دیشمکھ نے تقاریب کے "سادہ یر" کی رسم اجرائی انجام دی۔ ڈاکٹر سی ڈی دیشمکھ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ مقررین نے مولانا محمد علی جوہر اور علی برادران کی قومی اور مجاہدانہ خدمات کو.. خراج تحسین ادا کیا۔ میر اکبر علی خاں صدر کمیٹی نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے اور اسی مقصد کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ مسز دیشمکھ نے کہا کہ وہ علی برادران سے ۱۹۲۳ء میں کاکناڈا کانگریس کے دوران کام کر چکی ہیں۔

۱۴ر ڈسمبر: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ملک کے نامور دانشور ادیب ڈاکٹر عابد حسین، (متوفی ۱۳ر ڈسمبر دہلی)، کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جناب فضل الرحمٰن چیف ایڈیٹر اردو انسائیکلو پیڈیا بورڈ نے ڈاکٹر عابد حسین کی قومی اور ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے قرارداد تعزیت پیش کی۔ جس میں مرحوم کو وسیع النظر عالم، مجاہد آزادی اور صاحب کردار دانشور کہا۔

۱۶ر ڈسمبر: بزم اردو دفاتر معتمدین کی طرف سے ڈاکٹر عابد حسین کی وفات پر جلسۂ تعزیت جناب صادق احمد جوائنٹ سکریٹری محکمہ قانون کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر صلاح الدین نیّر، سکشن آفیسر پنچایت راج اور بزم اردو کے عہدیداران مسرز قادر جاوید، بشیر انور اور عباس ہاشمی نے ڈاکٹر عابد حسین کی دانشورانہ ادبی و قومی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔

۱۷ر ڈسمبر: اقبال اکیڈیمی کی طرف سے جلسۂ یاد مولانا حسرت موہانی کا اہتمام کیا گیا۔ جناب خلیل اللہ حسینی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، جناب اختر حسن اسسٹنٹ سکریٹری اردو اکیڈیمی، محترمہ رابعہ برنی، نکہری بدایونی، مرزا جمیل احمد بیگ ایڈوکیٹ، رؤف خیر اور غنی نعیم صاحبان نے حسرت کی قومی اور مجاہدانہ شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی و شعری خدمات مضامین اور... تقریروں کے ذریعہ زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ اس موقع پر مولانا حسرت موہانی کی تصانیف اور تالیفات کے علاوہ ان کی نگارشات پر مشتمل رسائل و جرائد کی ایک نمائش بھی ترتیب دی گئی تھی۔

● انڈین رائٹرس اینڈ آرٹسٹس اسوسی ایشن کا ادبی اجلاس جناب گوہر اسحاقی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی، شمیم نصرتی اور محسن حیات نے ادبی موضوعات پر مخاطب کیا۔ محسن جلگانوی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ محفل مشاعرہ جناب منوہر لال بہار کی... صدارت میں ہوئی۔ کئی شاعروں نے کلام سُنایا۔ ناگپال عظیم دہلوی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو کالج کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر سراج الدین صاحب مہمان خصوصی تھے۔ جناب احمد جلیس پروگرام ایگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے معین الدین صاحب نے ریڈیائی نشریات کے موضوع پر انٹرویو لیا۔ جمیل شیدائی نے امریکی ادیب سال بیلو کے نظریۂ حیات پر مقالہ سنایا۔ "آج کا شاعر" سلسلے کے تحت رحمت یوسف زئی نے کلام سُنایا۔ مشاعرہ میں مسرز رحمٰن جامی، برق یوسفی، حامد مجاز، مصلح الدین سعدی، مضطر مجاز، رؤف خیر، محمد علی اثر، حمید حاصل، ڈاکٹر یوسف کمال، امان ارشد، حسام الدین سلیم، س، ا۔ عشرت، حامد مغل، عبدالقدیر عزم، قدیر انصاری، اور نسیم اعجاز نسیم نے

کلام سنایا۔

۲۲ر ڈسمبر: جناب شیوراؤ شنکار (یم ایل اے، صدر انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش) نے ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی، ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ رام ریڈی اور ریاستی وزیر پنچایت راج مسٹر یم باگا ریڈی کو اردو کے تعلق سے پندرہ نکاتی منشور مطالبات پیش کرتے ہوئے اردو کے تعلیمی مسائل کی عاجلانہ یکسوئی کا مطالبہ کیا ہے۔

۲۳ر ڈسمبر: آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے ۱۹۷۷ء کے دوران شائع ہونے والی مندرجہ ذیل (۲۸) مطبوعات کو ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ مصنفوں کے نام کتاب کے محاذی قوسین میں درج ہیں:

(۱) نغمے کا سفر (جیلانی بانو)
(۲) خالی پٹاریوں کا مداری (اقبال متین)
(۳) رات والا اجنبی (عوض سعید)
(۴) فقط (یوسف ناظم)
(۵) نیم خواب (شاذ تمکنت)
(۶) صدف (امیر احمد خسرو)
(۷) فانوس (مصحف اقبال توصیفی)
(۸) شہر تمنا (علی احمد جلیلی)
(۹) صف مژگاں (خیرات ندیم)
(۱۰) امانت سخن (باقر امانت خانی)
(۱۱) آب و رنگ (سعادت نظیر)
(۱۲) شہر دل (سی اے عشرت)
(۱۳) جو نہ کرنا تھا (برق آشیانوی)
(۱۴) بہارستان (منوہر لال بہار)
(۱۵) اتنی کھٹی میٹھی توضیحات اور کارنامے (محمود خاور)
(۱۶) عرفان نظر (ڈاکٹر یوسف سرمست)
(۱۷) اقرار (رؤف خیر)
(۱۸) چوڑی کے غلام (پرویز یداللہ)
(۱۹) ساز مغرب (حسن الدین احمد)
(۲۰) چہرہ چہرہ داستان (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)
(۲۱) یاران شہر (طیب انصاری)
(۲۲) عوامی شخصیت اور فن (محمد علی اثر)
(۲۳) شب گرد (حمید الماس)
(۲۴) انوار سحر (ڈاکٹر راؤد نیشکھ)
(۲۵) مملکت کا دائرہ عمل (محمد رحمت علی)
(۲۶) علم المعجزات (ڈاکٹر سمیت کمار)
(۲۷) حفیظ جالندھری کا تنقیدی مطالعہ (مضطر کشمیری)
(۲۸) سماج اور تعلیم (ڈاکٹر عبد القادر عمادی)

—— ادارہ "سب رس" مصنفوں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

● انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کی مجلس عاملہ کا اجلاس صدر انجمن جناب منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معتمد انجمن جناب غلام صادق الدین نے رپورٹ پیش کی اور انجمن کی ایک سالہ کارکردگی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انجمن کی جانب سے تعلیم بالغان کے پانچ مرکز کام کر رہے ہیں اس موقع پر دیگر اراکین مسز رجمل اطہر، حمایت علی ہاشمی، خلیل الرحمن، یم اے حکیم، عبداللہ بیگ، غلام قادر خاں اور سید لوہری نے بھی مخاطب کیا۔ اس اجلاس میں طے پایا کہ اردو تعلیمی فنڈ اور اردو مدارس کے سروے کے کاموں میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا جائے

۲۴ر ڈسمبر: حلقۂ ارباب ذوق (نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے حضرت سکندر علی وجد کے شعری انتخاب پر عالمانہ تبصرہ سنایا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست معتمد حلقہ نے شکریہ ادا کیا۔

● ادارۂ قدر ادب کی محفل رباعی جناب محمد یعقوب عمر ھامی لکچرار شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں ہوئی۔ کئی بزرگ اور نئے شاعروں نے رباعیاں سنائیں۔ منیر النساء معتمد قدر ادب نے شکریہ ادا کیا۔

● آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف منعقدہ جلسۂ تقسیم انعامات کی خصوصی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے اردو دوست ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے یقین دلایا کہ ریاستی حکومت

نظم ونسق اور تعلیم کی سطح پر اُردو کے فروغ اور اس زبان کی توسیع وترقی کے سلسلہ میں ہر ممکنہ عملی اقدام کو بروئے عمل لائے گی۔ ڈاکٹر ریڈی نے مزید کہا کہ اُردو کو ریاست میں علاقائی زبان کا موقف دیا گیا ہے درسی کتابوں کی طباعت کی ذمہ داری اُردو اکیڈیمی کے سپرد کیے جانے کے سلسلے میں حکومت کی آمادگی پر چیف منسٹر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ موصوف نے دوران تقریر یہ بھی کہا اُردو کی ترقی میں آندھرا پردیش کو پورے ملک میں سبقت حاصل ہے۔ چیف منسٹر نے اُردو اکیڈیمی کے سابق صدر نشین مجلس انتظامی جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی ترا ا اُردو خدمات اُردو اکیڈیمی سے ان کی وابستگی کو خراج تحسین ادا کیا۔ ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے اس خوشگوار محفل میں اکیڈیمی کی جانب سے مصنفوں کو ان کی مطبوعات پر ایوارڈ، سند اور شال پیش کیے۔ نائب صدر اکیڈیمی جناب یم باگاریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج نے اکیڈیمی کی سہ سالہ کارکردگی پر روشنی ڈالی اور چیف منسٹر کی اُردو دوستی کو زبردست خراج تحسین ادا کیا اور کہا کہ چیف منسٹر کی اُردو دوستی کے باعث اکیڈیمی کی سالانہ گرانٹ میں اضافہ ممکن ہو سکا اور دس لاکھ کی امداد ریاستی حکومت سے مل سکی۔ ڈاکٹر یم۔ چنا ریڈی نے اکیڈیمی کی مطبوعات کی رسم اجرا انجام دی۔ صدر اکیڈیمی جناب آصف پاشاہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اور ڈائرکٹر اکیڈیمی جناب بھارت چند کھنہ نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶ ڈسمبر: ڈاکٹر اے آر باجی ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ آندھرا پردیش نے ادیبوں، شاعروں، پروفیسروں اور صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ اور دار الترجمہ کی اُردو خدمات کو زبردست خراج تحسین ادا کیا اور اس امر کا تیقن دلایا کہ ریاستی محکمہ اطلاعات کے اُردو ماہنامہ "آندھرا پردیش" کو باقاعدہ اور مقبول عوام بنانے میں اُس کے نئے ایڈیٹر مسٹر ملک محمد علی خاں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں مسز نا اختر حسن، نائب معتمد اُردو اکیڈیمی، حیدرآباد، مسز نواس لاہوٹی، اور سعادت جہاں رضوی تحریری تجاویز پیش کرتے ہوئے ماہنامہ "آندھرا پردیش" کو عملی تعاون دینے کا تذکرہ کیا۔ جناب بھارت چند کھنہ، ڈائرکٹر اُردو اکیڈیمی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ ابتدا میں مسٹر ملک محمد علی خاں ایڈیٹر ماہنامہ "آندھرا پردیش" نے مخاطب کیا اور آخر میں شکریہ ادا کیا۔

۲۸ ڈسمبر: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے پریس نوٹ کے بموجب چھ ماہ کی قلیل مدت میں اُردو تعلیمی ٹرسٹ فنڈ میں دو لاکھ روپیے جمع ہوئے۔

۳۰ ڈسمبر: سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جوبلی ہال میں مولانا محمد علی جوہر صدی تقاریب کے موقع پر ایک سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے عظیم مجاہد آزادی محمد علی جوہر کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے سیمنار کی صدارت کی جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یو پی نے شریمتی گاندھی کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر راہ معظم نے نظارت کے فرائض انجام دیئے اسی شب ایک محفل شعر جناب عابد علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ممتاز شعراء نے کلام سنایا۔ ریاستی وزیر آبکاری مسٹر پی گنگا ریڈی مہمان خصوصی تھے ●●

خریداروں کے نام ..

جن اصحاب کی طرف سے سب رس کا زرِ سالانہ وصول طلب ہے، وہ براہِ کرم یاد دہانی کے مکتوب کی روشنی میں جلد اپنا چندہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔

(ادارہ)



گوالیار کے قریب ایک دیہات میں مکندرام مشرا نام کا ایک موسیقار رہتا تھا۔ اسے شہرت، عزت اور دولت سب کچھ حاصل تھی لیکن اولاد نہیں تھی۔ اسی وجہ سے وہ بے حد مایوس اور غمگین رہتا تھا۔ ایک دن وہ گوالیار کے ایک بزرگ غوث محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے ایک تعویذ دے کر کہا کہ اسے اپنی بیوی کے بازو پر باندھو۔ چند ماہ بعد اس کی بیوی نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ اس کی آواز بڑی پیاری تھی۔ اسی لیے اس کا نام تان سین رکھا گیا۔

تان سین بچپن میں بڑا شریر تھا۔ وہ گایوں کو چراتے ہوئے جنگلوں میں گھومتا پھرتا۔ ایک بار مشہور گویّے سوامی ہری داس کا اس گاؤں سے گزر ہوا۔ ان کے چیلے بھی ساتھ تھے۔ کچھ دیر سستانے کے لیے انھوں نے درختوں کے نیچے پڑاؤ ڈالا۔ تان سین بھی پاس ہی گائیں چرا رہا تھا۔ اسے شرارت سوجھی۔ ایک پیڑ کے پیچھے چھپ کر اس نے شیر کے چنگھاڑنے کی آواز نکالی۔ سوامی جی کے چیلوں نے محسوس کیا کہ آواز بہت قریب سے آ رہی ہے۔ چاروں طرف دیکھا کہیں شیر نظر نہیں آیا۔ ایک چیلے نے تان سین کو دیکھ لیا اور اسے پکڑ کر سوامی جی کے پاس لے آیا کہ یہی بچہ شیر کی آواز نکال رہا تھا۔ سوامی جی نے خفا ہونے کے بجائے اس کی تعریف کی۔ اس نے شیر کی آواز کی ہو بہو نقل کی۔ تان سین نے بتایا کہ وہ تمام جانوروں کی آوازیں نکال سکتا ہے۔ سوامی جی تان سین کو لے کر اس کے گھر گئے اور اس کے باپ سے کہا کہ اگر تربیت دی جائے تو یہ بچہ بہت بڑا موسیقار بنے گا۔ تان سین کے باپ نے اسے سوامی جی کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اسے موسیقی کی تعلیم دیں۔ چند ہی برسوں میں تان سین موسیقی کا ماہر بن گیا۔ گوالیار کی مہارانی نے جو خود بھی بڑی مغنیہ تھیں، تان سین کو بلا کر اس کا گانا سنا اور تان سین کی فرمائش پر اسے اپنا گانا سنایا۔ یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ یہیں تان سین کی ملاقات حسینی سے ہوئی جو مہارانی کی مصاحب تھی۔ تان سین نے اسلام قبول کر کے حسینی سے شادی کر لی اور اپنا نام محمد عطاء اللہ خاں رکھا۔ حسینی بھی سوامی جی کی شاگرد بن گئی۔ ان کو ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ یہ دونوں

بھی بچپن سے گانا سیکھنے لگے اور بہت جلد اس فن میں کمال پیدا کرلیا۔

تان سین کی شہرت اب ہندستان میں دُور دُور تک پہنچ گئی۔ ایک موقع پر اکبرِ اعظم نے تان سین کا گانا سنا تو اتنے متاثر ہوئے کہ اسے اپنا خاص مصاحب بناکر نورتنوں میں شامل کرلیا۔ وہ آئے دن تان سین کو قیمتی تحفوں سے نوازتا تھا۔ اکبر کے بعض درباری تان سین سے حسد کرنے لگے۔ اس کو اکبر کی نظروں سے گرانے کے لیے کئی بار سازشیں کی گئیں۔ لیکن ہر بار انھیں منہ کی کھانی پڑی۔ تان سین کے مخالفوں کو ایک خطرناک چال سوجھی۔ انھوں نے بادشاہ سے عرض کی کہ کوئی موسیقار اسی وقت بڑا کہلا سکتا ہے جب وہ دیپک راگ گائے۔ تان سین بھی اگر یہ راگ گا سکے تو ہم اس کی بڑائی کو مان لیں گے۔ اکبرِ اعظم نے تان سین سے دیپک راگ سنانے کی فرمائش کی۔ دیپک راگ کی یہ خصوصیت ہے کہ جب اسے چھیڑا جاتا ہے تو گرمی بڑھنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اثر سے چراغ جل اُٹھتے ہیں اور آخر میں خود گانے والا جل کر راکھ بن جاتا ہے۔ تان سین نے بادشاہ سے پندرہ دن کی مہلت مانگی۔ اس نے اپنی بیٹی سرسوتی اور سوامی جی کی ایک شاگرد روپاوتی کو پندرہ دن تک میگھ راگ کی مشق کرائی۔ اس راگ کے اثر سے بادل امڈ آتے ہیں اور خوب بارش ہوتی ہے۔ تان سین نے دونوں کو ہدایت دی کہ جب دیپک راگ شروع ہو تو وہ میگھ راگ گانا شروع کر دیں۔ جب یہ خبر شہر میں پہنچی کہ آج تان سین دیپک راگ گانے والا ہے تو ساری خلقت محل کے اطراف جمع ہوگئی۔ تان سین نے جوں ہی اپنا راگ چھیڑا فضا میں حدت بڑھنے لگی۔ لوگوں کے جسم پسینے میں شرابور ہوگئے۔ درختوں کے پتے سوکھ کر جھڑنے لگے۔ پرندے گرمی سے جھلس کر درختوں سے گر پڑے۔ دریا کا پانی جوش کھانے لگا ہر طرف شعلے بلند ہوئے اور چراغ جل اُٹھے۔ قریب تھا کہ راگ کی حرارت تان سین کو جھلس ڈالے۔ اِدھر لڑکیوں نے جو میگھ راگ شروع کیا تھا اپنا اثر دکھانے لگا۔ اچانک بادل گھر آئے اور دھواں دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس واقع کے بعد تان سین ایک مہینے تک شدید بیمار رہا۔ اکبر نے اس کے بستر کے قریب بیٹھ کر خدا سے تان سین کی صحت کے لیے دعا مانگی کہ تان سین اچھا ہو جائے تو وہ گیارہ دن تک غریبوں کو کھانا کھلائے گا۔ تان سین کے صحت یاب ہونے پر بڑا جشن منایا گیا۔ اکبر نے تان سین کے خلاف سازش کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ اس کے بعد تان سین کئی برس اکبر کے دربار میں

تا رہا۔ اس نے بہت
سے نئے راگ ایجاد
جیسے درباری ٹوڈی،
یاں کا راگ، میاں کی ملہار۔
۱۵۸۵ء میں تان سین کا
ال ہوا۔ اس کا مقبرہ
الیار میں ہے جہاں
بھی سارے ہندستان
موسیقار عقیدت سے
پھول چڑھانے جاتے ہیں۔

سب رس برادری

عزیز بچو! ساری دنیا میں سن ۱۹۷۹ء کو
کا عالمی سال قرار دیا گیا ہے اس سال بڑے لوگ
کے مسائل، انکی صحت، انکی تعلیم و تربیت اور انکے
پر غور کریں گے اور مستقبل کے معمار بچوں کے بارے میں نئے
جکٹ کام کرنے لگیں گے۔

ہم نے بڑوں کے سب رس میں چند اوراق پر آپکے
دہ مضامین، نظمیں با تصویر چھاپنے کا سلسلہ شروع
ہے۔

"سب رس برادری" کے رکن بن کر اردو کی خدمت
ضامین لکھیئے، کہانیاں، تجزیئے، لطیفے ضرور اور
روانہ کیجئے۔ اپنے بھائی بہنوں اور دوستوں میں
ایسی میٹھی زبان سیکھنے، پڑھنے لکھنے اور بولنے کی
میں حصہ لیجئے۔ اس طرح آپ سب رس برادری
ں جڑ جائیں گے۔ اپنا نام، پتہ اور اسکول کا
وا بھجوائیے اگلے مہینے سب رس برادری میں اپنا
چھپ جائے گا۔ (وقار بھائی)

وقار خلیل

جیک اور جِل

جیک اور جِل
چل نکلے تھے مِل
چلتے چلتے رستے میں کچھ ان کو مل گئی تِل
تِل کے تیل کی خاطر نکلے
ڈھونڈنے جب وہ سِل
جیک اور جِل
سِل کیا ملتی، پہنچے آخر کار پرانی مِل
مِل والے نے تِل تو لے لی اور بڑھائی بِل
بِل کے ملتے ہی دونوں کا بیٹھنے لگا تھا دِل
ہوش اڑے کچھ ایسے ان کے، بھول گئے تھے سِل
جیک اور جِل، چل نکلے تھے مِل
جیب تھی خالی اور پریشاں، بھاگے، پہنچے ہِل
ایسے بھاگے پاؤں دبا کر جیک اور جِل
بڈھا مالک لکڑی ٹیکے، لپکا، جائیں ہِل
چوروں جیسے بھاگ گئے وہ چھوڑ کے راہ میں بِل
جیک اور جِل، شاید جائیں مِل

بچو! ان کو اپنے دیس میں ہرگز آنے نہ دینا
ورنہ یہ کر دیں گے سن لو، مشکل اپنا جینا

ٹیبل لیمپ

رضی الدین اقبال

مارے غصے کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس نے سائنس کی کتاب ٹوٹی ہوئی میز پہ دے ماری اور بڑبڑانے لگا: "امتحان سر پہ آرہے ہیں۔ ڈھیر سی پڑھائی کرنا ہے کتنی دفعہ پاپا سے کہہ چکا ہوں کہ ٹیبل لیمپ لے آئیں، یہ پچیس نمبر کے چھت پہ لگے مدھم بلب کی روشنی میں نہیں پڑھا جا سکتا، مگر یہاں سنتا ہی کون ہے۔ کسی کو فکر نہیں کہ یہ ساتویں جماعت کا لڑکا ہے اور اب سرکاری امتحان ہوگا۔ تیاری کے لئے کچھ تو سہولت دینی چاہیئے۔ اونہہ..."

اس نے منہ بسورا، جھنجھلایا، اور پاپا کی لعن تاری۔

بیٹا! اس سال امتحان میں اچھے نمبر لانا ہے تاکہ اچھے نمبر آئیں گے۔

"عارف! بیٹا کہاں ہو تم؟" اماں کی آواز آئی اور اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"یہاں یہاں ہوں۔" وہ کمرے سے نکلتا ہوا بولا۔ اماں نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا تو تشویش سے بولیں:

"کیا ہوا رے! طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ آنکھیں سوج گئی ہیں۔ چار بجے پڑھا نہیں کرتے میرے لال! جاؤ کھیلو کودو اور ہاں، بازار سے ایک کیلو نمک لے آؤ۔"

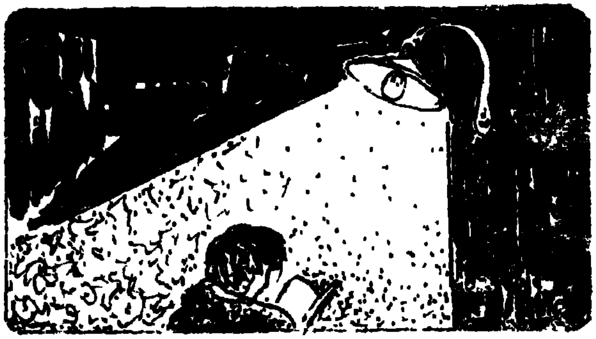
"اچھا۔" اُس نے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں! آج تو بہت اُداس لگ رہا ہے؟" اماں اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"ماں! میں آج سے پڑھائی نہیں کروں گا۔" وہ غصے کو دباتے ہوئے بولا۔ "کیوں؟" اماں کے اس جواب پہ وہ جھنجھلا اُٹھا۔

"دو مہینے سے ٹیبل لیمپ کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس مدھم روشنی میں پڑھا نہیں جا رہا ہے۔ مگر پاپا نے کوئی توجہ نہ دی۔"

"اوہ! تو اس لئے خفا ہے میرا بیٹا۔ آج میں تیرے پاپا سے کہوں گی۔ اچھا اب جا۔ ہر روز گھنٹہ دو گھنٹے تفریح صحت



کیلئے ضروری ہے بیٹا۔"

دو گھنٹے بعد وہ بازار سے گھوم پھر کر لوٹا تو پاپا آچکے تھے۔ اور اماں کی آواز آرہی تھی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

اماں کہہ رہی تھیں:

"دیکھئے! اس کا امتحان قریب ہے۔ آپ کل ہی بلکہ اب جاسکیں تو ٹیبل لیمپ لے آیئے۔ اُس کی آنکھیں اس کم روشنی سے متاثر نہ ہو جائیں۔"

"لیکن رضیہ! تم سوچو یہ تمہارے ٹیک تمہارے ماں کی نشانی ہیں۔ انھیں گروی رکھتے ہوئے..." پاپا کی شکست خوردہ آواز سن کر وہ کانپ گیا۔ (باقی صفحہ پر)

المیہ اور مداوا

ایک ہلاکت خیز طوفان نے ۱۹/نومبر ۱۹۷۷ء کو سیاہ بخت سنیچر کے روز آندھراپردیش کے ساحلی اضلاع کو نشانہ بنایا اور اپنے پیچھے موت۔ تباہی اور بربادی کے ہولناک مناظر چھوڑ گیا جس کے فوری بعد ایک کثیر مقصدی بازآبادکاری پروگرام شروع کیا گیا جو قلیل مدتی اور طویل مدتی امدادی اقدامات پر مشتمل تھا۔ اس پروگرام کے تحت انجام دیئے جانیوالے کاموں کا خاکہ درج ذیل ہے:

تقسیم کردہ مفت امداد	۱۷ کروڑ روپے
محصول مالگزاری کی معافی	۷ر۳۴ کروڑ روپے
۴۱۸۰۰ بنکروں کو امداد	۲ر۲۵ کروڑ روپے
۱۴۰۰۰ ماہی گیروں کو امداد	۱ر۶۱ کروڑ روپے
۷۵۰۰ صناعوں کو امداد	۶۸ر۰۵ لاکھ روپے
سڑکوں۔ پلوں اور عمارتوں کی درستگی	۱۹ر۲۸ کروڑ روپے
آبپاشی کاموں اور برقی تنصیبات کی بحالی	۱۸ر۶۸ کروڑ روپے
تعلیمی اداروں کی بحالی	۱ر۳۸ کروڑ روپے
بلدی جائدادوں کی درستگی و مرمت	۱ر۵۰ کروڑ روپے
کیمیائی کھادوں اور بیجوں کی فراہمی اور اراضیات کو لائق کاشت بنانے کے کام	۱ر۸۴ کروڑ روپے
تاحال تعمیر شدہ مستقل نوعیت کے مکانات کی تعداد	۱۱۱۰

ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ آندھراپردیش
حیدرآباد

No. 2665/C4 33/78

خود روزگار کے مواقع

بیروزگاری ایک ہمالیائی مسئلہ ہے۔ اس عظیم چیلنج سے نمٹنے کے لئے ہماری جانب سے انتھک جد و جہد اور لگاتار کوشش کی ضرورت ہے چنانچہ آندھرا پردیش میں ۱۵۔ اگسٹ ۱۹۷۸ء سے ۵ کروڑ روپے مالیت کی ایک خصوصی روزگار اسکیم آغاز کی گئی ہے جس کے تحت پڑھے لکھے بیروزگاروں کو عملی تربیت دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس اسکیم سے زیادہ تر ہمارے کمزور طبقات کو فائدہ پہنچے گا۔

سال ۷۷ - ۱۹۷۶ء کے دوران ریاست میں مجموعی طور پر روزگار کی صورتحال میں قابل لحاظ بہتری پیدا ہوئی۔ دفاتر فراہمی روزگار کی جانب سے تقریباً ۵۲۸۷۶ ملازمتیں دلائی گئیں اور اس طرح پچھلے سال کے مقابلے میں روزگار کے ۳۴ فیصد اضافہ مواقع فراہم کئے گئے۔

اسمال فارمرس ڈیولپمنٹ ایجنسی (ایس یف ڈی اے) مارجینل فارمرس اینڈ اگریکلچرل لیبررس اسکیم (ایم ایف اے ایل) ڈراوٹ پرون ایریاز پروگرام (ڈی پی اے پی) اور لائیو اسٹاک پروڈکشن پروگرام (ایل پی پی) بھی روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

مذکورہ بالا ایجنسیوں کے دائرۂ عمل کے علاقوں میں موجود تقریباً ۱۵ لاکھ چھوٹے اور مارجینل کسانوں میں سے اب تک ۵۸ء۶ لاکھ سے زائد کی شناخت عمل میں لائی جاچکی ہے اور مختلف مالیاتی اداروں سے ان کو امداد فراہم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ ایسے چھوٹے کسان جن کی اراضیات ڈھائی ایکڑ تری اور ۵ ایکڑ خشکی سے زیادہ نہیں ہیں۔ محصول مالگزاری سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد No.2665/C4/31/78-79

سن اجراء: ۱۹۳۸ء فون ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۴۲
شمارہ: ۲
فروری ۱۹۷۹ء

زر سالانہ: ۱۵ روپے ششماہی: ۸ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچاس

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ترتیب

ہمارے باز آباد کاری پروگرام

آندھرا پردیش میں طوفان سے متاثرہ علاقوں کے لئے کئے گئے طویل مدتی باز آباد کاری اقدامات کئی پہلوؤں پہ مرکوز ہیں جیسے مالگزاری کی ادائی سے چھوٹ۔ بنکروں۔ دستکاروں اور ماہی گیروں کو مالی امداد وغیرہ ۔ کسان برادری کو خصوصیت کے ساتھ امداد بہم پہنچانے کی غرض سے حکومت نے ۳۴ر۷ کروڑ روپیوں کے مساوی محصول مالگزاری معاف کرنے کی منظوری دی ہے

ایک اندازے کے مطابق متاثرہ بنکروں کی تعداد تقریباً ۰۰۸۱۴ اور ماہی گیروں کی تعداد تقریباً ۱۴ ہزار ہے اور صرف ماہی گیروں کی باز آباد کاری پر ۲۳ر۱۶۱ لاکھ روپیے خرچ کئے گئے۔ بنکروں کی باز آبادکاری پر ۲۲۵ لاکھ روپیوں کی رقم خرچ کی گئی۔ ۰۰۵۷ مختلف زمروں سے تعلق رکھنے والے دستکاروں جیسے موچیوں۔ چمڑے کی دباغت کرنے والوں۔ سیندھی کے درخت تراشنے والوں، بڑھائیوں اور لوہاروں وغیرہ کو ۵ر۶۸ لاکھ روپیوں کی امداد دی گئی۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ

36/78 - 79

اپنی بات

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام ۱۱ - ۱۲ فروری ۱۹۷۹ء کو یوم محمد قلی قطب شاہ کی سالانہ تقاریب منائی گئیں۔ اِن تقاریب کی بنیاد سترہ برس پہلے بانیٔ ادارہ ادبیاتِ اُردو، ڈاکٹر زور مرحوم نے رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد کو تازہ رکھا جائے جو قدیم اردو کا ایک عظیم شاعر گزرا ہے اور جس نے دکن میں اُردو شعر و ادب کو فروغ دینے کے ساتھ قومی یک جہتی کو پروان چڑھانے میں اہم حصہ لیا تھا۔ اِسی بادشاہ نے شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی تھی جو اب ریاست آندھرا پردیش کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کو بساتے ہوئے محمد قلی نے یہ دُعا مانگی تھی ؎

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر   رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیع

یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ دکنی زبان و ادب اور دکنی کلچر سے ایک زندہ رشتہ قائم رکھتے ہوئے اس کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ کیا جائے۔

یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس میں جو مقالے پڑھے گئے تھے انھیں اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ادارہ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام "اُردو کی بقاء ترویج اور ترقی کے مسائل پر ایک سیمنار منعقد کیا گیا تھا۔ جناب سید ہاشم علی اختر نے اس موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کیا تھا اور ممتاز دانشوروں ادیبوں اور صحافیوں نے مذاکرہ میں حصّہ لیا تھا۔ سب رس کا پانچواں شمارہ خاص نمبر ہوگا جس میں مذاکرے کی مکمل روداد شامل رہے گی۔ اہلِ قلم حضرات سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس موضوع پر اپنے مضامین سب رس کے اس خاص نمبر میں اشاعت کے لئے ارسال فرمائیں۔

مغنی تبسم

محمد علی اثر

اُردو غزل قطب شاہی عہد میں

غزل اُردو شاعری کا سب سے اہم ادبی اور تہذیبی سرمایہ ہے اس لیے غزل کا مطالعہ دراصل ایک مخصوص تہذیب، ایک مخصوص معاشرتی نظام اور مخصوص تاریخی اور سماجی حالات کا مطالعہ ہے۔ (بقول) رشید احمد صدیقی۔

"ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح غزل میں اور غزل کی روح ہماری تہذیب میں بے نقاب نظر آتی ہے"

(جدید غزل ص۱۱)

ہر زمانے میں لوگ غزل سے دلچسپی لیتے رہے ہیں اور ہر دور میں اس کے سر پر شہرت و مقبولیت کا تاج رکھا گیا۔ اُردو میں شعر و ادب کی ابتدائی نشو و نما کا سہرا دکن کے سر ہے۔ دبستانِ دکن کے قدیم ادبی ورثہ میں اگرچہ کہ مثنوی کی صنف نہایت مقبول رہی ہے لیکن فارسی شاعری کے اتباع میں قدیم دکنی شعراء نے ابتداء ہی سے غزل پر بھی توجہ کی ہے اُردو میں غزل کے اوّلین نقوش کب اُبھرنے شروع ہوئے اس کا قطعی طور پر تعین مشکل ہے۔ بہمنی عہد کا وہ دَور جس میں اُردو میں تصنیف و تالیف کا روایت پڑنا شروع ہوئی، اُردو ادب کی تاریخ کا تاریک دَور ہے اس عہد کی عام تاریخ کے بارے میں کافی مواد فارسی تاریخوں میں مل جاتا ہے لیکن قدیم تاریخیں بالعموم زبان اور شعر و ادب کی نشو و نما کے تذکرے سے عاری ہوتی ہیں۔ پھر جہاں تک اس دَور کی اُردو شاعری کا تعلق ہے وہ ایک ایسی زبان کی شاعری ہے جو پہلی مرتبہ بولی کے مرحلے سے آگے بڑھ کر زبان کی منزل میں داخل ہو رہی تھی۔ اس لیے فطری طور پر اس عہد کے مورخین یا مصنفین نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اُردو کی اوّلین تحریریں دنیا کی اکثر زبانوں کے اوّلین تحریری نمونوں کی طرح صوفیوں اور مذہبی رہنماؤں کی تحریریں ہیں۔ لیکن حضرت بندہ نواز اور چند صوفیوں کے فوری بعد ہم کو اُردو میں ادبی کوششوں کے ابتدائی نمونے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" اس سلسلہ کی ایک اہم مثال ہے۔ پھر نظامی کے معاصرین میں مشتاق، لطفی اور قریشی کے نام ملتے ہیں جن کی غزلیں قدیم اُردو غزل کے ابتدائی نمونوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

دبستانِ گولکنڈہ کے اوّلین غزل گو شاعروں میں فیروز، محمود اور ملا خیالی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر شاعر کی صرف ایک غزل دستیاب ہوئی ہے اس لیے اس کی غزل گوئی کے بارے میں قطعی طور پر کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے البتہ فیروز اور محمود کی نو دریافت شدہ غزلوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ قدیم اُردو کے یہ دونوں شعراء اپنے عہد کے اساتذۂ سخن اور باکمال غزل گو بھی تھے۔ محمد قلی قطب شاہ اپنے کلام میں شاید فیروز اور محمود کی سی روانی، برجستگی اور جذب طرازی دیکھ کر کہہ اُٹھتا ہے کہ اگر فیروز اور محمود میرے کلام کو دیکھتے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ بے ہوش ہو جاتے۔ ؎

اگر محمود اور فیروز بے ہوش ہوئیں عجب کیا ہے　　ہوے مج وصف نا کر سک ظہیر اور انوری بے ہوش

قطب الدین قادری فیروز ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک نامور شاعر ہے۔ وہ بیدر کا متوطن تھا اور بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں اپنے مرشد حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی ۱۵۶۴ء) کی ایما پر گولکنڈہ آیا تھا[1] اس کی ایک مختصر مثنوی "پرت نامہ" کے علاوہ دو تین غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ محمد قلی کے علاوہ وجہی اور ابن نشاطی نے فیروز کو استادِ سخن کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اس سے اپنے کلام کی داد چاہی ہے۔ مثلاً وجہی کہتا ہے۔

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں　　دعا دے کے چومے مرے ہات کوں

کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس　　کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس

توں ایسی طرز دل لتے پنجیا نوی　　کہ دسرے کر تیا سب تری پیروی

فیروز کی غزلوں کے مطالعہ سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ بہ آسان ممکن ہے جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ "پرت نامہ" کوئی ایسا بڑا ادبی نقش نہیں تھا جو فیروز کی استادی اور اس کے کمال فن کے شایاں شان ہو[2]۔

فیروز کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی ہے۔ اس کا تصورِ محبوب مادی اور مجازی ہے۔ وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے کا ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے۔ اگرچہ کہ اس کے کلام میں "ہندی" اور "فارسی" اثرات دونوں کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی "ہندوی" عنصر غالب نظر آتا ہے۔ زبان اور طرز ادا سے قطع نظر اس کے متخیلہ پر بھی مقامی عناصر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سہر و قدرت سہاتے جو نو بہار بن میں　　نازک نہال پنجیا اس جیو کے چمن میں

گوریاں سہیلیاں سب جگ کیاں بساریاں　　جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکھن میں

فیروز جے حمد کا دیکھیں جمال صور میں　　ہر حال اس صنم کا اکھیں خیال من میں

فیروز کی طرح سید محمود بھی ابراہیم قلی کے عہد کا ایک بلند پایہ شاعر ہے۔ زمانہ مابعد کے شاعروں میں محمد قلی، وجہی اور ابن نشاطی اس کو قدیم اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے محمود ایک پرگو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے اردو کے علاوہ عربی اور افغانی میں بھی شعر موزوں کیے ہیں لیکن صرف اردو شاعری کی وجہ سے اس کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمود نے غزل کے علاوہ مثنوی، مرثیہ، گیت، قصہ اور دوہرے بھی کہے ہیں لیکن اس کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے[3] اس کے کلام کی ایک قلمی بیاض انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

محمود طبعاً ایک غزل گو شاعر ہے۔ اس کی غزل کا نمایاں وصف، روانی و برجستگی، سادگی و موسیقیت ہے۔ اس کے کلام میں سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی، تاثر اور سوز و گداز کا حسین امتزاج بھی نظر آتا ہے اس کی غزل "گفتگو بہ زنان" کے موضوعات تک محدود نہیں بلکہ مختلف مسائلِ حیات اور زندگی کے گوناگوں مشاہدات اور تجربات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

1ے سید محی الدین قادری زور "دکنی ادب کی تاریخ" صفحہ ۵۱
2ے مسعود حسین خاں ڈاکٹر "پرت نامہ" قدیم اردو جلد اوّل صفحہ ۲۲۸
3ے جمیل جالبی ڈاکٹر "تاریخ ادبِ اردو" جلد اوّل صفحہ ۴۰۱

جو قدم راکھے سبک ساری کی رہ میں جیوں حباب　　نیں ہے لغزش پاوں کوں اس کے اگر چلنا پر آب
آج ہور کل میں اپس کی زندگی ناگھان توں۔　　جو توں کرنا ہے سو کر لے حق کے کاماں کوں شتاب

گر کان ہیں تج کوں لے اس باغ میں غنچے سگل　　کرتے ہیں سو جیباں سی تلقین خاموشی تجے
ہے بات یو در ریز کا ترشہ کمر کوں باند چل　　مغرور ہو بیٹھا ہے کی اونچے طلا کاری چجے

مملکتِ گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا رعایا پرور حکمراں، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار، فن تعمیر اور رقص و موسیقی کا دل دادہ تھا بلکہ اردو، فارسی اور تلگو کا ایک بلند پایہ اور خوش گو شاعر بھی تھا، اس کی قادر الکلامی اور موزونیِ طبع کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر روز اسی طرح بے تکلفی سے شعر کہتا تھا جس طرح دریا میں روز موجیں اٹھتی ہیں لیکن نہ تو دریا کی روانی میں فرق آتا ہے اور نہ موجوں کا تلاطم کم ہوتا ہے وہ کہتا ہے

صدقے نبی قطب شاہ یوں شعر بولے ہر دن　　دریا کوں روز جوں ہے موجاب کا طلوع

محمد قلی نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اس کے کلیات میں حمد، نعت، منقبت، عید میلاد النبی[۴]، شب معراج شب برات، عید رمضان، بقرعید، عید غدیر، نوروز، بسنت، سالگرہ، جلوہ، کھیل، برسات، محلات شاہی، بارہ پیاریاں وغیرہ موضوعات پر ۲۱۰۰ مسلسل غزلیں، ۲۰۰ غزلیں، ۲۷ ریختیاں، ۲، قصیدے، ۴۱ رباعیاں اور ایک ناتمام مختصر مثنوی شامل ہے رباعیوں اور مثنوی کو چھوڑ کر اس کا تمام کلام غزل کے فارم میں ہے۔ محمد قلی اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے جس کا کلام مکمل دیوان کی شکل میں دستیاب ہو سکا ہے۔ اس نے صنفِ غزل پر سب سے پہلے باقاعدہ توجہ کی ہے جہاں تک غزلوں کی تعداد اور تنوع کا تعلق ہے محمد قلی دکنی اسکول کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا ہے غزل کے لیے جس داخلی کیفیت اور خارجی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ محمد قلی کو میسر تھا شاید اسی لیے غزل اس کی محبوب صنفِ سخن بن گئی۔ یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں ہم نظم سمجھتے ہیں دراصل مختلف موضوعات کے تحت کہی گئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہیں۔

قدیم اردو بالخصوص دبستانِ گولکنڈہ کے کسی شاعر کے کلام کی ادبی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کم و بیش یہی خصوصیات دکنی کے دوسرے کلاسیکی شعرا کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر کچھ نہ کچھ اپنی انفرادی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی بعض نمایاں خصوصیات تمام دکنی شعرا میں مشترک نظر آتی ہیں۔ سادگی، روانی اور برجستگی دکنی شاعری کی وہ نمایاں خصوصیت ہے جو ۱۷۰۰ء کے بعد شمالی ہند میں نشو و نما پانے والی شاعری میں تدریجی طور پر کم ہوتی گئی ہے۔ مرزا جان جاناں مظہر کی تحریک کے بعد شمالی ہند کے شعرا کا اظہارِ بیان تدریجاً فارسی طرز نگارش سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کے فارسی ادب پاروں میں صنعت گری کا رجحان بہت زیادہ تھا، صنائع بدائع کا اہتمام، دور از کار تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے ذریعے بات کو زیادہ پیچیدہ بنا دینے کا میلان فارسی شعر و ادب کے اہم عناصر تھے۔ اس کے برعکس محمد قلی یا قدیم اردو کے دوسرے شعرا کا یہ رجحان قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے فارسی کی مروجہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے مرصع اور پُرپیچ کی جگہ سادہ اور رواں اظہار بیان اپنایا۔ محمد قلی کی شاعری میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ملے گا جہاں اس نے صنائع بدائع کے التزام کی کوشش کی ہو۔

محمد قلی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے اور نہ فکر کی گہرائی، درد و غم کی فراوانی ہے اور نہ نشتریت، اس نے اپنی زندگی کی بہاریں

عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گذاریں، اس لیے اس کے کلام میں رنگینی و رعنائی ہے۔ تازگی و شگفتگی ہے۔ سیرابی و سرمستی ہے۔ غرض آسودگی کے تمام روپ اس کے کلام میں جلوہ گر ہیں۔ محمد قلی کا آرٹ کلاسکی آرٹ کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ خوشحالی، اطمینان اور آسودگی کا آرٹ ہے چونکہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا اس کے محلوں میں بیسیوں ملکوں کی منتخب حسینائیں موجود تھیں اس لیے اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کے آسودہ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

محمد قلی کی غزل کی دوسری نمایاں خصوصیت واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی ہے۔ اس نے اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد قلی یا دکن کے دوسرے شعرا کا تصورِ محبوب اردو شاعری میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے یہ محبوب تصوری و خیالی پیکر نہیں بلکہ اسی عالم رنگ و بو میں رہنے بسنے والا گوشت پوست کا انسان ہے محمد قلی نے برملا انداز میں اپنے محبوب کو سکی، سہیلی، دھن، سودھن، یار، ناری، سندری، سنجنی، سانولی، پیاری، چھبیلی، گوری، کنولی، موہن، مشتری، ہندی چھوری، پدمنی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے وہ ایک کثیر المحبوب شاعر ہے اس نے اپنے کلیات میں اپنی ان گنت محبوباؤں کی تعریف و توصیف میں سینکڑوں غزلیں کہی ہیں۔

محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے۔ اس کی رگ و پے میں ہندوستان کی تہذیب سرائیت کر گئی ہے۔ وہ ایک تلنگن عورت "بھاگیہ رتی" کے بطن سے تھا۔ اتحاد پسندی اور رواداری اسے ورثے میں ملی تھی اسے ہندوستانی مزاج سے وہی مناسبت تھی جو امیر خسرو یا اکبر اعظم کو حاصل تھی، اس نے اسلامی عیدوں کے ساتھ ساتھ بسنت، نوروز، آمد برسات، دیوالی وغیرہ خالص ہندوستانی تہواروں کو بھی ایک بین قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا۔ اس کا کلام اس کے ماحول اور اس کی رنگارنگ شخصیت کا آئینہ دار ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا — تمھیں ہیں چاند میں ہوں جوں تارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں — کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نبی صدقے بسنت کھیلیں قطب شہ — رنگیلا ہو رہیا ترکس سارا

گرجا ہے میگھ سر تھے تازہ ہوا ہے بستاں — پھولاں کی باس پا یا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن — چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں کئے پرستاں

غرض محمد قلی کی غزلیں نہ صرف ہندوستانی تہواروں، عیدوں، موسموں، مناظر فطرت، کھیلوں وغیرہ کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں بلکہ ہندوستانی عوام کے طور طریقے، رسومات، معتقدات، اور توہمات کی بھی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اگر قطب شاہی عہد کی تہذیب کے نقوش دیکھنے ہوں یا اس عہد کے لوگوں کے جذبات اور تصورات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس خصوص میں محمد قلی کا کلام ہماری مکمل رہنمائی کرے گا۔

محمد قلی کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ بھی شدت سے ابھرتا ہے اس کی بیشتر غزلیں "نبی صدقے" سے شروع ہوتی ہیں اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور وہ مذہبی ریت و رسوم پر بھی چلتا ہے لیکن مذہب کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔ اسے مذہب کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ

اپنی عیش کوشی کو بھی نبی اور علی کا صدقہ قرار دیتا ہے ؎

نبی صدقے بارہ اماماں کرم تھے　　　کرو عیش جم بارہ پیاریاں سوں پیا رے

محمد قلی کے کلام کا بیشتر حصہ خارجی موضوعات پر مشتمل ہے لیکن ریختیوں میں اس کا میلان زیادہ تر داخلیت کی طرف نظر آتا ہے اس کی ریختیوں میں زنانی لب و لہجہ اور عورتوں کی زبان کی مکمل خصوصیات ملتی ہیں۔ اس نے غزلوں کے مقابلے میں ریختی کے اشعار زیادہ جی لگا کر کہے ہیں اس لیے ان میں نکھار اور تاثر کی فراوانی ہے موزوں الفاظ، دلکش تراکیب، حسین استعارات اور خوب صورت تشبیہات کے ذریعے اپنے شاعرانہ کمال اور فنی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

جن پیو سے تھے بچھڑے اسے سنسار میں نیں کوچ خط　　　جس ٹھار ہیں وہ پیو نیں اس ٹھار ہیں نیں کوچ خط

پیا بچھڑا ہے مجے کوں دکھ گھنیرا　　　نہ جانوں کب ملے گا پیو میرا

کوپ سوں آئے ہیں اشہ مرے گھر　　　چند ممن جھمکتا او مکھ سمن

محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کی سراپا نگاری میں بے پناہ فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے سراپا کے بیان میں اس نے جو مسلسل غزلیں کہی ہیں ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر محبوب کی بعض انفرادی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ اس کی بیبیوں محبوباؤں کے قد و خال اور طور طریقے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان غزلوں کی مدد سے ایک مصور ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تصویر بنا سکتا ہے مثلاً ننھی ایک کم سن اور نوخیز لڑکی ہے جو رسم عاشقی سے نا آشنا ہے اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑھی باندھ رکھی ہے جب وہ چاندنی میں ناز سے چلتی ہے تو چاند لاج سے چھپ جاتا ہے اور ستارے اس کی آرتی اتارنے کے لیے دھرتی پر اتر آتے ہیں۔ اس کے چاند سے چہرے پر کجراری آنکھیں بہت زیب دیتی ہیں۔

محمد قلی طبعاً نغمہ و نشاط اور راگ رنگ کا شاعر ہے اس کی غزلوں میں آسودگی، بھرائی، سرمستی، رنگینی اور رعنائی کے تمام روپ نظر آتے ہیں لیکن اس کی شاعری محض عیش کوشی اور کامیاب عاشق کے نشاط وصل کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں ایک دردمند اور ہجر آشنا شاعر کے دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں فراقیہ اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ اشعار قلی کے فکر و فن کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

مو نظر سامنے نہیں ہے یار　　　نین پانی میں تیرتا دل دار
خدا جیو کی بہاں کوں دکھا ایک بار　　　دکھا ساعر فن کر غم کروں خوار زار
رات میں کے نین نچ سونے نہ دیو ہیں　　　اور ہمن گھر میں نپٹ ویرانہ کیا
تج بن پیارے نیند نکہ نیناں میں نچ آتی نہیں　　　ریختی اندھاری ہے کٹھن تج بن کٹی جاتی نہیں

ملک الشعرا اسد اللہ وجہی، محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر و ادیب ہے اس نے غالباً ابراہیم قطب شاہ کے آخری زمانے میں ایک شیوہ بیان شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی محمد قلی قطب شاہ نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا پھر اس نے محمد قلی قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ کا عہد بھی دیکھا۔ "قطب مشتری" "سب رس" اور "فارسی" دیوان کے علاوہ اس کی چند

دستیاب ہوتی ہیں۔ وجہی کی آٹھ غزلیں "قطب مشتری" میں اور دو "سب رس" میں شامل ہیں۔ ان غزلوں کے علاوہ مولوی سخاوت مرزا اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے اس کی مزید پانچ غزلوں کی نشاندہی کی ہے۔ وجہی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہ ہوگا کہ وہ قدیم اردو کا ایک پختہ مشق اور قادر الکلام غزل گو بھی تھا اور اس نے غالباً فارسی کے ساتھ اردو میں بھی کوئی دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہوگا۔ جو ہنوز پردۂ تاریکی میں ہے۔

وجہی کی غزل کی نمایاں خصوصیات زبان و بیان کی سلاست و صفائی، واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی ہیں۔ قدیم اردو کے دوسرے شعرا کی طرح وجہی کا کلام بھی ایک صحت مند نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے۔ وجہی کی غزلیں محمد قلی کے مقابلے میں زیادہ رواں، اور پُر اثر معلوم ہوتی ہیں۔

سہے دل تیرا عشق نئی کیوں کر سہے گا دیکھنا   کو لگ تجھے عالم منے رسوا کرے گا دیکھنا

تارے کتے ننیاں کوں تج تاریاں ہیں مستی تو نہیں   شب بولتے تج زلف کوں شب میانے اتنی تارکاں

وجہی کی غزلیں اصلیت اور واقعیت کی غمازی کرتی ہیں۔ اس کے کلام میں مقامی ماحول کی تہذیبی روایات اور معاشرتی خصوصیات نظر آتی ہے۔ اس لیے اس کی غزلوں میں مقامی ماحول، مقامی دریاؤں، پرندوں، پھولوں، جانوروں وغیرہ کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ ان کے ہاں کاسی، جوگی، جوتشی، برہمن، کنول، گنگا، ہرناں، سنپارے، راویاں، پنکھی، ناگ وغیرہ الفاظ مقامی اثر کی نشان دہی کرتے ہیں۔

وجہی کی غزلوں کا بیشتر حصہ عالم فراق کی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے کلام میں ایک دردمند اور حساس دل کے دھڑکنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی کا احساس ہوتا ہے۔

دیدے مرے نا دیسے جو دیدار دیکھے تجے   تج صبر دیو نہار وہ دیدار کہاں ہے
لوگاں یو کہا کتے ہیں سو معلوم نہیں مجے   تج بے خبر کوں کا لہے خبر تج فراق تے
جاتا ہے جیو پیا رہے ٹک بیگ آ کرم کر   تج درس دیکھنے کوں انکھیاں میں دم رکھیا ہوں

آخری شعر کا مضمون استاد ذوق نے کچھ اس طرح باندھا ہے۔

آنا ہے گر تو آؤ کہ سینے سے چل کے اب   آنکھوں میں آکے ٹھہرا ہے دم انتظار کا

وجہی کی پندرہ غزلوں میں سے چند ریختیاں ہیں اُن میں جس عورت کے جذبات، احساسات اور کیفیات عشق کی عکاسی کی گئی ہے، ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز اس کا "پیو" ہے جس پر وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دینا عین زندگی سمجھتی ہے اور صرف ایک ہی کی ہو رہنا چاہتی ہے۔ وجہی کی ریختیوں میں جنسی تلذذ ہے اور نہ عریانی یا جذبات کی پراگندگی، اس کے ہاں ایک ٹھہراؤ، پاکیزگی اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔

یکتا ئیں سہیلی مرنا دل دو جے پر نہ دھرنا   اس پیو کوں اپنا کرنا اس پاپی جیو کے کوں کھو سکے
پیو اپنے کوں ٹک آج میں ملتی سپنے دیکھی سوے کر   جب پیو چلا سٹ سیج مج تب سوتے اٹھی رو ئے کر

وجہی اپنے عہد کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ عالم، فلسفی اور حکیم بھی تھا اس لیے اس

کی غزلوں میں فلسفہ و تصوف، فقر و قناعت اور اخلاق و حکمت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

دکھاتا ہوں میں تجھ۔ تجھ یار دیک		توں جیوتے آپس کوں اپے مار دیک
خدا تج میں تیرپچ چھپا ہے		تو دیدار میں اپنے دیدار دیک
معین نکو کر اسے ایک ٹھار		وہ ہر ٹھار ہے اسکوں ہر ٹھار دیک

باطن فقیر ہوکر ظاہر غنی رہا ہوں		لوگاں میں بالے جیوں تیوں گھر کا بھرم رکھیا ہوں
بھوکا ہوں کر کسی کن میں ہات نہیں پسار یا		آپس کوں آپ کھا کر اپنی شرم رکھیا ہوں

قدیم اردو کا ایک اور نامور اور عظیم المرتبت شاعر غواصی ہے۔ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا، عمر میں محمد قلی اور وجہی سے چھوٹا تھا۔ غالباً اس نے محمد قلی کے عہد میں شاعری کا آغاز کیا۔ سلطان عبد اللہ قطب شاہ نے اسے اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا اور "فصاحت آثار" کے لقب سے نوازا۔ اس کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کی "شکر افشانی" کے چرچے صرف دکن ہی میں نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں ہونے لگے تھے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے سبب "طوطیانِ ہند" اس کے "شکرستان" کی جانب رغبت کرنے لگے تھے۔ اس کو اپنی شہرت کا بخوبی احساس تھا۔ وہ کہتا ہے

طوطیاں سب ہند کے رغبت کریں تیوں آج خوش		شکرستاں ہو غواصی شکر افشانی کیا

عزب علی میں یور ہوں، میراں کیرا منظور ہوں		غواصی ہو مشہور ہوں اس سلطنت کے بھار میں

اسی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے میر حسن، قائم اور میر تقی میر نے اپنے تذکروں میں غواصی کا ذکر کیا ہے جبکہ قدیم اردو کے دوسرے بلند پایہ شاعر مثلاً محمد قلی قطب شاہ اور ملک الشعرا وجہی ان تذکروں میں جگہ نہ پا سکے۔

غواصی کی تین مثنویوں (مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ) کے علاوہ غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔ موجودہ مواد کی روشنی میں وہ ایک باکمال غزل گو، بلند پایہ مثنوی نگار اور ایک کامیاب قصیدہ نگار شاعر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی دبستانِ دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے غزل کے میدان میں نہ قطب شاہی عہد کا کوئی شاعر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ عادل شاہی دور کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کی غزل میں بھرتی کے شعر یا ایسے اشعار بہت کم ہیں جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔

قدیم اردو کے دیگر کلاسیکی شعرا کی طرح غواصی کے کلام کی نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور حقیقت پسندی ہے۔ لیکن جو چیز اس کو دکنی شعرا میں منفرد مقام بخشتی ہے اور اردو کے صفِ اول کے شعرا میں لا کھڑا کرتی ہے وہ تاثر کی فراوانی، سوز و گداز، نغمگی اور شعریت ہے۔ غواصی کو زبان اور بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے اس کے کلام میں پاکیزگی اور بلندی کا احساس ہوتا ہے اس کے انداز میں ایک اعتدال، ٹھہراؤ، اور توازن نظر آتا ہے۔ اس کی آواز رچی ہوئی اور مصفا ہے۔ اس کا لہجہ مدھم، دل نشین اور اپنے معاصرین یا متقدمین سے مختلف ہے، وہ اپنے پیشرو یا ہم عصروں کی بازگشت نہیں۔ غواصی دکنی غزل کے ایک نئے اسکول کا بانی ہے جس کے بعد کے بلند پایہ شاعروں نے خصوصاً ولی اورنگ آبادی نے پیروی کی ہے۔

غواصی ایک حسن پرست شاعر ہے اس کا رومانی جذبہ خارجی شاعری کی تصویر کشی میں زیادہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اس کی مثنویوں اور قصیدوں میں مناظرِ فطرت کی مرقع کشی کے متعدد بیش بہا نمونے

ود ہیں۔ غزل میں بھی اس نے منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ محبوب کے حسن کو اُجاگر کرنے کے لیے بھی اس نے مناظرِ قدرت سے
طرح سے کام لیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

جھنور کر جیو کوں میرے ادک لبدا تیا تیرا — کمل مکھ ہور نین نرگس رنگیلا گال گل لالہ
چمن کے جھاڑ سب خوش ہو سگل پھولاں منے تیرا — سہیلا گادتے پاتاں کے ہاتاں سوں بجا تا لہ

اس میں شک نہیں کہ غواصی نے اپنے اردگرد کی اشیا کو آنکھ کھول کر دیکھا ہے۔ مناظرِ قدرت کا غائر نظر سے مشاہدہ کیا ہے
اس کے بیان کی خارجیت میں جذبے کی داخلیت بھی شامل ہے۔ کہیں کہیں یہ داخلیت خود کلامی کا روپ اختیار کر لیتی ہے
واردات کا بیان اس نے جس جس انداز سے کیا ہے اور اس میں سادگی و پُرکاری نے جس طرح سے نئے نئے پہلو تراشے ہیں وہ بیک وقت
کے جذبات کی گہرائی اور فنی پختگی کی دلیل ہیں۔ چھوٹی بحروں میں غواصی کے اشعار میر تقی میر کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ حسبِ ذیل اشعار
دگی، گداختگی اور سوز و گداز ملاحظہ کیجئے۔

دل میں اک بات ہے کیسے نہ کہوں — کہ پھٹے گی وہ بات یاں واں پڑ
دل کی دیوانگی نہیں جاتی — پھونکتا ہوں جتا دعا یاں پڑ

اے سجن تج کوں یاد کر پَل پَل — رووں آپس میں اپیج میں ڈھل ڈھل

غواصی کی شاعری بنیادی طور پر جذبات و احساسات کی شاعری ہے جذبات کی موثر ترجمانی اور قلبی واردات کی فن کارانہ
ں کی وجہ سے اس کا تمام کلام غنائیت کے کیف و سرور میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود انتہائی سادگی کے کلام میں
اشہے۔ تاثر کے ساتھ اس کے کلام میں سوز و نشتریت اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ پُر درد سُروں میں
کے ساز پر کچھ اس طرح چھیڑتا ہے کہ سننے والا بھی اپنے دل کے تاروں میں ارتعاش محسوس کرے۔

ہماری وہ چنچل سجانا کہاں — لگی چٹپٹی ہمسر پانا کہاں
مجھے اس سے دل توڑ کہتے ہیں لے — اسوں توڑ دل ہی لگانا کہاں

اس آفتاب باج مری انکھیاں تلیں — دستا ہے دیس آج شب تار کیا کروں

دوسرے دکنی شاعروں کی طرح غواصی نے بھی اپنے کلام میں ہندوستانی روایات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کی شاعری میں ہندوستانی
ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی تصوّرات، یہاں کے سبزہ و گل، مناظرِ فطرت اور رہن سہن کے مقامی طور طریقوں
کش تصویریں ملتی ہیں۔ اس کے ہاں یہ ہندوستانیت محض زبان تک محدود نہیں بلکہ اس کے خیال، سوچنے کے انداز اور
بیان میں بھی نمایاں ہے

اُردو کے اکثر غزل گو شاعروں کی طرح اس نے ہندوستان میں رہ کر شیراز و اصفہان کے راگ نہیں الاپے۔ اس کے کلام
لالہ زاروں وہاں کے پرندوں، دریاؤں یا قصوں کے حوالوں کی بجائے ہندوستانی پرندوں، جانوروں، یہاں کے موسموں،
سا وغیرہ کا ذکر جا بجا ملے گا۔ غواصی کی غزل میں ہندوستانی اقدار اور مقامی روایات کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اس کے بیش تر

اشعار میں حسن وعشق کے وہی مضامین اپنائے گئے ہیں جو ہندوستانی ذوق کے مطابق ہوں۔ حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں نہ صرف مقامی روایات کی ترجمانی کی گئی ہے بلکہ ان اشعار کے خالق کے طرز فکر اور حسن متخیلہ پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے

رنگ بھر یا سبج گھر میں آج آیا بسنت — غیب تھے نازا طرب لیا یا بسنت
درس تیرا سو دین کا دیوا — لٹ تری کفر کی ہے دیوالی
ملک دکھن میں حور تھے نادر ہوتوں بجا ہے کر — ہے بے نہایت اسے سکی ملک دکھن کوں آج فرح
حال یکساں نہیں کہ جیوں جمتا — گھہ بہوں پور گھہ اتر جاوں

غواصی کا محبوب ایک پیکر حسن وشباب اور نسوانی محاسن کا مجسمہ ہے۔ جس کی چلتی پھرتی پرچھائیاں اس کی غزل میں دکھلائی دیتی ہیں۔ غواصی نے محبوب کے لیے واضح طور پر تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے اور برملا انداز میں اس کو ناز، دھن، سکی، سندری، سجانا، موہنی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔

غواصی کو اپنی بلندیٔ فکر اور شاعرانہ کمال کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنے پیش رو یا ہم عصر دکنی شعرا میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ غزل گوئی کے میدان میں غواصی نہ صرف دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے بلکہ جدید غزل گو شعرا مومن، حسرت جگر اور فراق سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ اس کے کلام میں ایسے بیسیوں اشعار موجود ہیں جن میں اس نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور زمانے کی قدر ناشناسی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک بڑے فنکار کی طرح اپنے ہم عصروں سے اپنے فن کی داد چاہتا ہے۔

غواصی جوہراں جوتی تو لئی دھر تا جنوں میں آ — کہاں وہ جوہری پارکھ جو پرکھے جوہراں میرے
جکوئی عارف کے صاحب ہیچ ہیں سو کہتے ہیں یوں — کہ یاں تو کوئی نہیں دستا غواصی کے قرینے کا

مملکت گولکنڈہ کا ساتواں تاجدار سلطان عبداللہ اردو اور فارسی کا ایک خوش گو شاعر تھا۔ اس کو شعر وادب کا چسکا اور اہل علم وادب ہنر کی سرپرستی ورثہ میں ملی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ اور اس کے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طبیعت ومزاج میں کئی امور مشترک ہیں۔ دونوں نہ صرف یہ کہ بلند پایہ شاعر، علم وادب کے رسیا اور فنون لطیفہ کے مداح تھے بلکہ دونوں عورت اور شراب کے دلدادہ بھی تھے طبیعت اور مزاج کی اسی مناسبت کی وجہ سے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ادبی اور تمدنی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ میں وہی ماحول پیدا ہوگیا تھا جیسا کہ محمد قلی کے دور میں موجود تھا۔

عبداللہ قطب شاہ کا مکمل دیوان ہنوز دریافت نہیں ہوا ہے اس کا موجودہ دیوان ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں صرف ردیف "ت" تک ۷۹ غزلیں اور ایک مرثیہ شامل ہے۔ سادگی وپرکاری اور بے ساختگی وبرجستگی عبداللہ کی غزل کی اولین خصوصیت ہے اس نے اپنے سیدھے سادے مشاہدات، احساسات اور تجربات زندگی کو سیدھے سادے الفاظ اور رواں پیرایہ بیان میں پیش کیا ہے۔ اس کے کلام میں نہ محمد قلی کی سی رنگارنگی، شوخی، شگفتگی اور رعنائی ہے اور نہ غواصی کی طرح تجربہ کی تہہ داری اور جذبات کی گہرائی۔

سراپا نگاری، وصل محبوب، شراب اور عورت کے مختلف اعضا کی تصویر کشی سلطان عبداللہ کی غزل کے خاص موضوعات ہیں۔ اس کا تمام دیوان محبوب کے حسن وجمال، قد وقامت، رفتار وگفتار، لب ورخسار اور چشم وابرو کی تعریف وتوصیف سے بھرا پڑا ہے اس نے اپنی غزلوں میں محمد قلی کی طرح محبوب کا سراپا بیان کیا ہے۔ عبداللہ کی سراپا نگاری میں محمد قلی کی سی جزئیات نگاری، رنگارنگی اور تنوع تو نہیں لیکن اس کے ہاں چلبلاہٹ، شوخی، عورت کے مختلف اعضا سے لطف اندوزی اور چھیڑ چھاڑ کا احساس نہیں ہوتا۔

موہن مدن مستی نے پہنی ہے پھول مالا یا چاند کے گلے میں حلقہ ہو آ ہے ہالا
لٹ بیل ہے بنفشہ انکھی ہے ٹیک نرگس مکھ پھول سیوتی کا رخسار جیوں ہے لالا
مکھ نور کا دریا ہے بھویاں سوتل میں کالے انکھیاں تیریاں ہیں مچھلیاں سنگے سوتا اجالا
صدقے نبی کے بھایا عبداللہ شہ کے من کون
تیرا یو ناز غمزہ تیرا یو چھند چالا

غزل میں ہندوستانی ماحول اور روایات کی ترجمانی دکنی شعرا کا اہم کارنامہ ہے دیگر دکنی شعرا کی طرح عبداللہ کی غزل بھی مقامی ماحول اور مقامی تہذیب و تمدن کی غمازی کرتی ہے۔ اصلیت، واقعیت اور حقیقت پسندی اس کی غزل کی نمایاں خصوصیت ہے اردو شاعری پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ہندی نژاد ہونے کے باوجود ہندوستانی رنگ روپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس کے سارے قدوخال ایرانی ہیں اس کی نہروں میں دجلہ و فرات کی روانی ہے اس کی عشقیہ داستانیں شیریں فرہاد کے افسانے سناتی ہیں، اس کے باغوں میں قمری و بلبل نغمہ سنجی کرتے ہیں، اس کی بہار لالہ و گل کھلاتا ہے غرض اس کی تمثیلات، تشبیہات، تلمیحات اور شاعری تمام عناصر عجمی ہیں۔ یہ خیال ۱۷۰۰ء کے بعد دہلی اور لکھنؤ میں نشوونما پانے والی شاعری کی حد تک درست معلوم ہوتا ہے لیکن دکنی شعرا اس خصوص میں کافی حقیقت پسند اور صحت مند نقطۂ نظر کی غمازی کرتے ہیں۔ عبداللہ کے کلام میں ہندوستانی فضا، ہندوستانی دیو مالا اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کی مکمل ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کی غزلوں میں بسنت رُت، مرگ اور نوروز بھی ہے اور رام کا بان، بن باس اور راجہ اندر کے اکھاڑے کی اپسرائیں، منیکا، اروشی اور رنبھا بھی، کوئل کی کوکو بھی ہے اور پپیہے کی پیہو پیہو بھی۔ بھنورا اور کنول بھی ہے چمپا اور چمیلی بھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر اک تیرا پلک ہے رام کا بان ہر اک سوکا ہے تیرا جیوں کٹارا
بسنت آیا کھلایا پھول لالا سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
کنول تو چن کنول جو بن، کنول من کنول ایسی نول نے آیا کھلایا
مین کا رنبھا اربس آ کے ناچیاں تو ہا ہا و ہو ہوتے مندل بجاتا

عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ غیر مردف غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پیشرو شعرا مثلاً محمد قلی، غواصی یا وجہی کے ہاں یہ رجحان بہت کم پایا جاتا ہے۔ عبداللہ کے دیوان کی مجموعہ ۹۷ غزلوں میں سے ۵۶ غزلوں میں ردیف کا اہتمام روا نہیں رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی بیشتر غزلیں غیر مردف ہیں لیکن اس نے نہ صرف یہ کہ قافیہ کی مدد سے غزل کا جادو جگایا ہے بلکہ موسیقی کا احساس پیدا کرنے کے لیے متعدد غزلوں میں چار چار یا اس سے زاید قافیے استعمال کیے ہیں مثلاً

چند کلا تیرا گلا ہے نرملا اجکلا سورج جھلا کے مبتلا کیا گلا دو نرملا
نین میں لا تو کاجل بتایلا نکو کھلا لٹ اچپلا ہوں ہلاکہ چلبلا ہے دو بلا
مراد لا ہے باولا الا بلا منے بلا جو مد پلا تجے گلا لیوں بھلا سے چنچلا
نبی کے صدقے عبد لا کدم کلا سنے کوں لا تجے بلا لیا ملا منگل گلا چند کلا

محمد قلی قطب شاہ کی طرح عبداللہ کو بھی حضرت محمد صلعم کی ذات اقدس سے بے پناہ عقیدت تھی محمد قلی کی طرح اس کی غزل کا ہر مقطع نبی کے صدقے

سے شروع ہوتا ہے۔ مقطعوں سے قطع نظر اس کے دیوان میں تین نعتیں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نبی کا "داس" اور "سیوکی" کہتا ہے۔ دنیاوی ترقی، شاہانہ وقار، شاعری میں جادو بیانی، عیش کوشی اور وصلِ محبوب کو بھی نبی کا صدقہ قرار دیتا ہے۔

شاہ عبداللہ جو ہے حضرت نبی کا سیوکی
ہر گھڑی صلوات بھیجے دیکھ کر تیرا جمال

صدقے نبی کے شوخ السحر شاہ عبداللہ جوگی سگھڑ
تج جو بناں کے دوتی گز خوش وست کر ملکا گیا

دبستانِ گولکنڈہ کے دیگر غزل گو شاعروں میں میراں جی خدا نما، احمد، ملک یزدی، ابن نشاطی، طبعی، اور شاہ ابوالحسن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعراء نے قطب شاہی سلاطین کے عہد میں غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں محمد قلی، یا غواصی کی طرح کوئی اہم رول انجام نہیں دیا بلکہ دیگر اصنافِ شعر کے ساتھ ساتھ دو ایک غزلیں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی حیثیت تبرک سے زیادہ نہیں ہے۔

(یومِ محمد قلی قطب شاہ کے ادبی جلاس میں پڑھا گیا)

(محمد قلی کی مذہبی پالیسی صفحہ ۲۰ سے آگے)

مختصر یہ کہ محمد قلی قطب شاہ کی مذہبی پالیسی رواداری، وسعتِ نظر اور رعایا پروری پر مبنی تھی۔ اس بادشاہ نے بھی مغلیہ خاندان کے عظیم حکمران اکبر کی طرح اس بات کو اپنا مطمعِ نظر بنایا کہ اس کی مملکت میں رہنے بسنے والے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو متحد کر کے انھیں ایک اکائی میں بدل دیا جائے۔ اکبر کے برخلاف محمد قلی نے جو راستہ اپنایا وہ زیادہ صحت مند تھا۔ نہ تو اس کا مذہب کبھی معارضِ بحث میں آیا نہ کبھی اس نے سماج کے کسی خاص گروہ یا طبقہ کی دل آزاری کی۔ نہ تو اس نے قوانینِ اسلام میں تجربات کیے اور نہ تو کسی نئے مذہب کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا مذہب اور اس کے عقیدے راز نہ رہے اس نے اپنے عقیدے کھلے دل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیے لیکن مذہبی جنون کی بنیادوں پر اس نے مذہبی پالیسی کو نہیں رکھا۔ اس نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے مذہبی رسوم اور اقدار کی جو عزت پیدا کی وہ اس کی مذہبی پالیسی کا بہت بڑا عطیہ ہے۔

(یومِ محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)

(اردو نامہ صفحہ ۳۴ سے آگے)

● انڈین رائٹرز کا ادبی و شعری اجلاس جناب طالب خوندمیری کی صدارت میں ہوا۔ انور سلیم اودے پوری مہمان خصوصی تھے۔ محسن جلگانوی نے جدید شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ رحمت سکندرآبادی کی صدارت میں سرز طالب خوندمیری، محسن، عزیز بھارتی، ناگپال عظیم، انور سلیم، شاغل ادیب، گوہر حاتمی، ساون لاہوتی، قاسم اثر، فاضل شاد، باسط پرواز اور رمیش چند شکل نے کلام سنایا۔

۳۱ جنوری: محفلِ خواتین کا ماہانہ اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خواتین اور ملازمت کے زیرِ عنوان مباحثہ ہوا۔ جس میں سلطانہ صاحبہ، عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید اور مظفر النساء ناز نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محترمہ انیس قیوم فیاض نے افسانہ سنایا۔ خواتین شعراء نے آخر میں اپنا تازہ کلام پیش کیا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید معتمد محفل خواتین نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

● ممتاز غزل گو شاعر حضرت شاہد صدیقی کی ۷ ویں برسی ۲۹ جنوری کو منائی گئی۔ برسی کے موقع پر فاتحہ و ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا۔

صادق نقوی

محمد قلی قطب شاہ کی مذہبی پالیسی

تاریخ عالم انقلابات سے عبارت ہے یہ انقلاب وجودِ آدم سے آج تک وقت کی تقدیر رہے ہیں ان کا مزاج اور ان کی وقت کے تقاضوں کی تابع رہی ہے یہ جس محور کے اطراف گھومتے ہیں اُسے ورقِ کائنات پر انسان کہا جاتا ہے ۔ لیکن انقلابات کا یہ انسانوں کے درمیان بھی دیواریں بناتا ، درجے مقرر کرتا اور اونچ نیچ کی حدیں بناتا ہے انسان ان حدود کے جس مثلث میں گردش کرتا اُس کا رقبہ اُس کے مرتبے اور سماج میں اس کی شخصیت کا تابع ہوتا ہے۔ اگر وہ انسانوں کے ایک گروہ پر جو مخصوص جغرافیائی حدود میں بستا اور تہذیب کے مشترک ڈوروں سے بندھا ہوتا ہے تو اُسے تاریخ کی زبان میں راجا، مہاراجا، شاہ ، بادشاہ ، عالیجاہ، شہنشاہ کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے اس صورت میں ایسے انسان کی حرکت کا رقبہ وسیع ہوتا ہے لیکن مثلث کے تینوں راس پھر بھی جوں کے توں باقی رہتے ہیں۔ یہ مثلث جن خطوط سے مل کر بنتا ہے وہ اس کا سماجی ضرورت، سیاسی تقاضے اور مذہبی عقائد ہیں ۔ اس لیے بادشاہ کی مذہبی پالیسی کا مطالعہ ان ہی خطوط پر ممکن ہوسکتا ہے۔

بادشاہ کی شخصیت جن اجزا سے مرکب ہوتی ہے ان میں سیاست کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا ہے کبھی کبھی بلکہ اکثر یوں ہوتا ہے کہ شخصیت کے دوسرے تقاضے اس کے سامنے قریب قریب مفقود ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں مذہب اور مذہبی پالیسی سیاست کا ایک جزا اور ضرورت بن جاتی ہے ۔ اقتدار کا حصول اور اس کی حفاظت کے آگے مذہب کا تصوّر ذیلی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ تاریخ کا بڑا حسین اتفاق ہے کہ ۱۶ ویں صدی کے اواخر سے ستر ہویں صدی کے ابتدائی دوَر تک شمال اور جنوب کے حکمرانوں نے مذہبی پالیسی کو بڑی اہمیت دی۔ مغل سلطنت کے عظیم حکمران جلال الدین اکبر (۱۶۰۵ - ۱۵۴۲) اور قطب شاہی خاندان کے محمد قلی قطب شاہ (۱۶۱۲ - ۱۵۸۰) اور عادل شاہی خاندان کے ابراہیم عادل شاہ کی پالیسیوں میں خاص طور پر مذہبی پالیسی بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ تینوں ہم عصر تھے اس لیے تاریخ کے طالب علم کے لیے ان کی مذہبی پالیسیوں کا تقابلی مطالعہ اُس دوَر کے تقاضوں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ چوں کہ میرا یہ مضمون محمد قلی قطب شاہ کی مذہبی پالیسی کے جائزہ کی ایک کوشش ہے اس لیے میں اس تقابل کو اکبر اور محمد قلی تک محدود کر رہا ہوں لیکن اس تقابل کا مقصد کسی بادشاہ کی عظمت اور مقام کا تعین نہیں ہے بلکہ یہ اُس دوَر کے تقاضوں کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ہندوستان اس دوَر میں دو مختلف تہذیبوں کے درمیان منقسم تھا۔ اس کے باوجود سارے ہندوستان کی مسلم مملکتوں کی

سب سے بڑی ضرورت بکھرے ہوئے سماج کو متحد کرکے اُسے ایک اکائی میں تبدیل کر دینا تھا۔ یہ بات بہر حال ماننی ہوگی کہ تاریخ کے ہر دَور میں اور ہندوستان کی ہر حکومت میں چاہے وہ مسلمانوں کی ہو یا ہندوؤں کی ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت رہی ہے۔ بارہویں صدی سے شمال میں مسلم حکمرانوں کی سلطنتوں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا خاندانِ غلامان، خلجی، تغلق، سیّد اور لودھی خاندانوں نے ایک کے بعد ایک ہندوستان میں اپنی سلطنتیں قائم کیں۔ سلطنتیں بنی بھی اور ٹوٹ بھی گیئں۔ حکمران آئے بھی اور چلے بھی گئے لیکن ان سلطنتوں میں رہنے بسنے والے غیر مسلم رعایا نے ان تبدیلیوں میں نہ کوئی حصہ لیا اور نہ ان تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر ہوا۔ مختصر یہ ان لوگوں کی وفاداریاں ان سلطنتوں کے ساتھ کبھی بھی نہ رہیں۔ ہندوستان میں پہلے دو مغل حکمرانوں کے دَور میں بھی یہی حالات جوں کے توں قائم رہے۔ اکبر ہندوستان کے مسلم حکمرانوں میں کئی ایک حیثیتوں سے منفرد ہے۔ اس نے سب سے پہلے اس بات کو محسوس کیا اور اس کمی کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن یہ کام کچھ اتنا آسان بھی نہ تھا۔ اکبر نے جو راستہ اپنایا اُسے چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اُس نے اسلام کے کچھ اصولوں کی قربانی دی، جین، عیسائی اور پارسی مذاہب کے کچھ اصولوں کو اپنایا۔ مسلمانوں کے اُس گروہ کی دل آزاری کی جو علما کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کو رعایتیں اور سہولتیں بخشیں۔ اُس کا یہ سفر ۱۵۷۵ء میں عبادت خانے کی تعمیر سے شروع ہوا، اور "دینِ الٰہی" کے اعلان پر آکر ختم ہوا۔ اگرچہ اکبر اعظم کا اپنا ایجاد کردہ 'مذہب' تاریخ کا اس دَور کا ایک مذاق بن گیا لیکن اُس کی مذہبی پالیسی اس حیثیت سے کامیاب تھی کہ اُس نے غیر مسلموں کو خاص طور پر راجپوتوں کو مغلیہ تخت و تاج کا وفادار بنا دیا۔ اکبر کا مذہب آج ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے۔ اسمتھ (SMITH) نے کئی مقامات پر یہ بات اصرار کے ساتھ لکھی ہے کہ اکبر مسلمان باقی نہ رہا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"AS EARLY AS THE BEGINING OF 1580 AKBAR HAD REJECTED ISLAM." (1)

اور ایک مقام پر لکھتا ہے :۔

"IT IS ADMITTED THAT HE DISCARDED THE CEREMONIAL OF THE PROPHET O RELIGON. AFTER A SHORT SPACE OF FIVE OR SIX YEARS (FROM 1575) ON WARDS NOT A TRACE OF MOHAMMADAN FEELING WAS LEFT IN HIS HEART" (2)

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے تاریخ دانوں کا ایک بڑا طبقہ اس خیال سے اختلاف رکھتا ہے مثلاً "آر۔ پی۔ ترپٹھی (R. P. TRI PATHI) اپنی کتاب RISE AND FALL OF THE MOUGAL EMPIRE میں اکبر کے مسلمان باقی رہنے اور مرنے کا یقین دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

WHAT EVER MIGHT HAVE BEEN THE IMPRESSION OF JESUIT FATHERS AND THE RUMOURS CURRENT AMONG SOME CLASSES OF PEOPLE, THERE IS NO DOUBT THE AKBAR LIVED AND DIED A MUSALMAN (2)

AKBAR THE GREAT, VINCENT. S.A. SMITH. PAGE NO 212 (1)

RISE AND FALL OF THE MOUGAL EMPIRE. R.P. TRIPATHI - PAGE NO 285. (2)

مجھے اس مضمون میں ظاہر ہے اکبر کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے پر بحث نہیں کرنی ہے میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اکبر نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جو راستہ اپنایا اس پر چل کر خود اس کا اپنا مذہب اور اس کے عقیدے زیر بحث آ گئے۔ تقریباً کچھ ایسے ہی مسائل محمد قلی کے سامنے بھی تھے جب وہ تخت نشین ہوا۔ دکن کا معاشرہ بڑا پیچیدہ تھا جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف ملکوں کے افراد، مختلف تہذیبوں کے لوگ بستے تھے۔ محمد قلی کے سامنے بھی وہی سوال اہمیت رکھتا تھا جس پر اکبر نے اپنی توانائی صرف کی تھی۔ معاشرے کو متحد کرنا اور سماج کو ایک اکائی کی شکل دینا یہ اس کی سیاسی ضرورت بھی تھی اور سماجی بھی۔ محمد قلی جس آغوش میں پلا بڑھا ہوا اور اس نے جس ماحول میں تربیت پائی تھی اس کی خصوصیت وسیع النظری اور مذہبی رواداری تھی۔ امن اور شانتی قطب شاہی بادشاہوں کا آئین تھا اس درسگاہ میں محمد قلی کو ایک اور خصوصیت ملی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے کلیات محمد قلی میں ماہ نامہ کے مصنف کے حوالے سے لکھا ہے کہ ممکن ہے محمد قلی کی ماں بھاگ رتی یا یک تلنگن ہی ہو (۱) اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد قلی کو بچپن ہی سے ہندو مسلم ماحول میں پرورش پانے کا موقع ملا۔ مذہبی رواداری اس کے تحت الشعور کا حصہ بن گئی۔ لیکن محمد قلی کی کچھ اور مشکلیں تھیں جو شمالی ہند کے کسی بادشاہ کے حصے میں نہیں آئیں۔ دکن کا معاشرہ صرف مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان منقسم نہیں تھا بلکہ مسلمان بھی شیعہ اور سنی میں تقسیم تھے۔ شیعوں کی بڑی تعداد ان غیر ملکیوں پر مشتمل تھی جو ایران اور اس کے آس پاس سے ہندوستان آئے تھے۔ سنیوں میں اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جن کا وطن ہندوستان تھا۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ جہاں کہیں ان دونوں فرقوں کے درمیان کسی بھی مسئلہ پر اختلاف رائے ہوا ہے تو اس اختلاف کو فرقوں کے تضاد اور عقائد کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے کچھ یہی حال محمد قلی کے دور کی تاریخ لکھنے والوں کا ملتا ہے۔ محمد قلی کے خلاف ہونے والی بغاوتوں، تخت و تاج کے حصول کی کوششوں، قیام امن کے [illegible] کو صرف ایک [illegible] کے سپرد کر دیا گیا۔ عقائد کا اختلاف [illegible] لیکن کھلے ذہن سے تاریخ اور واقعات کا مطالعہ محمد قلی پر لگائے گئے اس الزام کی بڑی حد تک نفی کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے اور ایسا ہر دور اور ہر بادشاہ کی حکومت میں ہوتا رہا ہے کہ بادشاہ کا اپنا مذہب، اس کے اپنے عقیدے، اس کی سلطنت میں اہمیت اختیار کر لیتے تھے۔ چونکہ بادشاہ کی شخصیت سہارا ہوتی [illegible] بادشاہ ہوتا تھا اس لیے بادشاہ کا ہر عمل ظاہر کیا جاتا۔ تاریخ کے اوراق سے کئی ایک مثالیں میری اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جب بادشاہ بدھ مذہب کا ماننے والا رہا تو اس کی مملکت میں بدھ مذہب کا چرچا رہا۔ بادشاہ کے اپنے عقیدے شہرت پا کر عوام میں رائج ہوئے۔ جب بادشاہ ہندو مت کا پیرو رہا تو ہندو مذہب کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ مندر بنے، مذہبی تعلیم کو مضبوطی ملی۔ جب بادشاہ سنی عقیدے کا ماننے والا رہا تو وہی عقیدے اور اسی مذہب کے آئین سلطنت کا قانون بن گئے۔ اگر یوں ہی محمد قلی نے اپنے مذہب اور اپنے عقیدے کا پرچار کیا ہو یا اپنے مذہبی رسومات پر سختی سے عمل کیا ہو تو اسے تنگ نظر بادشاہ یا متعصب کہنا کسی صورت سے بھی جائز قرار نہیں پا سکتا۔ ورنہ محمد قلی پر لگائے گئے الزام کی زد میں اشوک، سمندر گپت، فیروز تغلق، اورنگ زیب اور شیواجی اور دوسرے کئی ایک [illegible] بھی آ جائیں گے۔

محمد قلی کو حصول سلطنت کے لیے خاصی جد و جہد کرنی پڑی۔ اس کے سامنے بھی تین قوتیں تھیں۔ سنی، شیعہ اور ہندو۔ ان میں

---

(۱) زور، ڈاکٹر محی الدین قادری — کلیات محمد قلی — ص ۳

سے دو کی مدد محمد قلی کو دستیاب تھی اور وہ تخت پہ آ گیا ظاہر ہے تیری قوت نے کم از کم شروع میں اپنے اقتدار کے حصول کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کوشش جسے یقیناً مذہب کی آڑ میں ظاہر ہونا تھا۔ اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ محمد قلی کی شیعیت کے خلاف بغاوت کی گئی۔ جن دو بغاوتوں کا تاریخ میں واضح ذکر ملتا ہے وہ اس کے بڑے بھائی عبدالقادر عرف شاہ صاحب اور اس کے حقیقی بھائی خدابندہ کی ہیں۔ ان دونوں بغاوتوں میں سنی علما اور مشائخین نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ لیکن ظاہر ہے یہ بغاوتیں حصولِ اقتدار کی کوششیں تھیں دونوں باغیوں نے حصولِ تخت کی کوشش کی۔ محمد قلی کے مذہب کو مسئلہ نہیں بنایا اب ان کا ساتھ دینے والے جیسے کہ میں اوپر کہہ آیا ہوں وہی تھے جنھوں نے محمد قلی کی تخت نشینی کے وقت مخالفت کی تھی۔

محمد قلی کی مذہبی رواداری کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ سیاسی مجبوری کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس نے نہ اپنے عقیدوں کو چھپایا نہ اپنے مذہب پر مصلحت کی چادر ڈالی۔ نہ اس نے اکبر کی طرح مذہب کے اصولوں کو تجربات کی سولی پر چڑھایا اور نہ نئے اختراعات کیں۔ اس کی یہ عملی دیانت داری اس کا سب سے بڑا شرف تھا۔

اس کا اپنا مذہب کچھ بھی رہا ہو اس نے کبھی کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو مذہبی بنیادوں پر نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ بات یہاں مجھے آپ سے عرض کرنا ہے کہ عام طور پر جسے مذہب کہا اور کہا جاتا ہے دو اجزا سے مرکب ہوتا ہے ایک ہے قانونِ مذہب اور دوسرا ہے تہذیبِ مذہب۔ جیسے خدا کو واحد ماننا، رسول کی رسالت کا اقرار، نماز، روزے اور زکوٰۃ کے احکام قانونِ مذہبِ اسلام کی تعریف میں آتے ہیں۔ قانونِ مذہبِ اسلام میں ردّ و بدل یا مسلمانوں کو اُن پر عمل کرنے سے روکنا مذہبی تعصب کہلاتا ہے۔ رسوم و روایات یا لباس کی تبدیلی تعصب کی تعریف میں نہیں آتی اس لیے کہ یہ سماج، وقت اور تقاضوں پر منحصر ہوتی ہے۔

اب آپ اس معیار کو سامنے رکھ کر محمد قلی کی تاریخ پڑھیے کہیں بھی ہمیں یہ نہیں ملتا کہ محمد قلی نے اکبر کی طرح قانونِ اسلام میں ردّ و بدل کیا ہو بلکہ یہاں تک پالیسی کا تعلق تھا اس کے دور میں مکمل مذہبی آزادی تھی۔ پروفیسر ہارون خاں شیروانی اپنی کتاب HISTORY OF THE QUTBSHAHI DYNASTY کے صفحہ ۳۰۰ پر لکھتے ہیں۔

> "THE WHOLE OUTLOOK OF THE STATE AS CENTERED IN THE PERSON OF THE SULTAN WAS NON COMMUNAL"

صفحہ ۲۹۸ پر پھر اسی خیال کو دہراتے ہیں۔

> "THERE WAS COMPLETE RELIGIOUS FREEDOM AND BOTH HINDUS AND MUSLIMS COULD ATTAIN THE HIGHEST OFFICE IN THE STATE AT THE BIDDING OF THE SULTAN."

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "وہ عمر بھر وسیع المشرب رہا، سنیوں، شیعوں اور ہندوؤں سب کو برابری کی نظر سے دیکھتا تھا۔" (۱)

محمد قلی کی مذہبی پالیسی کا یہ المیہ ہے کہ اکثر مورخوں نے بادشاہ کے اپنے مذہب اور اس کی مذہبی پالیسی کو خلط ملط کر دیا ہے

---

(۱) زور، ڈاکٹر محی الدین قادری کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ ص ۹۳

شاہ کا اپنا مذہب اس کے عقیدے اور نظریے، اُس کی اپنی شخصی آزادی کے ضمن میں آتے ہیں لیکن اس کا اپنا مذہب ضروری نہیں ہے اس کی مذہبی پالیسی کا معیار بنے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ پالیسی اُس کے مذہب کا اثر رکھتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محمد قلی کی تاریخ سے ان دونوں چیزوں کو علاحدہ علاحدہ کرکے پڑھا جائے۔ وہ شخصی اعتبار سے مذہبِ اثنا عشری کا پابند تھا۔ زندگی بھر اپنے کو غلامِ علی وابستۂ اہلِ بیت کہتا رہا۔ اُس کی شاعری میں کئی مقامات پر اسی بات کا اقرار ملتا ہے لیکن ان اشعار کو اُس کی مذہبی پالیسی کے اظہار کا ذریعہ سمجھنا اور ان کے معیار پر پالیسی کے خطوط مقرر کرنا غلط ہے۔

محمد قلی کی مذہبی پالیسی اُس کی زندگی کے اُن کارناموں سے مرتب کرنی چاہیئے جن پر محمد قلی نے اپنی حکومت کی اساس رکھی۔ اُس کا عمل اس کی پالیسی کے اظہار کا ذریعہ تھا۔ اور جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے محمد قلی نے وسیع النظری، مذہبی رواداری، امورِ رعایا پروری کے اصولوں پر اپنی حکومت کی اساس رکھی۔

قطب شاہی سلاطین میں وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے ہندوستانی تہذیب کو گلے لگایا۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ "محمد قلی اور اس کے معاصرین اکبرِ اعظم اور ابراہیم عادل شاہ نورس ہندوستانیت کی طرف اتنے مائل ہوئے کہ یہاں کی تہذیب و معاشرت تک اختیار کر لی اور ایک مخلوط (ہندو + مسلمان) ثقافت کے بانی ہوئے جو ان کی زندگیوں تک پورے عروج پر رہی (۱) اس نے ہندوستانی طرز کا لباس اپنایا (۲) ہندوستانی تہذیبی اقدار کو قبول کیا۔ ہندوستانی تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ محمد قلی اور اکبر کی مذہبی پالیسیوں کا فرق یہ ہے کہ جہاں اکبر نے مذاہب کے قوانین میں تلاشِ حق کی اور مذاہب کے قانون کو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو متحد کرنے کا ذریعہ سمجھا وہاں محمد قلی نے مذاہب کے قوانین میں داخل اندازی نہیں کی اس نے مذاہب کی تہذیبی قدروں کو اپنایا۔ اس کے کلیات میں بسنت یا وسنت .. ہندوؤں کی عید سے پر (۹) نظمیں ملتی ہیں۔

محمد قلی نے جس طرح غیر مسلموں کے تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اسی طرح اس نے مسلمانوں کا خاص طور پر عاشور خانوں میں اُن تہذیبی اقدار کو فروغ دیا جن میں غیر مسلموں کے حصہ لینے سے قانونِ مذہب پر کوئی آنچ نہ آ سکتی تھی۔

عاشور خانے محمد قلی قطب شاہ کا سب سے اہم (INSTITUTION) تھا جن کے ذریعہ محمد قلی نے مختلف مکاتیبِ خیال رکھنے والوں میں اتحادِ عمل کی روح پھونکی۔ عاشور خانے کے رسوم اور روایات کی اہمیت یہ تھی کہ ان کو مسلم چاہیئے وہ شیعہ ہوں کہ سنی۔ اور ہندو سب کے سب خلوص و عقیدے سے پیدا کر سکتے تھے۔

عاشور خانوں کی مذہبی اہمیت ظاہر ہے اور مجھے یہاں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے لیکن عاشور خانوں کی سماجی اور اقتصادی اہمیت جسے بہت زیادہ نظرانداز کر دیا گیا ہے قابلِ توجہ ہے۔ عاشور خانہ اور عاشور خانے کے رسوم کی ابتداء حکومت قطب شاہیہ کے ساتھ ہی ہوئی۔ محمد قلی کے دور میں ان کو زیادہ بڑھاوا ملا۔ نظام الدین احمد نے حدیقۃ السلاطین میں صاف لکھا ہے "رسمیت قدیم و قانونیت قلیم از ابتدائی سلطنت خاندان عالیہ قطب شاہیہ خصوصا از زمان خاقان جنت بارگاہ محمد قلی قطب شاہ سعادت .... و مرسوم است (۳)

---

(۱) ایک مقدمہ، کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ ص ۲۲
(۲) " " " " " ص ۲۴
(۳) نظام الدین احمد حدیقۃ السلاطین " ۴۱

عاشور خانے کی مجلسیں اور تعزیہ داری شیعوں کے لئے مخصوص رہی ہوں گی لیکن عاشور خانے کی عظمت اور عاشور خانوں کے دوسرے رسوم میں ہر مذہب و ملت کے افراد کی شرکت تاریخ سے ثابت ہے بلکہ آج تک قطب شاہی دور کے مقرر کیے ہوئے یہ اقدار باقی ہیں ڈاکٹر شیر اوفا اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"IT HAS NEVERTHELESS LEFT AN INDELIANLE MARKS IN THE LIFE AND CUSTOMS OF DECCANI'S HINDU 'MUSLIMS WHETHER SHIA OR SUNNI ①

عاشور خانوں کے باہر جو رسوم و رواج عام ہوئے اُن میں سے قریب قریب سارے رسوم کا مزاج ہندوستانی ہے۔ یہ رسوم دکن میں رہنے بسنے والوں کے مزاج کے عین مطابق تھے مثلاً محرم میں رنگ اور مختلف بھیس اختیار کرنے کی رسم جو غیر مسلموں میں خاص عام تھی۔ مرہٹہ تہذیب سے لی گئی تھی۔ محرم کے رسوم، عقیدت کا اظہار صرف کسی ایک خاص طبقہ کا ورثہ نہیں تھیں۔ محرم کی خاص خصوصیت جو عہد قطب شاہی کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ یہ تھی کہ ان دس دنوں میں سارے تفریقے اور سماج کے مختلف طبقات کے درمیان کھینچی ہوئی دیواریں خود بخود ٹوٹ جاتی تھیں۔ اور یہ رسوم امیر و غریب، ہندو و مسلمان، شیعہ اور سنی ہر کس و ناکس کے لیے مشترک بن جاتے تھے۔

محمد قلی کا مطمح نظر سماج کو متحد کرنا تھا۔ اُن میں مذہب اور فرقوں کے فرق سے پیدا ہونے والی نفرت کو مٹانا تھا۔ اور یہ مقصد عملی طور پر اُسے اِن دنوں اور اِن رسموں کے توسط سے یقینی طور پر حاصل ہوا۔

غلام امام خان (تاریخ رشید الدین خانی ص ۲۱۴) میں اس خیال کو یوں لکھتے ہیں۔ "کہ محرم کے دوران ہر فرد وہ شاہ ہو کہ گدا، شیعہ ہو کہ سنی، مسلمان ہو کہ ہندو و لنگر کی رسم اپنے حوصلے کے مطابق بجا لاتا تھا۔"

ڈاکٹر زور نے بھی حیات میر مومن میں قریب قریب یہی بات دُہرائی ہے محمد قلی کی مذہبی پالیسی کے خطوط اُس کی عملی زندگی سے اجاگر ہوتے ہیں اُس کی رواداری عملی روپ میں ظاہر ہوئی۔ اکبر کی طرح محمد قلی قطب شاہ نے اپنے نظم و نسق میں غیر مسلموں کو نہ صرف اُن کا حق دیا بلکہ انھیں اعزاز عطا کر کے اس بات کو ظاہر کیا کہ اُس کی پالیسی حق دار کو حق پہنچانے پر مشتمل ہے اور مذہب و عقیدے کا فرق اس سلسلے میں رکاوٹ نہیں بنا۔ آسیراو، دھرمارا، مجلیت راؤ، سری راؤ، ساباجی وغیرہ کتنے ہی غیر مسلم تھے جو نظم و نسق کے ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور تھے۔ اسی طرح سنی امرا کی بھی ایک خاصی تعداد تھی جو نظم و نسق میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہی۔ اس لیے یہ کہنا کہ محمد قلی کے نظم و نسق میں صرف اور صرف ایرانی شیعہ عہدہ دار تھے تاریخ کو جھٹلانا ہے۔

محمد قلی کی مذہبی رواداری کا ایک بیّن ثبوت اُس کی عطا و سخا میں وسعت نظری سے ملتا ہے اُس نے عطا اور سخا کے باب میں ہندو مسلم، سنی شیعہ کا کبھی فرق روا نہ رکھا۔ اُس کا نصب العین رعایا کی بھلائی رہا۔ حق داروں تک حق پہنچانا اور کسی امتیاز کے بغیر سماج کے بچھڑے، غریب لوگوں کی مدد کرنا محمد قلی کی زندگی کا اصول رہا۔ اُس کا سخا کا سمندر خاص طور سے محرم میں امڈ کر آتا تھا۔ لیکن عاشور خانوں سے ملنے والی امداد میں مذہب کی تفریق روا نہ رکھی جاتی تھی۔ خواجہ غلام حسین (گلزار آصفی) اور نظام الدین احمد نے (حدیقۃ السلاطین ص ۵۸) یہ ... بلفظ ... محرم کے دس دنوں میں ... امداد صرف مسلمانوں کے لیے نہ تھی بلکہ غیر مسلم بھی یہ امداد پاتے تھے۔

(باقی صفحہ ۱۴۲ پر دیکھیے)

① HISTORY OF QUTUB SHAHI DYNASTY PAGE 43

آمنہ انصاری

پیا باج پیالہ

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

سچ مچ دیوانے کو بھلا کون پند دے سکتا ہے اور دیوانہ بھی وہ کہ جس نے محبت کی چاندنی میں دامن سے گریبان تک پھیلے جانے کتنے کتنے ارمانوں ... ے کیے، یہ محبت بھی کتنی عجیب شئے ہوتی ہے کہ جب زندگی کے افق پہ طلوع ہو تو سات رنگوں کی چھوٹ سے زمین آسمان سب جگمگا اٹھیں یہ محبت کے رنگ، یہ عشق کی کرنیں، یہ چاہت کی سحر ناکی — قطب شہہ دیوانہ نے کتنے برس بیتے کہ قلعہ کے دامن میں سرد پتھروں کی آغوش میں جا سویا۔ لیکن اس کا یہ گیت، یہ آواز، یہ لے اب تک بھی اسی طرح زندہ ہے اسی طرح پُر اثر، اسی طرح دل میں اتر جانے والی، یہ البیلا نغمہ نہ جانے کیا کیا یاد دلا رہا ہے۔ میرے سامنے دور تک پھیلی ہوئی سڑک ہے، یہ کسی سہاگن کی مانگ کی طرح خوب صورت، چاندنی رات میں کندن کی طرح دمکتی ہوئی۔ اونچی نیچی چٹانیں بیچ بیچ میں۔ گھنے دھن مڑیوں کے سبز مخملیں پیوند — قلعہ کی فصیل کے نیچے تالاب کا پانی پگھلی ہوئی سیم کی طرح چمک رہا ہے۔ قلعہ، یہ فصیل، یہ کنگورے، یہ فتح دروازہ جس کے ماتھے پر لگی ہوئی مضبوط کیلیں اب بھی دشمن کا سینہ چھید ڈالنے کے لیے تیار نظر آتی ہیں۔ دونوں دروازوں کے درمیان خطرناک موڑ۔ لوہے کی مضبوط توپیں، پرانی قرابینیں اور سامنے پھیلا ہوا میدان۔ میرے اطراف ٹوٹے ہوئے کنگورے ہیں بند دروازے، پتھروں کے ڈھیر اور دور سے جیسے کوئی آواز دے رہا ہو سے

ان ہی پتھروں پہ چل کے جو تم آ سکو تو آؤ — میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

یہ پتھروں کا دیس ہے یہ نیلم و گوہر کی بستی ہے یہ میرا وطن ہے یہ قطب شہہ کی نگری ہے دیکھو قلعہ کی فصیل پر کیسے چراغاں ہو رہا ہے سناٹے کیسے بول رہے ہیں ذرا غور سے سنو، یہ پتھر میرے دل کی طرح دھڑک رہے ہیں۔ یہیں کہیں وہ رہتا تھا وہ سانولا سجن، من کا پیارا، وہ سیدھا قد چھریرا بدن، پتلی لمبی ناک ذرا چوڑا دہن، پتلے پتلے ہونٹ، ترشی ہوئی مونچھیں باریک قلمی بھوئیں، نشہ میں مست آنکھیں، ململ کا جامہ، شبنم کا نیمہ پیرہن، آپا شاہی جوتی، گلے میں کپڑا ڈالے وہ بھاگ رتی کا بیٹا، وہ قرا تو نیلو کا وارث وہ وہاں بالا حصار کی کھلی چاندنی پر وہی تو ہے اسی کے لیے تو فضا اتنی حسین ہو گئی ہے۔ سنو وہ گھنگھرو چھنک اٹھے۔ وہ کسی کی

پشوانہ بھرا کر چاندنی کے کنول برسانے لگی وہ تاروں پہ رقص شروع ہوا۔ مستی ہی مستی سرور ہی سرور کہ ؎

بشر مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست

آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

اور قطب شاہ نے جام پر جام لنڈھانے شروع کئے۔ اس کے پہلو میں چاند جمع ہوتے رہے۔ وہ دیکھو شمع کی لو کی طرح کپکپاتی انگلیوں میں پیالہ تھامے کون اسے مخمور نگاہوں سے تک رہا ہے یہ کس کے یاقوت کی طرح دمکتے ہونٹ ہیں کہ قطب شاہ کو لب بہ لب حکایتیں سنا رہے ہیں۔ یہ رخسار کہ جن میں بجلیاں پس کر گھلی ہیں یہ آنکھیں کہ جن میں موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں یہ پیشانی جس کی دمک نے ہیروں کو ماند کر دیا یہ زلفوں کی گہری گھٹا یہ مواج سمندر کہ جس کی سیاہ گرم لہروں میں معانی نے اپنا چہرہ دھو لیا ہے۔ ہاں یہ بھاگ متی ہی تو ہے اس کی محبوب، اس کی معبود، بچپن کی رقاصہ کہ جس کی پائل کی جھنکار پہ قطب شاہ کے دل کی نگری ڈول اٹھی۔ کتنی عجیب تھی یہ داستانِ حسن و وفا۔ اس دنیا میں جانے کتنے ہی لوگ آئے کتنے ہی چلے گئے۔ کتنی محبتیں تھیں جو فنا ہو گئیں، کتنے دل تھے جو زمانے کے قدموں تلے ذرہ ذرہ ہو کر کھو گئے۔ کتنے پھول جیسے چہرے تھے جو خاک کے تودوں میں جا چھپے۔ لیکن وہ آگ کہیں نہیں بجھی۔ محبت کا آتش کدہ جو آدم نے روشن کیا تھا مسلسل شعلے بھڑکاتے رہا۔ آگ جلتی رہی، دھواں اٹھتا رہا اور دھوئیں کی ان لکیروں نے جو پیکر تراشے وہ محبت کے آتش کدہ کی پتھریلی دیواروں پر ہمیشہ کو کندہ ہو کر رہ گئے قطب شاہ کے عشق نے جو اُجالا پھیلایا۔ وہ آج جگمگاتی کہکشاں کا روپ دھارن کر گیا یہ نگری کہ جس کی بنیاد کا پہلا پتھر عشق تھا آج تک بھی چاہنے اور چاہے جانے والوں کی بستی ہے یہ شہر شہرِ خوباں ہے۔ یہ محبوبوں کا دیس ہے یہ بھاگ متی کی بستی ہے۔ موسیٰ ندی کی نرم جھلملاتی سطح پر ہونٹ رکھ کر دیکھو جیسے شہد اور گلاب۔ یہاں کی ہواؤں میں کیوڑے کی مہک رچی ہے آؤ میرے دکن کو دیکھو کہ صبح کے ابھرتے ہوئے نور میں دوپہر کی دھوپ میں شام کے جھلملاتے سایوں میں تمہیں قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کا نشہ ملے گا۔ پھولوں کے گچھوں میں ان کے انفاس کی خوشبو رچی ہے۔ چاند کرن کرن، سورج کی روشنی، دھنک کے سات رنگ یہ سب تم کو قطب شاہ کے عشق کی گواہی دیں گے۔ اس کا گیت اس کا نغمہ ہمیشہ یونہی ان فضاؤں میں گایا جاتا رہے گا۔ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے یہ کتنا کھلا سچ ہے

پیا باج ایک تِل جیا جائے نا ؎ پیا باج پیالہ پیا جائے نا

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس میں)

محمد قلی قطب شاہ معانی

غزل

خوشا مستی تمہارا جی ہمن پر بل گیا ہے اب کھول مے کا خماری تج کدھر لوں ساقیا ہے اب

سدا دیتا ندا مطرب مقام دلپذیری کا ہمارے تم میانے آشنا باتاں کیا ہے اب

دم صبح مے لعلے ادھر بھر توں پلا تِل، تِل، صبا مرغاں کریں تہ تہ نوا سوں نو کیا ہے اب

مرید پیرِ میخانہ ہوا ہوں دیکھ اے زاہد ہماری مدہ پرستی میں ہمن تیسی رہا ہے اب

فلک سارے سکل تارے اپن رغبت سوں داسن ہیں سب سدا قطب سعادت کا معانی تج دیا ہے اب

صلاح الدین نیّر

ہر ایک رُت میں ہم یہاں گُل پیرہن رہے
حالات اپنے پھر بھی شکن در شکن رہے

ہم ان سے مانگ لیتے تھے پھُولوں کے پیرہن
جو لوگ قتل ہو کے یہاں بے کفن رہے

کلیوں کے لب پہ جم گئی موسم کی تشنگی
پھُولوں کے زخم جب بھی چمن در چمن رہے

ہر زخم اپنی ذات کا آپس میں بانٹ لیں
جب تک ہے سانس ہم میں یہ دیوانہ پن رہے

بدلیں نہ وضع داری کے انداز دوستو!
پھولوں سے گفتگو میں بھی اک بانکپن رہے

اپنی انا کی آگ میں جلتے رہے مگر
جب تک جلے ہیں زینتِ صد انجمن رہے

اِس دورِ کم نگاہی میں اکثر ہمارے دوست
کچھ تو صنم تراش ہیں کچھ بت شکن رہے

اوڑھے ہوئے ہی رہئیے اُجالوں کی چادریں
نیّر! اندھیرا جب بھی کرن در کرن رہے

غزلیں

رئیس اختر

تیرہ شبی ملے کہ جمالِ سحر ملے
منظر کی آرزو ہے نظر معتبر ملے

جو بھی گیا وہ لوٹ کے آیا نہیں مگر
ہر شخص چاہتا ہے تری رہگذر ملے

اس واسطے طویل ہے اشکوں کی داستاں
لمحے مسرتوں کے بہت مختصر ملے

میری نظر تھی جس پہ وہ منزل نہیں ملی
ویسے تو راستے میں کئی راہبر ملے

کچھ تو قدم بڑھائیے رکنے سے فائدہ
یہ ضد نہ کیجئے کہ وہی رہگذر ملے

مدت کے بعد مل تو گئی روشنی رئیس
لیکن ہمارے ورثہ میں سب جلتے گھر ملے

غزل

کرچیاں جن کے رشتے بچوں سے نکلتا دیکھوں
کرب کی آنچ میں اک نسل کو جلتا دیکھوں

صبح سو کر جو اٹھوں، آنکھ کو ملتا دیکھوں
منظر اک شہر کی آبادی میں جلتا دیکھوں

جب کبھی نکلوں، نئی [illegible] کے سفر میں تنہا
خود کو خنجر کی روال دھار پہ چلتا دیکھوں

خود کو دہرانے لگے پھر وہی اکھڑے ہوئے لوگ
قبر کی دھول کو پھر چہروں پہ ملتا دیکھوں

جبر کا سانس کی ڈوری پہ لگا ہے الزام
عمر کی آگ کی دلدل میں پگھلتا دیکھوں

چڑھتے سورج کی سیہ رات نے پوجا کی تھی
چڑھتے سورج کو سیہ رات میں ڈھلتا دیکھوں

زندگی تجھ کو گنوا دوں نہ کہیں جینے میں
ڈوبتی راتوں میں خوابوں کو پگھلتا دیکھوں

موسموں کا ذائقہ کڑوا کسیلا

آسماں کا رنگ نیلا
نیلے نیلے پانیوں میں بادلوں کا عکس گیلا
بے ستوں چھت کے کنارے
سر پہ مکڑی کے تنے جالے
جالیوں کا تانا بانا کس قدر ڈھیلا
کشتیاں ہر دم بھنور میں
دور ان دیکھے جزیروں کے لئے
چند ملاحوں کی الجھی گتھیاں
چڑھتی سانسیں آنکھ چمکیلی، بدن پیلا
پھر خلاؤں کی خبر لانے گئے
ان پرندوں کا وہ مسکن اونچا ٹیلا
جاگتے میں جسم نے چکھ چکھ کے دیکھا
موسموں کا ذائقہ کڑوا کسیلا
نیلگوں گہرے سمندر میں
گرا جو بھی بر فیلا
آسماں کا رنگ نیلا

رؤف خلش

ل

ر ہے کیوں رہتے ہو کیا دیتی ہیں دیواریں
تو ہنسنے والوں کو رُلا دیتی ہیں دیواریں

بھی اپنی تنہائی کا جب احساس ہوتا ہے
ی نیند سے مجھ کو جگا دیتی ہیں دیواریں

ضی کا کھلتے حال سے رشتہ عجب دیکھا
خاموش ہیں لیکن صدا دیتی ہیں دیواریں

چلنا ہی نہ چاہے، روک لیتے ہیں اُسے ذرّے
کو سفر میں راستہ دیتی ہیں دیواریں

کے زخم سہہ کر بارشوں کی چوٹ کھا کھا کر
وں کو روزنوں کو آسرا دیتی ہیں دیواریں

غیاث متین

ایک نظم

تم اگر ہو
راکھ کا اک ڈھیر تو پھر
روشنی کس کا بدن ہے ؟
صرف سرگوشی سے کچھ حاصل نہیں
چیختے لمحوں کے
اس سیلاب میں
اپنے دھڑوں پر
جانے کس کے سر لیئے پھرتے ہو تم،

اژدہے پھیلے ہوئے ہیں
شہر میں،
آنکھ پہ باندھے ہوئے پٹّی،
گلے میں سانپ ڈالے،
موت کے اندھے کنویں میں،
سارے رشتے اشتہاری بن گئے ہیں
جن پہ ہنستے ہیں،
کھلی سڑکوں پہ چسپاں
پوسٹر !

اس زمیں کو پیٹھ پر لادے ہوئے
چلنا ہے تم کو
روشنی کی سیڑھیاں آواز دیتی ہیں
صرف سرگوشی سے کچھ حاصل نہیں
چیخ پھنستی ہے گلے میں آج تو،
ہاتھوں سے چیخو !!

کچھ تو داستاں لکھو

نامکمل سہی
کچھ تو داستاں لکھو
گفتگو سرخ پھولوں کی
سرفروشی خنک جھونکوں کی
مسکراہٹ سبزہ زاروں کی
گنگناہٹ رودِ موسیٰ کی
وہ ترنم
وہ نقشِ جاں لکھو
نامکمل سہی
کچھ تو داستاں لکھو
شفق سے تا بہ افق
جو تجلی تھی
ان کی آنکھوں میں
وہی لکھو ـــ یا
کربِ کہکشاں لکھو

میرے رفیق
لمحۂ غروب آفتاب
تم بھی تو تھے
شامِ غریباں لکھو
قصّۂ کارواں لکھو
نامکمل سہی
کچھ تو داستاں لکھو ـــ

محمد مجیداللہ صدیقی

کتبہ

وہ موسمِ بہار کی
پہلی منزل تھی
میں نے دھڑکتے دل سے تمہیں دیکھا تھا
مرے سامنے تمہارا چہرہ تھا
تمہاری آنکھیں
میری آنکھیں
بے شمار آنکھیں
آنکھوں کا اک سمندر تھا جس میں ہم ڈوبتے چلے گئے!

وقت نے دونوں ہاتھ
ہماری آنکھوں پہ رکھ دیئے
جو ہاتھ ہٹے تو یوں لگا
جیسے بہاریں لُٹ گئیں ـــ سانحہ گذر گیا

آج بھی مری آنکھوں میں
تمہاری آنکھیں ہیں
تمہارا چہرہ ہے۔ اشکبار آنکھیں
مگر
خدا کے لئے
جب بھی کہیں سرِراہ ملو
تو نظر جھکا کے چلو
کہ مجھے ڈر ہے
کہیں تم دیکھ نہ لو
مری آنکھوں میں
کوئی کتبہ بھی ـــ !!

حیدرآباد کے شاعر

۲۳

رشید انصاری

…ائیں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ دو تذکروں کا توسیعی سلسلہ

کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعروں میں
…ر انصاری کا شمار ہوتا ہے۔ تقریباً چار دہوں
…شعر و ادب، صحافت و ترجمہ کے کاموں میں
…وف رہے۔ عمران احمد نام، رشید الدین عرف
…رشید انصاری ادبی نام ہے ۱۶ر فروری ۱۹۱۷ء
…فرقائے دکن کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے
…د محمد سعید الدین انصاری جامعہ نظامیہ میں شیخ المنطق
…فلسفہ تھے۔ رشید انصاری ۱۹۳۰ء میں سٹی کالج
…ے میٹرک ہوئے۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں لاہور سے منشی،
…شی فاضل اور ادیب فاضل کیا۔ ریاست حیدرآباد
…ے مختلف محکموں میں ملازمت کے بعد ۱۵ر فروری ۷۲ء
…و وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوشی حاصل کی۔

مشہور صحافی حکیم انصاری مدیر "الاعظم"
…کے شریک مدیر اور کالم نویس کی حیثیت سے رشید انصاری
…نے علمی و ادبی نیز تہذیبی موضوعات پر بے تکان
…لکھا۔ حافظ شیرازی کے فارسی دیوان کو آپ نے نہایت
…وق اور محنت سے اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے
…حافظ کی (۵۰۴) غزلوں کا یہ منظوم ترجمہ اشاعت
…کے لئے تیار ہے۔ کاش کوئی صورت نکلے اور یہ مفید
…کام جلد منظر عام پر آجائے۔ رشید انصاری غزلیہ
…گوئی میں کلاسیکی طرزِ اظہار کے بزرگ شعرا میں مخصوص مقام رکھتے ہیں، صاحب بصیرت سخنور ہیں مگر ان دنوں آشوبِ چشم کے باعث
…بصارت سے محروم ہوگئے ہیں۔ شعری محفلوں میں کم کم شریک ہوتے ہیں، کبھی کبھار ریڈیو پر کلام نشر ہوتا ہے۔ دکن کے صلاحیت اور ضبط
…دل بزرگوں میں سرمہ صاحب نظر ں کی مثال ہیں (و،ع)

بیاں بے چارگی کا پیش اہلِ درد کیا کرتا
بجز اس کے کہ دکھلاتا یہ چہرہ زرد کیا کرتا

دلِ ناداں کے ہاتھوں جان پر بھی بن گئی آخر
رہے منہ دیکھتے ہمدرد، وہ بے درد کیا کرتا

دلِ ناعاقبت اندیش خود ہی مجھ سے کہتا ہے
یہ آتش عشق کی ہے، کوئی اس کو سرد کیا کرتا

شکستِ شیشہ بے آواز ہو، یہ غیر ممکن ہے
دلِ دو نیم تھا مجبور، ضبطِ درد کیا کرتا

ہمیں بخشی ہے شاہِ عشق نے آہوں کی یہ دولت
نہیں ہے جس کا دل سوزاں، وہ آہِ سرد کیا کرتا

مدینے کو چلے سب، ہے رشید بے نوا تنہا
نہ آنکھوں سے لگاتا کارواں کی گرد کیا کرتا

٥

یہ پہلے دیکھ، سینے میں دلِ درد آشنا بھی ہے
جدھر تو جا رہا ہے، کیا وہ تیرا راستہ بھی ہے؟

ترے عاشق کی شہرت کیوں نہ ہو سارے زمانے میں
اُسے شاہی ملی ہے، کیونکہ وہ تیرا گدا بھی ہے

ترا دل سنگِ خارا ہے، اُسے کیا موم کر سکتے
پریشاں نالۂ دل اور آہِ نارسا بھی ہے

پشیماں ہو چکا ہے، پھر بھی دل مجھ سے یہ کہتا ہے
ذرا دیکھو تو اس محفل میں کیا وہ بے وفا بھی ہے؟

ہیں کیوں اترے ہوئے چہرے مرے تیمار داروں کے
مریضِ عشق کہتا ہے، دوا بھی ہے، دعا بھی ہے

خدا تو تو نہیں اے زندا قسم کھا کر یہ کہتا ہوں
تو عیبوں کو چھپاتا بھی ہے اور حاجت روا بھی ہے

یہ مانا، وہ ہے مفلس، جان کی بازی لگا دے گا
ترے عشاق میں شامل رشید بے نوا بھی ہے

٥

نہ پوچھو، میرے نخلِ بے ثمر کا رنگ کیا ہوگا
یہ دیکھو، خشک سالی میں شجر کا رنگ کیا ہوگا

جو طائر تشنہ لب آئے تو سمجھو خشک ہے چشمہ
نہیں ہے خون دل میں چشمِ تر کا رنگ کیا ہوگا

یہاں پھوڑا ہے سر ہم نے، یہیں ہیں نقش خوں کی
وہ خود ہی دیکھ لیں گے سنگِ در کا رنگ کیا ہوگا

میں خود ہی پوچھتا ہوں جا کر بھی چارہ سازوں سے
ادھر خوں بار ہیں آنکھیں، اُدھر کا رنگ کیا ہوگا

وہی گمراہ نکلا، تم نے جس کی رہنمائی کی
یہی ہے خیر کی صورت تو شر کا رنگ کیا ہوگا

میں رندِ مست ہوں، شائستہ طاعت مجھ سے کیا ہوگی
خدا ہی جانتا ہے کل سحر کا رنگ کیا ہوگا

رشید سخت جاں کو جب نہیں ہے تابِ نظارہ
بتاؤ اہلِ دل، اہلِ نظر کا رنگ کیا ہوگا

سب رنگ

(اس عنوان کے تحت ہندوپاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین، نظم و نثر
کا انتخاب شائع ہوا کرے گا ـــ ادارہ)

احمد فراز

قرضِ دوستاں

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دُکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی، سحر ہوئی چلا گیا
ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اِک دیا بجھا تو سینکڑوں دیئے جلا گیا
سکوت میں بھی اس کے اِک ادائے دلنواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سُنا گیا
وہ اِک ہجومِ عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا
دِلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اُداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا
کبھی کبھی تو یوں ہوا ہے اِس ریاضِ دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا
شریکِ بزم دل بھی ہیں، چراغ بھی ہیں، پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا، وہ کہاں چلا گیا
اُٹھو، ستم زدوں چلیں، یہ دکھ کڑا سہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جس کو راس آ گیا
یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرضِ دوستاں چکا گیا

(ماہنامہ "فانوس" کراچی سے)

فہمیدہ ریاض

گیت

جھل مِل اوڑھنیوں کی، جگ مگ گہنوں کی متوالی
چنچلتا کی مورت، میٹھے بان چلانے والی
آیا کہاں سے اتنا مان
بندیا، لالی، کاجل، مہندی، بول تو کہاں گنوایا
دھول کروں میں سنگھار، تری گڑیوں نے راس رچایا
تونے مری جلائی جان
آیا کہاں سے اتنا مان
کیوں ری ہٹیلی تُنے نہ میری، میں بھی نہ تجھ سے بولوں
نا تجھے دودھ کٹوری میں دوں، نا میں بوڑیا کھولوں
اب تو میں نے بھی لی ٹھان
آیا کہاں سے اِتنا مان
لو وہ بسوری، ٹپکے آنسو، سمجھوں چالیں تیری
اری میں کب کی ہاری تجھ سے، روٹھ نہ مجھ سے میری
سوتن، بیرن، جان
میری سوتن بیرن جان

(مجموعۂ کلام "دھوپ" مطبوعہ کراچی سے)

نقد و نظر

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے، ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)

(ادارہ)

کتاب :- "شعلۂ نیم سوز" شاعر : فضا ابنِ فیضی

صفحات ۲۸۸ بڑا سائز، مجلد مع پلاسٹک گرد پوش، اشاعت ۱۹۷۸ء، قیمت ۴۰ روپے

ناشر : فیضی پبلی کیشنز۔ مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ - اُتر پردیش

"شعلۂ نیم سوز" اردو کے جانے پہچانے شاعر فضا ابن فیضی کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ فضا صاحب کو شعر کہتے ہوئے تین دہائیاں ہوئیں۔ کوئی بیس برس پہلے نظم نگار شاعر کی حیثیت سے انھوں نے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس لحاظ سے یہ مجموعۂ کلام بڑی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جیسا کہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے "فضا کی طبیعت میں جو جھجک، بے نیازی اور انکسار ہے اس سے ان کے کلام کی اشاعت التوا میں پڑتی رہی"۔

ایک زمانہ میں فضا صاحب کی نظمیں مستقل نگار میں چھپتی تھیں۔ نیاز فتح پوری ان کی شاعری کے معترف اور مداح تھے۔ نگار کے علاوہ اردو کے بہت سے معیاری رسالوں میں فضا صاحب کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔

فضا صاحب جوش ... سے نسبت رکھتے تھے۔ اقبال اور منصور حسین شور کے اثرات بھی ان کی نظموں میں جھلکتے ہیں۔ فضا صاحب کی شاعری میں ابتدا ہی سے فن کی پختگی نمایاں تھی اور ان کی نظم نگاری کا ایک خاص اسلوب متعین ہو چکا تھا۔ آگے چل کر ان کی نظموں کے معیار اور انداز میں بہت کم تبدیلی ہوئی۔ جوش اسکول کے زیرِ اثر جس طرز کی نظم نگاری کو فروغ ہوا تھا اور جس کی تشبیہ نگاری، قافیہ پیمائی اور خارجیت پہچان تھی اب اس کا چلن ختم ہو چکا ہے۔ فضا ابنِ فیضی کی یہ نظمیں زبان و بیان کے لحاظ سے نہایت "صاف ستھری" ہیں۔ جوش کی طرح فضا صاحب کا ذخیرۂ الفاظ بھی وسیع ہے اور وہ الفاظ کا استعمال وہ بھی دل ربا کر ساتھ کرتے ہیں۔ عروض اور قواعدِ زبان کے لحاظ سے ان کا کلام بے عیب ہے لیکن وہ بات جو "ماورائے سخن" ہے اور جو دل کو چھو لیتی ہے ان نظموں سے یکسر غائب ہے۔

فضا صاحب کی توجہ اب نظم نگاری سے ہٹ کر غزل کی طرف مبذول ہوئی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں ان کی جو غزلیں رسائل میں شائع ہوئی ہیں وہ ان کی شاعری میں ایک نئے اور خوش آیند موڑ کا پتہ دیتی ہیں۔ ان غزلوں میں طرزِ احساس کی تبدیلی کے تجربے کی گہرائی اور تاثر کی شدت پائی جاتی ہے۔ نظموں میں ان کا مشاہدۂ حیات ظاہری رنگ روپ تک محدود رہا یہ غزلیں

ہم کو زندگی کے نہاں خانوں کی سیر کراتی ہیں۔
"شعلۂ نیم سوز" کے قاری کو ان کی غزلوں کے زیر طبع مجموعوں "دریچۂ سیم سخن" اور "شمع محرابِ معانی" کی اشاعت کا منتظر رہنا چاہیئے۔ (ڈاکٹر مغنی تبسم)

نام کتاب: "حرف ناتمام" (شعری مجموعہ) عمر انصاری
ڈیمائی سائز مجلد مع گرد پوش۔ صفحات (۲۰۴) قیمت ۲۰ روپے
ناشر: مکتبۂ فردوسِ ادب۔ ۲/۱۰ امین آباد پارک۔ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

شعری مجموعوں کی بہتات میں عمر انصاری کا ضخیم اور دیدہ زیب پانچواں مجموعہ "حرف ناتمام" کلاسیک سے عصریت تک خوشبو اور مہک کا حامل سرمایۂ سخن ہے جس کے مطالعہ سے دبستانِ لکھنؤ کے ایک قادر الکلام سخنور کی شعری حیثیت اور طہارتِ فکر سے بھی خوشی ہوتا ہے۔

عمر انصاری بزرگ شاعر ہیں، ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۰ء سے شاعری اور مشاعروں سے خود کو منسلک رکھا۔ سردار جعفری اور علی جواد زیدی لکھنؤ یونیورسٹی کے ہم درس رہے ہیں "سازِ بے خودی" "صنم کدہ" "جرسِ کارواں" "بازگشت" اور نعتوں کا مجموعہ "ترانۂ نعت" شائع ہو چکے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ "حرفِ ناتمام" میں (۱۳۵) غزلیں شامل ہیں۔ بلحاظ ترتیب یہ مجموعہ چار حصوں پر مشتمل ہے حصۂ اول تازہ (۸۰) غزلوں پر مبنی ہے۔ دوسرا حصہ "تراشیدم" ۳۰ء سے ۱۹۴۲ء تک کی غزلوں کو سہارا دیتا ہے "پرستیدم" "بابِ سوم میں ۴۳ء تا ۶۲ء کی غزلیں مطبوع ہوئی ہیں اور چوتھا حصہ "شکستم" ۶۳ء تا ۷۲ء کی غزلیات سے روشن ہے۔ "تراشیدم" "پرستیدم" "شکستم" کے شعری عنوانات کے بطن میں جو کلام طبع ہوا ہے اس کے مطالعہ سے عمر انصاری کی غزل سے شیفتگی، زبان و بیان پر قدرت، زندگی کی قدروں سے رشتہ داری، تخیال و فکر میں یگانگت، کہنے اور بہتر کہنے کی جستجو کے چراغ جلتے نظر آتے ہیں۔ دبستانِ لکھنؤ کا روایتی شعری مزاج بھی ملتا ہے اور نئے زمانے کی خوشگوار تبدیلیوں کی تھرتھراہٹ بھی عمر انصاری کی شاعری میں محسوس ہوتی ہے چند شعر ادھر ادھر سے پڑھیئے

دیکھنے والے تو ساحل پہ بہت تھے لیکن	؎	بڑھ کے آیا نہ سفینے کو بچانے کوئی شخص
ڈھونڈ لیتا ہے خوشی میں بھی مجھے، غم میں بھی	؎	جانتا ہے مرے چھپنے کے ٹھکانے کوئی شخص

بھاگ کر تجھ سے کدھر جاؤں کہ ذہن و دل کے		جتنے دروازے ہیں کھلتے ہیں ترے در کی طرف

روشنی بخش کے دنیا کو پگھلتے رہنا	؎	ہم چراغوں کا تو ہے کام ہی جلتے رہنا

غم حیات کی جتنی تہیں کرید و گے	؎	پھر اک سراب کے بعد اک سراب نکلے گا

ہونے والا ہے کیا، کہاں اور کب ؛ کوئی کہتا نہیں سمجھتے ہیں سب
زندگی اتنی بے وفا تو نہیں ؛ ہاں مگر اس کا اعتبار نہیں
ایک کو دوسرے کی فکر نہیں ؛ ہوتے جاتے ہیں جانے کیا ہم لوگ
آدمی، آدمی نہ بن پایا ؛ مفت بدنام ہو گئے مذہب

ہونٹوں سے تو کرب ہے نمایاں کہتے ہو کہ مسکرا رہے ہو

عمر انصاری کا "حرفِ ناتمام" کئی جہتوں سے قابلِ مطالعہ شعری مجموعہ ہے جو چھپا بھی نہایت اہتمام و انصرام سے ہے۔ (وقار خلیل)

"امرت بانی" (ہندوستانی رنگ کی شاعری کا انتخاب)

مرتب: ڈاکٹر عبدالستار دلوی، صفحات ۳۳۳ ڈیمائی سائز

قیمت ۱۵ روپے۔ ناشر: مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر۔ بمبئی

ڈاکٹر عبدالستار دلوی، معروف اسکالر کی حیثیت سے ہمارے شہر ہی نہیں ملک بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بمبئی کی انجمن اسلام انسٹی ٹیوٹ" اور "مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر" کے علمی و تحقیقی امور میں ڈاکٹر دلوی نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جی کی بنا کردہ" ہندوستانی پرچار سبھا" سے ان کا متاثر ہونا فطری امر ہے۔

"امرت بانی" تین ابواب پر مشتمل ہندوستانی رنگ کی شاعری کا مجموعہ ہے پہلا باب منتخب ۲۰۶ اردو غزلوں پر محیط ہے۔ غزل امیر خسرو کی ریختہ ہے جس کا مصرعہ "زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں ... بنائے بتیاں" ہے اس حصہ میں کبیر، چندربھان برہمن، ولی، میر، انشا، نظیر اکبرآبادی، بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن، حالی، آرزو لکھنوی، فانی، حسرت، جگر، فراق، سیماب، مخدوم، جاں نثار اختر، ساحر، جعفری، چند پاکستانی شعرا (جن میں فیض اور ندیم قاسمی شامل نہیں ہیں) کے علاوہ شہاب جعفری، بدر، کمار پاشی، محمد علوی، ندا فاضلی اور ہندی کے شاعر دشینت کمار کی غزلیں شامل ہیں۔

باب دوم میں ۵۱ تخلیقات ہیں جن میں نظمیں، گیت اور بھجن شامل ہیں۔ امیر خسرو، کبیر، میرا بائی، اکھا بھگت سوامی، نظیر، میر تقی، اکبر، اقبال، عظمت اللہ خاں، فراق، حامد اللہ افسر، سمترا نندن پنت، حفیظ، اختر شیرانی، ساغر نظامی، مجاز، اختر الایمان، ساحر، خلیل الرحمٰن اعظمی اور زبیر رضوی کے علاوہ درجنوں ہندی کے معروف شعرا کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔

باب سوم "دوہے، رباعیاں (دوبیتی) اور چوپدے پر مشتمل ہے جن میں بو علی شاہ قلندر، خسرو، کبیر، تلسی داس، جمیل الدین عالی، یگانہ، جوش، فراق، اور مصطفیٰ زیدی کا کلام ہے۔

باب چہارم۔ ٹپنیاں، شبداولی اور تعارف پر محیط ہے۔

ڈاکٹر دلوی نے اس کتاب کے مبسوط "مقدمے" میں "ہندوستانی" کی بھرپور وکالت کرتے ہوئے گاندھی جی کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کی سعیِ مشکور ڈاکٹر دلوی نے گاندھیائی ہندوستانی نقطۂ نظر پر یہ انتخاب شائع کیا ہے "امرت بانی" اردو اور ہندی کی سلیس، نکھری اور ستھری ہے۔ اسے پڑھا جانا اور کتب خانوں میں استفادہ کے لیے رکھا جانا ضروری قرار پاتا ہے۔ (وقار خلیل)

اُردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم جنوری ۔ انجمن ترقی اُردو شہر حیدرآباد
کے دفتر کا افتتاح کرتے ہوئے ریاستی
انجمن کے شریک معتمد جناب عابد علی خاں ایڈیٹر
"سیاست" نے پرانے شہر میں اُردو گھر
کی تعمیر کا مشورہ دیا اور کہا کہ شہر کے ہر علاقے
میں اُردو کے استعمال اور اس کی ترقی کے لئے
کام کرنے والوں کے درمیان تعاون اور
اشتراک کو فروغ دیا جانا چاہئے۔ صدر
جلسہ مسٹر منوہر راج سکسینہ کے علاوہ مسز نہ
غلام یزدانی (ایڈوکیٹ) تجمل اظہر اور
مہمان خصوصی نواب میر احمد علی خاں صدر
ریاستی انجمن نے خطاب کیا۔ جناب عابد علی
خاں نے ایک ہزار روپے کا عطیہ بھی شہر کی
انجمن کے دفتری امور کے لئے مرحمت فرمایا
جناب غلام صادق الدین معتمد انجمن نے شکریہ
ادا کیا۔

سہ جنوری ۔ ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر محمد علی خاں
کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ پروفیسر
خاں جامعہ عثمانیہ کے قدیم اور مقبول اساتذہ
میں تھے مرحوم یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر
اور میر نظام کالج کے پرنسپل بھی تھے۔ وظیفہ
پر علیحدہ ہونے کے بعد پروفیسر خاں کی خدمات
سے انوار العلوم کالج نے استفادہ کیا۔

۵ جنوری : نامور ماہر تعلیم اور صدر
ادارۂ ادبیاتِ اُردو پروفیسر سید علی اکبر
صاحب نے پروفیسر محمد علی خاں کی وفات پر
تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ "پروفیسر خاں
اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے فرد تھے انوار العلوم
کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے انہوں نے
نمایاں تر خدمات انجام دیں۔ پروفیسر علی
اکبر نے پروفیسر خاں کی وفات کو حیدرآباد
کی تعلیمی اور تدریسی دنیا کے لئے ناقابلِ تلافی
نقصان قرار دیا اور پسماندگان سے اظہارِ
تعزیت کیا۔

● انجمنِ معمارِ ادب کی طرف سے ممتاز
طنز و مزاح لکھنے والے ادیب جناب نریندر
لوتھر کی دہلی کو تبادلہ پر ایک وداعی
تقریب منعقد ہوئی۔ جناب بھارت چند
کھنہ صدر نشین ولائی حیدرآباد نے صدارت
کی۔ کھنہ صاحب کے علاوہ جناب مصطفےٰ کمال
ایڈیٹر شگوفہ اور بیگ احساس نے جناب
لوتھر کی ادبی خدمات اور اربابِ حیدرآباد
سے ان کے اخلاص مندانہ سلوک پر
ڈالی۔ آخر میں جناب نریندر لوتھر (
اے۔ ایس) نے کہا کہ حیدرآباد سے ان
وابستگی کا رشتہ برقرار رہے گا۔

۶ جنوری : بزمِ نارائن داس کا
غیر طرحی مشاعرہ صاحبزادہ میر محمد علی خاں
صدارت میں منعقد ہوا۔ قدیم طرز
تقریباً دو درجن شعراء نے کلام سنایا

۸ جنوری : اردو اور فارسی کے
شاعر جناب میر کاظم علی برق موسوی کا انت
ہوا۔ برق مرحوم میر قادر علی رعد کے
میر کاظم علی شعلہ کے پوتے اور میر احمد
شہید دہلوی کے پڑپوتے تھے۔ فارسی کلام
دو انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ برق مر
نے حکومتِ ایران کی دعوت پر دورہ
بھی کیا تھا۔ برق موسوی کے انتقال سے حید
ایک قادر الکلام سخنور سے محروم ہوگیا
حیدرآباد میں فارسی گو شعراء کی انجمن "بزمِ
کے بانیوں میں ایک تھے ضرورت ہے کہ
اُردو شعری انتخاب شائع کیا جائے۔

۱۰ جنوری : سہ ماہی "اسلامک ریو
(انگریزی) کی گولڈن جوبلی تقاریب کے
میں ایک سمینار "مسلم معاشرہ کے نئے رجحا
اور ابھرتے ہوئے انداز" کے موضوع
بصدارت پرنسس معظم جاہ منعقد ہوا۔ جنا
ہدایت اللہ نے سمینار کا افتتاح کیا۔ پر
جی رام ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی
نے سووینر کی رسم اجراء انجام دی۔ پروفیسر

ں اکبر نے استقبالیہ خطبہ پڑھا اور
۔ حامد علی عباسی نے اسلامک کلچر کی
ت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر منظور عالم نے
ر کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

• وقار خلیل کا پہلا شعری انتخاب
ریحان کے نام سے شائع ہوا۔ پروفیسر گوپی
رنگ صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ
نے پیش لفظ لکھا اور فلیپ پر جناب
احمد کیفی نے رائے دی ہے۔ غزلوں
موں کا اس انتخاب میں ۸۷ تخلیقات
ہیں۔ "شاعری" کو ادبی مرکز' اعجاز
' چھتہ بازار۔ حیدرآباد ۲ نے شائع

۱۲ر جنوری : بزم عرفان ادب
ب سے ریاستی اردو اکیڈیمی کے ایوارڈ
مصنفوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ جناب
حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی نے
کی صدارت کی۔ بزرگ شاعر جناب
وارثی نے مصنفوں کی گلپوشی کی۔ آخر
شعر و سخن منعقد ہوئی۔
• بزرگ شاعر جناب روکش سکندرآبادی
اعزاز میں ادبی اجلاس و مشاعرہ جناب
الدین پرنسپل اسلامیہ ہائی اسکول
رآباد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محسن
ری اور شاغل ادیب صاحبان نے
کی شاعری اور شخصیت پر مضامین
نے۔ آخر میں جناب معراج صوفی کی
ت میں شعرا نے کلام سنایا۔

• ادبی ٹرسٹ کی مجلس عاملہ کا
اجلاس صدر ٹرسٹ جناب حامد علی عباسی
کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں دیگر امور
کے علاوہ اشفاق حسین مرحوم کے مجموعۂ نثر
"سرودِ رفتہ" کے علاوہ مسز وقار خلیل،
ناصر کرنولی اور رئیس اختر کی شعری تخلیقات
کی اشاعت کے لیے ایک ایک ہزار روپے
کی رقمی اعانت منظور کی گئی۔ اس اجلاس
میں "بابِ رقص" کی رائلٹی کے طور پر
بیگم مخدوم محی الدین کے نام ڈیڑھ ہزار روپے
اجرا کیے گئے۔ مسز حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر
راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سید عبدالمنان،
منوہر راج سکسینہ، رمن راج سکسینہ،
سریندر اس لاہوٹی اور بانی و سکریٹری
ٹرسٹ عابد علی خاں نے شرکت کی۔

۴ار جنوری : اردو مجلس کا ماہانہ
ادبی اجلاس ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کی
صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن اور
جناب مظفر مجاز نے علی الترتیب "حسرت
شخص اور شاعر" "بندۂ عشق" کے زیر عنوان
مقالے سنائے۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ
ـ ـ ـ ـ آخر میں رحمٰن جامی اور محسن جلگانوی
نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر
معتمد اردو مجلس نے جلسہ کی کارروائی چلائی
اور شکریہ ادا کیا۔

• محترمہ بانو طاہرہ سعید کا دوسرا
شعری مجموعہ "مہکتے ویرانے" ادارۂ ادبیات
اردو کی طرف سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ
میں بانو کی شاعری پر جناب سید ہاشم علی اختر
معتمد ادارہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور
پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے مضامین لکھے ہیں
"برگِ سبز" کے نام سے بانو طاہرہ سعید کا
پہلا مجموعہ کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔
• ڈاکٹر عابرہ سعید کی ادبی تخلیق
"اردو ادب میں خاکہ نگاری" کے نام سے
"ادارۂ شعر و حکمت" کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔
۵ار جنوری : شہنشاہ ادب کا ادبی
اجلاس و مشاعرہ جناب رشید احمد رشید کی
صدارت میں منعقد ہوا۔ محسن جلگانوی نے
مضمون پڑھا۔ مسند باسی نے نعت سنائی۔ بسمل شعر
میں رشید، معراج صوفی، علی سرمد، محسن،
محوی سروشی، عزمی اور ناگپال عظیم دہلوی نے
کلام سنایا۔
۱۶ار جنوری : کل ہند صنعتی نمائش سوسائٹی
کی طرف سے خواتین کا مشاعرہ بصدارت محترمہ
عظمت عبدالقیوم منعقد ہوا۔ بانو طاہرہ سعید،
زہرہ تسکین، نایاب سلطانہ، انجم سوز،
اندو سرشت، مظفر النساء ناز، اجہد شیریں،
نور النساء تسکین، نسیم نیازی، عظمت اور
نسرین نے کلام سنایا۔
۷ار جنوری : ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ
رام ریڈی نے جونیئر کالج چنچل گوڑہ میں امیٹینگ
اسٹوڈنٹس لیڈرشپ آف انڈیا کے زیر اہتمام
"یوم اردو" کے جلسہ میں بہ حیثیت مہمان خصوصی
خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے فروغ کے سلسلے میں
ہر ممکن اقدام کیا جائے گا۔ وزیر تعلیم نے اردو

میڈیم کے طلبا کے لئے خصوصی جماعتوں کے قیام اور اردو ماڈل اسکولوں کے سلسلے میں حکومت کی تجویز کا انکشاف کیا۔ موصوف نے تالیوں کی گونج میں اس امر کا اعلان کیا کہ انھیں اردو سے محبت ہے چنانچہ وہ اردو سیکھ رہے ہیں اور بہت جلد بات چیت کی حد تک اردو سیکھ جائیں گے۔ مسٹر جلیل پاشاہ صدر ریاستی اسٹوڈنٹس یونین نے بھی مخاطب کیا۔

۱۸ جنوری : مسٹر شیو پرشاد (ایم ایل اے) نے ایک بیان کے ذریعہ ریاستی اردو اکیڈیمی، نظامس اردو ٹرسٹ، ادبی ٹرسٹ اور دیگر علمی و ادبی اداروں سے اپیل کی ہے کہ وہ نعتیہ کلام اور مذہبی کتابوں پر مشتمل ادب کی مالی اعانت کر کے حوصلہ افزائی کریں۔

۲۱ جنوری : اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب اختر حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا جناب رؤف خیر نے مولانا محمد علی جوہر پر مقالہ سنایا۔ جناب یم مظہر الزماں نے نئی کہانی پیش کی۔ آج کا شاعر کے زیرِ عنوان جناب بشارت علی بشارت نے کلام سنایا۔ آخر میں محفل شعر منعقد ہوئی۔ جناب جمیل شیدائی نے شکریہ ادا کیا۔

۲۲ جنوری : ڈائرکٹر آف فیلڈ پبلسٹی حکومت ہند کے زیر اہتمام بین الاقوامی بچوں کا سال کے سلسلے میں ایک منعقدہ محفل شعر جناب پی گنگا ریڈی، ریاستی وزیر آبکاری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب سید مکرم شاہ صدر نشین قانون ساز کونسل مہمان خصوصی تھے مسز کنول پرشاد کنول، اوج یعقوبی ڈاکٹر مغنی تبسم، بانو طاہرہ سعید، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، رئیس اختر فیض الحسن خیال اور صادق نقوی نے کلام سنایا۔

۲۳ جنوری : جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اور لنگویجز کے زیر اہتمام "کشمیر حیدرآباد" نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے چیف منسٹر کشمیر جناب شیخ عبداللہ نے تاریخی اور خوب صورت شہر حیدرآباد کو جزیرہ نمائے دکن کی انگوٹھی کا چمکتا نگینہ قرار دیا اور کہا کہ حیدرآباد، ملک کی شاندار روایات کا سنگم ہے۔ یہاں ہماری مشترکہ تہذیب کی کتنی ہی دھارائیں دوش بدوش فروغ پا رہی ہیں۔ اس تقریب کی صدارت ریاستی چیف منسٹر ڈاکٹر یم چنا ریڈی نے کی۔ ڈائرکٹر جنرل محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ ڈاکٹر اے آر باجی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب محمد یوسف ٹینگ ڈائرکٹر کلچرل اکیڈیمی کی قیادت میں کشمیر کے کلچرل ٹروپ نے زبیر رضوی کا ڈرامہ "پیا باج پیالہ" پیش کیا۔ عہد محمد قلی قطب شاہ پر مبنی اس تاریخی ڈرامے کو حیدرآباد میں بے حد پسند کیا گیا۔

• زندہ دلان حیدرآباد کے ۱۹۷۹ء کے انتخابات میں مسرز بھارت چند کھنہ صدر، رشید قریشی، اور محمد عنایت اللہ نائب صدور طالب خوندمیری معتمد، بوگس حیدرآبادی اور مسیح انجم نائب معتمدین، یم اے بیگ خازن اور اراکین عاملہ میں سید مصطفیٰ کمال، ناظم مرزائی گڑبڑ حیدرآبادی، صبغۃ اللہ بھیاٹ، اسمٰعیل ظریف اور رشید عبدالسمیع جلیل منتخب ہوئے۔

۲۴ جنوری : نمائش کلب میں مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ عنایت اللہ، طالب، مصطفیٰ علی بیگ، گڑبڑ حیدرآبادی، بوگس حیدرآبادی، بھیاٹ، حفیظ خاں سپاٹ، سرپٹ حیدرآبادی، منور علی کھونگیری اور اسمٰعیل ظریف نے کلام سنایا۔

۲۶ جنوری : یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر "ایوانِ اردو" پر جناب میر سراج الدین علی خاں، آفس سکریٹری نے قومی پرچم لہرایا۔

۲۸ جنوری : حیدرآباد لٹریری فورم کا ادبی اجلاس جناب تاج مہجور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب یوسف اعظمی نے "انگریزی اور اردو شاعری میں عصریت" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نقی حسن جعفری نے "قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول "کارِ جہاں دراز ہے" پر تنقیدی مضمون سنایا۔ علی الدین نوید نے منتخب کلام پیش کیا۔ حسن فرخ صاحب نے جلسہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

(باقی صفحہ ۴۶ پر)



بچوں کا سب رس

سروجنی نائیڈو

رضوانہ فردوسی

حیدرآباد کی پُرکشش سرزمین نے کتنے ہی غیر ملکیوں کو اپنا بنالیا۔ انھیں لوگوں میں بنگال کے اگھور ناتھ پادیا بھی تھے۔ جو بنگال سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے۔ بقول نصیر الدین ہاشمی "اس دور کی ہر علمی ـب میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔" انھوں نے ہی حیدرآباد میں سب سے پہلے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا تھا۔ وہی م کالج جیسے اہم تعلیمی ادارے کے بانی تھے اور برسوں اس کے پرنسپل بھی رہے۔ خود سروجنی نائیڈو کا تھا "بھارت دیس میں دو ایک ہی ایسے ہوں گے جن کا دھیان گیان پتاجی سے بڑھا چڑھا ہوگا۔" ان کی شریک یات وردا سندری دیوی صحیح معنوں میں "ماں" تھیں وہ اپنے بچوں کے مستقبل کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔

سروجنی نائیڈو اپنے ماں باپ کی سب سے پہلی اولاد تھیں۔ امیر گھرانے میں پیدا ہوئیں تھیں ں ہر طرف پیار ہی پیار تھا۔ اس لیے ان کا بچپن بڑا سکھی اور پیارا رہا۔ لڑکپن ہی میں وہ بچوں کی لیڈر بن ۔ گروہ میں اگاڑی ہوجاتیں، اچھی اچھی کہانیاں سناتی تھیں۔ کھیل کھیل میں کام کی باتیں بتاتی تھیں، اس کہ شاید ایک دن دیس کی بڑی لیڈر بننے والی تھیں۔

سروجنی نائیڈو کی ابتدائی تعلیم و تربیت حیدرآباد ہی میں ہوئی تھی۔ ۱۲ سال کی چھوٹی سی عمر میں انھوں نے سیڈنسی کالج سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ ۱۸۹۵ء میں انگلینڈ گئیں اور وہاں کنگس کالج اور گرٹن کالج میں اعلیٰ تعلیم ل کرنے کے بعد ۱۸۹۸ء میں خرابی صحت کی بناء پر ہندستان لوٹ آئیں۔ انگلینڈ سے ہی ان کی شاعری کا حقیقی ز ہوا۔ سروجنی کو اپنے باپ کی طرح سائنس اور ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ انھیں شعر و شاعری سے لگاؤ تھا ہیں کہ ایک دن وہ ریاضی کا ایک چھوٹا سا سوال حل کر رہی تھیں جو انھیں کافی مشکل نظر آرہا تھا وہ ریاضی کا ل حل نہ کرسکیں اور کتاب بازو رکھ کر ایک نظم لکھ دی۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ ماں باپ ان کے قلم سے بہت خوش ہوئے تھے۔ ۱۳ سال کی عمر میں انھوں نے دو ہزار الفاظ پر مشتمل ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ یں کلاس روم کی تعلیم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وقت کا زیادہ حصہ مطالعہ میں گذارتی تھیں اور وقت کبھی رائیگاں نہیں کرتی ۔ ایک بار کسی سہیلی کو انھوں نے لکھا تھا "مطالعہ کا بڑا حصہ میں نے ۱۴ سے ۱۶ سال کی عمر میں پورا کیا۔" انھیں شاعری بے حد لگاؤ تھا۔ نظام حیدرآباد بھی ان کی ایک نظم سے بہت متاثر ہوئے تھے اور انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے

وظیفہ جاری کیا تھا اسی وظیفہ پر وہ انگلینڈ گئی تھیں وہ نظم کچھ اس ڈھنگ کی تھی۔

شاہا! تیرے حضور میں میرا یہ گیت ایک نذرانہ ہے قبول فرما، ہیرے موتیوں والے تیرے تخت و تاج میں میرے شعر و شاعری کے پھول

انگلینڈ سے واپسی کے بعد ان کی شادی ڈاکٹر گووند راجلو نائیڈو سے حیدرآباد میں ہوئی۔ نائیڈو جی ان دنوں حیدرآباد میں چیف میڈیکل آفیسر تھے۔ اس شادی سے خاندان میں ہلچل مچ گئی تھی۔ سروجنی کے ماں باپ اور خاندان والے بالکل راضی نہ تھے کیوں کہ نائیڈو جی نہ تو بنگالی تھے اور نہ برہمن۔ لیکن سروجنی نے سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر ڈاکٹر نائیڈو سے شادی کی تھی۔ ان کی بیاہتا زندگی بھی بڑی خوش حال تھی ان کے چار بچے تھے دو لڑکے جے سوریا، رندھیر اور دو لڑکیاں پدمجا اور لیلا منی ـــ وہ بڑی شفیق ماں تھیں اپنے بچوں سے انھیں بڑا پیار تھا اپنی شاعری میں انھوں نے اپنے بچوں کے لیے بھی بڑے میٹھے بول لکھے ہیں اپنے بڑے لڑکے کے لیے یوں دعائیں لکھی تھیں "جیسے کے سورج !! ایشور کرے تم شعر و شاعری کے بھی آفتاب بن جا

مسز سروجنی نائیڈو کی بڑی لڑکی پدمجا نائیڈو ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ تھیں تعلیم خانگی طور پر گھر میں ہوئی تھی چوں کہ وہ بچپن سے دائم المریض تھیں کسی اسکول یا کالج میں شریک ہو کر کسی مقررہ نصاب کی تکمیل نہ کر سکیں۔ پدمجا کی کئی باتیں اپنی ماں سے ملتی تھیں۔ ماں کی طرح وہ انگریزی زبان کی شاعرہ تھیں۔ شاعری کی طرح انھیں مصوری اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ کل ہند کانگریس کی دکن اور کانگریس کے اصولوں کی پابند تھیں۔ غریبوں اور مزدوروں کی بھلائی، ان کی خدمت انہیں مشغلہ تھا ان ہی خدمات کے مدنظر انھیں غریبوں اور مزدوروں کا لیڈر کہا جاتا تھا۔

لیلا منی نائیڈو، سروجنی نائیڈو کی دوسری بیٹی ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ محبوبیہ اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد آکسفورڈ سے بی۔ اے آنرز کی ڈگری لے کر ۱۹۲۸ء میں وطن لوٹیں اور لاہور کالج میں فلسفہ کی صدر بنیں۔ لیلا منی نائیڈو اس طرح حیدرآباد کی پہلی خاتون تھیں جو طبابت اور تعلیمات کے علاوہ کسی دوسرے کام پر مامور ہوئیں۔ انھیں بھی اپنی ماں اور بہن کی طرح انگریزی ادب میں عبور تھا۔ حیدرآباد کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے وہ کئی انجمنوں اور اداروں کی صدر اور نائب صدر کی حیثیت سے مصروف زندگی گذارتی تھیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتی تھیں۔ جن انجمنوں اور اداروں میں کام کرتی تھیں وہاں بلا خوف جرأت اور صداقت سے اظہار رائے کرتی تھیں یہ صفت انھیں دوسروں سے ممتاز رکھتی تھی۔ لیلا منی کا نام ان کی جرأت، صداقت، استقلال اور مستعدی کے لحاظ سے نمونہ اور مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

مسز نائیڈو اردو اور فارسی سے اچھی طرح واقف تھیں روان اردو بولتی تھیں۔ شعر فہمی اور سخن سنجی کا کا ملکہ تھا۔ بعض مرتبہ آپ اردو میں تقریر کرتی تھیں سب سے پہلی اردو تقریر وہ تھی جو "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کے پہلے سالانہ اجلاس ۱۹۰۵ء میں کی گئی تھی۔

سروجنی نائیڈو کہنہ مشق شاعرہ تھیں۔ ان کی نظموں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ذریعے مشرقی خیالات، مشرقی جذ

مغربی لباس اور مغربی رنگ میں اظہار ہوتا ہے ان کی نظموں میں حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کے ایسے ایسے انمول نمونے نظر آتے ہیں جن کی درخشانی اور تابناکی پڑھنے والوں کو متحیر کر دیتی ہے ان نظموں میں ایک طرف موذن کی اذاں، پجاری کے بھجن کا ترانہ گایا گیا ہے تو دوسری طرف کہاروں کے گانے، پالکی بردار کے گیت، فقیر کی صدا، سنترہ بیچنے والی کی آواز کو بھی لطیف اور پاکیزہ مضمون کی صورت میں بدل دیا ہے ان کی نظموں میں ... آستانہ، طائر وقت اور شکستہ پر قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری کی طرح آپ کی نثر بھی فصاحت و بلاغت آمیز ہوتی تھی۔ مسز سروجنی کو بہ حیثیت مقرر پیش کرنا بھی ضروری ہے آپ نہ صرف جادو بیان شاعرہ تھیں بلکہ فصیح و بلیغ خطیبہ بھی تھیں آپ تقریر نہیں کرتی تھیں بلکہ روانی ... اور زورِ بیان کے دریا بہاتی تھیں سروجنی نائیڈو حیدرآباد ہی کی نہیں بلکہ سارے ہندستان کی ایسی خاتون ... جنھوں نے امریکہ اور انگلستان میں تقریر کر کے اہلِ زباں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ بلبلِ دکن کی خوش نوائی، جادو بیانی نے تحسین و آفریں کے صدہا تمغے حاصل کئے تھے۔

مسز سروجنی کی سیاسی خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۳ء سے ہوا تھا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش سے اپنی سیاسی زندگی شروع کی تھی۔ اس اتحاد کے لیے بڑے سے بڑا کام کرتی تھیں اس کام کے لیے تھیں بھی موزوں۔ وہ اسلام کی بڑی عزت کرتی تھیں اور مسلمان بھی اُن پر بھروسہ کرتے تھے انھوں نے ایک عید پر لکھا تھا:۔

"وقت زندگی، تقدیر کے سرجن ہار
اے مہر و کرم والے / ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں
اَن تھک ہواؤں، اتھاہ سمندروں کے مالک / یا حمید، یا حفیظ

۱۹۲۲ء میں "کالی کٹ کانفرنس" کے وقت انھوں نے بتایا تھا کہ مسلمانوں کے کتنا بُرا برتاؤ ہو رہا ہے وہ جو ان کے حکمران تھے انھیں سچی بات بڑی کھلی۔ حکم دیا کہ سروجنی جی آئندہ سے پبلک میں تقریر نہ کریں مگر انھوں نے کر دکھایا کہ اُن کا کہنا سچ تھا۔ ۱۹۱۹ء سے آزادی کی لڑائی میں سروجنی دیوی مہاتما گاندھی کے ساتھ تھیں جب ... سلسلے میں مہاتما گاندھی کو جیل جانا پڑا تھا تو انھوں نے سروجنی سے کہا تھا کہ "میں بھارت دیس کے اتحاد کو ... سپرد کرتا ہوں"۔ ۱۹۲۵ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدر بنیں، یہ ہندستانی عورت کے لیے پہلا ... تھا اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں بھی وہ انڈین نیشنل کانگریس کی ایک سال کے لیے کارگذار صدر رہیں ... ء میں گاندھی جی نے جو نمک ستیہ گرہ کی تھی، اس کی وہ سرگرم رکن بھی تھیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تھا اس وقت سروجنی کی عمر (۶۸) سال کی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ ... نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بڑا کٹھن کام کیا تھا پھر بھی بھارت دیس تقسیم ہوا تو انھیں بڑا دکھ ہوا۔ ... چاہیے کہ اُن دنوں میں سروجنی کو آرام ملنا چاہیے تھا اس لیے انھیں اتر پردیش کا گورنر بنا دیا گیا۔ آزاد ہندستان کی پہلی خاتون تھیں جو اعلیٰ عہدہ پر پہنچ سکیں۔ ایک دن ہنس کر کہا تھا "میں دیس میں گورنر نہیں بلکہ گورنس (والک سیوک)

ہوں، یہ بات سچ بھی تھی) لیکن یہ ایک دن دیکھا گیا کہ انھوں نے بڑے پیار سے ایک دکھیا بچی کی آنکھ سے آنسو پونچھے تھے۔

حیدرآباد میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا، مسز جلماپلے، مسز یم کے پلے، عظمت النساء بیگم (دختر ممتاز یار الدولہ) مسز صوفی، مسز راجہ وینو گوپال پلے، مسز رستم جنگ، بیگم خدیو جنگ نے سروجنی کے ساتھ ملک کی سماجی سیاسی اور معاشرتی بیداری میں حصہ لیا تھا۔

فروری ۱۹۴۹ء سے بیمار رہنے لگیں، بیماری کچھ زیادہ نہ تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ دیس کی سیوک کا آخری وقت آگیا ہے۔ بیمار ہونے کے کوئی ۱۵ دن بعد ۲؍ مارچ ۱۹۴۹ء کو وہ اس دنیا سے سدھار گئیں۔ مرنے سے کچھ گھنٹے پہلے انھوں نے اپنی نرس سے کہا تھا کہ "کچھ گا کر سناؤ" اور پھر ہمیشہ کی میٹھی نیند سو گئیں۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ ان کا مرنا دیس کے لئے ایک عظیم نقصان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرد دماغ ہوتا ہے اور عورت دل۔ وہ دل و دماغ دونوں تھیں۔ جب ہی سروجنی نے دیس کے بیٹے اور بیٹی دونوں کو سمیٹا۔

ملک بھر میں ان کی صد سالہ سالگرہ کی تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ حیدرآباد میں بھی ان کی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ سب سے پہلے ۱۳؍ فروری ۱۹۷۹ء کو حیدرآباد یونیورسٹی گولڈن تھریشولڈ (جو سروجنی کی رہائش گاہ تھی) میں گورنر چیف منسٹر اور وائس چانسلر حیدرآباد یونیورسٹی کی جانب سے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

۱۷؍ فروری ۱۹۷۹ء کو انگلش ڈپارٹمنٹ عثمانیہ یونیورسٹی نے ۲ روزہ سمینار منعقد کیا تھا۔ جس میں ملک کی ممتاز شخصیتوں نے ان کی بے لوث خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تعلیمات پر عمل کئے جانے پر زور دیا ●●

سردار الہام

سحر

اذاں کی وہ صدا اٹھی
درا کی وہ ندا اٹھی
نمازی اٹھ کھڑے ہوئے
مسجدوں کے در کھلے
ہیں شیخ اور برہمن
عبادتوں میں غوطہ زن
امیر چونک کر اٹھے
اٹھے، پھر اٹھ کے سو گئے
پرند بھی چہک اٹھے
گلاب بھی مہک اٹھے
پروں کو جھاڑتا ہوا
پرند بھی کھڑا ہوا
وہ شاخِ گل پہ بیٹھ کر
وہ چیخ کر، پکار کر
سنا رہا ہے داستاں
زباں میں اپنی بے زباں
کبھی ہے گل کو چومتا
کبھی کبھی ہے جھومتا
نسیم زور سے چلی
تو جھومنے لگی کلی
ستارے چل کھڑے ہوئے
روانہ قافلے ہوئے

المیہ اور مداوا

آج آندھرا پردیش کے طوفان زدہ ساحلی اضلاع کے بیشتر علاقوں میں صبح کے ابھرتے ورج کی کرنوں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ہری بھری اور سرسبز و شاداب فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ متاثرہ حلی اضلاع گنٹور اور کرشنا کے علاقوں میں رہائشی مکانات کی تعمیر خشت بہ خشت منزل بہ منزل ی کے ساتھ جاری ہے۔

ہلاکت خیز طوفان باد و باراں کی تباہ کاریوں کے بعد شروع کئے جانے والے ہمہ رخی بازآبادکاری پروگرام کی بدولت قدرت کے غضب کے شکار مایوس عوام میں امید کی کرن نمودار ہوئی۔

"بے گھروں کے لئے گھر" اب محض دلوں کو گرمانے والا نعرہ نہیں ہے۔ طوفان سے متاثرہ لاقوں میں یہ ایک زندہ حقیقت بن گئی ہے۔ چیف منسٹر ریلیف فنڈ اور رضاکارانہ تنظیموں کی اد سے تعمیر شدنی مکانوں کی مقصود تعداد ۲۰۰۰۰ میں سے اب تک ۱۳ ہزار مکانات کی تعمیر کام شروع کیا جا چکا ہے۔ ساحلی اضلاع میں جابجا طوفان سے بچاؤ کے لئے سلسلہ وار سائبانوں کی یر کو فوقیت دی جا رہی ہے۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

35/78-

بہتر رسل و رسائل کی سہولتیں

ہماری دیہی معیشت کو بڑھاوا دینے کی غرض سے ریاست آندھرا پردیش کے تمام اندرونی علاقوں میں واقع دیہاتوں کو بہتر رسل و رسائل کی سہولتیں فراہم کرنے پر زور دیا گیا۔ آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن (اے پی ایس آر ٹی سی) نے سال رواں کے دوران میں مزید ۱۱۳۷ دیہات کو بھی سہولتیں مہیا کی ہیں۔

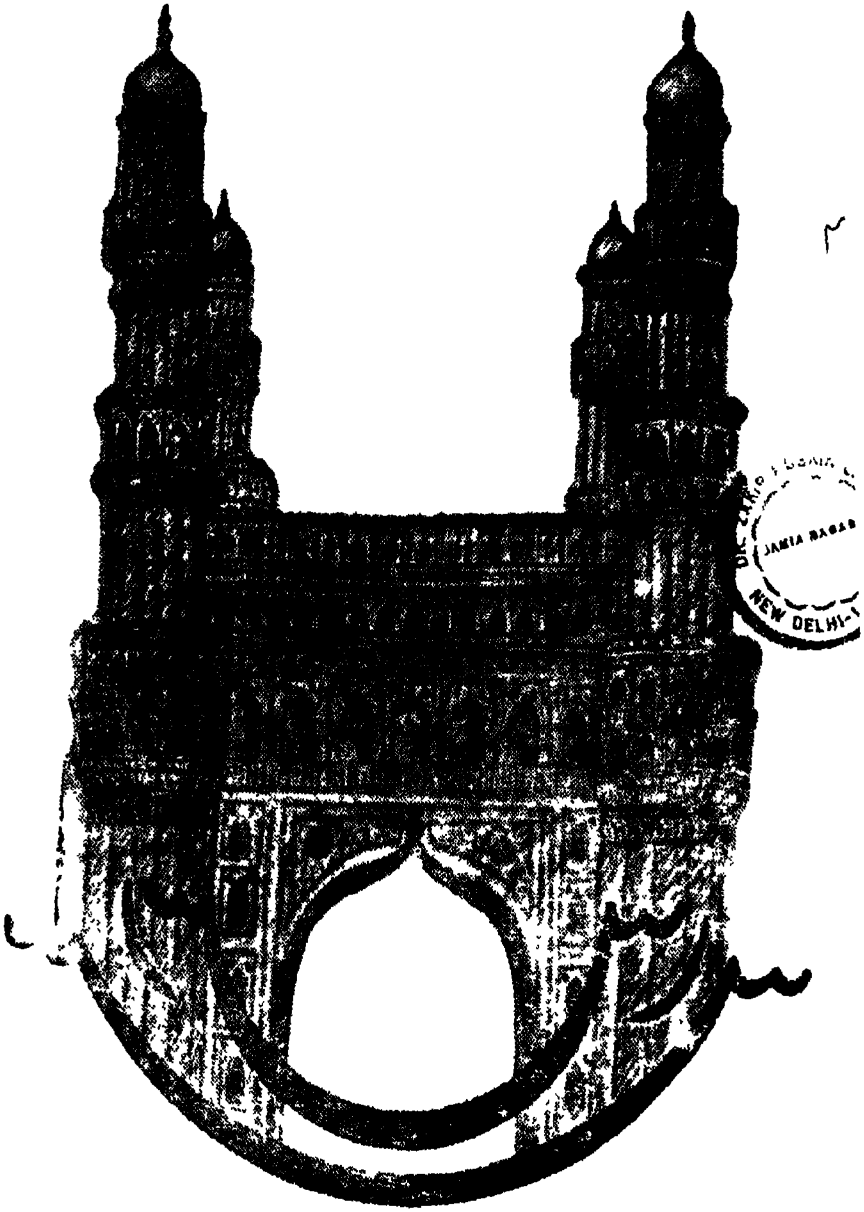
۲ / اکتوبر ۱۹۷۸ء کو دیہاتوں کو جوڑنے والی ٹرانسپورٹ اسکیم کا آغاز کیا گیا اس کے تحت ۱۱۲۱۳ مزید مواضعات کو جملہ ۷۷۷ بس روٹس سے جوڑ دیا گیا۔

مستقبل قریب میں زیادہ سے زیادہ دیہاتوں کو اس اسکیم کے تحت لایا جائے گا آج ہمارے دیہاتوں کو رسل و رسائل کی بہتر سہولتیں دستیاب ہیں۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

37/78-79

سب رس



یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

سن اجراء : ۱۹۳۸ء
فون : ۳۸۴۶۹

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

ڈاکٹر مغنی تبسم (معتمد مجلس مشاورت و مدیر اعزازی)   وقار خلیل (معاون مدیر)

جلد : ۴۲
شمارہ : ۳
مارچ ۱۹۷۹ء

زر سالانہ : ۲۰ روپے ، ششماہی : ۱۰ روپے
فی شمارہ : ایک روپیہ پچھتر پیسے

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
مقام اشاعت : ادارۂ ادبیات اُردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ترتیب

آندھرا پردیش کی بدلتی ہوئی معیشت

قدرت نے ریاست آندھرا پردیش کو بے پناہ وسائل عطا کئے ہیں۔ محل وقوع کے اعتبار سے یہ ریاست ملک کے بیچوں بیچ واقع ہے اور اس کی جدید صنعتی بنیادیں ہندوستان کے کونے کونے سے صنعتکاروں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔

۷۸۴ کروڑ روپے کے متاثر کن سرمائے سے قائم کردہ ۲۶۰ کے برابر متوسط اور بڑی صنعتیں ریاست کے صنعتی حالات کو از سر نو بدل رہی ہیں۔

۲۳۲ کروڑ روپے کی لاگت سے ، کاکی ناڈا میں قائم کردہ کیمیائی کھاد کا کارخانہ ۱۹۸۱ء سے پیداوار دینا شروع کردے گا۔ ۷/ جولائی ۱۹۷۸ء کو صدر جمہوریہ ہند نے اس کارخانہ کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ اس کارخانے میں ۴ر۹۵ لاکھ ٹن یوریا پیدا کیا جاسکے گا جس سے سالانہ ۹۰ کروڑ روپے حاصل ہوں گے۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

اپنی بات

علمی و ادبی رسائل کو آئے دن گوناگوں مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ کاغذ کے دام قابو سے باہر ہوگئے ہیں، اچھی کتابت گراں ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ ادبی موضوعات پر جم کر لکھنے والوں میں "جمود" کی سی کیفیت طاری ہے۔ صرف "شاعری" دستیاب ہے مگر کمیت کے لحاظ سے اس میں سپاٹ پن اور یکسانیت کی فراوانی نظر آتی ہے۔ ایسے حالات میں ریسرچ میگزین کو باقاعدگی سے شائع کرنا بڑا صبر آزما معلوم ہوتا ہے۔

"سب رس" بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہے، اچھی تخلیقات کی دستیابی میں معروف قلم کاروں کا تعاون تو ہمیں حاصل ہے۔ مگر بڑھتے ہوئے طباعتی مصارف کو برداشت کرنا کارِ دشوار نظر آرہا ہے۔

مجبور ہوکر ہمیں "سب رس" کے زرِ سالانہ میں اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اُمید ہے ادبی رسائل کے شیدائی فراخ دلی سے اِسے قبول کرلیں گے اور مزید اپنے حلقۂ احباب میں سب رس کے خریدار بنانے کی مہم میں ہماری معاونت کریں گے۔

مارچ اور اپریل کے مشترکہ شماروں کی تخلیقات میں تنوع، عصریت اور نقد و نظر کی بصارت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی ژرف نگاہی بھی آپ کو محسوس ہوگی۔

"سب رس" کا معلنہ خصوصی شمارہ ترتیب کے مراحل میں ہے، ہم اُسے اسم با مسمّٰی بنانا چاہتے ہیں تاکہ اُردو کی بقاء اور ترویج و ترقی کے تمام مسائل کا احاطہ ہوسکے۔

وقار خلیل

رحمٰن ثاقب

عصمت چغتائی کا ناول "معصومہ" ایک مطالعہ

عصمت چغتائی اپنے مخصوص نسوانی طرز، اپنی بے باکی، اپنے باغیانہ انداز، حقیقت نگاری، رندانہ جرأت اور جراحی عمل کے لئے اُردو فکشن میں ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہیں۔ بمبئی میں مقیم ہونے کے بعد انہوں نے زیادہ تر اپنی کہانیوں میں بمبئی کے ماحول کو پیش کیا ہے اور یہاں کی سماجی و معاشی زندگی کے ساتھ ساتھ فلمی زندگی ـــ جو شہر بمبئی کا ایک اہم جز ہے ـ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ناول "معصومہ" کا موضوع بھی یہی ہے۔ "معصومہ" میں ان کے نفسیاتی اور سماجی مطالعہ کی گہرائی ملتی ہے ـــ اس ناول میں بورژوا طبقہ کی عکاسی کی گئی ہے بڑے بڑے گھرانوں، فلمی ڈائرکٹروں، پروڈیوسروں، سرمایہ داروں اور ان کے ساتھیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔

معصومہ ناول کی ہیروئن کا نام ہے وہ ایک معصوم لڑکی ہے جس کو حالات نے نیلوفر بائی بننے پر مجبور کیا۔ ناول، معصومہ کی زندگی اور اس کے گاہکوں کے حالات پر مشتمل ہے اس ناول کا پلاٹ منضبط نہیں۔ اس میں مختلف قسم کے واقعات، ایک ہی شخص سے متعلق ہیں اور ان واقعات میں ایک دوسرے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ معصومہ عرف نیلوفر بائی کا واسطہ مختلف اشخاص سے پڑتا ہے۔ نیلوفر کے مختلف گاہکوں کے ذریعہ عصمت چغتائی نے اس ناول میں بمبئی کے مختلف تاریک گوشوں کو منظرِ عام پر لایا ہے اور بمبئی کی مجرمانہ زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس میں احمد حیاتی جیسے عورت کے بھوکے انسان بھی ہیں جو نیلوفر جیسی لڑکیوں کو محض اپنی جنسی تسکین کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اسی کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور سورج مل جیسے تاجر جو عورت کو اپنے بزنس کی ترقی کا آلہ کار بناتے ہیں۔ ان کے لئے عورت محض نوٹ چھاپنے کی ایک مشین ہے اس کے ساتھ ساتھ ہمیں احسان میاں جیسے دلال بھی نظر آتے ہیں اور راجہ صاحب جیسے حکومت کے غدار جن کی ریاست جمہوری سرکار کی نذر ہونے کے بعد گول مول کاروبار سے حکومت کو دھوکا دے کر اپنی سلطنت چھین لینے کا بدلہ جمہوریت سے لے رہے تھے۔ عصمت چغتائی کرنل جیسے غدار اور عیاش افسروں سے بھی ہمیں متعارف کراتی ہیں جن کا رسوخ سرکاری محکموں میں باوجود ان کے عہدے سے مستعفی ہونے کے ہنوز برقرار رہتا ہے اور محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنا ایمان، اپنا دھرم، اپنا دیس، یہاں تک کہ اپنا ضمیر اپنی روح اور اپنے آپ کو بیچنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ نیلوفر ان عیاش لوگوں کا کھلونا بن کر اپنے اور اپنے خاندان کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتی رہتی ہے۔ ناول کا پلاٹ انہی اشخاص اور واقعات پر مشتمل ہے

ناول کی ابتداء میں نیلوفر کے فلیٹ کی رہنمائی کرتے ہوئے عصمت چغتائی نے گرو گر نتھ کے استعمال پر بھرپور طنز کیا ہے جہاں دن میں راک اینڈ رول کے گیت اور شام میں فلمی دھنوں پر بھجن گائے جاتے ہیں وہ لکھتی ہیں:۔

"اور جب گرو گرنتھ کے استعمال سے "لال لال گال اور ریشمی شلوار" کی تانیں سنائی دیتی ہیں تو انسان خواہ مخواہ خدا کی

ذات بابرکات کا قائل ہوجاتا ہے اس کی شان نرالی ہے وہ چاہے تو پتھر پر پھول کھلا دے اور مندروں مسجدوں میں راک اینڈ رول بجوا دے"۔

یہاں عصمت چغتائی نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو عبادت گاہوں کو عیش کے اڈے بناتے ہیں دنیا بھر کے کالے دھندے ان عبادت گاہوں کے ذریعہ کئے جاتے ہیں۔ یہاں لوبان بھی جلتا ہے اور شراب کی خوشبو بھی مہکنے لگتی ہے یہاں دیوتاؤں کی شان میں بھجن بھی گائے جاتے ہیں اور دیویوں کے لال لال گالوں اور ریشمی شلواروں کے گن بھی گائے جاتے ہیں، غرض یہاں پاپ اور پن پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔

ناول میں سب سے پہلے معصومہ کی ماں بیگم اور احسان میاں کے کرداروں سے متعارف کرایا جاتا ہے بیگم کا تعلق حیدرآباد کے نوابی خاندان سے ہے۔ اپنے خاوند کے ٹھکرانے کے بعد چار بچوں کا بوجھ لئے تلاشِ معاش کی خاطر بمبئی آتی ہیں۔ احسان میاں، بیگم سے معصومہ کے پہلے گاہک احمد بھائی کا تعارف کراتے ہیں تو بیگم شتابہ بن جاتی ہیں مگر چار مہینے کا مکان کا کرایہ، نوکروں کی تنخواہ، بنیے کا قرضہ، بجلی کا بل، دھوبی کی دھلائی، بچوں کی فیس ان تقاضوں نے بیگم کی عزت و آبرو کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اب بیگم کی خاندانی جھجک نے دم توڑ دیا۔ پانی سر سے گزر جاتا ہے تو بیگم اپنی لڑکی کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ یہاں سے بیگم کے کردار میں تبدیلی شروع ہو جاتی ہے وہ حالات کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی باتوں میں بازاری رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ "امراؤ جان ادا" کی خانم کی طرح وہ منجھی ہوئی نائیکہ بن جاتی ہیں۔ پیشے کے ساتھ ساتھ گو قدرت نے ضرورت کے لحاظ سے خود کچھ دیکھا دیئے تھے جب وہ چاندی کی پٹاری سامنے رکھے گلوریاں بناتیں تو بس سارنگی کی گنگناہٹ اور طبلے کی تھاپ کی کسر رہ جاتی تھی۔ خانم کے چکلے اور بیگم کے مکان میں صرف یہی ایک فرق تھا کہ وہاں بسم اللہ جان کے علاوہ اور بھی بہت ساری طوائفیں تھیں جہاں باقاعدہ موسیقی کا درس دیا جاتا تھا آئے دن مجرے ناچ گانے ہوا کرتے تھے۔ خانم کا چکلہ ایک ایسا مرکز تھا جہاں لکھنؤ کے زوال آمدہ نواب اپنا شوق پورا کرنے کے لئے آتے تھے۔ مگر بیگم کا مکان صرف نیلوفر تک محدود ہے۔ "امراؤ جان ادا" کے نوابوں کی جگہ "معصومہ" میں سرمایہ دار طبقہ نے لی۔ خانم کی طرح بیگم بھی نیلوفر کے ذریعہ احمد بھائی سے کپڑے اور زیوروں کی فرمائشیں کراتی ہیں مگر جب احمد بھائی کا بیڑہ غرق ہوتا ہے تو جس طرح خانم نواب چھبن کے کنگال ہونے پر انہیں دھتکارتی ہیں اسی طرح بیگم بھی احمد بھائی کے ساتھ بڑی بے مروتی برتتی ہیں آگے چل کر بیگم نیلوفر کے گاہکوں کا ایک منجھی ہوئی نائکہ کی طرح خیال رکھتی ہیں اور اپنے اور اپنے خاندان کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہتی ہیں۔

احسان میاں کا کردار بمبئی کے ان دلال پروڈیوسروں کی نمائندگی کرتا ہے جو جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو بمبئی کے سرمایہ داروں کی آغوش میں پہنچا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں احسان میاں ایک طرف دلالی کرتے ہیں دوسرے وہ فلم پروڈیوسر بھی کہلاتے ہیں۔ فلم میں کام کرنے کے شوق میں جو لڑکیاں بمبئی آتی ہیں انھیں یہ اپنا شکار بناتے ہیں اور ایسی لڑکیاں جو حالات سے مجبور ہو کر ذریعہ معاش کی تلاش میں بمبئی آتی ہیں احسان میاں جیسے دلالوں کے جنگل میں پھنس کر طوائفوں کی زندگی گزارتی ہیں۔ بمبئی میں آج بھی ایسے بہت سے خاندان مل جائیں گے جن کی پرورش اسی قسم کی طوائفیں کرتی ہیں۔ معصومہ کو بھی احسان میاں اپنا شکار بناتے ہیں بیگم کو بمبئی میں پناہ دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بیگم تین لڑکیوں کی ماں تھیں۔

معصومہ کا کردار شریف گھرانوں کی معصوم لڑکیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو حالات کا شکار ہو کر طوائفوں کی زندگی گزارنے لگتی ہیں پہلی دفعہ جس دن احمد بھائی نے معصومہ کو اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہا تو معصومہ ان کے قابو میں نہیں آتی اور نہایت ہی بُرے

سلوک کرتی ہے بیگم کے سمجھانے کے بعد ہی وہ یہ راستہ اختیار کر کے نیلوفر بائی کہلاتی ہے احمد بھائی کا کردار بمبئی کے دولت مند گھرانوں کے عیاشی لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے شریف گھرانوں کی مجبور لڑکیوں کو پھانستے رہتے ہیں ان کے سر پر نیلوفر کے عشق کا بھوت بری طرح وار دتھا وہ نہایت ہی بھونڈے قسم کے شخص ہیں۔ نیلوفر کے عشق میں طرح طرح کی ذلتیں سہہ لیتے ہیں۔ نیلوفر کا ضیعہ طرح طرح کے حکم دیا کرتی ہے۔ زمین پر ناک رگڑنا، کتے کی طرح بھونکنا، گدھے کی بولی بولنا۔ نیلوفر کا پھینکا ہوا جوتا اپنے دانتوں سے پکڑ کر لانا اور اس کے پیروں میں پہنانا ان کا معمول بن گیا تھا۔ یہ واقعات ہمیں "امراؤ جان ادا" کی بسم اللہ جان کی یاد دلاتے ہیں۔ اور یہاں نیلوفر کا کردار بسم اللہ جان سے بالکل قریب ہو جاتا ہے جس طرح مولوی صاحب بسم اللہ جان کے لئے ایک کھلونا تھے اسی طرح نیلوفر بھی احمد بھائی کو ایک کھلونا سمجھ کر ان سے کھیلتی رہتی ہے۔ احمد بھائی کی طرح مولوی صاحب بھی بسم اللہ جان کے عشق میں بری طرح پھنسے ہوئے تھے جب بسم اللہ جان انھیں درخت پر چڑھنے کا حکم دیتی ہے تو انھیں اپنی زندگی سے زیادہ بسم اللہ جان کی دل جوئی کا خیال رہتا ہے۔ ستر سال کی عمر میں زیتون کی تسبیح چھوڑ کر اونچے درخت پر چڑھ جاتے ہیں مگر بسم اللہ جان کا دل نہیں توڑتے اسی طرح احمد بھائی بھی نیلوفر کا دل بہلانے کے لئے اس کے ہر حکم پر اپنا سر تسلیم خم کرتے رہتے ہیں۔

نیلوفر منوہر میں دلچسپی لینے لگتی ہے جو عمر میں اس سے چھوٹا تھا وہ اپنے آپ کو منوہر کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرتی ہے عصمت چغتائی نیلوفر جیسی لڑکیوں کی نفسیات سے خاص واقفیت رکھتی ہیں۔ یہاں جین آسٹین کی طرح انہوں نے نیلوفر کے جذبات کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔

نیلوفر کی زندگی میں سورج مل اور راجہ صاحب جیسے سرمایہ دار بھی داخل ہوتے ہیں دراصل عصمت چغتائی نے سورج مل اور راجہ صاحب کے کرداروں کے ذریعہ ان عمر رسیدہ سرمایہ داروں کے کالے کرتوتوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو پشتوں سے اناج میں کنکر ملاتے آئے ہیں۔ آٹے میں سفید لکڑی کا برادہ، گھی میں چربی اور ہلدی میں گیہو کے پھول ملانے کا فن جانتے ہیں۔ جو گھر میں حسین اور پڑھی لکھی بیویوں کی موجودگی میں محض منہ کا مزہ بدلنے کے لئے نیلوفر جیسی دو چار لڑکیوں کو رکھیل بنا کر رکھتے ہیں جو ان لڑکیوں کو بزنس میں بھی استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس کی بچت ہوتی ہے ایسی لڑکیوں کو اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے آغوش کی زینت بنا کر اپنے کاروبار میں سہولتیں فراہم کرتے ہیں جو اپنے کارخانوں کے منافع سے اپنی تجوریوں میں پیسہ بھر کر ملک کی مجموعی دولت بڑھانے اور ملک کو منفعت پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں جو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضرورت پڑنے پر خون خرابے سے بھی نہیں چوکتے۔ جو غریب مزدوروں کے جھونپڑے جلانے سے بھی باز نہیں آتے اور فرقہ وارانہ فسادات کرانے سے نہیں جھجکتے اور دوسری طرف اس خون خرابے کی زکوٰۃ کے طور پر اناتھ آشرموں میں دان دیا کرتے ہیں۔

ہوٹل کے منیجر کا کردار نیلوفر کے کردار کے ارتقاء کے لئے لایا گیا ہے اور ان سرمایہ داروں کے گناہوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اپنی عیاشیوں کو پورا کرنے کے لئے اس قسم کی ہوٹلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔

نیلوفر ان سرمایہ داروں کا آلہ کار بن کر ان کے آغوش گرما کر اپنے خاندان کی ان داتا بنتی ہے۔ اسی ناول میں سرمایہ دار طبقہ اور اس کے بنائی ہوئی سماجی قدروں پر بھرپور طنز کیا گیا ہے

عصمت چغتائی کے مرد کردار عموماً مکار، بے وفا، بداخلاق اور بدکردار ہوتے ہیں جیسے "معصومہ" کے احمد بھائی، سورج مل، راجہ صاحب، احسان میاں، کرنل وغیرہ۔ ان کی عورت اس کے برعکس ہے ان کے نسوانی کردار مردوں سے باوفا رہتے ہیں مگر مرد کی

بے وفائی انھیں غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے "معصومہ" کی بیگم اپنے میاں کے ٹھکرانے کے بعد ہی احسان میاں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرتی ہیں اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے معصومہ بانو کو نیلوفر بائی بناتی ہیں۔ اسی طرح "ٹیڑھی لکیر" کا ثمن بھی افتخار کی بے وفائی اور مکاری کے بدلے کی آگ شاہد انجنیر، پروفیسر رحمن، اور کامریڈ صمد کے پہلوؤں میں ٹھنڈی کرتی ہے "ضدی" میں پوران کی بیوی شانتا بھی اپنے پتی کی بے رخی کی وجہ سے اپنے ایک عزیز کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے "عجیب آدمی" کا دھرم دیو اپنی بیوی منگلا کی بجائے زرینہ جمال پر مہربان ہوتا ہے تو منگلا اسماعیل کو فریدی کی آغوش میں غلط کرتی ہے۔ غرض ان کے نسوانی کردار بڑے جگر دار اور مردمار ہوتے ہیں۔ وہ ابتدا میں مرد کے زیر اثر ہوتے ہیں لیکن جلد ہی وہ موقف حاصل کرتی ہیں کہ مرد ان کے پیروں کی جوتی بن جاتے ہیں ناک گھسنے لگتے ہیں۔ یہ کردار عورت کی بے بسی کے انتقام کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں وہ بدکار اس لئے ہیں کہ دنیا انھیں نیک اور اچھا رہنے نہیں دیتی۔ ان کے ماحول کو زہر آلود کر دیتی ہے اس کی بہترین مثال نیلوفر کا کردار ہے ناول ختم کرنے کے بعد معصومہ کے کردار کا اثر ہمارے ذہن پر دیر تک قائم رہتا ہے

ناول "معصومہ" کے مکالمے آسان زبان میں تحریر کئے گئے ہیں اس کا صحیح اور برمحل استعمال کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ناول کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے مکالمے ناول کے واقعات میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ انہیں وہاں سے علحدہ کرنا ممکن معلوم نہیں ہوتا ہے عصمت چغتائی نے بمبئی کی روزمرہ بول چال کی زبان کو فطری انداز میں پیش کیا ہے مخصوص کردار کے منہ سے مناسب مکالمے کہلواتی ہیں۔ نیلوفر ہو کہ احمد بھائی، احسان میاں ہوں کہ راجہ صاحب، فلم پروڈیوسر ہوں کہ سورج مل، ہر ایک اپنے اپنے طرز میں گفتگو کرتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔

عصمت چغتائی کے ناولوں میں جو مقبولیت "ٹیڑھی لکیر" کو ملی وہ ان کے کسی دوسرے ناول کو نصیب نہیں ہوئی۔ .. "مگر "ٹیڑھی لکیر" کے مقابلہ میں یہ ایک کمزور تخلیق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ "معصومہ" میں دراصل بورژوا طبقہ کی عکاسی کی کوشش کی گئی ہے یہ میدان عصمت چغتائی کا نہیں بلکہ قرۃ العین حیدر کا ہے عصمت چغتائی نے متوسط طبقہ کو قریب سے دیکھا ہے اسی کی عکاسی میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے اور اس طبقہ کے ماحول اور گھریلو معاشرت کو بڑے ہی کامیاب انداز میں پیش کرتی ہیں غرض یہی وجہ ہے کہ نسبتاً "ٹیڑھی لکیر" کے "معصومہ" ان کی کمزور کوشش ہے۔ ▲▼

اعلان: بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند، فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر کا نام: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات، حیدرآباد ۴۔
پرنٹر: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی

پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔ ۴
پبلشر کا نام: سید علی اکبر۔
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔ ۴
نام و پتہ مالک: ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔ ۴

میں، سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔ دستخط (سید علی اکبر)

محمد عبدالکریم ماہرؔ

مرزا داغؔ دہلوی کی فضیحت رنگ کے باعث

نواب مرزا خاں دہلوی نے ایک رئیس گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ابھی ہوش سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ۸ ۔ ۹ سال تک اپنی خالہ کی آغوش میں رہے۔ جب ان کی والدہ کا عقد بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے ہوا تو قلعۂ معلی پہنچے۔ وہاں ان کی تعلیم و تربیت شہزادوں کے ساتھ ہونے لگی۔ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے دن گزرنے لگے۔ اسی رنگین اور شاعرانہ ماحول نے ان کو حسن و جمال کا شیفتہ اور شعر و سخن کا گردیدہ بنالیا۔ وہاں ان کی طبع رسا کے جوہر خوب چمکے۔ شہرت اور مقبولیت عامہ نے ان کے قدم چوم چوم لیے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے چند سال قبل مرزا فخرو کا انتقال ہوا اور غدر کے بعد سلطنت مغلیہ نے آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیا۔ دلی کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اور بہت سے صاحب کمال لوگوں نے جدھر سینگ سمائے ادھر کا راستہ لیا۔

داغ کی ماں کشمیرن تھیں۔ باپ دادا سرخ و سفید رنگ والے بخارا کے باشندے تھے۔ بلند قامت اونچی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں ان کو اپنے بزرگوں سے ملی تھیں مگر قدرت نے انہیں چمپئی رنگت دی تھی جو بعد میں سیاہ ہوگئی۔ (زبان داغ ص ۱۳۵)۔ اس رنگ کی وجہ سے ان کو بارہا خفت اٹھانی پڑی۔ اکثر محفلوں میں ان کا یہی رنگ مرکز توجہ بن جاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ان کے جذبات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے خود بھی اپنے کئی اشعار میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

داغ کی شکل دیکھ کر بولے — ایسی صورت سے پیار کون کرے
وہیں سے داغ سیہ بخت کو ملی ظلمت — جہاں سے حضرت موسیٰ کے ہاتھ نور آیا
پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں — جلا کے خاک نہ کردوں تو داغؔ نام نہیں

ایک دفعہ داغ ایک جلسے میں پہنچے جہاں ایک صاحب بہادر بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ داغ کی جوانی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں شوخی بھری ہوئی تھی۔ اس انگریز نے مرزا صاحب سے ہاتھ ملایا اور یہ سمجھ کر کہ انگریزی جانتے ہوں گے کچھ سوال کیا۔ مرزا صاحب نے تڑاق سے اسی لہجہ میں جواب دیا۔ اس انداز سخن سے متعجب ہوکر صاحب بہادر نے اردو زبان میں پوچھا آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ مرزا نے جواب دیا امریکہ کا باشندہ ہوں۔ وہ ان کے رنگ روپ پر غور کرنے لگا تو مرزا بولے آپ میری رو سیاہی پر نہ جائیے۔ میں نے سمندری سفر بہت کیا ہے۔ میرے رنگ کو

دھوپ، سمندر کی آب و ہوا نیز جہاز کے دھوئیں نے سیاہ کر دیا ہے۔ مرزا صاحب کے اس جواب پر جلسہ میں زور دار
کا قہقہہ بلند ہوا اور صاحب بہادر بھی ہنس پڑے۔ (بزم داغ صفحہ ۲۳۱)۔

داغ غدر کے بعد تلاش معاش میں رام پور گئے۔ اور درباری شاعر مقرر ہو گئے۔ چند سال بعد داروغہ اصطبل بنے۔ ایک خط میں خود انھوں نے صراحت کی ہے کہ وہ داروغہ اصطبل نہیں تھے بلکہ بہت سے داروغہ ان کے ماتحت تھے اور ان کا عہدہ اہلکار معتمد ریاست و معتمد سرکار تھا۔ (زبان داغ صفحہ ۲۷)۔ داغ خود داروغہ رہے ہوں خواہ معتمد سرکار لیکن اصطبل سے ان کا تعلق مسلم ہے۔ بعض اہل رام پور ان کے اعزاز و اکرام سے جلنے لگے تھے چنانچہ جب وہ پہلی بار ایک عہدہ دار کی حیثیت سے اصطبل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھا جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

شہر دہلی سے آیا ایک مشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

مشکی سیاہ گھوڑے کو کہتے ہیں ظاہر ہے کہ شعر داغ کی ہجو میں تھا۔ ان کے اور گھوڑے کے رنگ کی مناسبت سے ایسی خوبصورت لفظی رعایت سے کام لیا گیا تھا کہ داغ بھڑک اٹھے۔ پھر مشکی کا داغ ہونا بڑی گہری چوٹ تھی۔ داغ نے شاعر کے بارے میں بہت کچھ پوچھا لیکن پتہ نہ چلنے پر اعلان کر دیا کہ وہ شاعر سے کچھ باز پرس نہیں کریں گے۔ بلکہ اس کی جودت طبع پر اظہار خوشنودی کریں گے۔ لیکن شاعر کا پتہ نہیں مل سکا۔ بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یہ شعر میر اللہ علی رسا رام پوری شاگرد شیخ علی بیمار کا تھا۔ (بزم داغ صفحہ ۵۲ بحوالہ بابت جنوری و فروری ۱۹۵۳ء)

رام پور میں قیام کے دوران بھی داغ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے اور خوب داد سخن پاتے تھے۔ ایک دن نواب صاحب رام پور نے اپنے ایک مصاحب خاص نواب عبداللہ خاں سے پوچھا "داغ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے"
"جواب ملا" تیتڑے میں گلاب بھرا ہوا ہے"۔ (بزم داغ صفحہ ۶۱)

مطلب، یہ کہ صورت تو کالی ہے مگر باطن گل ہائے معانی کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔

داغ کا رنگ عوام کی طرح خواص میں بھی سرمایہ تفریح و تفنن بنا ہوا تھا۔ امیر مینائی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے
دلی میں یادگار قدما مخدومی جناب کرم اللہ خاں صاحب شیدا نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک زمانہ تھا کہ حضرت حالی یہاں موجود تھے۔ مرزا (داغ) انہیں ایام میں رام پور سے رخصت لے کر دلی آئے۔ مولانا (حالی) نے کوئی رقعہ مرزا کو بھیجا اور اس کے سرنامہ پر حافظ کا یہ شعر لکھ دیا

آں سیہ چردہ کہ شیرینی عالم با اوست چشم میگوں لب خنداں دل خرم با اوست (مکاتیب امیر مینائی صفحہ ۲۰۰)

مطلب۔ وہ سیاہ فام شخص جس کو دنیا جہاں کی شیرینی ملی ہے نشیلی آنکھیں تبسم ریز لب اور خوش و خرم دل بھی اسی کا حصہ ہے۔ دیکھئے کس لطیف پیرایہ میں طنز کیا گیا ہے۔

خاں بہادر رتنی محمد خاں خورجوی نے اپنی آپ بیتی "سرد و رفتہ" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس میں داغ سے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ داغ حیدرآباد جانے سے پہلے خورجہ بھی گئے۔ وہاں دو پٹھان چھیڑنے کی غرض سے ان سے ملے۔ ایک نے

کہا کہ یہ میرے ساتھی شاعر ہیں اور دلی تخلص کرتے ہیں کلام سناتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اجازت ہو تو ان کا کلام میں سناؤں۔ اجازت ملنے پر انھوں نے کہا یہ غزل آپ کی غزل ـــ

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں   سناؤں درد دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

کی زمین میں کہی گئی ہے۔ چند شعر سنا کر یہ مقطع سنایا۔

دلی کو رو برو میں آنا داغ کا ایسا قیامت ہے   کہ جیسا پھنس گیا ہو جس طرح مکڑی کے جالے میں

اس واقعہ کو لکھتے ہوئے خاں بہادر نے لکھا ہے کہ "داغ نے غزل کے بعض اور شعر سن کر داد تو دی لیکن مقطع سن کر ہنسے اور خاموش ہو گئے" (داغ از تمکین کاظمی)

دراصل داغ رام پور کی ملازمت ترک کرنے کے ارادے سے رخصت لے کر دلی چلے گئے تھے وہاں سے انھوں نے حیدرآباد کا رخ کیا جو اس زمانے میں بھی علوم و فنون اور شعر و ادب کا بڑا مرکز تھا۔ کچھ عرصہ بعد آصف جاہی دربار میں رسائی ہوئی۔ نواب میر محبوب علی خاں نظام سادس نے ان کے نام ماہانہ (۴۵۰) روپیہ کا وظیفہ استقراری اثر کے ساتھ حیدرآباد آنے کی تاریخ سے منظور فرمایا۔ یہ وظیفہ بعد میں ایک ہزار روپے ماہانہ کر دیا گیا اور انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی۔ حضور نظام ان سے مشورۂ سخن بھی کرنے لگے۔ داغ کو یہاں کافی عیش و آرام کی زندگی میسر ہوئی چنانچہ انھوں نے اپنے ایک شعر میں اپنے سکونتی مکان واقع محلہ افضل گنج کو "عیش منزل" کہا ہے۔

داغ کے حیدرآباد آنے کے ابتدائی ایام کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن سیاہ چوگوشیہ ٹوپی پہنے جس پر سونے کی ایک پٹی ٹنک رہی تھی کھلے ٹاپ کی بگھی میں بیٹھ کر گٹی سے گزر رہے تھے۔ چند نوجوانوں نے جو وہاں چہل قدمی کر رہے تھے داغ کو دیکھ کر کسوٹی پر سونے کی تحریر کی پھبتی اڑائی۔ داغ تک یہ بات پہنچی تو انھوں نے تعارف حاصل کرنے کے لیے ان نوجوانوں کو مدعو کر لیا اور ان کی پھبتی کو اپنے لیے فال نیک سمجھا۔

داغ کی حیدرآباد میں آمد سے چند سال قبل (سنہ ۱۹۰۲ء میں) پارسی تھیٹریکل کمپنی آئی تھی جس کے ناٹک بہت پسند کیے گئے تھے۔ اس کے جانے کے بعد یہاں کے چند کاروباری اور شوقین اشخاص نے نواب شمشیر جنگ بہادر کی سرپرستی میں ایک ناٹک کمپنی قائم کر لی۔ برق، داد، تجلی، زخمی، امیر حمزہ وغیرہ مکالمہ نگاری اور دوسرے کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں ناٹک دیکھنے یا اس سے کوئی تعلق رکھنے کو نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے لوگ چھپ چھپ کر آتے جاتے تھے۔ ایک روز کوئی خاص کھیل تھا اور داغ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ داغ نے سادہ شیروانی پہنی، رام پوری ٹنگڑ شملہ باندھا، منہ پر ڈھاٹا لپیٹ کر ہاتھ میں ایک لٹھ لیے تھیٹر پہنچے۔ اسٹیج کے سامنے خصوصی مہمانوں کے لیے صوفے پڑے تھے بڑے اعزاز و اکرام سے داغ کو وہیں بٹھایا گیا۔ نہیں معلوم بڑی رانی نام کی اداکارہ کو داغ کے آنے کی خبر تھی یا کیا کرا نے داغ ہی کی یہ غزل چھیڑ دی ـــ

ترے وعدے کو بت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے   کبھی شام ہے کبھی صبح ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے

چونکہ رانی کو اداکاری اور ترنم دونوں میں خاص مہارت تھی اور رنگا تی بھی خوب تھی سماں بندھ گیا ـــ

کبھی دیکھو تو سر رہگذر کہ تڑپتے کتنے ہیں خاک پر — نہ چل ایسی چال تو فتنہ گر کوئی یہ بھی طرز خرام ہے

اس شعر کو گاتے وقت اس نے بتا تا بھی شروع کر دیا اور البیلی چال سے حاضرین کے دلوں کو پامال کرنے لگی تو عجیب حال ہو گیا ۔ داغ تو بس جھومنے لگے ۔ اس نے مقطع پر گایا تو نہ صرف داغ کو مخاطب کیا بلکہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر انہیں کی طرف بتاتی بھی گئی ہے ۔

دل و دیں کا جس کو نہ پاس ہو یہی نامراد ہے دیکھ لو — جسے داغ کہتے ہیں اے بتو اسی رو سیاہ کا نام ہے

داغ کالے تھے ہی اسی پر تاسی رنگ کا رام پوری صافہ اور قد بھی ماشاء اللہ کافی لمبا پھر اس خیال سے کہ عوام پہچان نہ لیں ڈھاٹا بھی باندھ رکھا تھا اس لیے تمام لوگوں کی نظریں انھیں پر پڑنے لگیں اور خود داغ کے احباب نے بھی ونس مور " ونس مور (مکرر ۔ مکرر) کے شور سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا اس سے حاضرین اور وہ خود بھی بہت محظوظ ہوئے ۔ (داغ از تمکین کاظمی)

رام پور میں محض سیاہ رنگ کی وجہ سے داغ کو مشکی گھوڑا کہا گیا تو وہ پی گئے نور جہ میں بھنسا کہا گیا تو سکوت اختیار کر لیا ۔ حیدرآباد میں طوطی پر سونے کی تحریک کی پھبتی اڑائی گئی تو خندہ پیشانی سے اس کو خوش آمدید کہا ' پھر حیدرآباد ہی کے ایک اسٹیج سے ان ہی کی ایک ایسی غزل گائی گئی جس کے مقطع سے ان کی تضحیک اور فضیحت کا پہلو نمایاں تھا تو وہ وہاں سے بھی مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے ۔ غرض محض جسمانی رنگ کی وجہ سے بار ہا ان کی ہنسی اڑائی گئی مگر کیا مجال کہ وہ کسی پر بگڑے ہوں یا ان کی تیوریوں پر بل آئے ہوں ۔ ۵۵

- - - - - - - - - -

زور مرحوم کی اُردو دوستی ، خوش ذوقی اور تن دہی سے میں واقف تھا ۔ لیکن اُن کے قائم کئے ہوئے **ایوان اردو** کو دیکھ کر تو آنکھیں کھل گئیں اور جتنا وقت اس وسیع و شاندار عمارت کے اندر گزرا ' یہ یاد ہی نہ آنے پایا کہ اردو بھی اس وقت کوئی مظلوم زبان اور ہر طرح کے جور و ستم کی شکار ہے ۔

اور تو اور اس طلسم زار میں قدم رکھ کر یہ بھی پتہ چلنے نہیں پاتا کہ اُردو دنیا کی کسی بھی متمدن و متمول زبان سے ' ہیٹی یا کسی سے کچھ قدم پیچھے ہے ۔

اس چار دیواری کے اندر اُردو کلچر کی ایک پوری دنیا آباد ہے ۔ اللہ اکبر!

بابائے اُردو کا لقب مولوی ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے لئے مختص ہو چلا ۔ ورنہ زور مرحوم بھی اپنے کرامات کے لحاظ سے اس لقب کے کچھ کم مستحق نہیں ۔

ادارۂ ادبیات اردو کی وسعت اور بو قلمونی دونوں کا اندازہ دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے ' سننے سے نہیں ع " سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے "

۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء **مولانا عبدالماجد دریابادی**

قندِ مکرر

معمّہ

مخدوم محی الدین

یہ نظم "مجلّہ عثمانیہ" حیدرآباد (جلد ہشتم شمارہ اول و دوم ۱۹۳۵ء) میں چھپی تھی جبکہ مخدوم بی اے کے طالب علم تھے۔ "بساطِ رقص" (شعری کلیات) میں یہ نظم شامل نہیں ہے۔ (ادارہ)

ملائک نے مجھے سجدہ کیا تھا   خلافت کا نشاں مجھ کو ملا تھا
خدا نے روح پھونکی تھی بدن میں   اُسی کے خاص ہاتھوں سے بنا تھا
عطا کی خلعتِ شرف خلائق   بڑی بخشش تھی اک عالم صلا تھا
تمنائے الوہیت کا پیکر   عبودیت کے سانچے میں ڈھلا تھا
ملا میرے تھی بزمِ عرش پھیکی   یوں کہنے کو فرشتے تھے، خدا تھا
نہ پوچھو کُن سے پہلے کون کیا تھا   میں بندہ تھا، خدا تھا جو بھی تھا، تھا
مجھے پھینکا گیا اس خاک داں میں   جو آغوشِ الٰہی میں پلا تھا
مری لغزش سراپا بندگی تھی   کسی کا قہر اندازِ وفا تھا
وہی میں ہوں کہ انجام تباہی   وہی میں آفرینش کی بنا تھا
جہانِ تیرگی ہے اور میں ہوں   وہی میں عرش کا روشن دیا تھا

کوئی بتلائے کیا ہونا ہے آگے
کوئی کہہ دے میں کیا ہوں اور کیا تھا

دو غزلیں

ضیا ابن فیضی

سلجھتا کب، مری سعیِ دگر سے اور اُلجھا   ہُنر کا مسئلہ، عرضِ ہُنر سے اور اُلجھا
اسے تھی سارا اُجالا سمیٹنے کی ہوس   اُفق اُفق وہ بکھرتی سحر سے اور اُلجھا
صدف صدف حیفِ صد سنگریزۂ جاں تھی   بدن، شکستِ طلسمِ گہر سے اور اُلجھا
وہ چپ رہا، تو ہوا میں بھی بدگماں کیا کیا   ہوا رُکی، تو سفینہ بھنور سے اور اُلجھا
خمارِ فرصتِ واماندگی، عجب شئے ہے   سفر کا نشہ، مرے بال و پر سے اور اُلجھا
مجھے اڑاتی پھرتی بادلوں کی طرح ہوا   زمیں چھوٹی، تو میں رہ گزر سے اور اُلجھا
حصارِ گرد میں کیا لطف بے مکانی کا   میں رہ کے دشت میں دیوار و در سے اور اُلجھا
ترے وجود کے اسرار ہم پہ کب کھلتے   یہ عقدہ، ناخنِ اہلِ نظر سے اور اُلجھا
کہاں ٹھہرتے، کہیں پر کوئی پڑاؤ نہ تھا   سفر کا سلسلہ ختمِ سفر سے اور اُلجھا
بڑھی تو دھوپ، کہ جھگڑے چکا دے آپس کے   مگر وہ سایہ، اکیلے شجر سے اور اُلجھا
بہار دے گئی اک برگِ زرد کا تحفہ   دِل ایسے موسمِ نامعتبر سے اور اُلجھا

فضاؔ وہ میں نہیں، آؤں گرفت میں اُس کی
یہاں معاملہ نقد و نظر سے اور اُلجھا

ہم نے دیکھا نہ تھا موسم کوئی ایسا سرسبز   دل ہوا خوں، تو ہوئی کشتِ تمنا سرسبز
دھیان سے اس نے سنیں آج ہماری باتیں   اک زمانے پہ ہوا حرفِ تقاضا سرسبز
کیا کہوں تجھ سے کہ یاد آئے ہیں چہرے کیا کیا   عکس در عکس رہا آئینہ اپنا سرسبز
پھول راہوں میں کتر جاتی ہے رفتار اس کی   ہیں بہارِ رمِ آہو سے یہ صحرا سرسبز
جس کے دامن میں ترے قرب کی کلیاں چٹکیں   اب بھی ہے عمرِ گذشتہ کا وہ لمحہ سرسبز
درد کی آنچ میں تپ کر نکھر آیا چہرا   زندگی میں تھا کوئی نقش کب اتنا سرسبز
کون سی پیاس میں جلتا ہے، کوئی کیا جانے   موج در موج ہے، پھر بھی نہیں دریا سرسبز
ہر حقیقت ہے سلگتے ہوئے خوابوں کی طرح   آج تک ہو نہ سکا دیدۂ بینا سرسبز
چاہیئے عرضِ ہُنر کا بھی سلیقہ یارو!   لفظ سرسبز نہ اسلوب نہ معنیٰ سرسبز
دکھ اُٹھاؤ کہ ذرا لب کا تبسم نکھرے   تن جلاؤ کہ رہے ذہن کا پودا سرسبز
سوزِ احساس و بصیرت ہے بڑے کام کی چیز   شمع تو بجھ گئی، پھر بھی رہا شعلا سرسبز
یہ الگ بات کہ بے ذوق ہوں یوسف کی طرح   مری راتوں میں ہوا خوابِ زلیخا سرسبز
دے اب اوروں کو بھی یہ نیلمیں پیکر یارب   میں ہی کیوں زہرِ سخن سے رہوں تنہا سرسبز
ورنہ یہ راہ تو پہلے نہ تھی اتنی گلزار   ہم سفر تم ہو، تو ہیں نقشِ کفِ پا سرسبز

میں نے لکھا جو فضاؔ تذکرۂ عارض و لب
ہو گیا نخلِ قلم سارے کا سارا سرسبز

اسلم عمادی

آنکھ جلتی ہے بہت ، سانس تڑپتی ہے بہت
آج کی رات مری جان اندھیری ہے بہت

جانے کس موہ کی مایا تھی کہ ہم جی بھی لئے
آج سچ سمجھے کہ دنیا بھی یہ جھوٹی ہے بہت

نہ تو محفل ہوں، نہ جنگل ہوں، نہ کرتب گھر ہوں
زندگی مجھ میں اگر ہے تو اکیلی ہے بہت

یہ نہیں یاد کہ اکھڑے ہیں کئی جڑ سے درخت
پتہ ٹوٹا تو مری آنکھ بھر آئی ہے بہت

لوگ آواز و نوا مانگتے ہیں اور اسلم
ہم غریبوں کے لئے سانس بھی بھاری ہے بہت

بانو طاہرہ سعید

فراق و وصل میں کوئی نہ امتیاز رہے
خدا کرے کہ جنوں اتنا سرفراز رہے

تجھ ہی سے تیری محبت چھپائے بیٹھے ہیں
یہ راز راز ہے اے دوست راز راز رہے

کبھی تو ایک اُچٹتی نظر ادھر بھی پڑے
کبھی تو لطف و کرم چشمِ نیم باز رہے

سحر گزیدہ ہوں ، تاریکیاں ہیں مونسِ جاں
ہے آرزو ، شبِ ہجراں ذرا دراز رہے

بگڑتے کام بنے ، بار بار ایسا ہوا
نہ جانے ہاتھ تھے کس کے جو کارساز رہے

ہوئے نہ طاہرہ ، مرعوب 'وقت' سے ہرگز
زمانے آئے 'گئے' ہم تو بے نیاز رہے

غزلیں

سیدہ منجو قمر یداللہی

تمباکو

سنہ ۱۴۹۲ء میں جب کولمبس نے امریکہ کی نئی دریافت کی اسی سن کے آس پاس ضلع ہوانا کے موضع ورجینا میں جو جنوبی امریکہ میں میری لینڈ بحر اٹلانٹک کے جنوب میں واقع ہے وہاں کی سرخ قوم کو تمباکو کی کاشت کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ ورجینا کے گرجا گھروں کے پادریوں نے تمباکو کا پتہ پیس کر اس کی ناس کو مذہبی رسم کی طرح سونگھنا شروع کیا۔ ورجینا کی صرف مرطوب سرزمین کا ایک تنگ خطہ تمباکو کی کاشت کے لئے موزوں قرار دیا گیا۔ کیوں کہ اس سرزمین میں ریت، چونا، تمباکو، کیلسیئم پوٹاشیم کی بہتات ہوتی ہے، جہاں رطوبت اور مطلوبہ طبعی حرارت پائی جاتی ہے۔ اسی سرزمین سے تمباکو کا پودا کیوبا[۱]، فلپائن، ملیشیا، پہنچایا گیا اور آخر کار سنہ ۱۵۸۵ء[۲] میں ڈریک نامی ملاح نے یہ پودا انگلستان لے گیا، وہاں کے لوگوں نے ورجینا گرجا گھروں کے پادریوں کی طرح پہلی پہل ناس سونگھنی شروع کی۔ پھر سگار، سگریٹ ایجاد کئے لیکن پوپ ہشتم اور پوپ نہم نے تمباکو کے چھوٹے چھوٹے پتوں پر تحریر کرکے آپس میں جان پہچان والوں سے خط وکتابت شروع کی۔ جو بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ پودا ترکی اور اس کی آس پاس کی ریاستوں میں پہنچا تو وہاں کے باشندوں نے ضروری چھان بین کے بعد تمباکو کی کاشت کرنی شروع کر دی۔ لیکن حکومت ترکستان نے تمباکو کے مضر اثرات کو نظر میں رکھ کر بچوں کو اس کا استعمال ہرگز نہ کرنے کی ہدایت کی بلکہ قانوناً ممنوع قرار دیا۔ ڈاکٹر پیرس لکھتا ہے ترکی نے تمباکو کے استعمال کو "جرم عظیم" قرار دیا۔

کم و بیش ایک مدت کے بعد انگریز تاجروں نے ہندوستان کو تمباکو سے واقف کرایا۔ سب سے پہلے مدراس کی حکومت کے تھر ترچنا پلی میں انہوں نے ایک مرطوب تنگ خطہ سرزمین کو تمباکو کی کاشت کے لئے موزوں قرار دیا لیکن یہاں کا تمباکو اعلیٰ درجہ کا نہ ہو سکا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان نے گنٹور اور دیگر اقطاع ہند میں تمباکو کی کاشت کو فروغ دیا آج کل سالانہ بیس کروڑ روپیے کی تجارت ہوتی ہے۔ ابتداً کشمیر اور بنگال سے تمباکو کے معاوضہ میں دیگر اشیاء کے تبادلے کی تجارت شروع ہوئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے" تمباکو" کے تین اور نام مروج تھے۔ جیسے تماخو (دکنی)، تماکو (ہندی)، تنباکو (تلگو)۔ تمباکو (مذکر) اردو، مشہور پودا، جس کے پتے کاغذ میں یا آبنوس کے پتے میں لپیٹ کر سگریٹ، بیڑی یا حقہ میں پیتے ہیں۔ عام طور پر پان کے ساتھ (زردہ) کھاتے ہیں یا اس کے ساتھ گڑ ملا کر قلیان میں پیتے ہیں، صرف ہندوستان ہی کیا، دنیا جہان کے شوقین حضرات وخواتین مختلف طور سے حقہ، گڑگڑی، چلم یا وضعدار پائپ میں رکھ کر اس کے دھوئیں کے کش لگاتے ہیں،

ص۱ ؛ کیوبا کا سگریٹ بہتر ہوتا ہے۔ ص۲ ؛ اس وقت ہندوستان میں شہنشاہ اکبر برسراقتدار تھا

شاہانِ مغلیہ کے دور میں شاہی محلات سے ملحق ایک خاص کمرہ مختص کیا جاتا تھا جسے "بھنڈی خانہ" کہا جاتا تھا، جس میں اعلیٰ درجہ کا تمباکو محفوظ کیا جاتا تھا۔ بھنڈا بردار، قلیان (شاہی حقہ) میں گڑ، مکھن، خوشبودار خمیرہ گڑا کو ملا کر "بھنڈا" تیار کرتا اور شاہی دربار میں شہنشاہ بادشاہ کے حضور پیش کرتا۔ شہزادیوں کے لئے "تلخ کم" بھنڈا، خوبصورت برق انداز، یہ لفظ خاص براس جو حقہ بردار ہوتی، اس کے لئے کہا جاتا تھا جیسے توپچی کو میدانِ جنگ میں کہا جاتا ہے۔ جب "برق انداز" محل کے دالان میں آتی تو "برق انداز بہ آمد باد" کا نازک آواز میں خواص شور مچاتیں تو دیگر مامائیں حاضر ہو کر نیچہ تھام لیتیں اور "قلیان" شہزادیوں کے حضور پیش کیا جاتا۔ نیچوان پر سونے چاندی کے پتر پر گنگا جمنی کا کام کیا ہوتا تھا، جسے شہزادی نور جہاں نے ایجاد کیا تھا۔ اس جم جماتے نیچہ کو، جو جست کے تار اور معوج پتر سے لپٹا ہوتا تھا، مغلانی کے اشاروں کے مطابق خوب صورت خاص کنیزیں تھام لیتیں تو شور کی آواز سن کر "شاہی خواص" اپنے اپنے کمروں سے نکل کر یہ تماشا دیکھنے لگتیں اور طعنہ دیتیں کہ "بھاگ بھریاں" آنکلی ہیں۔ جب ان کی طعن کی بات شہزادی نور جہاں کے گوش گذار ہوئی تو اس نے قلیان بردار خادماؤں کو "نگارِ عالم" کے خطاب سے نوازا تھا تو خواص کی چولیوں کے کتے مارے خوشی کے نکل گئے تو وہ بولتیاں:
"کھادئے بیر کھایاں وہ بھی گنوایاں"

"جیسا کہ میں نے تمباکو کے چار نام اوپر گنائے ہیں تو "ماں کا پیٹ، کمہار کا آوا، کوئی گورا کوئی کالا" والی کہاوت سامنے آتی ہے کہ سب بچے ہیں تو ایک ہی ماں کی اولاد، لیکن ہر ایک کا رنگ روپ الگ الگ، اسی طرح تمباخو، تمباکو، تنباکو اور تماکو ان چاروں الفاظ کے لغوی معنی صرف تماکو کے ہیں لیکن املا اور تلفظ ہر لفظ کا جدا جدا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ادبائے اردو اور خاص طور پر بابائے اردو حضرت عبدالحق مرحوم نے لفظ "تمباکو" کو مقدم جانا اور رائج اردو کر لیا۔ جو آج تک مروج ہے۔ تمباکو کے سالم پودے یعنی جڑ سے لے کر اس کے پتے کی انی تک ہر چیز کو "تمباکو" کہتے ہیں۔ اس کے پتے جڑ اور ڈنٹل کے الگ الگ نام نہیں ہیں یہ سالم تمباکو کام آتا ہے۔ کیوں کہ اس کے ہی پتے میں جڑ اور نس نس کو لپیٹ کر خوب صورت سگار بنایا جاتا ہے۔ آبنوس کے پتے میں لپٹا ہوا یا تمباکو کے پتے ہیں۔ اگر تمباکو دیسی ہو تو اسے چوٹ بھی کہتے ہیں۔ چاول سے بنے ہوئے کاغذ میں تمباکو لپیٹ کر، سگریٹ بنا کر، اس کی انی میں صاف کی ہوئی روئی دبا دی جائے تو کہتے ہیں ایسا سگریٹ مضر نہیں ہوتا کہ دھواں چھن کر نکلتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ کسی نے کہا ہے:
"سگریٹ کا دھواں موت کا کنواں" یوں بھی ڈاکٹروں نے تصدیق کی ہے کہ دھوئیں کا تریاق (نکوٹین) دو اقسام کے جراثیم سے مملو ہوتا ہے۔ اعضائے انسانی پر سوت مضر اثرات مرتب کرتا ہے اور موجبِ "سرطان" بنتا ہے ●●

سب رنگ — اس عنوان کے تحت ہندوپاک کے معیاری ادبی رسائل وکتب سے مضامین نظم ونثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

آپ بیتی

احمد ندیم قاسمی

میں اپنی زندگی کے موٹے موٹے واقعات کو اتنی بار دُہرا چکا ہوں کہ اب بار بار ان ہی کی تجدید (تکرار) معلوم ہوتی ہے۔ اپنے قلم سے اپنے حالات زندگی کبھی تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے مگر یہ تفصیل سوانح نگار کی وسعت چاہتی ہے اور اس کے لئے مہینوں کی فرصت چاہیئے جو ان دنوں ناپید ہے۔ البتہ میں اپنی آپ بیتی کے ضمن میں اپنی چند یادیں اور محسوسات پیش کئے دیتا ہوں جن کی میری زندگی سے وابستگی عیاں ہے، محسوسات کا یہ مجمل تذکرہ تسلسل سے محروم نہیں۔

میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جس کے افراد اپنی روایتی وضع داری نباہنے کے لئے ریشم تک پہنتے تھے اور خالی پیٹ تک سو جاتے تھے، بقول غالب ؎ خول خوردنم نہفتہ و می خوردن آشکار

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مدرسہ جانے سے پہلے میرے وہ آنسو بڑی احتیاط سے پونچھے جاتے تھے جو اماں سے محض ایک پیسہ حاصل کرنے میں ناکامی کے دکھ پہ بہتے تھے لیکن میرے لباس کی صفائی، میرے بستے کا ٹھاٹ اور میری کتابوں کی "ٹیپ ٹاپ" کسی سے کم نہ تھی۔ گھر سے باہر احساس برتری طاری رہتا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سارے آبگینے ٹوٹ جاتے تھے، جنھیں میری طفلی کے خواب تراشتے تھے، پیاز، یا سبز مرچ یا نمک مرچ کے مرکب سے روٹی کھاتے وقت زندگی بڑی سفاک معلوم ہونے لگتی تھی اور جب میں اپنے ہی خاندان کے بچوں میں کھیلنے جاتا تھا تو آنکھوں میں ڈر ہوتا تھا اور دل میں غصہ۔ خاندان کے باقی سب گھرانے کھاتے پیتے تھے۔ زندگی پر ملمع چڑھائے رکھنے کا تکلف صرف ہمارے نصیب میں تھا۔ والد گرامی پیر تھے، یادِ الٰہی میں کچھ ایسی استغراق کی کیفیتیں طاری ہونے لگیں کہ مجذوب ہو گئے اور جن عزیزوں نے ان کی گدی پر قبضہ جمایا، انہوں نے ان کی بیوی، ایک بیٹی، دو بیٹوں اور خود ان کے لئے کل مبلغ ڈیڑھ روپیہ ماہانہ (جس کے نصف بارہ آنے ہوتے ہیں) وظیفہ مقرر کیا، تین پیسے روزانہ کی اس آمدنی میں اماں مجھے روزانہ ایک پیسہ دینے کے بجائے میرے آنسو پونچھ لینا زیادہ آسان سمجھتی تھیں اور آج جب میں اپنی نظموں اور افسانوں کے معاوضے کا کچھ حصہ ہر مہینے ان کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تو وہ رو دیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ میں روتی تو جب بھی تھی مگر وہ آنسو میرے اپنے تھے، مگر اب جو رو رہی ہوں تو یہ وہ آنسو ہیں، جنھیں میں تم دونوں

کی آنکھوں میں قتل کردیتی تھی کہ گھرانے کی عزت پر پانی نہ پھر جائے۔

گھرانے کی اس عزت کے احساس نے مجھے وقت سے پہلے حساس بنادیا۔ ممکن ہے اسی گداز نے مجھے فنکار بنادیا ہو۔ اگر بچپن میں ماں کی محبت نہ ملتی تو یہ ممکن ہے آج میں نہایت خطرناک قنوطی اور قنوطی ہوتا لیکن عالم یہ تھا کہ جب ہم بھائی بہن اپنی اماں کا ہاتھ بٹاتے، وہ چرخہ کاتتیں اور ہم پونیاں بناتے، وہ چکی پیستیں اور ہم مل کر گیت گاتے، بہرحال جب ہم سب اکھٹے ہوتے (والدگرامی ۱۹۴۲ء میں انتقال فرماگئے تھے)، اور بارش ہونے لگتی تو اماں دہلیز کے پاس بیٹھ جاتیں، ہم تینوں ان کے آس پاس گھس جاتے۔ باہر آنگن میں بلبلے انگنت گنبدوں کا فرش بچھاتے اور آنگن کی بیریوں کے پتے اڑتے ہوئے اندر ہمارے پاس آجاتے اور باہر گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے پرنالوں کے نیچے نہاتے اور چلاتے تو اماں ہمارے سر پہ ہاتھ پھیرتیں اور روتیں اور بڑے دکھ سے آپ ہی آپ کہتیں: "بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے، اے پاک فرشتو، خدا کے دربار میں جاکر مجھ دکھیا کی طرف سے عرض کرو کہ میں نے جو دکھ بھوگنے سو بھوگے، ان میرے بچوں کو کوئی دکھ نہ دینا، میں نے انھیں بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے، یہ پڑھیں لکھیں اور نیک اور لائق بنیں اور دنیا میں نام پیدا کریں، اللہ ان کی قسمتوں کے کانٹوں کو پھول بنادے اور یہ نہ ہوسکے تو یہ کانٹے میری قسمت میں لکھدیں۔ یہ بچے میرا اثاثہ ہیں۔ یہ بچے میرا غرور ہیں۔ مال تو سب تیرا ہی ہے پر تو نے مجھے یہ مال عطا فرمایا ہے تو بس اتنا کر کہ میں ان کا دکھ نہ دیکھوں۔ بوند بوند کے ساتھ فرشتہ اترتا ہے اور میں بوند بوند کو پکار رہی ہوں۔ میری پھٹی پوروں اور کٹی ہوئی ایڑیوں کی لاج اب تیرے ہاتھ میں ہے یارب العٰلمین۔" پھر وہ کوئی آیت کریمہ زیر لب پڑھتیں اور ہم تینوں پر "چھو" کرتیں، اور یہ "چھو" ہوتے ہی زندگی کی ڈالیاں پھولوں سے لد جاتیں، پھاروں اور چھکاروں کا ایک طوفان امڈ پڑتا اور ہم موسلا دھار بارش میں ناچتے کودتے اپنی بیریوں کے بیر چننے کے لئے بھاگ جاتے۔ آپا پکارتیں: "کیڑا ہے بیر میں۔"

اور میں گول مٹول احمد شاہ ناچتے ہوئے اپنی بھدی آواز میں گاتا: "کیڑا ہے بیر میں، دانہ ہے ڈھیر میں، رتی ہے سیر میں، کھا جاؤ۔"

"تم اصل میں میراثی ہو،" بھائی جان کہتے، "تمہیں تو ہم نے رحم کھا کر اپنے گھر میں رکھ لیا ہے۔ تمہیں ایک روز چیل پنجوں میں دبائے اڑائے لئے جارہی تھی، ابا کو رحم آگیا، چیل سے چھین کر تمہیں اپنے ہاں ڈال لیا، پر جب سے تم نے بولنا سیکھا ہے سب کو معلوم ہوگیا ہے کہ تم "ڈھاڈھی" ہو، کوئی سی بات بولو، اس کا گانا بنا لیتے ہو سور۔"

"گانا گالیتے ہو سور، کھانا کھالیتے ہو سور، پھانا کھا لیتے ہو سور، دھانا دھا لیتے ہو سور، ٹھانا ٹھالیتے ہو سور،" یہ فہل رو جب ہی رکتی، جب بھائی جان بیر کی گٹھلی تاک کر میری موٹی سی ناک پہ مارتے اور میں ایک دردمند فریادی بن کر اماں کے حضور اپنی بیگناہی ثابت کرنے چلا جاتا۔

مجھے زندگی میں بے انتہا محبت میسر آئی ہے۔ بھائی کی محبت، بہنوں کی محبت، محبوبہ کی محبت، دوستوں کی محبت، میری ادبی کاوشوں کو سراہنے والوں کی محبت، لیکن میں ماں کی محبت کا اس لئے سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں

ہ اس محبت نے مجھے پتھر نہیں بننے دیا، اگر میرے ادب میں PATHOS کا کہیں وجود ہے تو یہ میری اماں کی دین ہے۔ ور اگر میں انفرادی دُکھ کے حصار سے نکل آیا ہوں تو یہ بھی اماں کی دین ہے۔

نو برس کی عمر میں مجھے اماں سے الگ ہو کر تعلیم کے سلسلے میں کیمبل پور جانا پڑا۔ چچا جان وہاں سیول آفیسر تھے انہوں نے ہم دونوں کی تعلیم کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض سنسان دوپہروں کو ہم دونوں بھائی ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آکر بیٹھ جاتے۔ اور رو رو کر اماں کی باتیں کرتے پھر اچانک بھائی جان کو یاد آجاتا کہ وہ مجھ سے دو برس بڑے ہیں، وہ میرے آنسو پونچھتے، مجھے تسلیاں دیتے، مجھ پر زیادہ رقت طاری ہو جاتی تو غصہ بھی ہو جاتے، پیٹ بھی ڈالتے۔ مگر ان ہی بھائی جان نے۔ مجھے ایک دن مجھے اپنے پاس بلایا۔ "شاہ ذرا ادھر تو آؤ۔" میں ان کے پاس گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور ہر طرف کتابیں بکھیر رکھی تھیں۔ "پلنگ پر آجاؤ۔" میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "شاہ!" انھوں نے کہا: "اماں یاد آ رہی ہیں آؤ روئیں۔" "چلئے شروع کیجئے۔" میں نے کہا۔ وہ بھرے بیٹھے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے میں نے زار زار ان کا ساتھ دیا اور جب ہم خوب رو لئے تو انہوں نے میرے آنسو پونچھے اور بولے: "بس اب جی ہلکا ہو گیا... ہو گیا نا؟" "ہو گیا" میں نے کہا اور ہو بھی گیا تھا سچ مچ۔

سو میری زندگی پر سب سے عظیم اثر میری اماں کا ہے۔ میرے آنسو بہنے میں اب اتنے جلدباز نہیں رہے۔ اب میں اپنے قلم اور اپنے عمل سے جی ہلکا کر لیتا ہوں اب جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دنیا کی بیشتر ماؤں نے اپنے بچوں کے لئے تو تے کی کالک سے روشنائی بنائی ہے اور بوند بوند کے ساتھ اترنے والے فرشتوں کو اپنے بچوں کے تحفظ کا واسطہ دیا ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ میرے جیسے اربوں کروڑوں بیٹیوں نے ایک پیسے کے حصول میں ناکامی کے دُکھ پہ آنسو بہائے ہیں اور ماؤں کی آغوش میں منہ چھپا چھپا کر روئے ہیں۔ جب میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوں کہ میں دھرتی کا بیٹا ہوں، دھرتی سب کی ماں ہے تو میرے احساسات میں تموج نمایاں ہوتا ہے میرے قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور میں ارتقائے حیات کی رفتار کی تصویریں اپنے شعروں اور کہانیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بالکل ایسی آسودگی محسوس ہوتی ہے جیسے ماں بیٹے سے کہے کہ بیٹا یہ میری ایڑی سے کانٹا تو نکال دو۔ اور بیٹا کانٹا نکال کر اسے سوئی کی نوک یا اپنی ہتھیلی پر رکھ کر زبانِ حال سے کہے کہ آج میں نے ایک بہت بڑی عبادت کی ہے!

میں جب اپنے بچپن کا تصور کرتا ہوں تو ماں کے بعد جو چیز میرے ذہن پر چھا جاتی ہے وہ حسنِ فطرت ہے۔ یقیناً میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مظاہرِ فطرت سے موانست کا یہ جذبہ کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوا، مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ جب بھی اپنا ماضی یاد کرتا ہوں تو لہلہاتے ہوئے کھیتوں، اُڑتے ہوئے بادلوں، ڈھلی ہوئی پہاڑیوں اور چکراتی، بل کھاتی اور قدم قدم پر پہلو بچاتی ہوئی پگڈنڈیوں کی ایک دنیا میرے ذہن میں آباد ہو جاتی ہے بھکڑ کے پھول کی جڑیں مٹھاس کا موتی، لانبی لچکتی گھاس کی چوٹی پر جانے کی کوشش میں چیونٹی سے بھی کہیں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی استقامت چٹختی ہوئی چٹانوں کی جھریوں میں سے پھوٹتے ہوئے جنگلی پھولوں کے پودے، گھنی پھلاہیوں کے سائے میں دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو دُور نیلے پہاڑ کے دامن میں آئینے کی طرح چمکتی ہوئی جھیل پر سورج کی کرنوں کی سڑک، بادل کی گرج کے ساتھ

تاپنے کی چادروں کی طرح بجھتے ہوئے پہاڑ، مکّی کے بھٹوں کے لانبے لانبے سنہرے بالوں میں مکّی کی مہک، یہ اور دوسری تفاصیل جو کبھی کبھی میرے افسانوں اور شعروں کا پس منظر بن جاتی ہیں۔ میری زندگی کے اسی دَور کا جمع کیا ہوا اثاثہ ہے جب میں وادیوں اور گھاٹیوں میں اُپلے چننے نکلتا تھا یا اپنے میلے کپڑوں کی پوٹلی لئے اونچی پہاڑیوں پر پیالوں کے سے تالابوں میں کپڑے دھونے جاتا تھا یا بعد میں مسان یا میانوالی یا خوشاب کے دُور دراز ریلوے اسٹیشن میری منزل قرار پائے اور سناٹے میں لپٹی ہوئی راتوں کو اونٹ کی گھنٹی یا خچر کے ٹاپوں نے چونکا چونکا دیا۔ اُس وقت میں بادل کی گرج سے بے طرح ڈرتا تھا۔ بجلی کے لشکاروں کے ساتھ ہی میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔ اور روتی آواز میں بھائی جان سے کہتا: "لالہ اب بادل گرجے گا؟" "ہاں!" وہ کہتے۔ "پھر؟" میں پوچھتا۔ پھر یہ گرج کسی نہ کسی طرح میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا ہی جاتی اور میں خوف زدہ ہوکر رو دیتا۔ اُس وقت تک مجھے مظاہرِ فطرت کے اس پہلو پر غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ لیکن بعد میں جب کڑک کا یہ خوف ایک دم میرے ذہن سے نکل گیا اور دوسرے لوگوں کو گھبراتا دیکھ کر مجھ میں مسکرانے کی ہمت آ گئی تو ایک بار . . . شاید کالج کے دنوں میں . . . مجھے یہ خیال آیا کہ کیا انسان کبھی عناصر پر قابض ہو سکے گا؟ پھر جب میں نے طوفان میں اُڑتے ہوئے چھپّر دیکھے اور سیلابوں میں گاؤں کے گاؤں کو ڈوبتا پایا اور جب کسی گھر میں بھڑکی ہوئی آگ کے شعلوں کو اوپر ہوا میں تالیاں بجاتے اور ناچتے دیکھا، جب میرا دُور کا ایک عزیز بیٹھے بٹھائے آسمان سے گرتی ہوئی بجلی کا شکار ہو گیا، جب کوئٹہ کے زلزلے میں میرے چند عزیز دوستوں کے رشتہ دار موت کے گھاٹ اُتر گئے اور جب میں نے یہ سنا کہ ان میں بیشتر تعداد بھول سے بچوں کی تھی، تب عناصر پر انسان کے قابض ہونے کا سوال ایک عزم بن کر میرے ذہن میں اُبھرتا تھا، مگر اُبھرا نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے کہ میں بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا اور خدا کا خوف اس سے آگے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتا تھا اور پھر چچا جان مرحوم کا یہ فرمان نہ خدا کے وجود کے بارے میں سوچنا تک کفر ہے۔ وہ بس! وہ کیوں ہے اور کیسے؟ یہ خیال صرف کافر ہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے میں نے اپنی ایک نظم "تذبذب" میں جو "جلال و جمال" میں شامل ہے کہا ہے ؎

خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک
کہاں خرد کی اڑانیں، حریمِ ذات کہاں

کہاں وہ زندہ و پائندہ حُسنِ لامحدود
میرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں

بہت آگے چل کر میرے ذہن میں یہ خیال گھر کر سکا جب انسان بڑے ناز سے ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم!
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم!

کہہ سکتا ہے تو پھر یہ کیوں نہ کہے کہ ؎

تو وقت ہے، روح ہے، بقا ہے
وہ حُسن ہے، رنگ ہے، صدا ہے

تو جیسا ازل میں تھا سو اب ہے
وہ ایک مسلسل ارتقا ہے

وہ ہر شے کی پلٹ رہا ہے کایا
انسان عظیم ہے خدا یا!

دراصل آج میرا جو بھی نظریہ ہے، وہ ایک دم میرے ذہن پر پھٹ نہیں پڑا، بلکہ میں نے اسے نہایت پھونک

...نک کو قدم رکھتے ہوئے بالکل تدریجی یا صحیح لفظوں میں بالکل جُز باتی انداز میں قبول کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں ...ذہب نہیں ہوں، میں مانتا ہوں کہ نظریہ بدلتا رہتا ہے، لیکن اس تبدیلی کا رجحان ... ارتقائی ہوتا ہے۔ نیچر سے میری ابتدائی معصومانہ محبت اور نیچر کے مظاہر پر قبضہ کرنے کا عزم ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فاصلہ ہے ...ن میں اس ... دوسرے پر کود کر نہیں پہنچا، شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں مجھے اپنا آج کا یہ شعر عزیز ہے کہ ؎

اب کیا ہے فرشتوں کے تعارف کی ضرورت　　انسان نے انسان کو پہچان لیا ہے

تو وہاں مجھے اپنے ماضی کی اس یادگار سے بھی نفرت نہیں کہ ؎

الٰہی! خیالوں کے خلوت کدے میں کوئی شعبدہ باز سا آبسا ہے
وہ پردے ہٹے، وہ کوئی مسکرایا، مجھے ہو بہو تو نظر آرہا ہے

ہمارے ملک میں طبقاتی شعور تو شاید صرف سائنٹفک تعلیم ہی سے پیدا ہو سکے اور اپنے مقدر پر راضی برضا ہو کر بیٹھے رہنے اور توکل کے عقیدے پر قناعت کر لینے کی نہیں، شاید انتہائی درجہ کی محنت ہی سے جڑ سکیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ غریبی اور امیری کا خوفناک تفاوت یہاں کے اوسط درجہ کے انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کا احساس عموماً جذباتی ہوتا ہے، اور انسان کڑھنے اور اپنے دل کو خون کرنے سے آگے کچھ سوچتا ہی نہیں، لیکن غریبوں اور میانہ طبقہ کے لوگوں کی امیروں سے نفرت ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ مذہبی اخوت آنکھوں سے اوجھل کر سکتی ہے اور نہ مقدر پرستی۔ دیہات میں تو یہ تفاوت اور بھی تیز نظر آتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہزار ڈیڑھ ہزار کی آبادی کا بلا شرکت ایک یا دو آدمی ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کے پسینے کی کمائی پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں نے جب پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو مناظرِ فطرت کے حسن اور اسلامی روایات کے طنطنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس معاشرتی اور معیشتی تفاوت نے بھی متاثر کیا اور میں رومانوں اور خوابوں سے اٹے ہوئے ذہن کا وہ چور دروازہ بند نہ کر سکا، جس میں سے آنکھوں دیکھی سفاک حقیقتیں اندر سرک آتی تھیں مگر اس وقت مجھ پر یہ حقیقتیں محض رقت کی کیفیت طاری کر سکتی تھیں اور میں اسی کیفیت کو اپنی کہانیوں میں نقل کر دیتا تھا۔ بہت بعد میں مجھے یہ سوچنے کا خیال آیا کہ فلاں غریب ہے تو آخر کیوں غریب ہے؟ فلاں نے اپنی بیٹی بیچ دی تو کیوں بیچ دی؟ فلاں نے چوری کی ہے تو کیوں کی ہے؟ فلاں بے گناہ نے تھانیدار کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچیں تو کیوں کھینچیں؟ او فلاں چپکے سے بیگار پر کام کرنے چلا گیا تو کیوں چلا گیا۔ اور جب میں نے سب کچھ سوچا تو ہر حقیقت کے پیچھے مجھے دیووں کی ہتھیلی چھنچھناتی سنائی دی۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا منکر نہیں ہوں، میں داڑھی مونچھیں منڈوا دینے یا ...ٹ پتلون پہن لینے کو مشرقی اقدار کی بے حرمتی نہیں سمجھتا، لیکن انسان سے محبت کرنے، خلوص برتنے، سچ بولنے، بے تعصب اور بے ریا رہنے، نڈر ہو کر سچائی کا اعلان کرنے اور ظالم کی طرف برسرِ بازار انگلی اٹھا کر ظالم کہہ دینے کو بہترین اخلاق تصور کرتا ہوں اور جب میں علی الاعلان سچ بولتا ہوں تو مجھے انسان کی روح کائنات پر پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ بہر کیف اخلاقی اور روحانی قدروں کا احترام کرتے ہوئے بھی میں نے یہی محسوس کیا کہ اگر انسانی طبقوں کا یہ تفاوت ختم ہو جائے یا اگر ایسا ہو کہ کوئی انسان کسی انسان کا محتاج نہ رہے اور ہر انسان محض اپنے لئے نہیں بلکہ ساری انسانیت کے لئے اچھے اچھے

کام کرے اور آدمی اپنی انفرادیت کی کچھ اس ڈھب پر پرورش کرے کہ اس کے پیش نظر ہمیشہ اجتماعی مفاد ہو تو جینے کا لطف آجائے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں اپنے علاقے میں مجھ سے جو کچھ ہوسکا، محض اس لئے کیا کہ ہمارے رہنماؤں کی تقریروں میں انسانی مساوات کی بہشتیں آباد ہوتی تھیں اور وہ ملیشیا پہنتے تھے اور ہمارے دیہقانی کارکنوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور جلسہ گاہ میں پہنچ کر بھی اپنے چہرے پر سے سفر کی دھول نہیں پونچھتے تھے میرا سیاسی شعور نابختہ تھا اس لئے میں دور تک نہ دیکھ سکا۔ اپنی ناک سے ذرا سا آگے دیکھ لینے کی ہمت بڑی آزمائشوں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ میں پشاور ریڈیو اسٹیشن میں پاکستانی نغمے لکھ رہا تھا، جب ایک پروگرام اسسٹنٹ نے ریڈیو اسٹیشن کی چھت پر چڑھ کر اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کئے اور اسٹیشن ڈائریکٹر نے سبز جھنڈا کھول دیا۔ یہ ۱۳ / اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ تھی اور اس وقت رات کے ۱۲ بجے تھے۔ دنوں تک میں سرشاری کے عالم میں رہا اور پھر ایک دن ریڈیو اسٹیشن سے واپس ہوتے ہوئے میں نے سڑک پر ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں دیکھیں اور بعد میں یہ بھی دیکھا کہ غیر مسلم عورتیں کپڑوں کی گٹھڑیوں کی طرح تانگوں میں ... ٹھونس کر بھگائی جا رہی تھیں اور میں نے ایک جلتے ہوئے گھر میں ایک بچے کی چیخیں سنیں اور پھر جب پشاور شہر میں ہندوؤں کے محلے کو آگ لگادی گئی تو میں صدر پشاور .... میں حواس باختہ بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا جب ایک دوست کی ننھی سی لڑکی میرے پاس بھاگی آئی، مجھ سے چمٹ گئی اور روتے ہوئے بولی :

"چچا جان! وہ دیکھئے آسمان جل رہا ہے!" آسمان جل رہا تھا، بچی نے غلط نہیں کہا تھا، آسمان جل گیا اور اس کی بجھی ہوئی راکھ انہی پر آکر گری جنھوں نے اسے دیا سلائی دکھائی تھی۔ میرے ذہن میں دھڑلے سے ہونے لگے۔ ملک کی سیاسی صورت حال نے مجھے قدم قدم پر جھکیرا ڈالا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں، ہم کہاں جا کر رکیں گے، اس وقت میں نے یہی استفہامیہ ایک رباعی میں منتقل کر دیا تھا ؎

کیا اپنا سراغ خود نہیں پاؤ گے؟ کیا پھر کوئی اجنبی بلا لاؤ گے؟
یہ راہ تو اس موڑ پہ مڑ جائے گی اے اہل وطن، کہو، کہاں جاؤ گے؟

امیر تیمور کے انصاف اور شہنشاہ اورنگ زیب کی نرم دلی اور عدل گستری اور بنو امیہ اور بنو عباسیہ کے دور کے بغداد کے امن و سکون کے بارے میں اب مجھ سے ریڈیو فیچر نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ میرا ایک ڈرامہ "شکست و فتح" ریڈیو پر خاصا مقبول ہوا ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ میں نے تیمور کی خوفناک شخصیت کو عدل و انصاف کے تخت پر بٹھاتے ہوئے اپنے ضمیر کی کتنی ... پکاروں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں آج بھی حضرت عمرؓ کا قصیدہ تک لکھنے کو تیار ہوں، میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زہد و تقویٰ کا معترف ہوں اور میں ٹیپو کی وطن دوستی سے پیار کرتا ہوں، لیکن جب مجھے دارا شکوہ پر ایک فیچر لکھنے کا حکم ملا اور میں نے اس فیچر میں اورنگ زیب کے مظالم کو ذرا واشگاف انداز میں بیان کیا تو "سنسر" چیخ اٹھے اور مجھ سے جواب طلبی ہوگئی۔ میں اپنے وطن کے گیتوں اور رقصوں کی کہانیاں پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے ہم وطنوں کی امنگوں اور ولولوں کی تصویریں کھینچنا چاہتا تھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہر روز نئے سے نئے فیچر کے ذریعہ اپنے رہنماؤں کو ان کے وعدے یاد دلاتا رہوں، مگر جب میں نے ان امور میں اپنے قلم کی نوک کو مڑا ہوا پایا تو میں پشاور سے بھاگ آیا اور لاہور میں آکر میں نے بہت کچھ لکھا اور اگرچہ مجھے یہ اعتراف

ہوئے ندامت سی محسوس ہوتی ہے، مجھ پر اور دوسرے ترقی پسند مصنفین پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے نئے وطن کی حقوں سے آنکھیں پھیر کر اندھا دھند لکھا۔ لیکن کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا وہ خداواد ، ورنہ اگر حکومت کے عتاب کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے ذی اقتدار طبقے کو نہایت کریہہ قسم کے ناسور اور نہایت گھناؤنے قسم کے دکھاتا تھا، صرف اس لئے کہ وہ ادھر بھی متوجہ ہوں، یہی تعمیری تنقید ہے، لیکن میں نے جھجک جھجک کر بھی جو کچھ لکھا، اس مجھے آخر کار جیل میں لا ڈالا، چھ مہینے تک میں یہی سوچتا رہا کہ مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا ہے، مجھے تو ابھی اپنا وہ شہ پارہ لفظوں منتقل کرنا ہے جو ذی اقتدار جماعت کی ناراضی کا صحیح جواز بن سکتا ہے، میں تو ابھی تک کھل کر بات کہنے کا انداز ہی سیکھ رہا تھا اور پہلے تو میرے ہموطنوں نے ہی مجھ پر فتوؤں کی بوچھار کر دی اور اس کے بعد ایک خوشگوار صبح کو میرے گھر کے دروازہ پر ا کے ایک انسپکٹر نے کہا: "یو آر انڈر اریسٹ۔" تو کیا اپنا شہ پارہ لکھ کر مجھے پھانسی کا منتظر رہنا چاہیے!

یہ چند بکھری ہوئی یادیں تھیں۔

جو اپنی شخصیت کو دوسروں پر ٹھونسنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے ادب کے پس منظر کو ذرا سا واضح کر دینے کے لئے میں نے یہ ماحول' کے ارشاد کی تعمیل میں قلمبند کر دیں۔ میں نے ابھی کچھ بھی تو نہیں لکھا۔ چند نظمیں، چند غزلیں اور چند کہانیاں لکھ ئی اپنے ان فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو گیا۔ جو ہر باشعور اور غیرت مند انسان کی طرح مجھے بھی تفویض ہوتے ہیں۔ میں ے اور فن کی شاہراہ کا ایک مسافر ہوں۔ بہت دور سفر کرنے کے ارادے ہیں اور مجھے اعتراف ہے کہ میں ابھی ابتدائی مراحل طے نہیں کر سکا۔

زندگی کا حسن اور کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت، یہ اور بے شمار سری باتیں، ابھی میرے ذہن میں پک رہی ہیں، تکمیل کا دعویٰ نہیں۔ فن کی تکمیل کا دعویٰ فن کی توقیر نہیں ں، فن کار کی موت ضرور ہے اس لئے طالب علم کہنے سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور مزید جستجو کا ذوق تازہ ہوتا ہے۔ چھتیس برس کا ہونے کو آیا ہوں۔ شادی شدہ ہوں، دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام ناہید ہے اور ایک کا اط ، معاش کی مصیبتیں بے شمار ہیں مگر اب مجھے مصیبتوں سے بھڑتے رہنے اور بھڑتے ہوئے مسکرانے اور ر ہنے کا ڈھنگ آ گیا ہے۔ اس لئے بڑے مزے سے زندہ ہوں۔ (بہ شکریہ جنگ کراچی)

غزل

شان الحق حقی

وہ مزار کھتے ہیں کچھ تازہ افسانے اپنے
جو لیے جاتے ہیں سب درد پرانے اپنے

حال میں اپنے کچھ اس طرح مگن ہیں گویا
ہم نے دیکھے ہی نہیں اگلے زمانے اپنے

کر کے اک بار تری چشم فسوں گر کے سپرد
پھر نہ پوچھا کبھی بندوں کو خدا نے اپنے

بزم یاراں میں وہ اب کیف کہاں ہے باقی
روز جاتے ہیں کہیں جی کو جلانے اپنے

ہم وہی ہیں کہ جہاں بات کسی نے پوچھی
خوش گماں ہو کے لگے داغ دکھانے اپنے

ذکر سے اس کے سنوارا ہے سخن کو حقی
خوش مزا لگتے ہیں کانوں کو ترانے اپنے

رمن راج سکسینہ
(معتمد یوم محمد قلی قطب شاہ)

خیر مقدمی تقریر یوم محمد قلی قطب شاہ

ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد کی جانب سے میں آپ تمام اصحاب کا پُرخلوص خیر مقدم کرتا ہوں۔ "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی تقاریب گذشتہ سترہ سال سے منائی جارہی ہیں ان تقاریب کو بانی ادارۂ ادبیات اردو، ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے قیام آندھرا پردیش کے بعد ۱۹۵۸ء میں شروع کیا تھا تاکہ بانی شہر حیدرآباد، اردو اور تلگو ادبیات کے شیدائی، سلطان محمد قلی قطب شاہ کی زندگی اور کارناموں سے عام اور خاص کو آگاہ کیا جاسکے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب یہ تقاریب حیدرآباد میں ایک قومی تہوار اور جشن کی اہمیت حاصل کرچکی ہیں۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے گذشتہ اجلاسوں کی صدارت مشاہیر ہند نے کی ہے۔ جن میں راشٹرپتی ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی کا نام قابل ذکر ہے۔ ہم مشکور ہیں کہ آج ان تقاریب کا افتتاح عالیجناب ایس۔ اوباسیوا راؤ صاحب چیف جسٹس آندھرا پردیش فرمائیں گے۔ صاحب موصوف تلگو ادبیات میں کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ علمی و ادبی حلقوں میں آپ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کا تعلق آندھرا کے ایک ایسے قدیم گھرانے سے ہے جسے اقتدار کے حاصل رہنے کے باوجود زراعت سے ہمیشہ تعلق رہا ہے۔ آپ حیدرآبادی اور آندھرائی تہذیب و ثقافت کے زبردست پرستار ہیں۔

میں محترمہ روڈامستری صاحبہ، وزیر سیاحت آندھرا پردیش کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں جو اس اجلاس کی صدارت فرما رہی ہیں۔ حیدرآباد کی علمی اور سماجی سرگرمیوں میں آپ کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے ہمیشہ رہا ہے۔ محترمہ روڈامستری ادارۂ ادبیات اردو کی ایک سرگرم رکن رہ چکی ہیں۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے ابتدائی اجلاسوں میں آپ نے ڈاکٹر زور اور ان کے شرکاء کار کے ساتھ کام کیا ہے۔ اس لیے آپ ان تقاریب سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

عالیجناب گنگا ریڈی صاحب وزیر آبکاری جامعہ عثمانیہ کے ایک قابل احترام سپوت ہیں۔ آپ حیدرآبادی تہذیب اور روایات سے گہرا انس رکھتے ہیں۔ توقع ہے کہ آپ ان روایات کے محافظ بنے رہیں گے۔

شہر حیدرآباد، غالباً واحد شہر ہے جہاں ہر سال بانی شہر کی یاد اس طرح منائی جاتی ہے اور شہر کی آئندہ ترقی و آرائش کے متعلق غور کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے صدر نشین جناب یم۔ بالیا صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ آپ ہماری درخواست پر یہاں تشریف لائے اور اتھارٹی کی جانب سے شہر کی ترقی و آرائش کی اسکیمات سے ہمیں واقف فرمائیں گے۔ بیرسٹر محمد سردار علی خاں صاحب، حیدرآباد کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے حیدرآباد کی عظمت کو دیکھا ہے اور آئندہ اس عظمت کو برقرار رکھنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نہ صرف اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا بلکہ حیدرآباد کے بانی کی حیثیت سے اس نے ایک نئے کلچر کی سرپرستی کی جو دکھنی کلچر کہلاتا ہے۔ وہ ایرانی النسل ہونے کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کا زبردست حامی تھا۔ غالباً وہ وجیانگرم کی تہذیب سے بھی متاثر ہو چکا تھا، جہاں اس کے والد ابراہیم قلی قطب شاہ نے اپنے بھائی جمشید قلی قطب شاہ کے عہد میں جلا وطنی کی زندگی گزاری تھی۔ محمد قلی قطب شاہ وہ پہلا حکمراں ہے جس نے ایرانی لباس کو ترک کر کے دکھنی لباس زیب تن کیا۔ وہ دکن کے دیسی ململ کا لباس اور گلے میں آندھراوں کا ادبرنا پہنا کرتا تھا۔ بادشاہ کی تقلید میں امراء اور عوام نے ایک ایسا لباس اپنایا جس سے ہندو مسلم کی تفریق نہ ہو سکتی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے دور میں سلطنت کی سرکاری زبان فارسی تھی، تمام دفتری کاروبار اور فرامین فارسی میں اجراء ہوتے تھے لیکن محمد قلی قطب شاہ، اردو اور تلگو کا دلدادہ تھا اس لیے سرکاری زبان کے ساتھ ساتھ اردو اور تلگو زبان کی سرپرستی کی گئی۔ یہ بات آج بھی ہمارے حکمرانوں کے لیے شمعِ ہدایت ہو سکتی ہے۔ وہ ریاست کی سرکاری زبان کو مناسب اہمیت دیتے ہوئے دیگر زبانوں کی سرپرستی کر سکتے ہیں۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "اگلے وقتوں کے یہ لوگ" ہم سے زیادہ روشن خیال اور رواداری تھے۔ سید اکبر فرزند اکبر حضرت شاہ راجو نے تلگو میں ایک اہم کتاب "شرنگار منجری" لکھی تھی۔ اس کتاب کا بعد میں سنسکرت میں ترجمہ کر کے محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے شائع کیا گیا۔

زوال گولکنڈہ کے بعد تلگو زبان و ادب کی سرپرستی مدھم پڑ گئی کیونکہ مغل صوبہ دار جو دہلی سے آئے تھے وہ تلگو زبان سے یکسر واقف نہیں تھے۔ دکن کی گنگا جمنی تہذیب کو جاننے میں انہیں کافی عرصہ لگا۔ آصفی دور کے تیسرے حکمراں اور ان کے بعد کے حکمرانوں نے یہاں کی تہذیب کی بھرپور سرپرستی کی اور وہ دکن ہی کے ہو گئے۔

آج یہاں ادارۂ ادبیات اردو کی ایک سالہ سرگرمیوں کا تذکرہ کرنے کے بجائے جو ادارہ نے جناب سید علی اکبر صاحب کی صدارت اور جناب ہاشم علی صاحب اختر آئی اے ایس کی معتمدی میں انجام دیئے ہیں، میں حیدرآباد کے قدیم روایتی ہندو مسلم اتحاد کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جسے گزشتہ سال بدقسمتی سے کبھی کبھی فراموش کیا گیا ہے۔ قطب شاہی دور میں ہندو عمائدین نے ایرانی امراء عمائدین کے دوش بدوش سلطنت کی ترقی اور تحفظ میں اپنا حصہ ادا کیا خصوصاً عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے دورِ حکومت میں اہم عہدوں پر ہندو افسر فائز تھے۔ مادنا، اکنا اور رستم راؤ کے نام سرِفہرست ہیں۔ رستم راؤ تو قطب شاہی افواج کا سپہ سالار تھا جس کے احکام کی تعمیل ایرانی اور حبشی افواج کیا کرتی تھیں۔ یہ افسر جہاں تلگو کے پنڈت تھے وہاں فارسی میں اعلیٰ مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب کا ایک فرمان ابوالحسن کے نام وصول ہوا جو سفید کاغذ پر سفیدی میں لکھا گیا تھا، اہلِ دربار اس عجیب و غریب تحریر کو پڑھ نہ سکے۔ دیوان مادنا پنڈت نے نہ صرف اس فرمان کو پڑھ لیا بلکہ جو اب جو مراسلہ دہلی روانہ کیا گیا وہ بھی سفید کاغذ پر سفیدی میں تحریر کیا گیا۔ اس واقعہ سے ان کی فارسی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دکنی کلچر پر آپ کو ان تمام فرقوں کی چھاپ نظر آئے گی جو اس علاقہ میں ملتے ہیں۔ شیروانی حیدرآبادیوں کا مشترکہ لباس ہے۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان سب "کج کلاہی" کے دلدادہ ہیں۔ اسی لئے حیدرآباد "کج کلاہوں کا شہر" معلوم ہوتا ہے۔ یہاں صرف لباس کی بناء پر ہندو اور مسلمان میں تمیز کرنا مشکل تھا اور ایسی صورت میں اکثر ملاقاتی کا نام جان کر اس الجھن کو حل کیا جاتا تھا۔ فارسی اور اردو دانی کا یہ حال تھا کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ کر سکتا تھا۔ راجہ نریندر پرشاد فارسی اور عربی میں اپنے ہمعصر نواب سرسالار جنگ اور امیر الامراء نواب رشید الدین خاں سے کسی طرح

لم نہ تھے۔ حیدرآباد میں شادی بیاہ کے رسومات بھی بڑی حد تک یکساں رہا کرتے تھے۔ گھوڑا جوڑا، رت جگا، منجا، مہندی، چوتھی کے رسوم ہندوؤں اور مسلمانوں میں مساوی اہمیت اور اہتمام سے ادا کیے جاتے ہیں۔

حیدرآباد میں صدیوں سے یہاں کے ہندو اور مسلمان اپنے تہوار اور عیدیں مشترکہ طور پر مناتے رہے۔ سنکرت اور محرم میں ہندو اور مسلمان مساوی طور پر حصہ لیا کرتے تھے۔

ہولی کا تہوار نواب سر سالار جنگ کی دیوان دیوڑھی میں بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ سر سالار جنگ کے سفید انگرکھے پر ہندو اور مسلمان خوب رنگ چھڑکا کرتے تھے۔ بسنت کے موقع پر بشیر الدولہ آسمان جاہ اپنی دیوڑھی میں جشن مناتے تھے۔ ناگر پنچمی کے موقع پر خورشید جاہ بہادر اپنی بارہ دری میں سپیروں کو مدعو کرتے اور ان کی سرپرستی فرماتے تھے۔ محرم کے موقع پر فعل صاحب کی سواری کا ایوان شاد میں پورے احترام کے ساتھ استقبال کیا جاتا تھا۔ ماہ محرم کی دسویں تاریخ تک راجہ رائے رایاں، راجہ دہرم ونت اور راجہ پیشکار کی دیوڑھیوں میں اسٹیٹ کی جانب سے علم اور پنجہ استادہ کیے جاتے تھے۔ اس طرح امرا حیدرآباد عوام میں گھل مل جانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ساتویں محرم کا شاہی لنگر دراصل ایک سرکاری تقریب تھی جس میں ریاست کی فوج باقاعدہ اور بے قاعدہ عوام کے بیچ سے ہو کر گزرتی تھی۔ آج اس جمہوری دور میں ضرورت ہے کہ اس قسم کی نیم سرکاری تقاریب کو پھر سے جاری کیا جائے۔

میسور کی حکومت نے دسہرہ کے جلوس کو سرکاری طور پر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی طرح ہماری حکومت ساتویں محرم کے شاہی لنگر کا آغاز کر سکتی ہے۔ یہ نہ صرف قومی یکجہتی کے لئے ضروری ہے بلکہ جمہوری نظام کو موثر اور پسندیدہ بنانے میں معاون ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے وزیر سیاحت اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

یوم محمد قلی قطب شاہ کے انعقاد کا اصل مقصد شہریان حیدرآباد اور عمائدین حکومت کو دکنی کلچر کی جانب متوجہ کرنا اور اس سمت میں آگے بڑھنے کے لئے دعوت عمل دینا ہے۔ بانی شہر کی حیثیت سے محمد قلی قطب شاہ نے جو روایات چھوڑی ہیں وہ ہمارے لئے قیمتی ورثہ ہیں اور اس ورثہ کی حفاظت بہرحال ہمارا اخلاقی اور قومی فریضہ ہے۔

خواتین و حضرات! میں ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے پھر ایک بار آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ کا بھرپور تعاون ہمیشہ حاصل رہے گا۔ شکریہ

(یوم محمد قلی قطب شاہ (۱۱ر فروری ۷۱ء) کے افتتاحی اجلاس منعقدہ گنبدان قطب شاہی گولکنڈہ میں پڑھا گیا)

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

میں نے ایوانِ اردو میں اس میخانۂ ادب کے نشانِ جاوید
ساقی حضرت زورؔ مرحوم کی روح کی یہی صدا سنی ہے
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

سکندر علی وجد ۱۹ر اپریل ۶۵ء

نقد و نظر

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں (ادارہ)

۱) نام کتاب:۔ تلگو افسانے مترجم کے گوپال کرشنا راؤ (صفحات: ۳۵۶، قیمت ۵۰۔۱۸)

۲) " :۔ گجراتی کہانیاں " مظہر الحق علوی (صفحات: ۲۴۹، قیمت ۰۰۔۱۴)

ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، ۵/A گرین پارک، نئی دہلی ۱۶

نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادبی شہ پاروں کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسی سلسلے میں چند کتابوں کے ترجمے اردو میں بھی شائع کیے گئے ہیں۔ اب تک ہمارے ملک میں یہ عجیب و غریب صورتِ حال رہی ہے کہ یہاں کی زبانوں کے ادیب مغربی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کرتے اور ان سے اثر قبول کرتے رہے ہیں۔ لیکن اپنی زبان کے سوا ملک کی دوسری زبانوں کے ادب سے ان کی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے یہی حال ہر زبان کے قارئین کا بھی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی ہمیں انگریزی ہی کے توسط سے حاصل ہوتی ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے اس صورتِ حال کو محسوس کرتے ہوئے ملکی زبانوں کی ادبیات کے تراجم کا جو کام شروع کیا ہے وہ نہایت قابلِ قدر ہے ایک مشترکہ کلچر کی تعمیر اور قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کام بڑی اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر زبان کے تمام اہم ادبی کارناموں کو جلد از جلد ملک کی دوسری بڑی زبانوں میں منتقل کیا جائے ترجموں کا جو کام اب تک ہوا ہے اس کی رفتار نہایت سست اور غیر تشفی بخش ہے۔ یہ کام بڑی حد تک نیشنل بک ٹرسٹ ہی کر رہا ہے۔ دوسرے اشاعتی اداروں کو بھی اس طرف توجہ دینا چاہیئے۔ تعلیمی اور تمدنی امور سے متعلق محکموں اور مختلف زبانوں کی اکیڈمیوں کو چاہیئے کہ وہ تراجم کی اشاعت کے لئے نہ صرف مالی مدد دیں بلکہ اچھے ترجموں کو خصوصی انعامات دے کر اس کام کی حوصلہ افزائی کریں۔

نیشنل بک ٹرسٹ کی زیر تبصرہ کتابوں میں ایک تلگو افسانوں کا انتخاب ہے۔ اسے تلگو کے مشہور ادیبوں پرام سبرامنیم شرما اور واکائی پانڈو رنگا راؤ نے مرتب کیا ہے اس کے مترجم تلگو کے اسکالر کے گوپال کرشنا راؤ ہیں۔ جنھیں اردو زبان پر بھی دسترس حاصل ہے۔ اس مجموعے میں تلگو کے ستائیس ۲۷ افسانہ نگاروں کی ایک ایک کہانی شامل کی گئی ہے مجموعی طور پر معیاری کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتخاب کے وقت مرتبین نے اپنے ذوق اور پسند کو زیادہ اہمیت دی ہے اور اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے کہ کوئی انتخاب اسی وقت بھرپور ہو سکتا ہے جب اس میں ہر مکتبِ خیال اور طرزِ فکر کی نمائندگی ہو۔ مرتبین نے جو پیش لفظ لکھا ہے اس سے تلگو افسانے کے ارتقا پر زیادہ روشنی نہیں پڑتی۔ آخر میں افسانہ نگاروں کا جو تعارف لکھا گیا ہے وہ بھی تشنہ ہے۔ اس مجموعے میں تلگو کی چند اچھی کہانیاں پڑھنے کو ضرور مل جاتی ہیں لیکن تلگو افسانے کے بارے خدوخال اُجاگر نہیں ہو پاتے۔

"تلگو افسانے" کے مقابلے میں "گجراتی کہانیاں" کے مرتبین نے اپنے انتخاب میں زیادہ وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ اس مجموعے میں اگرچہ صرف بیس کہانیاں شامل ہیں لیکن ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے گجراتی افسانے کے مختلف ارتقائی مراحل کو اپنی نظروں کے سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ لیتے ہیں۔ ملیانی اور رودی رلیف سے لے کر جدید نسل کے رگھوبیر چودھری اور ایوا ڈیو تک گجراتی کہانی نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے اور آج وہ اس منزل پر ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں اپنا سر فخر سے اونچا کر سکتا ہے۔ اس مجموعے کے مرتبین یشونت شکل اور پروفیسر الزدوجہ برہم بھٹ ہیں۔ گجراتی کہانی کے آغاز و ارتقاء پر انہوں نے ایک مختصر لیکن جامع دیباچہ تحریر کیا ہے۔ بعض اہم افسانہ نگاروں کی تخلیقات اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں ان کے کارناموں کا ذکر دیباچہ میں کر دیا گیا ہے۔ کہانی کاروں کا تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن ہر ایک کے بارے میں ضروری اطلاعات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ مظہر الحق علوی نے اس کتاب کا ترجمہ بامحاورہ اردو میں اس طرح کیا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے جس کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر کہانی کے اسلوب اور مزاج کو ترجمے میں برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ خاص طور پر ایوا ڈیو کی کہانی چور کا ترجمہ "تخلیقی ترجمہ" کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ سے ہم یہ توقع رکھیں تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنی کتابوں کی قیمت عام ناشروں کے مقابل میں کم رکھے۔ زیر تبصرہ دونوں کتابوں کی قیمت عام معیار سے کچھ زیادہ ہی رکھی گئی ہے۔　　　(مبصر: ناز صدیقی)

نام کتاب:- روشن لکیریں (شعری مجموعہ) صادق نقوی (۱۴۴ صفحات)　　قیمت ۱۲ روپئے

ملنے کا پتہ: اردو اکیڈیمی بک ڈپو۔ اے سی گارڈز۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

صادق نقوی حیدرآباد کے اُن جواں سال شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے ۱۹۶۰ء سے شعری و ادبی محفلوں میں اپنے آپ کو روشناس کرایا۔ ویسے صادق ۱۹۵۵ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ صادق نقوی اپنی شائستہ مزاجی، شگفتہ لہجے، بالغ نظری اور شاعرانہ بانکپن کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ شاعر، پھولوں کی تازگی، بادِ صبا کی انگڑائی اور پہلی برسات کی خوشبو سے زیادہ مانوس ہے۔ شاعر کے کلام میں زندگی کی سچائی ملتی ہے۔ صادق با صلاحیت شاعر ہی نہیں سلجھے ہوئے مقرر، شائستہ اور متوازن اسلوب نگارش کے حامل نثر نگار بھی ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے صادق کے ذہن کی پاکیزگی اور روشن ضمیری کا اظہار ہوتا ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ شاعر اپنے فن کو کسی خاص ازم میں شامل کرنا نہیں چاہتا۔ شاعر کو کسی خاص اسکول سے اپنے آپ کی وابستگی کا اصرار بھی نہیں ہے لیکن "روشن لکیریں" کے بہ غائر مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کلاسیکی ادب کا احترام کرتے ہوئے عصری حسیت کو بھی فن کا جُز بنانا چاہتا ہے۔ اُن کے کلام میں قدیم اور جدید کا حسین اور دلکش امتزاج ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ "روشن لکیریں" صادق نقوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ غزلیہ شاعری کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہے یادگار محبت بھرے زمانے کی	وہ ایک ساعت محسوس دل لگانے کی
اکا اُمید پہ مینار گئی ہے اے صادق	کبھی تو جاگے قسمت غریب خانے کی

دہلیز پر کھڑے ہیں امیدوں کے قافلے	جی چاہتا ہے درد کے ماروں میں بانٹ دوں
اپنی انا کی لاش لیے اپنی گود میں	خنجر کی تیز دھار پہ چلتا ہے آدمی

اُردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم فروری :۔ نمائشی سوسائٹی کے زیر اہتمام نمائش کلب میں سالانہ محفل شعر کا انعقاد عمل میں آیا۔ نواب ہاشم جاہ نے صدارت کی اور صلاح الدین نیر نے نظارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس مشاعرہ میں سعید شہیدی، اوج یعقوبی، شاذ تمکنت، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر مغنی تبسم، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، منوہر لال بہار، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، نذیر علی عدیل، عزیز النساء صبا اور اسحق ملک نے کلام سنایا۔

● ادارۂ ترقی ادب کے زیر اہتمام مسٹر اندر کمار گجرال سفیرِ ہند برائے سوویت یونین کے خیر مقدم میں بمقام اُردو ہال جلسۂ عام منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر لیبر مسٹر جی وینکٹ سوامی نے صدارت کی۔ جناب کے یم خاں صدر ادارۂ ترقیٔ ادب نے جناب گجرال کا تعارف کراتے ہوئے گجرال اُردو کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا مطالبہ کیا۔ محترم مہمان جناب گجرال نے کہا کہ اُردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس زبان نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ماسکو میں اقبال صدی تقاریب کا تذکرہ کرتے ہوئے سفیر موصوف نے کہا کہ ہندوستانی شعر و ادب سے سوویت دانشوروں اور عوام کا لگاؤ ہند، روس دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔ مسز شیلا گجرال نے بھی مخاطب کیا۔ صدرِ جلسہ نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ وہ تلگو مادری زبان رکھنے کے باوجود اردو ذریعۂ تعلیم کے سہارے اپنی زندگی اور شخصیت بنانے میں کامیاب رہے ہے۔ جناب میر کمال الدین علی خاں معتمد نے شکریہ ادا کیا۔

۲ر فروری :۔ حیدرآباد لٹریری فورم کا ادبی اجلاس جناب تاج مہجور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عزیز قیسی اور جناب یوسف اعظمی نے ادبی رجحانات پر مخاطب کیا۔ علی الدین نوید نے اپنا کلام سنایا۔ جناب حسن فرخ معتمد حلف نے شکریہ ادا کیا۔

● بزرگ غزل گو شاعر جناب سعید شہیدی کے مجموعہ کلام "شفق" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن ادبی ٹرسٹ نے شائع کیا تھا۔ سعید شہیدی کا پہلا شعری مجموعہ "برق و آشیاں" کے نام سے کئی سال پہلے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

● مسٹر آئی کے گجرال سفیرِ ہند برائے سوویت یونین نے اقبال اکیڈیمی کا معائنہ کرنے کے بعد ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کی شاعری میں بیدار ایشیاء کی ایک نئی لہر ملتی ہے۔ جناب سید خلیل اللہ حسینی نے صدارت کی۔ اور مسٹر گجرال کی اُردو دوستی اور ان کی دانشورانہ حیثیت کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کریم رضا نے شکریہ ادا کیا۔

۳ر فروری :۔ جناب علی سرور کے دوسو اشعار پر مشتمل کتابچہ کی رسم اجراء جناب اختر حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی کے ہاتھوں انجام پائی۔ جناب بشیر وارثی نے محفلِ شعر کی صدارت کی۔

۴ر فروری :۔ اُردو تعلیمی ٹرسٹ کی مجلس عاملہ کا اجلاس جناب میر احمد علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معتمد ٹرسٹ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے بتایا کہ ۳ر فروری تک ٹرسٹ میں دو لاکھ چار ہزار پندرہ روپے جمع ہو گئے ہیں۔ موصوف نے کہا کہ اُردو تعلیمی ٹرسٹ کے منافع سے اُردو کوچنگ کلاسیس اور ماڈل اسکولوں

کا جلد قیام عمل میں آئے گا تاکہ ریاست اور شہر میں ابتدائی اردو تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے عصری درس گاہیں بہتر طریقے پر کام کرنا شروع کر دیں۔ اس اجلاس میں ٹرسٹ کے اراکین مسرز پروفیسر حبیب الرحمٰن ڈاکٹر ایس اے منان، منوہر راج سکسینہ غلام یزدانی، سرینواس لاہوٹی اور عابد علی خاں کے علاوہ ڈاکٹر عیلنی شاہد پرنسپل اردو کالج نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔

۱۰ فروری: ادارۂ قند ادب کے زیر اہتمام بصدارت جناب علی احمد جلیلی محفل دوبیتی و غزل منعقد ہوئی۔ قدیم اور کلاسیکی دبستان سخن کے کئی شعراء نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔

● انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کی طرف سے تعمیر ہونے والے "اردو گھر" کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے ریاستی انجمن کے صدر نواب میر احمد علی خاں نے کہا کہ اردو گھر کے قیام سے اردو کے شہر حیدرآباد میں علمی، تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں کو مرکزیت حاصل ہوگی جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ جناب منوہر راج سکسینہ صدر شہری انجمن نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے پہلے شہر میں اردو گھر کے دیرینہ خواب کی تکمیل کو جناب عابد علی خاں کی کامیاب مساعی کا نتیجہ قرار دیا۔ صدر جلسہ نے اردو گھر کے قیام کو اردو والوں کی سعی پیہم کا نام دیتے ہوئے بتایا کہ اس مرکز میں ماڈل اسکول کے علاوہ حوالہ جاتی اور نصابی کتب کا کتب خانہ بھی ہوگا۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن نے اردو والوں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اردو ہال اور ایوان اردو کے بعد اردو والوں کے لئے اردو گھر تیسرا ادبی مرکز ہوگا۔ صدر ریاستی اردو اکیڈیمی جناب آصف پاشا، جناب رحمت علی، ڈاکٹر منان، مسٹر یم بالیا چیرمین حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ بورڈ، رائے محبوب نارائن، راج بہادر گوڑ اور سرینواس لاہوٹی نے بھی مخاطب کیا۔ جناب غلام صادق الدین معتمد انجمن حیدرآباد شہر نے شکریہ ادا کیا۔

۱۱ فروری: دارالسلام میں کل ہند نعتیہ مشاعرہ الحاج عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ عالم فتح پوری، ڈاکٹر نظیر صفی پوری، حامد بھوپالی، تابان لکھنوی، بسمل ناگپوری کے علاوہ ہاشم جاہ، سعید شہیدی، شاذ تمکنت، غیاث صدیقی، خواجہ شوق، علی افسر، خیرات ندیم، معین بزمی، بجرنگ سنگھ فقیر، صلاح الدین نیر، راز عابدی، معظم عابد، نذیر علی عدیل، خورشید جنیدی جوہر ہاشمی، رئیس اختر، راجہ لال راجہ، فیض الحسن خیال، صبا افغانی، زور آغائی نے کلام سنایا۔ جناب ناظم عزراقی نے نظامت کی۔

● ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام یوم محمد قلی قطب شاہ کے عادی سالانہ اجلاس کی افتتاحی تقریب گنبد محمد قلی واقع گولکنڈہ فورٹ پر بصدارت مسرز روڈا مستری ریاستی وزیر سیاحت منعقد ہوئی۔ مسٹر بی گنگارپڈی ریاستی وزیر آبکاری مہمان خصوصی تھے۔ مسٹر اے ساحیا سیوا راؤ چیف جسٹس ریاستی ہائیکورٹ نے افتتاح کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ کو ایک عظیم انسان دوست سرکردہ سخنور اور مثالی حکمران قرار دیا اور کہا کہ قطب شاہی عہد سیکولرازم کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ جلسہ کا آغاز محمد قلی کی مناجات سے ہوا۔ جناب رمن راج سکسینہ معتمد تقاریب یوم محمد قلی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر زور نے ۱۹۵۸ء میں لسانی تقسیم کے ساتھ ہی ان تقاریب کا آغاز کیا تھا اور جب سے ہر سال یہ تقاریب حیدرآبادیوں میں قومی جشن اور تہوار کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ جناب سکسینہ نے کہا کہ محمد قلی صرف اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہی نہیں اس شہر کے بانی، دکنی کلچر اور ہندو مسلم اتحاد کا روشن مینار بھی تھے۔

جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو نے صدر جمہوریہ اور دیگر مشاہیر کے پیامات سنائے۔

جناب یم بالیا صدر نشین حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی بورڈ نے ادارہ اور

ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو زبردست خراج ادا کیا اور کہا کہ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب محمد قلی کا ورثہ ہے جسے ہر سال ادارہ یاد دلاتا رہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج حیدرآبادی تہذیب ہمارے ملک کے لئے روشنی کی ایک چمکتی لکیر کا کام کر رہی ہے۔ جناب امیر احمد خسرو اور جناب جہاندار افسر نے نظمیں سنائیں کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ پیش کیا

بیرسٹر سردار علی خاں نے قطب شاہوں سے آصف جاہوں کے عہد کو قومی ایکتا اور اخلاص و محبت کی فراوانی کا نام دیا اور مذہب، زبان اور تہذیب کے نام پر معیبہ محاذ کو حیدرآبادی روایات کے مغائر قرار دیا۔

مسز پی گنگا ریڈی نے محمد قلی کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ محمد قلی نے وہ عظیم انسانی خدمات انجام دی ہیں کہ چار سو سال بعد بھی عوام کے دلوں میں اس کی یاد کے نقوش روشن ہیں مسز رودڈامستری نے کہا کہ ڈاکٹر زورؔ کی مساعی کے سبب یوم محمد قلی کو اب حیدرآباد میں قومی اور تہذیبی میلہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ مسز رودڈامستری نے اعلان کیا کہ آئندہ سال سے یوم محمد قلی کو ریاستی حکومت اپنے تعاون سے حیدرآباد فیسٹول کے طور پر منانے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ اس عظیم حکمران اور اردو کے پہلے ہندوستانی سخنور کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکے جس نے قومی یکجہتی اور سیکولرازم کی روایات پہلے پہل قائم کیں۔ مشہور فنکار عزیز احمد خاں وارثی اور ان کے ہم نواؤں کی یادگار قوالی کو ہزاروں شیدائیوں نے پسند کیا۔ مشہور گلوکارہ پریم لتا ہروالکر غفار تنویر اور رکن الدین کے علاوہ شاہدہ جلیل اور کہکشاں نے بھی سازوں پر محمد قلی کا کلام پیش کیا۔ آل انڈیا ریڈیو سے افتتاحی تقریب کی ریڈیو ریلیز نشر کی گئی۔

● مخدومؔ سوسائٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ملک کے نامور ترقی پسند شاعر اور رہنما مخدومؔ محی الدین کے (۷۱) ویں یوم پیدائش پر شبِ غزل کا انعقاد عمل میں آیا۔ ریاستی وزیر پنچایت راج مسٹر یم باگاریڈی نے مخدومؔ کی شخصیت اور شاعری کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا اور کہا کہ مخدومؔ حقیقی معنیٰ میں مظلوم، پسماندہ اور محنت کش عوام کے شاعر اور نمائندہ قائد تھے۔ مشہور گلوکار فنکار وٹھل راؤ، عزیز احمد خاں وارثی، عارف رؤف اور فریدالدین نے سازوں پر مخدومؔ کا کلام پیش کیا۔ جناب شاذؔ تمکنت نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۲ فروری:۔ ایوانِ اردو میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ کے ادبی اجلاس کا ریاستی وزیر پنچایت راج جناب یم باگاریڈی نے افتتاح کیا اور ڈاکٹر زورؔ کی ادبی خدمات اور ادارہ کے کارناموں کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ اس موقع پر موصوف نے ادارہ کی طرف سے شائع شدہ محترمہ بانو طاہرہ سعید کے شعری مجموعہ "مہکتے ویرانے" کی رسم اجرا بھی انجام دی اور بانو کی شعری ذہانت کو سراہا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم معتمد ادبی اجلاس نے بھی بانو طاہرہ سعید کے مجموعہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جناب سری کرشن سنہا نے ادبی اجلاس کی صدارت کی۔ محمد قلی کے عہد، دکنی ادب اور حیدرآبادی کلچر پر مسرز محمد علی اثر (ریسرچ اسکالر) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، صادق نقوی لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی اور محترمہ آمنہ انصاری لکچرار انوار العلوم کالج نے مقالے پیش کئے محترمہ بانو طاہرہ سعید نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اسی شب ایوانِ اردو کے خوبصورت آڈیٹوریم میں جناب آصف پاشا صدر ریاستی اردو اکیڈیمی کی صدارت میں محفل شعر و سخن آراستہ ہوئی۔ جناب سید مکثر شاہ صدر نشین مجلس قانون ساز نے شمع روشن کی اور مشاعرہ کے آغاز کا اعلان کیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اس مشاعرہ میں پاکستان کے مہمان شاعر مظہر کامل کے علاوہ سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، نواب ہاشم علی احمد جلیلی، ڈاکٹر غیاث صدیقی، بانو طاہرہ سعید، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، وقار خلیل

امان ارشد، صادق نقوی، جو ہر ہاشمی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، علی الدین نوید، محسن جلگانوی، ناظم مرزائی، منیر الزماں منیر اور استعانہ سحر نے کلام سنایا۔

۱۳ر فروری :۔ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی صد سالہ سالگرہ تقریب محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش کے زیر اہتمام سروجنی دیوی کی قیام گاہ گولڈن تھریشولڈ (حیدرآباد یونیورسٹی) پر منعقد ہوئی۔ ریاستی گورنر مسز شاردا مکرجی اور چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے سروجنی دیوی کی قومی، ادبی اور شعری خدمات پر روشنی ڈالی۔ سابق گورنر اڑیسہ جناب میر اکبر علی خاں نے خیر مقدمی تقریر کی۔ مقررین نے سروجنی نائیڈو کو حیدرآبادی تہذیب و ثقافت کی پیداوار قرار دیا اور نئی نسل کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو ہندوستانی شہری بنانے میں مسز نائیڈو کی شخصیت اور فکر و فن کو نشانِ راہ بنائیں۔ جناب صلاح الدین نیر نے سروجنی نائیڈو کی دو انگریزی نظموں کے اردو منظوم تراجم سنائے۔ ڈاکٹر گربخش سنگھ وائس چانسلر حیدرآباد یونیورسٹی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۸ر فروری :۔ اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب مضطر مجاز کی صدارت میں ہوا۔ تفہیم شعر کے موضوع پر مباحثہ میں حامد مجاز، رحمٰن جامی، ڈاکٹر یوسف کمال اور برق یوسفی نے حصہ لیا۔

مسٹر نہپال سنگھ ورما نے کہانی سنائی۔ رؤف رحیم نے "صفی اورنگ آبادی کی شاعری" پر مضمون پیش کیا۔ محفلِ شعر میں شمس الدین تاباں، یوسف کمال، مصلح الدین سعدی، س۔ و۔ عشرت، خورشید خضر، برق یوسفی، رؤف خیر اور حمید حاصل نے کلام سنایا۔ جمیل شیدائی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

● بھارت گن ورد ھک لائبریری کے زیر اہتمام پروفیسر عالم خوندمیری کی صدارت میں یادِ سروجنی نائیڈو کے سلسلے میں ادبی محفل ہوئی، ڈاکٹر سریکا رام شرما، پروفیسر خوندمیری، ملک محمد علی خاں ایڈیٹر آندھرا پردیش اور جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد نے سروجنی دیوی کی عظیم شخصیت، حب الوطنی اور فکر و فن پر روشنی ڈالی، محفلِ شعر میں منوہر لال بہار، بالا پرشاد گوڑ، راجہ لال راجہ، جگجیون استعانہ سحر، دیدیہ پرکاش لاہوٹی اور نہپال سنگھ ورما نے کلام سنایا کالیداس کاشیکر صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

۲۲ر فروری : ایوانِ اردو میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ممتاز دانشور، مورخ اور مصنف پروفیسر یوسف حسین خاں کی وفات پر تعزیتی جلسہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کی صدارت میں منعقد ہوا، ڈاکٹر انور معظم اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے پروفیسر یوسف حسین خاں کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ ایک قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ پروفیسر یوسف حسین خاں ایسے دانشور، محقق، نقاد اور مورخ کی وفات ناقابلِ تلافی سانحہ ہے پروفیسر خاں نے دکنی تاریخ کے علاوہ ادب، کلچر اور اقبالیات پر گرانقدر ادبی نقوش چھوڑے ہیں۔

۲۴ر فروری :۔ حکومتِ آندھرا پردیش نے اردو اکیڈیمی کے بورڈ آف گورنرس اور اکزیکیٹو کونسل کی تشکیل جدید کی ہے۔ جناب یم باگا ریڈی وزیر پنچایت راج اکیڈیمی کے صدر اور جناب ابراہیم علی خاں (یم یل اے) نائب صدر، مولانا حافظ ابو یوسف (یم یل سی) صدر نشین مجلس عاملہ اور جناب چندر سریواستو ڈائرکٹر/ سکریٹری نامزد کئے گئے۔ اراکین بورڈ آف گورنرس میں مسز بی وینکٹ رام ریڈی (وزیر تعلیم) سید ہاشم علی اختر (آئی اے یس، معتمد ادارۂ ادبیات اردو) عابد علی خاں (ایڈیٹر سیاست) سید رحمت علی، سلطان صلاح الدین اویسی (یم ایل اے) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو) شیو راؤ شنکار (یم ایل اے) حامد علی عباسی ڈاکٹر زینت ساجدہ، اعجاز قریشی، اکرام جاوید پروفیسر فقیر پاشاہ قادری، احمد علی ایڈوکیٹ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، یدھ ویر (ایڈیٹر ملاپ) حسن الدین احمد، سید عظیم الدین ایڈوکیٹ ڈاکٹر حسینی شاہد (پرنسپل اردو کالج) ڈاکٹر

نی تبسم (مدیر اعزازی سب رس) ڈاکٹر لیمان اطہر جاوید، مصطفیٰ کمال (ایڈیٹر شگوفہ) اوج یعقوبی، سرینواس لاہوٹی اکٹر رشید موسوی، شاذ تمکنت، آمنہ نصاری، عاتق شاہ، محمود انصاری (ایڈیٹر منصف) داؤد اشرف، نذیر احمد (ایڈیٹر ورنیشل گرایجویٹ) امان اللہ خاں (یم یل اے) مرزا اصغر بیگ، ظہور الدین حمد، محمد اسماعیل، ڈاکٹر یم آر دین، عبدالجبار خاں، وحید مرزا، جلیل امرت حبیب اللہ، نصرت فاروقی، جلیل پاشاہ باقر آغا (ایم یل اے) اور سکریٹری محکمہ تعلیم، سکریٹری محکمہ فینانس شامل ہیں۔

اگزیکیٹیو کونسل کے اراکین میں مسرز عابد علی خاں، رحمت علی، سلطان صلاح الدین اویسی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، شیو راؤ شنکار، بیرسٹر سردار علیخاں اعجاز قریشی، ڈاکٹر زینت ساجدہ، سید ہاشم علی اختر، فقیر پاشاہ قادری، سید مصطفیٰ کمال، ابراہیم علی خاں (ایم یل اے) اور سکریٹری محکمہ تعلیم اور سکریٹری محکمہ فینانس شامل ہیں۔

●● تاج الخطاط جناب مظہر کامل (پاکستان) کے خیر مقدم میں ایک محفل شعر جناب معز الدین ملتانی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ سعید شہیدی امیر احمد خسرو، شمس الدین تاباں، خیرات ندیم، احمد معین بزمی، ساجد رضوی، صلاح الدین نیر، مرزا افسر چغتائی، صادق نقوی، حمید رونق، ثریا مہر، سراج حیدرآبادی، س۔ و۔ عشرت مظہر کامل اور کئی شعراء نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے معتمدی کی۔

●● محفلِ خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ رابعہ برنی کی صدارت میں ہوا۔ بچوں کے بین الاقوامی سال پر ایک مباحثہ ہوا۔ قمر جمال نے نئی کہانی سنائی۔ محفل شعر میں بانو طاہرہ سعید، مظفر النساء ناز اور بشیر النساء بشیر نے کلام سنایا۔ معتمد محفلِ خواتین محترمہ بانو طاہرہ سعید نے جلسہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۵ر فروری:۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر حسینی شاہد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب علی احمد جلیلی نے "اردو غزل پر ہندی کا اثر" کے زیر عنوان مقالہ سنایا۔ جناب صادق نقوی نے "نجم آفندی کی شاعری میں انسانی اقدار" کے موضوع پر مضمون پڑھا، محفلِ شعر میں مسرز علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، امان ارشد نیر، صادق نقوی، عباس عابدی، عزیز عبارتی اور استعارہ سحر نے کلام سنایا۔ پروفیسر یوسف حسین خاں کی وفات پر قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی، معتمد اردو مجلس جناب صلاح الدین نیر نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶ر فروری: انجمن شہنشاہ ادب کا ادبی و شعری اجلاس جناب بشیر وارثی کی صدارت میں ہوا۔ معزز ... وارثی، محوی سروشی اور ڈاکٹر حسن چھابڑا نے ادبی رجحانات پر گفتگو کی۔ رحمت سکندرآبادی محسن جلگانوی، ناگپال عظیم دہلوی، شاغل ادیب، حسن حیات، تجمل اظہر معراج صوفی اور کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

مجھے بڑی خوشی ہے کہ حیدرآباد میں **ایوان اردو** کے شاندار، علمی ذخیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس دوران کی مشکلات کے باوجود **ایوان اردو** کی حمایت سے اور حفاظت سے اردو کی میٹھی زبان.. بلاد دکن میں بیحد ترقی کرے گی۔

برطانوی اسکالر **سائمن ڈیگبی**

۶ر اپریل ۱۹۶۳ء

میں **ادارہ ادبیات اردو** میں کئی بار آچکا ہوں۔ جب کبھی آتا ہوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ **اردو۔ زبان** اور ادب پر اتنا اچھا کام ہو رہا ہے۔ امید ہے پھر آنے کا موقع ملے گا۔

ڈیوڈ میتھوز

(پروفیسر اردو لندن یونیورسٹی)

۲۳ر مئی ۱۹۷۸ء

سب رس

بچوں کے لئے

اظہر افسر

بقلم خود

(ڈرامہ)

(کلاس میں ماسٹر صاحب پڑھا رہے ہیں)

ماسٹر۔ (پڑھتے ہوئے) ہاں صفحہ ۸۶

مسرت سے چہرے پہ تیرے عیاں
بتا سچ کہ ہے شاہ زادہ کہاں
کہا پھر یہ جوگی نے سنئے حضور
چھپا ناں مجھے کون سا ہے ضرور

کون شور کر رہا ہے یہ

سدھیر!

سدھیر۔ جی۔ جناب۔

ماسٹر۔ کھڑے۔ ہو جاؤ

سدھیر۔ جی میں شور نہیں کر رہا تھا یہ۔

ماسٹر۔ چپ رہو۔ نکھو اپنی کاپی پہ "میں کبھی شور نہیں کروں گا" لکھا؟

سدھیر۔ جی۔

ماسٹر۔ یہ جملہ ایک ہزار مرتبہ لکھ کر آج چھ بجے تک تمہیں دکھانا ہوگا۔

سدھیر۔ چھ بجے تک ماسٹر جی۔

ماسٹر۔ ہاں

سدھیر۔ مگر آج ہفتہ ہے ماسٹر جی۔ آدھے دن کی چھٹی ہے

ماسٹر۔ کوئی بات نہیں میں ہاسٹل میں اپنے کمرہ پہ رہوں گا۔ چھ بجے تک تمہاری کاپی مجھے مل جانی چاہیئے۔ کیا سمجھے۔

سدھیر۔ جی ماسٹر جی۔

(گھنٹہ بجتا ہے)

ماسٹر۔ اوفوہ گھنٹہ بھی ختم ہوگیا۔ خیر بچو باقی سبق سوموار کو۔

(لڑکوں کا شور ۔ پھر خاموشی چھا جاتی ہے)

(ایک کمرے میں سدھیر میز سے سر لگائے اور پیر سر اٹھائے ایک کاپی پر کچھ لکھ رہا ہے)

سدھیر۔ میں۔ اب۔ کبھی۔ شور۔ نہیں کروں گا۔ میں اب۔ کبھی۔ شور نہیں۔ کروں گا۔

کندن۔ ایں۔ یہ کس الجھن میں پھنس گئے تم۔

سدھیر۔ اب میں کبھی شور نہیں کروں گا۔

کندن۔ اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔

سدھیر۔ میں اب کبھی۔

کندن۔ بس بس اب ختم کیجئے آپ کی یہ شور نہیں کروں گا کی رٹ۔ اس وقت کلاس نہیں ہو رہی ہے آپ جتنا چاہے شور مچا سکتے ہیں۔

سدھیر۔ نہیں کروں گا۔

کندن۔ مانتے نہیں۔ یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟

سدھیر۔ آج ماسٹر جی نے سزا دی ہے ہزار دفعہ یہ جملہ لکھنا ہے۔

کندن۔ مگر اس تماشے کا کیا ہوگا۔

سدھیر۔ (کتاب میز پر پٹکتے ہوئے) اس سزا نے سارا پروگرام گڑبڑ کر دیا ہے اب دو بجے ہیں اور شام کے چھ بجے تک مجھے یہ گورکھ دھندا ختم کر دینا ہے۔

کندن۔ مگر وہاں سب تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔

سُدھیر۔ (گنتا ہے) ایک دو تین چار
اور یہ دیکھو یہاں میں صرف
چوہتّر مرتبہ لکھ پایا ہوں۔
کندن۔ یعنی۔ اور نو سو چھبیس جملے لکھنے
پڑیں گے
سُدھیر۔ جی۔
کندن۔ کیا یاد کروگے، ایک ایسی انوکھی
ترکیب لے کر آیا ہوں کہ تم بھی۔
سُدھیر۔ کیا ترکیب ہے۔
کندن۔ بہت مزہ دار۔ آؤ میرے ساتھ۔
سُدھیر۔ میں نے کہہ دیا ہے میں تماشا دیکھ
نہیں سکتا۔
کندن۔ ارے تم آؤ تو سہی، سب
دیکھ سکتے ہو۔
سُدھیر۔ مگر ہم جا کہاں رہے ہیں۔
کندن۔ منشی عبدالقدیر کے پاس۔
سُدھیر۔ منشی عبدالقدیر۔ یہ کس چڑیا
کا نام ہے۔
کندن۔ یہ میری جان پہچان کا آدمی
وہ تمہارے یہ سارے جملے آدھے
گھنٹے میں لکھ کر رکھ دیں گے۔
سُدھیر۔ سچ؟
کندن۔ ہاں صرف تھوڑے سے پیسے
ہوں گے۔ وہ تمہارے یہ ایک ہزار
کیا دو ہزار جملے ذرا سی دیر میں
لکھ کر تمہارے حوالے کر دیں گے۔
اور پھر تمہارے ہی خط میں۔
جیسا تم لکھتے ہو۔

سُدھیر۔ جیسا میں لکھتا ہوں؟
کندن۔ ہاں بالکل۔ یہ اب تک تم
نے جتنا لکھا ہے نمونے کے طور پر
انہیں دے دیں گے۔ وہ گھنٹہ
دو گھنٹے میں پورا مضمون تیار
کر لیں گے۔
سُدھیر۔ واہ یہ تو بڑی نرالی ترکیب
سوجھی۔
کندن۔ نرالی نہیں میں بھی ایک بار چلا
چکا ہوں۔ مگر چلو جلدی کرو۔
پانچ ساڑھے پانچ بجے واپس
اگر تم اپنا کام واپس لے
سکتے ہو۔

(منشی جی کے گھر پر سدھیر اور کندن دروازہ
کھٹکھٹاتے ہیں۔ پھر یری جیسے منشی جی منہ
میں پان دبائے عینک چڑھائے ہاتھ میں قلم
لئے باہر آتے ہیں)
کندن۔ بڑے میاں سلام۔
منشی جی۔ سلام، سلام۔ فرمائیے کس
نوعیت کا ہے کام؟
کندن۔ وہی کام جو آپ میرے لئے اس
سے پہلے کر چکے ہیں یہ میرے دوست
سُدھیر ہیں۔
منشی جی۔ لائیے۔
کندن۔ یہ ان کا لکھا ہوا خط ہے بالکل
اسی خط میں ایک ہزار جملے لکھنے ہیں
منشی جی۔ ایک ہزار۔ یا پروردگار۔

کندن۔ کچھ سنیں گے بھی آپ یا نہیں۔
منشی جی۔ سنائیے۔ کُل تفصیل بیان فرمائیے۔
کندن۔ تفصیل وفصیل کچھ نہیں بس یہ ایک
جملہ کہ "میں کبھی شور نہیں کروں
گا" ایک ہزار بار لکھ ڈالیئے۔
کتنے پیسے ہوں گے۔
منشی جی۔ آپ تو اپنے ہیں آپ سے کیا
زیادہ لینے ہیں، بس تین روپے
ہوں گے!
سُدھیر۔ تین روپے تو بہت ہیں۔ ایک
روپیہ لیجئے بس، جلدی کیجئے
ہمیں اور بہت کام ہیں۔
منشی جی۔ ایک روپیہ؟ نہیں جناب سوا
روپیہ ہوگا۔ منظور ہو تو کام دیجئے
ورنہ یہ ——— یہ لیجئے۔
سُدھیر۔ نہیں۔ نہیں رکھیئے اپنے پاس،
سوا روپیہ ہم دے دیں گے۔ مگر
کب تیار ملے گا۔
منشی جی۔ پورے پانچ بجے۔
کندن۔ اچھا ہم چلتے ہیں پورے پانچ
بجے آجائیں گے۔
منشی جی۔ اچھا دیکھئے وہ۔
کندن۔ کیا بات ہے؟
منشی جی۔ کچھ پیشگی کا انتظار۔
سُدھیر۔ کتنے چاہئیں۔
منشی جی۔ آدھے پیسے
کندن۔ دے دلا کر جلدی جھگڑا ختم کرو
بھئی۔

سدھیر۔ لو یہ اٹھنی ہے۔ باقی پیسے ہم لوٹ کر دیں گے۔

منشی جی۔ جی بہت اچھا۔ آپ جب دیں گے ہم تب ہی لیں گے۔

مگر دیکھو دیر نہ ہو ــــ اور بالکل ایسے ہی ۔

بالکل بالکل۔ آپ اطمینان سے جائیے۔ مگر ہاں پانچ بجے آ جائیے۔

(سدھیر اور کندن تماشے سے لوٹتے ہیں)

سدھیر: بھئی کندن تماشے میں بڑی دیر ہو گئی۔ ساڑھے پانچ بج چکے ہیں اب ہم کب ان منشی جی سے ملیں گے اور کب ہاسٹل جائیں گے ۔

کندن: چلو۔ چلو تیز تیز قدم بڑھاؤ۔ منشی جی کا گھر تو یہ سامنے ہے ہاسٹل بھی ابھی پہنچ جائیں گے

(منشی جی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں)

منشی: (اندر سے) ایں یہ کون آیا ۔ بھئی کس نے دروازہ کھٹکھٹایا

سدھیر۔ میں ہوں سدھیر۔

منشی جی۔ جی جی ۔ جی تقصیر، ابھی حاضر ہوا۔ آپ کا منشی عبداللہ یہ

سدھیر۔ کہاں ہے لاؤ جلدی کرو ۔ ہو گیا یا نہیں ۔

منشی جی۔ ہو گیا ؟ اجی کب کا تیار ہے ۔ پانچ بجے سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں

سدھیر۔ یہ لو پیسے ، ایک دونی اور یہ دو چونیاں ، یہ آٹھ پیسے ہیں۔

کندن۔ ہو گئے پورے !

منشی جی۔ ایک چونی کچھ ٹھیک نہیں ہے میاں ۔

کندن۔ اوہو بھئی چلتی ہے

سدھیر نہ چلے تو مجھ کو لوٹا دینا ۔ چلو کندن دیر ہو رہی ہے ۔ اب ٹھہرنے کا وقت نہیں لکھا تو خوب ہے منشی جی نے ذرا بھی فرق نہیں۔

کندن ۔ بڑے کام کے آدمی ہیں منشی عبدالقدیر

منشی جی۔ جی ہاں آداب بجا لاتا ہوں ۔

(ہاسٹل۔ ایک کمرے میں آرام کرسی پہ ماسٹر جی ٹانگیں پھیلائے کتاب دیکھ رہے ہیں۔)

سدھیر۔ میں اندر آ سکتا ہوں ماسٹر جی

ماسٹر۔ کون سدھیر۔ ہاں ہاں ہاں آؤ۔

سدھیر۔ یہ لیجئے ۔

(ورق الٹتے ہیں) بہت اچھے ماسٹر جی اب امید ہے پھر کبھی اس قسم کی سزا دینے کی نوبت نہیں آئے گی ۔

سدھیر۔ جی ۔ نہیں ۔

ماسٹر۔ شاباش جاؤ ، اچھا لو یہ چاکلیٹ کا چھوٹا سا پیکٹ ہے لے لو

سدھیر۔ جی شکریہ ۔ آداب عرض ماسٹر جی۔

ماسٹر۔ آداب عرض ۔

سدھیر۔ (خوشی سے ناچتے ہوئے) کُٹ۔کُٹ

کندن۔ یا اللہ کیا ہوا

سدھیر۔ چل گئی

کندن۔ کیا چل گئی۔ ارے کچھ بتاؤ گے بھی یا یوں ہی ناچتے رہو گے۔

سدھیر۔ تمہاری چال چل گئی ماسٹر جی ذرا نہ سمجھ سکے۔ خوب خوش ہوئے اور۔ اور یہ دیکھو ۔

کندن۔ چاکلیٹ کا پیکٹ !

سدھیر۔ ہاں

کندن۔ تو لاؤ استاد میرا حصہ۔ . . کیوں کیسی ترکیب لڑائی ۔ سزا بھی نہ بھگتنی پڑی اور ــــ فلم بھی دکھائی ۔

سدھیر۔ اور یہ جو ہم نے تمہیں مٹھائی کھلائی.

(دونوں خوب ہنستے ہیں)

(اسکول ۔ ماسٹر کا کمرہ)

چپراسی۔ صاحب کوئی منشی جی آپ سے ملنے آئے ہیں۔

ماسٹر۔ منشی جی ــــ کون منشی جی ہیں۔ خیر انہیں اندر بھیج دو ۔

منشی جی۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

ماسٹر۔ آپ ــــ آپ کا نام ؟

منشی جی۔ جی منشی عبدالقدیر ۔

ماسٹر۔ فرمائیے

منشی جی۔ عرض کرنا یہ تھا کہ کوئی لڑکا بنام سدھیر۔ آپ اس سے واقف ہیں

ماسٹر: سدھیر۔ ہاں پانچویں جماعت کا

لڑکا ہے۔ کیوں۔
منشی۔ جی یہ ہی لڑکا شاید۔ کوئی دو دن
ہوئے یہ چونی مجھے دے گیا۔ کم بخت
چلتی ہی نہیں۔ بہتیرا چلائی۔ مگر
کہیں نہ کام آئی۔
ماسٹر۔ تو اب آپ چاہتے کیا ہیں۔
منشی۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ یہ چونی
دینے والے کو واپس کر دوں
اور اس سے نئی چونی لے لوں۔
ماسٹر۔ (گھنٹی بجاتا ہے) ایشور سنگھ
ذرا سدھیر کو بلاؤ۔ پانچویں درجے
سے (منشی جی سے) کیا کام
کرتے ہیں آپ ـــ میں نے
کہا آپ سو گئے۔
منشی۔ جی۔ جی نہیں کچھ فرمایا آپ نے؟
میں کچھ اونچا سنتا ہوں۔ خطا کو معاف
فرمائیے اور پھر سے ارشاد فرمائیے۔
سدھیر۔ جی ماسٹر صاحب
منشی۔ آـــ آـــ یہ ہی لڑکا ہے
یہی لڑکا ہے۔ کیوں برخوردار
ہم نہ کہتے تھے نہیں چلے گی یہ چونی۔
سدھیر۔ کیسی چونی؟
منشی۔ (ناک میں) ایں؟ بات
سے پلٹتے ہو۔ کھوٹی چونی دے
کر اب مکرتے ہو؟
ماسٹر۔ سدھیر۔ تم نے انہیں چونی کیوں
دی تھی۔
سدھیر۔ جی۔ جی میں۔ میں کیوں دینے چلا تھا
بھلا۔
منشی۔ بھئی واہ یہ خوب رہی، اور
وہ جو پرسوں...
سدھیر۔ (آہستہ سے) اچھا اچھا چپ
ہو جاؤ۔
ماسٹر۔ کیوں کہنے کیوں نہیں دیتے۔
منشی۔ برخوردار مجھے کچھ کہہ تو لینے دو۔
سدھیر۔ منشی جی ـــ اِدھر آؤ۔
ماسٹر۔ کہاں لے جا رہے ہو انہیں!
منشی۔ بھئی ہمیں نہیں آنا جانا کہیں
ہمیں تو ہماری چونی دلواؤ۔
سدھیر۔ یہ لو چونی ـــ لاؤ کھوٹی
میں چلا لوں گا۔
ماسٹر۔ ٹھہرو منشی جی۔ یہ قصہ کیا ہے
منشی۔ کچھ نہیں صاحب، اب چلتے ہیں
ماسٹر۔ نہیں بتاؤ گے۔
منشی۔ سرکار پیٹ پر پیر نہ ماریئے۔
ماسٹر۔ جب تک ساری بات نہ بتاؤ گے
یہاں سے نہیں جا سکتے! ایشور سنگھ!
منشی۔ ایں۔ یہ اچھی زبردستی ہے بھئی
صاحب ہماری چونی ہمیں مل گئی
اب جانے دو۔
ماسٹر۔ سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔
منشی۔ یا خدایا ـــ تو رحم کر۔ کیا اب
ہمیں بھی لڑکوں کی طرح پٹنے کا
ارادہ ہے ماسٹر جی۔
ماسٹر۔ جلدی بتاؤ سدھیر نے تمہیں چونی
کیوں دی تھی۔
منشی۔ وہ۔ مٹھائی کھانے کو دی تھی۔
ماسٹر۔ مانوگے نہیں تم۔ ایشور سنگھ!
منشی۔ ارے صاحب کچھ مفت دی تھی۔ ایک
ہزار جملے لکھوائے تھے ہم سے تب دی
تھی۔ ہم نے خود لکھے ہیں ہاں۔ بقلم خود۔
ماسٹر۔ سینکڑوں کو؟
منشی۔ جی نہیں ہفتے کو۔ کل سوا روپیہ لیا
تھا بس ایک چونی ہی خراب تھی۔ اچھا
اب میں چلا۔
ماسٹر۔ سدھیر۔
سدھیر۔ جی۔
ماسٹر بتاؤ تمہیں کیا سزا دی جائے۔
سدھیر۔ جی۔ میں، وہ ـــ
ماسٹر۔ مجھے خبر نہ تھی کہ اب تم دھوکہ بھی دینے
لگو گے۔ پتہ ہے تم نے کتنی غلطیاں
کی ہیں۔ کلاس میں شور مچایا ہے۔
ایک۔ اس کی سزا میں جو کام دیا گیا۔
وہ خود لکھنے کی بجائے دوسروں سے
لکھوایا۔ یعنی وہ ساری دوپہر تم نے
کہیں اور گزاری پھر شام ـــ مجھ سے
جھوٹ بول کر یہ کاپی میرے حوالے
کی کہ ایک ہزار جملے تم نے لکھے ہیں، اور
اب منشی جی کو چلتا کرنا چاہتے تھے!
منشی۔ بچہ ہے سرکار جانے دیجئے!
ماسٹر۔ ہونہہ ـــ تم چپ رہو
جی۔!
منشی۔ جی بہت اچھا!
ماسٹر۔ شرم سے ڈوب جانا چاہیئے تمہیں سد

اور پھر ان سب حرکتوں کے بعد چاکلیٹ کا پیکٹ بھی اینٹھتے ہو مجھ سے۔ ایشور سنگھ بید لاؤ۔

چپراسی۔ صاحب آپ کی بہن جی آئی ہیں۔

ماسٹر۔ بہن جی! اچھا انہیں پاس کے کمرے میں بٹھاؤ۔ اور بید لاؤ

منشی۔ جی میں تو چلتا ہوں۔

ماسٹر: ارے آپ آ گئیں۔ آئیے آئیے بہن جی۔ یہ لڑکا ــــ یہ تو

ماسٹر۔ اسے جانتی ہیں آپ! کیا بہن جی سے بھی تم نے کوئی نئی شرارت کی ہے

بہن جی۔ شرارت، نہیں نہیں۔ اس لڑکے نے تو میرا کھویا ہوا بٹوہ مجھے دلایا ہے۔

ماسٹر۔ کھویا ہوا بٹوہ ــــ وہ جو ڈاکخانے میں کوئی لے اڑا تھا۔

بہن جی۔ جی۔ ہاں۔ یہ تو بہت ہوشیار اور بڑا بہادر لڑکا ہے۔

چپراسی۔ صاحب بید لیجئے۔

بہن جی۔ بید کس لیئے۔

ماسٹر۔ ذرا انہیں بہادر صاحب کی مرمت کرنی تھی۔

بہن جی۔ نہیں۔ نہیں ایسا مت کیجئے۔

ماسٹر۔ آپ نہیں جانتیں آج انہیں کئی شکایتوں کی سزا ملنی ہے۔

بہن جی۔ میری خاطر سے آج معاف کر دیجئے صرف آج۔ آئندہ یہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ کیوں لے ہے نا۔

سدھیر: جی بہت شرمندہ ہوں، ماسٹر جی مجھے معاف کر دیجئے میں۔ جی لوگوں کے بہکانے میں آ گیا تھا۔ ورنہ مجھ سے ایسی بھول کبھی نہ ہوتی مجھے معاف کر دیجئے، وعدہ کرتا ہوں پھر کبھی ایسا نہ ہوگا۔

بہن جی۔ ایشور سنگھ۔ یہ بید لے جاؤ۔

ماسٹر۔ بہن جی۔

بہن جی۔ چلئے چلئے اب جلدی سے تیار ہو جائیے پارٹی کا وقت ہو رہا ہے اور ہاں سدھیر کو بھی کیوں نہ لے چلیں۔

ماسٹر۔ آپ کی مرضی ہو تو لے چلئے۔

منشی۔ اچھا مجھے تو اجازت دیجئے۔ آداب بجا لاتا ہوں۔ آداب بجا لاتا ہوں۔

(پردہ گرتا ہے)

بچوں سے باتیں

عزیز بچو! سب رس برادری کی رکنیت کا کوپن شائع کیا جا رہا ہے۔ اسے کاٹ لو اور ضروری باتوں کا اندراج کر کے بھیج دو یا پھر ایسی ہی نقلیں تیار کر کے اپنے بھائی بہنوں کو بھی "سب رس برادری" کا رکن بناؤ

سب رس میں بچوں کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بچوں کے مضامین کے صفحات میں ہم اضافہ کرنے والے ہیں' لطیفے، کام کی باتیں، کارٹون' کہانیاں اور مضامین صاف خط میں لکھ کر ہمیں روانہ کیجئے' ہم انہیں چھاپتے ہوئے خوشی محسوس کریں گے۔ "سب رس" کو خرید کر پڑھنے کی مہم میں اپنے بڑوں کو بھی شامل کیجئے!

وقار بھائی

سب رس برادری

نام

درجہ/مدرسہ

پتہ (مکمل)

میں "سب رس برادری" کا رکن بن کر اردو زبان کی ترقی' قومی یکجہتی اور ملک کی خدمت کیلئے خود کو اہل ثابت کرنے کی کوشش کروں گا/کروں گی۔ براہ کرم مجھے "سب رس برادری" کا ممبر بنا لیجئے۔

(دستخط)

نئے طرز کی منصوبہ بندی

۱۹۷۸ء ــ ۱۹۸۳ء کی مدت کے دوران ریاست آندھرا پردیش کے لئے ۳۹۶۶ کروڑ روپے کا متوسط مدتی منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی میں ایک نیا ڈھنگ اپنایا گیا ہے۔

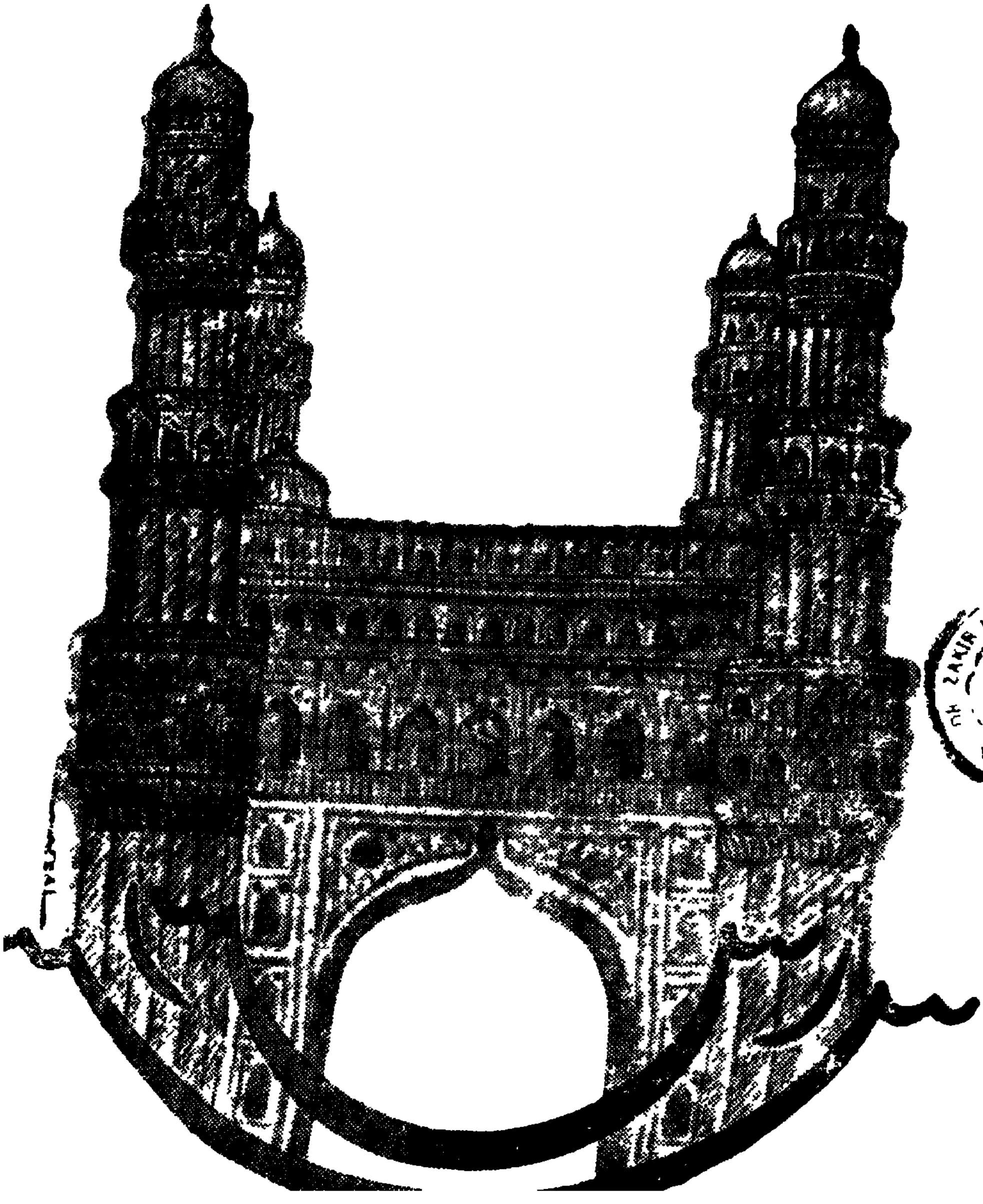
اس منصوبے کے تحت شعبہ جاتی موازنوں کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ چھوٹے منصوبہ کو ٹھوس طریقہ پر روبہ عمل لایا جا سکے۔

آبپاشی اور توانائی کے موازنوں میں کمی کرتے ہوئے متوسط مدت کے نئے پلان میں بڑی تبدیلی لائی گئی ہے۔ اس کے بالمقابل صنعتوں۔ مائننگ اور سوشیل سرویس کے شعبوں کی رقم میں اضافہ کیا گیا ہے۔

ڈائرکٹر جنرل
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

(41) L-No-94/ADVT/C4/79, DT. 17-1-79

سب رس



سن اجراء : ۱۹۳۸ء
فون : ۳۸۴۶۹
بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

ڈاکٹر مغنی تبسم
(معتمد مجلس مشاورت و مدیر اعزازی)
وقار خلیل
(معاون مدیر)

جلد : ۴۲ * شمارہ : ۴
اپریل ۱۹۷۹ء
قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ پچھتر پیسے

زر سالانہ : ۲۰ روپے ، ششماہی : ۱۰ روپے
مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، چارکمان حیدرآباد ۔ ۲
مقام اشاعت :- ادارۂ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ ۔ حیدرآباد ۔۔۔۔ ۴

ترتیب

بچوں کا بین الاقوامی سال

سال ۱۹۷۹ء "بچوں کا بین الاقوامی سال" کی حیثیت سے منایا جارہا ہے۔ آندھرا پردیش میں اس سال کے دوران میں بچوں کی فلاح و بہبود سے متعلق جاریہ اسکیمات کی عمل آوری میں زیادہ شدت پیدا کی جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ نئی اسکیمات بھی آغاز کی جائیں گی۔

بچوں کی ترقیاتی خدمات سے متعلق مشترکہ اسکیم اضلاع عادل آباد اور اننت پور کے دو بلاکوں میں زیر عمل آوری ہے۔ اس اسکیم کے تحت مشترکہ طور پر ایسی خدمات فراہم کی گئی ہیں جو غذا۔ صحت۔ تعلیم اور تفریحات سے متعلق سہولتوں پر مشتمل ہیں۔

سال ۷۸ - ۱۹۷۹ء کے دوران میں اضلاع مشرقی گوداوری۔ ورنگل کرشنا اور کرنول کے چار مزید بلاکوں میں اس اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے۔ بچوں کے بین الاقوامی سال میں اضلاع وشاکھاپٹنم۔ چتور اور میدک کے مزید تین بلاکوں میں اسکیم کی عمل آوری شروع کی جائے گی۔

ڈائرکٹر جنرل انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز

L. No.384/ADVT/44/79 D/9.3.79
D.G. I&PR 43

ڈاکٹر سید حامد حسین

اکبر الہ آبادی کی شعری انفرادیت

اکبر کے مقبول ترین اشعار وہ ہیں جن میں ان کی حساس شخصیت کی دھار پر ان کے عہد کی خیرگی نظر آتی ہے۔ اکبر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی سماجی تاریخ میں آنے والے اس شورش انگیز دور کے شاہد تھے، جس میں مغربیت کا سیلاب ایک زبردست خطرہ بن کر بڑھ رہا تھا اور جو روایتی افکار و اعتقادات، اقدار و اطوار کو اپنی تندی میں بہائے لئے جا رہا تھا۔ چنانچہ تہذیب و ترقی، روشن خیالی اور وسعت نظری کے نام پر اہل مشرق اپنی متاع بے بہا سے بے دریغ دستبردار ہو رہے تھے۔ اکبر نے خود مقدور بھر مغربی انداز کی تعلیم حاصل کی۔ پھر انہوں نے سرکاری ملازمت کی۔ سرکاری خطاب پایا اور سرکار کا پنشن حاصل کی، لیکن انھوں نے انقلاب و ترقی کا نقیب بننے کی بجائے اپنے لئے روایتی اقدار کا پاسباں بننا پسند کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قوم کی زبوں حالی کے مرثیے ہر طرف پڑھے جا رہے تھے اور قوم کو مغربی انداز فکر و حیات سے متعارف کرا کے ترقی اور فلاح کی راہ دکھائی جا رہی تھی۔ اکبر نے اس ماحول میں مغرب کی اس مغلوبیت اور انگریزی تہذیب و تمدن سے مرعوبیت کے رجحان کا پوری شدت سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے کبھی سیاسی رہنمائی کرنے کا دعویٰ نہیں کیا، لیکن انہوں نے قومی روایات کو محفوظ رکھنے اور قومی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے جو کوششیں کیں، وہ یقیناً قومی اہمیت کا ایک کارنامہ ہے۔ اکبر نے انگریز پرستی کی کھل کر مخالفت کی اور اس پر بھرپور طنز کرنے کا انہوں نے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا، وہ کہتے ہیں:

ہزار طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہیں — طواف ان کے گھروں کا ہے، انھیں سڑکوں کے پھیرے ہیں
سواری ہے انھیں کی، راہ اُن کی اور ڈاک ان کی! — انھیں کی فوج ہے، ان کی پولیس ہے اور تاک اُن کی
ہوا میں ایرشپ ان کے، سمندر میں جہاز اُن کے — عمل ہم میں کیا کرتے ہیں، نا معلوم راز اُن کے
علوم اُن کے، زباں ان کی، پریس اُن کے، لغات اُن کے — ہماری زندگی کے سارے اجزا ہیں بابت ان کے
قرائن کہہ رہے ہیں آ رہا ہے، دور فتنوں کا — ہوائیں وہ چلیں۔ گی نقش مٹ جائے گا کتنوں کا

اکبر نے بار بار ان بے اعتدالیوں سے متنبہ کیا، جو مغرب کی کورانہ تقلید کے نتیجے میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی، فکری اور روحانی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ، عقل نہ سیکھ　　کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول　　رہ کے قومی کا تو خود بیگانہ ہو رہزن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی　　یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا
سلف ریسپکٹ کا پھر یاد رہے گا نہ سبق　　پھر نہیں ہونے کی یہ بحث تو دشمن پیدا
بزمِ تہذیب سے ہو جائیں گے قطعاً خارج　　جس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہو شیون پیدا

اکبر نے قدیم روایتوں کے تحفظ اور اُن کے احترام پر جا بجا زور دیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ اصرار محض بے عقل قدامت پرستی کا نتیجہ نہیں ہے وہ قدیم سے صرف اس لئے احتراز نہیں کرنا چاہتے کہ وہ قدیم ہے، وہ ایک ایسی میانہ روی کے حامی ہیں، جس میں قومی انفرادیت برقرار رہ سکے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

نہ نرے اونٹ ہو، نہ ہوٹل ڈاگ　　نہ نِرے بھی ہو، نہ تم ہو آگ
چال ہے اعتدال کی اچھی!　　سازِ حکمت کا جوڑ ہے یہ راگ

بے اعتدالی، نقالی، غلامی، تصنع پر اکبر نے جا بجا طنز کیا ہے۔ اسی طنز کی زد میں مغربی تعلیم، مغربی انداز کے ادارے، مغربی طرزِ معاشرت، مغربی افکار آ گئے ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے سرسید کی مخالفت کی اور مسلمانوں میں نئی تعلیم کے فروغ اور کالج کے قیام کی کوششوں کو تنقید کا نشانہ بنایا:

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے　　کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم　　رنگ مذہب میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے　　شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

پیری کی زلف میں، الجھا نہ ریشِ واعظ میں　　دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے　　خزانہ بن گیا یوروپ کی داستانوں کا

اکبر کی شاعری کی جان ان کے انداز کی یہی شوخی اور تیکھا پن ہے۔ انھوں نے بڑی خوبی سے قوم کی اُس ہیئت کذائی کو جا بجا بے نقاب کیا ہے، جو مغرب کی اندھا دھند نقالی کی شکل میں پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً:

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے　　مسجد سے ہم نکل گئے بسکٹ کی چاٹ میں
میخانۂ رفارم کی چکنی زمین پر　　واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا
کیسی نماز، بال میں ناچو جناب شیخ　　تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا
یہ پاس، وہ پاس، نہ موجد، نہ اہلِ زر　　اخبار میں جو چھپ گئے، ارمان نکل گیا
خدا کے منکر، نبی سے غافل، کہاں کے پیر اور امام صاحب　　اُنھیں کے در پر جھکی ہے خلقت، سلام صاحب سلام صاحب
کہاں کی پوجا، نماز کیسی، کہاں کی گنگا، کہاں کا زمزم　　ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک، ہمیں بھی دو اک جام صاحب

اس طنز کو اکبر نے اپنی دلکش اصطلاحات، تلمیحات، اور الفاظ کے انوکھے استعمال سے مزید گوارا بنایا ہے۔ مثلاً:

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو! اتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو!

جامۂ ہستی کے ٹکڑے اُڑ رہے ہیں نزع میں پھینکئے اب کوٹ کو، تہ کیجئے پتلون کو

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتی لے کر

سودا اُس کو ہے جو سدھار الندن وہ دولت و جنس گھر میں جوتی لے کر

وحشت نئی روشنی سے آخر کو گھٹی فکرِ روزی میں شیخ کی طبع ڈٹی

کرکٹ، جمناسٹک، ٹریننگ کالج مولانا سیکھتے ہیں بالفعل نٹی

اکبر نے اپنی شاعری میں لاتعداد دلچسپ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ مثلاً گنگو، صلو، بدّھو، وفاتی، اونٹ، گائے بندر، سید، شیخ، مرزا، گزٹ، کرجا، کانفرنس وغیرہ اور ان سے انہوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے، وہ اُن کی ذکاوتِ طبع کا شاہد ہے۔ کبھی کبھی تو بالکل معمولی الفاظ سے وہ بڑا پُر لطف تاثر پیدا کر جاتے ہیں۔ اس شعر میں "پوری" اور "چپاتی" کا استعمال ملاحظہ ہو ؎ دُھن دیس کی تھی، جس میں گاتا تھا ایک دہاتی بسکٹ سے ملائم ہے پوری ہو یا چپاتی

یا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اس اکھاڑے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے شیخ نے تہمد سے ہجرت کی، طرف پتلون کے

یا یہ کہتے ہیں ؎ سوپ کا شائق ہوں، یخنی ہوگی کیا چاہئے کٹلٹ یہ قیمہ کیا کروں!

یا یہ شعر بھی دیکھئے ؎ اے شیخ جب نکل نہیں دستِ قوم میں پھر کیا خوشی جو اونٹ تیرے ریل ہو گئے

اس شعر کا تو لطف ہی اور ہے ؎ ہوتا ہے نفخ یوروپین نان پاؤ سے میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے

اکبر کی ظرافت اور زندہ دلی، اُن کا طنز اور اُن کی چٹکیاں، اُن کی شاعری کا ایک اہم اور غالب پہلو ہیں، لیکن اکبر کے شعری .. سرمائے کا ایک حصہ وہ بھی ہے، جس میں انہوں نے روایتی سنجیدگی کے ساتھ عاشقانہ اور عارفانہ مضامین کو نظم کیا ہے۔ اس شاعری پہ گو کہ اکثر روایت کی چھاپ بہت گہری نظر آتی ہے، پھر بھی اس میں جا بجا اکبر کی فطری شوخی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ؎

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی درد کے ساتھ ہی ساتھ اُس کی دوا بھی آئی

آئے کھولے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا میں بھی آیا تو سے گھر، میری بلا بھی آئی

وائے قسمت کہ مرے کفر کی وقعت نہ ہوئی بُت کو دیکھا تو مجھے یادِ خدا بھی آئی

ہوئیں آغازِ جوانی میں نگاہیں نیچی!! نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

اپنی شاعری کے آخری دَور میں اکبر کے کلام میں ایک انوکھی عارفانہ بصیرت کے انداز نظر آتے ہیں، یہ اکبر کی سنجیدہ شاعری کا وہ حصہ ہے، جسے عہدِ حاضر کے معتبر سرمایۂ شعر کا قابلِ قدر حصہ شمار کیا جاسکتا ہے، اُن کی یہ غزل تو خاصی مشہور ہے ؎

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہوں بازار سے گذرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

زندہ ہوں، مگر زیست کی لذّت نہیں باقی ہر چند کہ ہوں ہوش میں، ہشیار نہیں ہوں

اس خانۂ ہستی سے گذر جاؤں گا بے لوث سایہ ہوں فقط، نقش بہ دیوار نہیں ہوں

اس سے زیادہ متانتِ فکر رکھنے والی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

قوتِ سیر جو حاصل ہو تو دیوار نہ بن　　پنجۂ غیر میں رہنا ہو تو تلوار نہ بن!

دل کی خاطر تو ہے لازم تجھے بک جانا بھی　　صرف آنکھوں کا مزا ہو تو خریدار نہ بن

دل سے کہہ سکتے ہیں، ہاں شمع بصیرت نہ بجھے　　وقت سے کہہ نہیں سکتے کہ شبِ تار نہ بن

اکبر ایک پُرگو، قادر الکلام شاعر تھے، اُن کے شعروں میں ریاضی بھی ہے اور ریاضت بھی، اُنھوں نے سخت سے سخت زمینوں اور ناممکن سے ناممکن قافیوں کے ساتھ شاعری کی ہے۔ دوسری جانب انہوں نے نہایت خلوصِ فکر و جذبات کے ساتھ نازک سے نازک مضامین کو برتا ہے۔ طنز کے نشتر اور طنز نگاری کی بے دریغ فطرت رکھتے ہوئے بھی انہوں نے نہ کبھی احتیاط کو ہاتھ سے جانے دیا اور نہ وضعداریوں کو خیرباد کہا، ظرافت اور دل لگی کے نام پر انھوں نے کبھی سطحیت، چھچھورے پن یا سوقیت کو قبول نہیں کیا۔ افراد کی دل آزاری سے بھی انہوں نے ممکن حدود تک احتیاط برتی۔ سر سید کے مشن پر نکتہ چینی کی، اُن کی شخصیت پر چھینٹے نہ آنے دیئے۔ بہت سے اشعار جن کے ذریعہ دل آزاری کا اندیشہ ہو سکتا تھا، وہ انہوں نے چھپتے جی شائع نہ ہونے دیئے اور غالباً اسی احتیاط کے مدنظر اُن کے صاحبزادے نے بھی اُن کی اشاعت کی اجازت نہ دی۔

اکبر اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک شگفتہ باب کا اضافہ کرتے ہیں، لیکن جس طرح اُن کی ظرافت اپنے اندر ایک سماجی مقصد رکھتی ہے، اسی طرح اُن کی شاعری، ہمارے شگفتہ ادب میں حزم و احتیاط، خلوص اور وضعداری کی شائستہ اقدار کی ایک قابلِ قدر مثال پیش کرتی ہے۔

—✕—

اردونامہ صفحہ ۳۵ سے آگے

اردونامہ صفحہ ۳۵ سے آگے

نعیم زبیری، نجمہ نکہت، انور رشید، ساجدہ عابد، قدیر الزماں، محسن علی، یم مظہر الزماں، نہیال سنگھ ورما شامل تھے۔ عصمت چغتائی نے اس موقع پر ستالیمار پبلی کیشنز کی طرف سے نجمہ نکہت کی کہانیوں کے مطبوعہ نسخے "سیب کا درخت" کی رسم اجراء بھی انجام دی۔ سیمینار اور شامِ افسانہ میں اردو دوستوں، ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

۲۱ مارچ: بزم اردو جامعہ عثمانیہ عثمانیہ کی طرف سے ڈاکٹر حنیظ قتیل کو وداعی پارٹی دی گئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں محفل شعر ہوئی۔ مسرز ڈاکٹر مغنی تبسم، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، شاذ تمکنت، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، محمد علی اثر، صادق نقوی، رئیس اختر اور مجید اللہ صدیقی نے کلام سنایا۔

● حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے فیملی ویلفیر بیورو کی طرف سے بہبودی خاندان کے موضوع پر مقصدی مشاعرہ جناب حافظ ابو یوسف ایم ایل سی، صدر نشین مجلس انتظامی اُردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز اوج یعقوبی، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر غیاث صدیقی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، ناصر کرنولی، صادق نقوی، رؤف خلش، غیاث متین، علی الدین نوید، روش خیال، خلش جگری، عزیز النساء صبا اور نور النساء تمکین نے نظمیں سنائیں۔ جناب صلاح الدین نیر نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

مکاتیبِ رشید احمد صدیقی

مکاتیب کا شمار ادب ہی میں نہیں، ادبِ لطیف میں بھی ہوتا ہے اور اگر مکتوب اچھا ہو تو اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہونا چاہیئے۔ اردو میں جن کے مکاتیب فنونِ لطیفہ کی آبرو میں بھی اضافہ کرتے ہیں، ان میں رشید احمد صدیقی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ ایک اچھا مکتوب، اچھی غزل کی طرح ہوتا ہے، پُرکیف اور دل پذیر۔ رشید احمد صدیقی نے جہاں تہاں غزل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، یہ ساری کتابیں کم و بیش اچھے مکتوب کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہیں۔ غزل، شاعری نہیں، تہذیب بھی ہے..... غزل فن ہی نہیں فنون بھی ہے..... غزل صنفِ سخن نہیں، معیارِ سخن بھی ہے.... غزل ریزہ کاری میں میناکاری ہے..... غزل کو میں فن نہیں اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ

یہاں اچھے مکاتیب سے مراد کاروباری نوعیت کے مکاتیب اور نہ وہ جو محض رسمی طور پر تحریر کئے جاتے ہیں۔ بلکہ وہ مکاتیب ہیں جو ارادتاً "لکھے نہیں جاتے" بلکہ صاحبِ مکتوب جن کو آپ ہی آپ لکھ جاتا ہے۔ کاروباری مکاتیب کا دائرہ معین اور محدود ہوتا ہے۔ رسمی مکاتیب، مکاتیب برائے مکاتیب کے ذیل میں آتے ہیں۔ یہ اس لئے لکھے جاتے ہیں کہ ان کو لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کچھ ہمارے تہذیبی تقاضے اور ادھر راہ و رسم کی پابندیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو ضبطِ تحریر میں لانا پڑتا ہے۔ چاہیں نہ چاہیں ــ انسان ایسے مکاتیب میں بندھا ٹکا سا ہوتا ہے۔ لیکن وہ مکاتیب جو "آپ ہی آپ لکھے جاتے ہیں" وہ ہر طرح کی قید و بند سے آزاد ہوتے ہیں، لکھنے والا غیر شعوری طور پر ان کو لکھ جاتا ہے، وہ خود بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ قلم کی روانی پر اس کو گرفت نہیں ہوتی، ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں غالبؔ سے مضامین خیال میں آتے لگتے ہیں اور صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اسی بات کو اپنے خوب صورت اسلوب میں یوں پیش کیا ہے:

"خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے، جس طور پر محبت ہو جاتی ہے، کی نہیں جاتی، اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے، لکھا نہیں جاتا، محبت کے دیوتا کے مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔" [1]

---

[1] رشید صدیقی "مکتوباتِ نیاز پر اظہارِ خیال" "نگار" لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۴۰ء

ایسے مکاتیب میں داخلی اور بغیر اپنے آپ ظاہر ہوتا ہے اور مکتوب الیہ کی شخصیت کسی ظاہرداری اور ملمع کے بغیر منظرِ عام پر آجاتی ہے، جو اس کی حقیقی شخصیت ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے کسی مضمون میں تصانیف کو پلیٹ اور خطوط کو شخصیت کا ترجمان قرار دیا ہے۔ اس نوع کے مکاتیب آلۂ انعکاس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شخص چاہے نہ چاہے، جن سے شخصیت منعکس ہو کے رہتی ہے۔ ایسے مکاتیب میں قلم سے کام نہیں چلتا۔ ایسے مکاتیب تو خونِ دل سے لکھے جاتے ہیں۔ ادب میں ایسے مکاتیب ہی کی اہمیت ہوتی ہے اور ایسے مکاتیب ہی فنونِ لطیفہ میں شمار ہوتے ہیں۔

ادبی تذکرے، ادبی تواریخ، سوانح عمریاں........ یہ وہ چیزیں ہیں، جن کے وسیلے سے ہم کسی شخصیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ خود نوشت سوانح عمریوں کو اس خصوص میں اونچی حیثیت حاصل ہے۔ جس میں شخصیت نسبتاً کھل جاتی ہے، لیکن ان میں تصویر کے دونوں رخوں کا پایا جانا محال سا ہے۔ یہاں بیشتر واقعات پردۂ خفا میں بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ مبالغہ آرائی بھی ممکن ہے اور واقعات کو توڑ موڑ کر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں تازہ مثال جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" ہے۔ مکاتیب کا معاملہ ان سے مختلف ہی نہیں، ممتاز بھی ہے۔ ان مکاتیب کا جن کو میں نے فنونِ لطیفہ کے ذیل میں شامل لیا ہے۔

مصنف اپنے مضامین میں، مقرر اپنی تقاریر میں اور ایک عام فرد اپنی گفتگو میں جن خیالات کا اظہار کرتا ہے، قاری یا سامع سے، خواہ وہ کتنا ہی بے تکلف کیوں نہ ہو اور اپنائیت کا اظہار کرے تاہم وہ اپنے دل کی بات نہیں کہتا اور موقع و محل کو ملحوظ رکھنا ہی پڑتا ہے اور پھر یہ بھی کہ کتاب، نہ جانے کب، کہاں اور کتنے افراد کے زیر مطالعہ آتی ہے، جو مختلف مزاج میلانات اور افکار کے حامل ہوتے ہیں۔ تقاریر میں مقرر کو سامعین کی کئی سطحوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بہر طور، وہ نہیں کہہ سکتا، جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ گفتگو میں مخاطب سے نسبتاً زیادہ بے تکلفی ممکن ہے، لیکن یہاں بھی حفظِ مراتب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پاس و لحاظ کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مکاتیب کا معاملہ ان سب سے جداگانہ ہے بلکہ برعکس کہیے، یہاں جھجھک، تکلف، خاطر داری، پاس و لحاظ اور مروت کے بھی پردے آپ ہی آپ اٹھ جاتے ہیں۔ یا اٹھا دیے جاتے ہیں۔ بالخصوص ایسے خطوط، جو بے تکلف احباب کو تحریر کیے جاتے ہیں اور زیادہ بے تکلف ہوتے ہیں اور کیا کہیے۔ انسان ان میں اپنا دل چیر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ خط لکھ جاتا ہے، کبھی کبھی وہ بھی نہیں جانتا وہ کیا لکھ گیا، اس کو لکھنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض افراد اپنے نجی مکاتیب کی اشاعت موزوں خیال نہیں کرتے۔ خواہ وہ کتنی ہی اونچی ادبی مرتبت کے حامل نہ ہوں اور ادبی جواہر پاروں کی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔ رشید احمد صدیقی بھی ان ہی اصحاب میں شامل تھے، بلکہ اُن کا رویّہ بے حد شدید تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط کی اشاعت سے بے شمار افراد کو منع کر رکھا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے موسومہ اپنے مکتوب ۱۶ر جون ۱۹۴۳ء میں رقمطراز ہیں:

"نجی خطوط کے شائع نہ کرنے کے جواز میں دوستوں سے گفتگو اور بحث کے دوران میں مثال بجنسہٖ وہی دیتا ہوں، جو آپ نے دی ہے۔ یعنی غسل خانے میں تانک جھانک، کس صحیفۂ اخلاق میں روا ہے!...."

مکاتیب کو شائع نہ کرنے کے بارے میں ایک اور جگہ اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

" مجھے خطوط نگاری کی تاریخ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بچپن میں انشائے مادھورام، جوانی میں لیڈی چیٹرلی کے عاشق کے خطوط اور بڑھاپے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب نظر سے گذرے۔ ممکن ہے اسی کا ردِ عمل ہو، جس کی وجہ سے اس پر اصرار ہے کہ میرے خطوط خواہ کسی کے نام ہوں، شائع نہ کئے جائیں "[1]

خیر یہ تو باتیں تھیں ورنہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کے مکاتیب اچھے ہوتے ہیں، بہت اچھے، بے حد اچھے۔ علمی، ادبی، تہذیبی، یہ اور ایسے ہزار ویئے سے۔ ایک جگہ رشید احمد صدیقی نے اچھے مکتوب کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اس کو پڑھ کر پھاڑ دیا جائے (خود رشید احمد صدیقی نے اصغر گونڈوی کے موسومہ اپنے مکاتیب کو اصغر گونڈوی کے انتقال کے بعد حاصل کر کے پھاڑ دیا) رشید احمد صدیقی کی اس منطق کو کون تسلیم کرے گا اور اگر ان کی اس منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو کوئی دل جلا شاید یہ بھی کہہ بیٹھے کہ اچھے انسان کی پہچان یہ ہے، بات چیت کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے۔

رشید احمد صدیقی نے اپنے مکاتیب کو خود چاک کر دیا ہو، لیکن کسی اور سے یہ کفر ممکن نہیں۔ یہ ادبی قتل کون کرے گا؟ رشید احمد صدیقی کے اس رجحان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ رشید احمد صدیقی ایک جذباتی فن کار ہیں۔ وہ لوگوں سے عموماً لئے دیئے رہتے ہیں۔ ایک حد اور فصل کو قائم رکھتے ہوئے ملتے ہیں، لیکن جن سے بے تکلف ہیں اور جن سے کھل کر ملتے ہیں اُن پر اُن کی شخصیت کے بیشتر راز، راز نہیں رہتے اور پھر وہ اپنے تعلق سے اور ان کے بارے ہی میں نہیں، بلکہ اوروں کے بارے میں بھی بلا کسی تکلف کے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ مختلف احباب پر طنز بھی کر جاتے ہیں اور ان کو ظرافت کا نشانہ بھی بنا دیتے ہیں اور جہاں تہاں رازہائے درونِ پردہ بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے خطوط کا منظرِ عام پر آ جانا کسی صورت مناسب نہیں۔ کم از کم ایک عرصہ تک اُن کی اشاعت سے گریز کیا جانا چاہیے۔ لیکن جہاں تک مکاتیب کی وقعت اور ادب میں ان کی اہمیت کا تعلق ہے، رشید احمد صدیقی کا معیار و مذاق اونچا اور بہت اونچا تھا، عمدہ اور بے حد عمدہ وہ اچھے مکاتیب تحریر ہی نہیں کرتے، اچھے مکاتیب کا احترام کرنا بھی جانتے تھے۔ ان سطور سے مکاتیب کے بارے میں اُن کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے:۔

" خطوط کو نہ پکا گانا ہونا چاہیے، نہ فلمی قوالی۔ خط لکھنا دراصل خطبۂ صدارت تصنیف کرنے کا فن نہیں، جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے اور گفتگو کرنا، گفتگو ہی کرنے کا نہیں، خاموش رہنے کا بھی فن ہے اس اعتبار سے بڑا سخت گیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفاتِ الٰہیہ میں سے ہے۔ اپنے بے پایاں اور بے کراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا، خدا ہی کے بس کی بات ہے۔ خطوط نویسی کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ لیکن اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ حسن و ہنر کا جو اظہار و ابلاغ مختلف فنونِ لطیفہ سے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ گفتگو کرتے میں ان سب سے بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش، رنگ، رقص، آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت

---

[1] رشید احمد صدیقی " غالب کی شخصیت اور شاعری" شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۷۰ء۔ اشاعت اول ص ۲۳

معاشرے میں بد چلنی اور بدامنی کی کیسی قیامت برپا ہے۔ روس ایک طرح کا پریشر بلٹ بن گیا ہے جس کی وجہ سے سارا فضائی نظام درہم برہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بد بخت حکومت اور کیسی مظلوم قوم ہے، جہاں دوست یا عزیز پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قہرِ الٰہی اور کیسے کہتے ہیں۔"

علی گڑھ تو رشید احمد صدیقی کی زندگی تھا، ان کے لیے سب کچھ۔ اُن کے بیشتر مضامین کا مرکز و محور یہی تھا۔ اس طرح علی گڑھ کا ادبی نام ہے رشید احمد صدیقی! رشید احمد صدیقی نے علی گڑھ کا ذکر کیا ہے بڑے چاؤ سے، بڑے اہتمام سے۔ علی گڑھ کے لئے وہ شاید اپنی جان بھی قربان کر دیتے۔ علی گڑھ کے بنیادی کردار کو تبدیل کرنے کی بات ہو یا علی گڑھ میں کسی نہ کسی بہانے ہنگامے! یہ سب رشید احمد صدیقی کے لئے سوہانِ روح رہے۔ اپنے مضامین اور مقالات میں انھوں نے علی گڑھ کی تہذیبی، علمی، اور معاشرتی حیثیت پر روشنی ڈالی، لیکن علی گڑھ کے اس رُخ پر انہوں نے اپنے مضامین میں اظہارِ خیال نہیں کیا۔ شاید وہ کرنا بھی نہیں چاہتے تھے کہ اپنے مزاج و مذاق کے اعتبار سے اپنے دل کے داغوں کی نمائش عام وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن جب کبھی انھوں نے اپنے ہم خیال اور ہم مذاق افراد کو مکاتیب تحریر کئے ہیں، علی گڑھ کے بارے میں اُن کا قلم آنسو بہانے لگا ہے، خون کے آنسو! وہ اپنے شدید جذبات پر قابو نہیں پا سکے ہیں۔ اُنھوں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے کہ کہا نہیں جا سکتا۔ علی گڑھ میں ۲۴ راپریل ۱۹۶۵ء کو ہنگامے ہوئے۔ اس سانحہ کو ایک ماہ گذر گیا۔ ۲۴ رمئی ۱۹۶۵ء کو علی گڑھ کا یہ عاشق مسعود صاحب کو مکتوب لکھتا ہے۔ دیکھیے دل کے زخم کیسے تازہ ہیں، کیسے ہرے!

"علی گڑھ کے حادثہ کو آج ایک ماہ ہونے کو آیا، لیکن اس کا اثر کچھ اس طرح کا ہے، جیسے وہ سانحہ گزر نہ چکا ہو بلکہ بہ عنوانِ دگر برابر پیش آ رہا ہو۔ معلوم نہیں اب اپنی زندگی میں اس کا ختم ہونا دیکھ پاؤں گا یا نہیں۔"

اور ادھر کئی برس گزر جاتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں مُسلم یونیورسٹی (ترمیمی) بل، پارلیمان میں پیش کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ کے پرستاروں، عاشق زاروں اور جاں نثاروں کے کیا کیا خواب تھے جو چکنا چور ہوئے۔ آرزوئیں، ارمان، سب، سب اپنی موت آپ مر گئے۔ اُمیدوں کی کلیاں مرجھا گئیں۔ رشید احمد صدیقی کے دل پر جو گذری تھی اس کا اظہار اُن کے صرف مکاتیب میں ہوتا ہے۔ ایسے مکاتیب زیادہ تر مسعود صاحب کے موسومہ ہیں۔ ۳۱ رمئی ۱۹۷۲ء کے مکتوب میں یونیورسٹی بل کی سمت یوں اشارہ ہے۔

"یونیورسٹی بل کی بشارتیں دیکھ لیں؟ کوئی امید افزا بات کہیں سے سنائی نہیں دیتی۔ اللہ کی مقہور قوم کے فرد فروغ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بندوں کی مقہور قوم (ہم مسلمانوں) کو بھی نظر میں رکھیے۔ اس کے بعد ہندوستان کے بد نصیب مسلمانوں کو کیا کہیں۔ کس کس کی اور کہاں کہاں کی کہنی اور ہم سب کو بھرنی!"

ایک مکتوب میں جو ۶ رجون ۱۹۷۲ء کا ہے۔ یونیورسٹی بل کے بارے میں کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

"حادثہ سخت ہو یا جان عزیز، رعایتِ لفظی ہم اور آپ سے نہ چھوٹے گی! مسعود صاحب، ایک بات کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا کہ ہم جس متاع کو عزیز رکھتے ہیں یا ہم کو رکھنا چاہیے، اس

کی وکالت، حمایت اور حفاظت سے باز نہیں آ سکتے، فرد کا یہی مقام ہے۔ یہی فرد مردِ مومن کہلاتا ہے۔ یہ لڑائی حق کے لیے لڑی جاتی ہے، ہارنے جیتنے کے لیے نہیں۔ اس لیے اس کا انجام یا انعام شہادت یا سعادت ہے۔ جس کے لئے زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں، اُس کے لئے مرنے میں کیا ہرج!" رشید احمد صدیقی کے مکاتیب میں ان ہی موضوعات پر نہیں، گھریلو موضوعات پر بھی اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ نجی معاملات پر "گفتگو" بھی ہوتی ہے اور اپنی صحت اور دوسروں کی عافیت کی باتیں بھی۔ غرض وہ سب کچھ جو ایک عام انسان سے ممکن ہے اور فن کار خواہ وہ کتنا ہی بلند مرتبت اور عالی مقام کیوں نہ ہو جائے اپنے اندر کے انسان سے جُدا کب ہوتا ہے ایسا ممکن بھی نہیں۔ بیگم رشید احمد صدیقی حیدرآباد کے نقشی پاندان کی خواہاں ہیں۔ رشید احمد صدیقی اس خصوص میں اپنے مکتوب مورخہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۴ء میں مسعود صاحب کو لکھتے ہیں:

"معلوم نہیں، وہ میرا خط آپ کو ملا یا نہیں، جس میں بیگم فاطمہ عالم علی صاحبہ (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صاحبزادی) کے بارے میں عرض کیا تھا کہ میری بیوی نے ان کو ایک عدد حیدرآبادی پاندان خریدنے کے لئے پچپن روپیے دیے تھے، جب موصوفہ اوائل ماہ گذشتہ میں کشمیر جاتی ہوئی علی گڈھ ٹھہر گئی تھیں۔ تاباں صاحب کے صاحبزادے میاں افتخار حیدرآباد پہنچے ہوں گے۔ اُن کی معرفت وہ پاندان (بغیر ناگردان کے) بھیجا جائے یا بیگم مسعود وہ روپیے لے کر خود ویسا ہی پاندان خرید کر بھجوا دیں، جیسا موصوفہ نے میرے لیے خریدا تھا۔ بیگم فاطمہ کا پتہ نہیں معلوم، ورنہ اُن کو راست لکھتا۔"

اسی طرح کسی خط میں لکھنؤ کی سیویوں کی خواہش کی گئی ہے تو کسی خط میں اصغر علی محمد علی کے ہاں کے عطر اور محمد عمر محمد صدیق کے برقی قوام کا۔

رشید احمد صدیقی کو کبھی گلابوں کا بے حد شوق تھا۔ اُن کے اپنے گھر میں گلابوں کا ایک باغ سا تھا، جس میں دیسی گلاب، ولایتی گلاب، رنگ رنگ کے گلاب، چھوٹے گلاب، بڑے گلاب ..... غرض طرح طرح کے، قسم قسم کے، لیکن یہ شوق بتدریج کم ہوتا گیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ۔ اور ایک زمانہ وہ آگیا کہ انہوں نے گلابوں کی ذمہ داری، اپنے ہمشیر زادے کمال الدین کو منتقل کر دی۔ مسعود صاحب کے موسومہ مکتوب مورخہ ۹ر اگست ۶۹ء میں تحریر کرتے ہیں:

"ایک زمانہ تھا کہ اچھے گلاب، اچھے قالین، اور چینی کے اچھے ظروف جمع کرنے کا شوق تھا، کراکری چوری ہو گئی، گلابوں کا شوق کمال کو منتقل ہو گیا۔ قالین کے بجائے اب چٹائیاں سمیٹنے لگا ہوں۔
خانہ آرائی کے لئے کیا دیدۂ یعقوب کی سپیدی اور کیا حجلۂ مہ کنعاں!"

رشید احمد صدیقی کی صحت نے کبھی اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اکثر بیمار رہتے تھے اور بیماری بھی اپنے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی تھی۔ ایک گردے کے بغیر تو وہ زندگی گذار ہی رہے تھے۔ انتقال سے قبل وہ کئی عوارض کا شکار تھے اور ضعیف العمری سب سے بڑا عارضہ تھی۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ مجبوری بڑی شئے ہے، وہ سب کچھ

بہہ جاتے۔ انہوں نے اپنی علالت کا مختلف اصحاب کے موسومہ مکاتیب میں وقتاً فوقتاً تذکرہ کیا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲ر نومبر ۱۹۷۰ء میں لکھتے ہیں :

"ادھر کچھ طبیعت اعتدال سے ہٹی ہوئی ہے۔ ایسے میں معالج کی ہدایت کے مطابق ایک آدھ TRANQUILISER لے کر دم بخود ہو جاتا ہوں۔ چارپائی پہ لیٹ رہنے کا یہ بدل نکالا ہے۔ آپ کل شام تشریف لائے تو میں اسی عالم میں تھا۔"

راقم الحروف کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲ر جولائی ۱۹۷۱ء کا اقتباس ہے :

"میری طبیعت بالکل اچھی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں، نہ آنکھ کام دیتی نہ ذہن یا دل، دل کا پرانا مریض ہوں اور آنکھوں میں موتیا بند ..."

یوں وہ آئے دن کسی نہ کسی مرض سے متعارف ہوتے اور اس سے نبھا کرنے پر مجبور۔ نباہ نہ کرنے کے سوائے چارہ ہی کیا تھا۔ ایک اور مکتوب ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے موسومہ۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۷۳ء کا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ خود اپنی صحت کے تعلق سے کس قدر غیر یقینی کا شکار تھے :

"آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ جہاں مجھے اور بہت سے آزار لاحق ہیں، اُن میں سال بھر سے ہرنیا، کا اضافہ ہو گیا ہے، جس سے اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے یا کوئی چیز اٹھانے میں بڑی احتیاط کرتا ہوں، ہرنیا کا علاج صرف آپریشن ہے اور مجھ جیسے قلب کے مریض اور معمر کے لئے ناممکن ہے۔ دن میں کئی بار اس میں درد ہوتا ہے اور بے سان گمان اور اندیشہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے۔"

رشید احمد صدیقی اپنے دوستوں، جاننے والوں اور شناساؤں سے کس قدر تعلقِ خاطر رکھتے ہیں، اس کا اظہار "گنجہائے گرانمایہ"، "ہم نفسانِ رفتہ" اور "ذاکر صاحب" کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ان مجموعوں کے مرقعے، اُردو ادب کا گرانمایہ سرمایہ ہیں، ان میں رشید احمد صدیقی نے اپنے قلب و ذہن کو پیرا فگندہ نقاب کر دیا ہے۔ آپ پڑھ لیجئے کہ وہ کتنے لطیف لیکن شدید جذبات کے حامل ہیں۔ یہ اُن کا صرف مرقعہ نگاری کا انداز و اسلوب نہیں، اُن کی شخصیت کا مزاج بھی ہے۔ یہ ایک فن کار کے نہیں، ایک انسان کے احساسات بھی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد پہ رشید احمد صدیقی نے مرقع بھی تحریر کیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کے بارے میں دو تین جملے ہیں، لیکن اس اجمال میں بھی کتنی تفصیل ہے۔ یہ جوئے کم آب، بحر بیکراں سے کم نہیں۔ الفاظ کا انتخاب، ان کی نشست در و بست ہے ہی لیا :

"مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت سے اس وقت یونیورسٹی میں سبھی نہایت افسردہ خاطر ہو رہے ہیں۔ کتنا بڑا آدمی ہم سے رخصت ہو گیا۔ ایسے ہمہ جہت، فاصل اور یگانۂ روزگار کو ہم کہاں پائیں گے ...."

اور بعض ایسے اصحاب بھی ہیں، جن کے بارے میں انہوں نے کوئی مرقع نہیں لکھا، لیکن مکاتیب میں مرقعہ نگاری کر گئے ہیں کہ متعلقہ شخصیت اپنے حقیقی خد و خال میں محفوظ مل جاتی ہے۔

ایک ایسی ہی شخصیت مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے سابق پروفیسر ظفرالدین کی ہے، اُن کی وفات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مکتوب ہے ۱۴ر اگست ۶۴ء کا محررہ، مسعود صاحب کے موسومہ:

"ظفرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے میری ہمت اُن کو دیکھنے جانے کی نہیں ہوئی۔ باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور اصرار کا بھی اصرار رہا۔ جس کو زندہ، ہنستا بولتا، محبت کرتا ہوا دیکھتا چلا آیا، اُس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔"

رشید احمد صدیقی کا ادب کے بارے میں ایک مخصوص زاویۂ فکر ہے: وہ فن اور فن کار کے لئے سب سے پہلے اخلاق وآداب، حیا، شرافت اور شائستگی پر زور دیتے ہیں۔ اُن کے اس موقف سے تھوڑا بہت اختلاف کیا گیا ہے۔ لیکن اُن کے اس موقف کی صداقت اور خلوص سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ کوئی شخص اسی وقت اچھا فن کار بن سکتا ہے کہ وہ اچھا انسان بھی ہو، یہاں اچھے انسان سے مُراد اخلاق وآداب، حیا، شرافت اور شائستگی کی قدروں کے حامل انسان سے ہے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار انہوں نے بعض مکاتیب میں بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے موسومہ مکتوب مورخہ ۱۷ر جون ۶۳ء میں تحریر کرتے ہیں:

"شعر ہو، ادب ہو، زندگی ہو، فن ہو، سب لاطائل ہیں، اگر حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، بے حیائی و بے غیرتی فن نہیں، معصیت ہے۔ البتہ اس کا علاج نہیں۔ اگر کوئی یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ معصیت ہی اصل فن ہے یا معصیت اپنے ظہور کے لئے فن کی تلاش میں رہتی ہے۔"

ان سطور کا مطلب یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ فن کار کو کسی نظامِ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ لیکن رشید احمد صدیقی اس سے قطع نظر فن کار کے لیے کسی نظامِ حکومت کے حق میں نہیں۔ یہاں وہ فن کار کی آزادی پر زور دیتے ہیں، جس کے لئے ہر دَور میں آواز بلند کی گئی ہے۔ ان کے مضامین میں تو جہاں تہاں فرد کی آزادی کی بات ملتی ہے اور خطوط میں تو انہوں نے اپنے خیالات کو مختصر لیکن جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے موسومہ مکتوب مورخہ ۲۵ر مارچ ۶۲ء کا اقتباس ہے:

"آرٹسٹ کو خود اظہار کی پوری آزادی ہونا چاہیے، بغیر اس کے زندگی میں وہ تنوّع اور توانائی نہیں آتی جس کے طفیل .... ہر دم جواں ہے زندگی ....." لیکن اس کے ساتھ ہی وہ آزادی کے حدود بھی متعین کر دیتے ہیں۔ ایسی آزادی جو اصول وضوابط کی پابند ہے۔ بے ضابطہ اور بے لگام آزادی نہیں۔ ایسی آزادی کے بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ کیجئے۔ مذکورہ مکتوب ہی سے:

"...... بے ضابطہ اور بے لگام آزادی افراد کی ہو یا جماعت کی، قابلِ قبول نہیں، اس لیے کہ یہ نظم نہیں بلکہ نراج ہوگی، ہر شخص یا آرٹسٹ کو اس کا حق ہے کہ وہ اپنے ARTISTIC URGE کا اظہار کرے لیکن یہ تو سماج یا اس کے مستند افراد ہی طے کریں گے کہ اس آرٹسٹ کی طرف کیا اور کتنا التفات کیا جائے"

اسی طرح رشید احمد صدیقی کے ہاں فن اور لوازمِ فن کی بھی اہمیت ہے۔ بلکہ بہت زیادہ۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے موسوم

مکتوب مورخہ ۱۷ دسمبر ۶۸ء میں تحریر کرتے ہیں: "مصنف یا تحریک سے بیزار ہونے میں مضائقہ نہیں، البتہ فن کے آداب اور تقاضوں سے منحرف ہونا کسی طرح گوارا نہ کرنا چاہیے۔" رشید احمد صدیقی نے تنقید کی طرف توجہ ضرور کی تاہم اُن کا تنقیدی سرمایہ کچھ ایسا زیادہ نہیں اور پھر ان کی تنقیدات تاثراتی نوعیت کی ہوتی ہیں، اُن سب پر اُن کا اسلوب! قاری کو ان کی تنقید پر توجہ دینے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے، وہ ان کے اسلوب کے سحر سے مغلوب ہو جاتا ہے مکاتیب میں بھی انہوں نے مختلف شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ یہاں اُن کے اسلوب کی یلغار نسبتاً مہلن ہے، اس لیے تنقید کے قد و خال واضح ہیں۔ اور ایسے مکاتیب ہی میں ان کے تنقیدی شعور پر مزید روشنی پڑتی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اُن کے تنقیدی قد و خال کو سمجھنا ہو تو اُن کے ایسے مکاتیب کا مطالعہ ناگزیر ہے کہ اُن کے بغیر رشید احمد صدیقی کے تنقیدی موقف کا تعین بخوبی نہیں کیا جا سکتا۔ اس خصوص میں بس دو ایک اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اتفاق سے یہ دونوں مکاتیب پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے موسومہ ہیں۔ ۲ر نومبر ۶۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "اسرار اور رموز کو آپ نے کم اہمیت دی ہے۔ میرے نزدیک اقبال کی شاعری نہیں تو اقبال کے عرفانِ حقیقت میں یہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے شعرا سے ہٹ کر اور ان سے بلند ہو کر اقبال نے اپنے ایمان و ایقان کا ان میں اظہار و اعلان کیا ہے۔ اس طور پر اُن کی شاعری کا ان دو لانوں کو CONTEXT یا سیاق و سباق کہنا چاہیئے۔ ایسے موقع پر یا اس منزل کی شاعری GLORY GLAMOUR سے نہیں دیکھتے، شاعر کی شخصیت سے پرکھتے ہیں، یہ وہ چیز ہے جو اس قول کی نفی کرتی ہے یا اُس سے علاحدہ ہو جاتی ہے، جو کلام پاک میں ملتی ہے کہ شعرا بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں، مجھے وہ آیت ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ اقبال نے بعض نظمیں وقتی قدر و قیمت کی لکھی ہیں، جس کو جرنلزم کی اصطلاح میں NEWS REVIEWS کہتے ہیں، میں نے تو یہاں تک محسوس کیا ہے کہ اقبال نے جن مسائل پر جو بات جس بلاغت اور خوبی و حدت سے کہہ دی ہے، غالباً سعدی کے بعد اب تک کسی نے نہیں کہی ہے صوفیوں کی زبان میں یہ جزو میں کل دیکھنا ہے یا جزو سے کُل کا استنباط ہے۔ 'ارمغان حجاز' کا ایک خاص CONTEXT میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اقبالؒ عاشقِ رسولؐ تھے۔ عہدِ رسالت کے عاشقِ رسول کی مانند۔ وہ کبھی دیارِ رحمت میں نہیں پہنچ سکے۔ 'ارمغانِ حجاز' میں اُنہوں نے اُن کی حد تک اس کی یوں تلافی کی ہے کہ عالمِ خیال میں سفر اختیار کیا اور اپنے ذوق و شوق کا عالمِ بے اختیاری و بے خودی میں اظہار کیا ہے وغیرہ۔" یہ اقتباس قدرے طویل تھا۔ دوسرا اقتباس اگرچہ مختصر ہے لیکن بایں طور اہم کہ وہ کلاسیکس کے مقام کو تسلیم کرواتے ہوئے ادب کو زندگی سے کس طرح ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ذیل کا مکتوب ۲۵ر نومبر ۶۷ء کا "غالب، حالی، اکبر اور اقبال کو سمجھے بغیر اُردو کے شعرا اور تنقید نگار اور خاص طور پر نوجوان طالب علم اپنے اسلاف کی عظیم خدمات کا صحیح احساس نہیں کر سکتے۔ آشوب و آزمائش کے موجودہ دور میں اس کی بڑی ضرورت ہے۔" طنز و مزاح تو رشید احمد صدیقی کا میدان ہے۔ مکاتیب میں یہ جوہر کیوں نہ کھلتے۔ یہ جوہر

"اگر وہاں وہی رجسٹرار ہیں جو پان بہت کھاتے تھے اور اُردو شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے! جن کے تصرف سے صرف یا تونی ہو کر رہ گئے تھے جہاں کہیں ایسا آدمی دیکھیے، یقین کر لیجیے کہ نکما، ورنہ نا قابلِ اعتبار ہوگا ....."

انفلوئنزا کی کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ بقیہ عشرہ' جدھرا درجس کو دیکھیے۔ انفلوئنزا کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ غالب صدی کے دوران بھی ہر کس وناکس اور ہر کہ و مہ' غالب کا پرستار، شیدائی اور ماہرِ غالبیات بن چکا تھا، یہ سال گذرا کہ پھر وہی کیفیت رہی جو پہلے تھی۔ رہے نام اللہ کا۔ رشید احمد صدیقی کس خوبی سے بات پیدا کرتے ہیں۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے موسومہ مکتوب ۲۳ر جنوری ۶۹ء کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اِن دنوں میں بھی "غالب فلو" میں مبتلا ہوں۔ نظام لیکچرس کا یہی موضوع ہے۔ ریڈیو پر اسی موضوع پر تقریر کرنی ہے اور غالب مشاعرہ کا افتتاح بھی میرے سپرد ہے۔"

غالب کے مکاتیب اُردو ادب میں سنگِ میل ہیں اور شاید رہیں گے بھی۔ رشید احمد صدیقی کے مکاتیب کئی خوبیوں کے مالک ہیں' ان میں طنز و مزاح بھی ہے' ہلکا پھلکا، کہیں کہیں بلیغ! لیکن غالب کے مکاتیب کی طرح ان میں بے تکلفی نہیں۔ یا یہ انداز بھی نہیں جو غالب کے مکاتیب کی ایک شان ہے' اُن کے ہاں رکھ رکھاؤ ہے پاس و لحاظ ہے' لیکن یہ سب کچھ بناوٹ یا تصنع نہیں' اُن کی شخصیت کا ایک رُخ ہے۔ وہ رُخ' جو اُن کے "گنجہائے گراں مایہ" اور ایسے ہی انشائیوں میں نکھرتا اور اُجالا پھیلاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے مکاتیب بھی اُن کے انشائیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں ادبی چاشنی ہوتی ہے' یہ ہوتے ہیں شگفتہ سے' تر و تازگی کے حامل، شادابی لیے ہوئے وہی انداز' وہی طرح داری اور اسلوب کی دل آویزی لیے ہوئے۔ سادہ لیکن دل نشیں۔ میں یہاں رشید احمد صدیقی کے مکاتیب سے' دو ایک اقتباسات ایسے پیش کروں گا' جو اُن کے دل نواز اسلوب کی گواہی دیں گے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے موسومہ مکتوب' مورخہ ۱۱ر اپریل ۶۱ء میں تحریر کرتے ہیں:

"سال ہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے' جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ دے دی ہوں۔ آپ جانتے ہیں گیلی لکڑی کتنے دھیرے دھیرے' کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے اور اس سے کیسا تاریک اور دَم گھٹا دینے والا دُھواں اُٹھنے لگتا ہے۔"

ایک اور مکتوب کا اقتباس ہے۔ مکتوب تحریر کردہ ہے ۲۰ر مئی ۷۰ء کا اور موسومہ ہے حبیب احمد صدیقی۔

"مسلمان اس خواری کو پہنچ چکے ہیں کہ اب خدا اُن کو درخورِ عتاب سمجھتا ہے نہ خلق نہ اُن کو قابلِ التفات۔ بے غیرتی کے جس گڑھے میں ہم گر چکے ہیں، وہ ہمارا ہی کھودا ہوا ہے' جس پر آج شاید مٹی ڈالنے والے بھی نہیں ملتے۔ یہ کام بھی کسی وقت ہمیں کو انجام دینا ہے۔ مسلمان اس وقت جس عالم گیر ذلت اور شامت اعمال میں مبتلا ہیں اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم سب مسلمان ہونے

سے چھٹکارا حاصل کر کے اس کا اعلان کر دیں۔ اس سے ممکن ہے کس مپرسی اور فلاکت زدہ مسلمان اس بہیمانہ سلوک سے محفوظ ہو جائیں، جن کا آئے دن دور و نزدیک اُن کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حمیت باقی نہ رہی تو اس سودے میں کیا قباحت ہے؟"

اسلوب کی ان دل آویز اور دل کش مثالوں کے ذیل میں یہ اقتباس بھی دیکھیے۔ ایک جواہر پارہ ہے کہ جس کو ہمارے کلاسیکی ادب کے اقتباسات میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب معتمد عمومی انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش کے موسومہ مکتوب میں، جس پہ تاریخ ندارد ہے، لیکن مکتوب پر علی گڑھ کے ڈاک خانہ کی مہر ہے۔ ۲۰ راپریل سنہ ۶۴ء کی:

"جس کے سامنے کوئی اچھا اور بڑا مقصد ہوتا ہے، وہ زندگی اور زمانے کے مفسدات کو خاطر میں نہیں لاتا، جب کہ ہر طرف غیر یقینی اور مایوسی پھیلی ہوئی ہو، کسی اچھے اور بڑے کام میں لگ جانا، قابلِ تعریف بات ہے میں اس کو فتح کا پہلا زینہ سمجھتا ہوں۔"

رشید احمد صدیقی کے مکاتیب میں اس نوع کے اقتباسات کئی ملیں گے۔ زندگی کا کون سا معاملہ، کون سا مسئلہ، کون سا پہلو اور کون سا رُخ ہے، جس کو انہوں نے نظر انداز کر دیا ہو، ان مکاتیب میں خوش مذاقی بھی ہے اور جہاں تہاں اُن کا لہجہ گلو گیر ہو جاتا ہے۔ انہوں نے مسکراہٹیں بھی سمیٹی ہیں اور زندگی اور زمانے کا رونا بھی رویا ہے۔ خیالات کے اظہار میں جرأت سے بھی کام لیا ہے اور مصلحتوں کو بھی پیشِ نظر رکھا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے مکاتیب کے مطالعہ سے اُن کے ذہن کی مختلف تہوں کا مطالعہ ممکن ہے۔ اُن کے بیشتر مضامین سے اُن کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں، لیکن اُن کی شخصیت کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اُن کے مکاتیب کا ہمہ گیر جائزہ لینا ضروری ہے کہ یہ اُن کے خیالات کی تصویر، اُن کے ذہن و فکر تک رسائی کے لئے ایک اہم پُل اور اُن کے معتقدات کا آئینہ ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ مکاتیب میں انسان کا قلم نہیں، دل بولتا ہے تو یہ بات رشید احمد صدیقی کے مکاتیب پر بھی صادق آتی ہے کہ اُن کے مکاتیب بھی اُن کے دل کی جلوہ گری ہوتی ہے، اس لیے اُن کی شخصیت اور فن کے جاننے کے لیے اُن کے مکاتیب کے سیر حاصل مطالعہ کی ضرورت ہے! ••

مصحف اقبال توصیفی

ایک نظم

گجر بجے۔ وہ مجھے پتنگوں کے فرش پہ رقص کر رہی تھی

زمیں کے اطراف چاند ـــ وہ

میرے گرد دیوانہ گھومتی تھی
وہ تھک گئی تھی
وہ تھک گئی تھی

اک آئینہ ہات میں لئے
مہر کی شعاعیں
وہ میرے چہرے پہ پھینکتی تھی
میں ہات سے اوٹ کر رہا تھا
وہ چاہتی تھی کہ میری آنکھوں کو خیرہ کر کے
ان آئینوں میں کسی طرح مجھ کو قید کر لے
وہ چاہتی تھی کہ مجھ سے اپنا وجود بھر لے

میں اس سے دامن چھڑا رہا تھا
میں اس سے دامن چھڑا رہا تھا

غزل

اس پھول کو زلف میں سجا کر
خوشبو کا سفر مجھے عطا کر

آنکھوں میں اگا دے کوئی منظر
اک خواب ہی زہر میں بجھا کر

یہ ہونٹ مری جبیں پہ رکھ دے
میں بھول سکوں تجھے۔ دعا کر

یہ آئینہ خانہ، کیا کروں میں
میں تجھ کو کہاں رکھوں چھپا کر

یادوں نے کہا۔ "یہیں پہ بیٹھیں"
اخبار زمین پر بچھا کر

رشید عبدالسمیع جلیل

شناخت

یہ تم ہو یا کوئی خوابیدہ پرچھائیں
اُجالے کی تمنّا میں صلیبِ نور پر آئی
کرن تہذیب کی گذری ہے بیتابی اندھیروں سے
تو ممکن فاصلے پر کچھ نقوشِ نیم گوں ابھرے
یہ کیسا ربط ٹوٹا ہے
کہ ہم تم اجنبی ٹھہرے
اندھیرا اضطرابِ عصر کی شاخوں سے ٹپکا ہے
تو دھرتی پر اُتر آیا نئے احساس کا موسم
مری آنکھوں میں ٹھہرا ہے مگر اک پیاس کا موسم
یہ ممکن تھا کہ تم کوئی نیا چہرہ لگا لیتے
سرِ تصویر دو چار رنگ عہد دیتے
گریز و جذب کی حد میں
بکھرتے ٹوٹتے [illegible]وں کا ورثہ ہیں
کہیں قاتل نہ بن جائیں سرِ برگِ تمنّا یہ
لہو کی آنچ سے منظر سلگتا ہے
اچانک تم مگر تحلیل مت ہونا۔۔۔۔!!

غزل

سحر سعیدی

آپس میں اتحاد نہ دل میں محبّتیں
بوسیدہ ہو گئیں وہ پرانی کہاوتیں

جبکہ مرا وجود ہے خود اک کھلی کتاب
اب اور چاہتا ہے کوئی کیا وضاحتیں

کب اُس نے ہم پہ کی ہے کوئی لطف کی نگاہ
کیا رائیگاں ہی جائیں گی میری ریاضتیں

دیکھا ہے جب سے آپ کا کھلتا ہوا بدن
نظروں میں پھر چبھیں نہ گلوں کی نزاکتیں

دل کا مقام جاننے والوں سے پوچھیے
کتنی عزیز ہوتی ہیں رشتوں کی دولتیں

یہ اور بات حوصلے ٹوٹے نہیں مرے
کیا کیا نہ مجھ پہ رکھی تھیں دنیا نے تہمتیں

انداز چاہتوں کے نرالے ہیں کس قدر
اتنے ہوئے وہ دور بڑھیں جتنی قربتیں

پہلے تو وہ مزاج کا ایسا نہ تھا سحرؔ
سب اُس نے سیکھ لی ہیں زمانے کی عادتیں

غزلیں

صاحب حیدرآبادی

گھٹن کے دور سے باہر نکل تو سکتے ہیں
ہم اپنا راستہ خود بھی بدل تو سکتے ہیں

غموں کی بھیڑ سہی ہم بہل تو سکتے ہیں
وہ اجنبی کی طرح ساتھ چل تو سکتے ہیں

لرزتے جسم ہمارے یہ لڑکھڑاتے قدم
سہارا آپ کا پا کر سنبھل تو سکتے ہیں

یہ مانتا ہوں کہ سوکھے درخت ہیں ہم لوگ
تمہارے لمس کے جادو سے پھل تو سکتے ہیں

خراب لاکھ ہو قسمت، بری ہزار سہی
جب آپ چاہیں گے اس کو بدل تو سکتے ہیں

جو پھول تھے وہ گلستاں کے خار ہیں لیکن
عدو کے سینے میں ہر وقت کھل تو سکتے ہیں

ہوا کے رخ کو بدلنا کمال ہے صاحب
وگرنہ ساتھ زمانے کے چل تو سکتے ہیں

نصیر پرواز

خود ساختہ نمود و نمائش بھی چاہیئے
غالب نہیں ہوں مجھ کو ستائش بھی چاہیئے

یوں ہی نہیں بہیں گے یہ بوسیدہ کھنڈرات
آندھی کے ساتھ شہر میں بارش بھی چاہیئے

جسموں کو گدگداتی رہے قربتوں کی آنچ
ذہنوں میں احتیاط کی رنجش بھی چاہیئے

کھل جائیں چشم و دل کی طرح خاک کی تہیں
افلاک سے زمینوں کی سازش بھی چاہیئے

پورا کہاں ہوا ہے ابھی میرا انتشار
احباب و اقرباء کی نوازش بھی چاہیئے

الفاظ بھی حسین، خیالات بھی نئے
لیکن شعورِ طرز و نگارش بھی چاہیئے

آنکھوں میں کوئی خوابِ تفکر سجایئے
کچھ تو دلوں میں جینے کی خواہش بھی چاہیئے

آزادیٔ خیال بہت معتبر سہی
صوت و صدا پہ فکر کی بندش بھی چاہیئے

پرواز زندگی کوئی دشوار تو نہیں
اک چشمِ التفات کی جنبش بھی چاہیئے

منوہر لال ہادی

باقی رہے چرند نہ مور و طیور تک
طوفاں اٹھا تو ڈوب گئے بے قصور تک

اتنے سے فاصلے میں مسافر کہاں رہے
جانا ہے لاشعور سے فوق الشعور تک

ہم نے جنم جنم کا سفر بھی کیا تمام
پھر بھی ہوئی نہ دسترسِ جانِ حضور تک

ظلمت پرست عہد سے ہوتا بھی اور کیا
بے نور ہو گئے ہیں مقاماتِ طور تک

پہلے تو کج روی کے پرندے ہی تھے یہاں
اب بس گئے چمن میں طیورِ منتور تک

جب سے گری ہے برقِ گرانی چمن چمن
کرنے لگی گداگری چشمِ غیور تک

کیوں ورنہ انکسار کی نگری میں جا بسا
پہنچا ہے کچھ ضرور سرِ پرغرور تک

ہادی ضیا کی کھوج میں تجلی سے گذر گئے
پہنچا کہاں نہ آپ سے دیوارِ نور تک

قدیر زماں

سفر نامہ

وہ ایک امیانوئل کانٹ IMMANUAL KANT ہی تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جرمنی کے ایک شہر کونگس برگ میں پیدا ہوا وہیں بڑھا، وہیں تعلیم پائی، وہیں کی یونیورسٹی کا معلم بنا اور فلسفہ میں چند نامور کتابیں لکھیں۔ اسے دنیا کے کسی مقام کے سفر کی رغبت نہ تھی۔ کونگس برگ ہی میں اس نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ ایسی مثالیں بہت کم ہیں اور ہیں بھی تو ہمارے علم میں نہیں ورنہ دنیا کا کون ایسا شخص ہے جس کے ذہن پر "سفر نامہ" کے الفاظ کے ساتھ ہی کچھ مناظر، کچھ عمارتیں اور کچھ چہرے اُبھر نہ آتے ہوں۔ اس کی محفوظ یادوں میں چند ایسی یادیں بھی ضرور شامل ہیں جو کسی نہ کسی یادگار سفر کی دین ہیں۔ انھیں یادوں کو بعض لوگوں نے "سیاحت نامہ" یا "سفر نامہ" کے نام سے چھپوا کر محفوظ کر دیا ہے۔ اس مضمون کے عنوان کے ساتھ ہی میرا ذہن ایک شعری تخلیق کی طرف منتقل ہوتا ہے اور یہ تخلیق ہے ن۔م۔ راشد کی نظم "سفر نامہ"۔

دنیا کا سب سے پہلا سفر نامہ حضرت آدم کا جنت سے روانہ ہو کر کرۂ ارض تک پہنچنے کا ہے۔ نہ ہی راشد کی اس نظم میں اور نہ ہی دنیا کے کسی اور ادب میں اس کی تفصیل ہے کہ حضرت آدم جنت سے کرۂ ارض تک کن راستوں سے ہو کر اور کتنی مدت میں پہنچے اور انھوں نے دورانِ سفر کن کن صعوبتوں کو جھیلا لیکن اس ایک نظم میں آپ کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے کہ جو آدم کے خدا سے ہم کلام ہونے کی خواہش سے لے کر آج کے اس انسان سے متعلق ہے جو ایک سفر پر روانہ ہونے کے لئے ہوائی جہاز پکڑنے تک بھاگ دوڑ کرتا ہے اور اس بھاگ دوڑ میں زادِ راہ کے لئے ریزگاری تک لینا بھول جاتا ہے اور اپنی کئی آرزوؤں کو عرش ہی پر سوٹ کیس میں بند پاتا ہے۔

اردو میں ۱۹۰۰ء کے بعد سے سفر نامے کثیر تعداد میں لکھے اور شائع کئے گئے۔ کچھ ایسے سفرنامے بھی ہیں جو انگریزی اور فارسی زبانوں سے ترجمہ ہو کر ہمارے سامنے آئے۔ قدیم ترین سفرناموں میں ہیون سانگ، فاہیان اور میگستھینز کے سفرناموں سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کے بعد البیرونی اور ابن بطوطہ کا نام آتا ہے، جو بالترتیب ۹۷۶ء اور ۱۳۳۴ء میں ہندوستان آئے۔ لیکن ان سفرناموں کے چند اقتباسات ہی اردو کی نصابی کتابوں میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان سیاحوں کی تحریروں سے تاریخ کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے، ملک کی تنظیمی کیفیت، عدلیہ کے قوانین، تجارت کے اصول اور لوگوں کے رہن سہن کے طریقوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس کے بعد اردو میں ترجمہ شدہ جن سفرناموں کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہ ہیں آرمینس ویمبری کا سفر نامہ (۱۸۴۰ء) ڈاکٹر برنیر کا سفر نامہ (۱۸۸۸ء) خالدہ خانم کا سفر نامہ (۱۹۲۰ء) کیتھرائن میو کا سفر نامہ (۱۹۲۸ء) یورپی ممالک سے متعلق پہلا سفر نامہ جس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا "سیرِ مقبول" (۱۶۶۴ء) ہے اسے آغا مقبول اصفہانی نے لکھا تھا۔ اس میں مختلف جزیروں کے ذکر کے ساتھ جنوں

اور میموں کا ذکر بھی موجود ہے۔ سفرنامہ کا رنگ داستانی ہے۔

قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ اردو کا پہلا طبع زاد سفرنامہ کونسا ہے۔ ایک قدیم سفرنامہ یوسف کمبل پوش کا ملتا ہے جو ۱۸۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس میں انگلستان اور فرانس سے متعلق سفر کے واقعات موجود ہیں۔ اور بقول [illegible] اس میں ولایت کے عجائب اور ان کے اپنے تجربات، میموں کے پیچھے بھاگنے کا ذکر بہت ہے۔ اس کے بعد قابلِ ذکر جو سفرنامے لکھے گئے ان میں سر سید کا سفرنامۂ انگلستان، شبلی نعمانی کا سفرنامہ روم و مصر و شام (۱۸۹۲ء) اور منشی محبوب عالم (ایڈیٹر پیسہ اخبار) کا یورپ کا سفرنامہ (۱۹۰۰ء)۔ شبلی [illegible] اور منشی محبوب عالم کے ان سفرناموں سے اس صنفِ ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان سفرناموں میں ملکوں کے سیاسی اور سماجی حالات سے پہلی بار ان ملکوں کے ادیبوں اور صحافیوں کا ذکر بھی آتا ہے۔ شبلی نے مصری ادیبہ فاطمہ خانم کا ذکر بڑے ذوق و شوق سے کیا تو منشی محبوب عالم نے ایک ترکی ایڈیٹر سے اپنی ملاقات اور صحافت کے بارے میں تبادلۂ خیال کا ذکر دلچسپی کے ساتھ کیا ہے۔

جدید دور کے چند سفرناموں کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے سے قبل میں ان سفرناموں کے نام لینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن سے اردو دانوں اور خاص طور پر اہلِ حیدرآباد کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔

سفرنامہ میر محبوب علی خاں (۱۸۹۹ء)، سفرنامہ افسر جنگ (۱۹۰۷ء)، مولانا محمد علی کے یورپ کے سفرنامے (۱۸۹۸ء تا ۱۹۲۸ء)، حسن نظامی کے دو سفرنامے سفرِ مصر و شام و حجاز (۱۹۱۳ء) اور سفرِ افغانستان (۱۹۳۳ء)، بدرالاسلام فضلی کا سیاحت جاپان (۱۹۳۰ء)، بہادر یار جنگ کا سفرنامۂ بلادِ اسلامیہ (۱۹۲۱ء)، "پردیس کی باتیں" مرزا حسین احمد بیگ (۱۹۳۱ء)، علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سلیمان ندوی کا سفرنامہ سیرِ افغانستان (۱۹۳۳ء)، راجہ خواجہ پرشاد کا سفرنامۂ یورپ (۱۹۳۳ء)، نواب محمد ظہیر یار جنگ کا سیاحت نامہ یورپ و امریکہ (۱۹۳۳ء)، ڈاکٹر رضیہ اکبر کا تاثراتِ سفرِ ایران (۱۹۷۰ء) اور فرید مرزا کے دو سفرنامے (۱۹۷۳ء و ۱۹۷۶ء)۔

اس طرح اور بھی سفرنامے کثیر تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان تمام سفرناموں کا ذکر کرنا جن میں مثنوی نادر اور ظریف لکھنوی کی دیگر منظوم سفرنامے بھی شامل ہیں اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ میں آپ کو صرف ان سفرناموں سے متعارف کراؤں گا جو [illegible] میں دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے جدید رو پہ چل پڑے ہیں۔

شبلی نعمانی کا سفرنامۂ روم و مصر و شام نہ صرف اس دور کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا بلکہ مصنف نے اپنے سفرنامے کے ذریعے سفر کے مقاصد کا ایک نیا پہلو درس دیا۔ لکھتے ہیں "اس دورِ دوران کے سفر سے کتب خانوں کی سیر کے علاوہ میرا کچھ اور مقصد ہو سکتا تو یہاں کی طرزِ تعلیم اور ترقی تعلیم کا اندازہ کرنا تھا۔"

اس کے بعد جس سفرنامے کو اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے وہ پروفیسر احتشام حسین کا سفرنامہ ہے جو "ساحل اور سمندر" کے عنوان سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ نہ صرف یہ کہ پروفیسر احتشام حسین نے اپنے سفرنامے کو ایک شاعرانہ عنوان دیا بلکہ اسے ایک نئے ہی طرزِ بیان سے آشنا کیا۔ ملاحظہ ہو۔

"میں یہ سماں دیکھ کر واپس آیا تو قلم دوات لے کر بیٹھا کہ جو کچھ خود دیکھا ہے دوسروں کو بھی دکھا سکوں۔" اس سفرنامے کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ آپ ایک سفرنامہ ہی نہیں بلکہ ایک انشائیہ کا بھی مطالعہ کر رہے ہیں۔ "وہی تنہائی کا بوجھ، وہی بوجھل طبیعت، پہاڑوں پر سوکھے درختوں پر کھڑے چند ہرے درختوں نے مجھے متوجہ کیا۔ خزاں کے باوجود یہ سدا بہار درخت، بہار کے یہ نقیب

موسم کی سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سینہ تانے کھڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مایوسی میں امید اور اندھیرے میں اُجالے کا خیال آتا ہے۔

انیس سو پچپن عیسوی کے بعد اردو ادب میں جدید رجحانات نے زور پکڑا۔ شاعری اور افسانہ نگاری میں ہیئت اور اسلوب کے نئے نئے تجربے کیے جانے لگے۔ "نئے دور" کا سب سے پہلا قابلِ ذکر سفر نامہ جمیل الدین عالی کا "دنیا مرے آگے" ہے۔ یہ سفر نامہ پہلے پہل اخباری کالموں میں شائع ہوا۔ بقول ابنِ انشا "عالی کا سفر نامہ اخبار کا مقبول ترین فیچر تھا اس میں فقط معلومات کی بات نہ تھی، اسٹائل کی دلکشی کا حصہ تھا۔ جہاں خود جاتے تھے قارئین کرام کو ساتھ لے جاتے تھے کہیں روما کے کلوسیم میں گھوم رہے ہیں کہیں سین کے پل پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ کہیں ٹیمز میں تیرا کر رہے ہیں اور یہ دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں کہ اس میں سوائے پانی اور کیچڑ کے کچھ نہیں ہے"۔ جدید دور اور اس دور کے ادبی تقاضوں کا اثر ہی تھا کہ "سفر نامہ" نگاری کے آسمان پر ایک اور آفتاب طلوع ہوا۔ اس کا نام ابنِ انشا تھا۔ اس نے ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۲ء مشرقی و مغربی ممالک کے سفر کیے اور چار سفر نامے لکھے جن کے نام ہیں "چلتے ہو تو چین کو چلیے" "آوارہ گرد کی ڈائری" "دنیا گول ہے" اور "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" ان سفر ناموں میں سفر کے واقعات، عمارتوں اور ملکوں کی تاریخ، کردار نگاری، تحریر کی شگفتگی اور جگہ جگہ افسانوی طرزِ ادا، سچی زبان کا بے ساختہ استعمال یہ ایسے واقعات ہیں جنھوں نے ان سفر ناموں کو خلوص کی چیز بنا دیا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"ہمارے ہاں کے ایک بزرگ کہ اسمبلی کے اسپیکر تھے ایک روز جنیوا کے ہوٹل کے باہر سیر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے دیکھ لیا۔ اور پولیس کو رپورٹ کی کہ ایک شخص خون تھوک رہا ہے۔ فوراً کانسٹبل آئے اور کہا کہ چلو اسپتال"

دوسرا اقتباس لندن کے ایک ایسے درخت کے بارے میں ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں لگایا گیا تھا۔ "ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے معمر درخت ہیں۔ لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے، لیکن یہ درختوں کا سرسید یا بابائے اردو ان سب کا رشتہ میں دادا رہا ہے۔ افسوس اس نے ابھی اپنی عمر عزیز کے ۱۲۳۵ سال پورے کیے تھے کہ کسی ظالم نے ۱۸۹۲ء میں اس پر آرا چلا دیا۔ حسرت اِن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

ذیل کے اقتباس میں مسافر کا موضوعات سے لگاؤ، ایک جرمن بوڑھے کی کردار نگاری، اُس ملک کا ثقافتی پہلو اور ابنِ انشا کی نثر نگاری کا نمونہ، اِن سب کو ایک ساتھ ملاحظہ کیجیے۔

"جرمن میں بیتھوون کا گھر پوچھتے ہو صاحبزادے! وہ سامنے پھاٹک ہے۔ اس کے اندر چلے جاؤ۔ ہم نے کہا ہماری کتاب میں کوئی اور سڑک لکھی ہے۔ یہ تو قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ اس پر دقیانوسی نے فرمایا۔ بیٹا جی! بیتھوون صاحب اب تمھیں اس سڑک پر اس گھر میں نہ ملیں گے۔ وہ تو بہت دن ہوئے مر گئے۔ پھاٹک کے اندر چلے جاؤ۔ داہنے ہاتھ کے ساتھ دس نمبر کی قبر ہے"

چند سطور کی تحریر سے قاری کے ذہن کو صدیوں کی تاریخ یاد دلانا بھی ابنِ انشا کی نثر کا ایک اہم پہلو ہے۔ اقتباس طویل سہی لیکن اس کا مطالعہ "آوارہ گرد کی ڈائری" کے پورے سفر نامے کے مطالعے کی ترغیب دیتا ہے۔

"جنیوا کی آخری رات ہم نے دریا پار سنہری کلسوں والے روسی گرجے کا چکر کاٹ کر یونیورسٹی کے باغ میں سے ہوتے ہوئے بجوک سے پردی نیوف ڈی لاتری کی سیرگاہ میں جھانکی لی۔ گھاٹی چڑھ کر ان ٹیڑھی میڑھی تنگ و نیم تاریک جگہوں میں گم ہو گئے جن میں اب بھی سولھویں اور سترھویں صدی کی بو باس تھی۔ سب سے پہلے کوچہ نمبر ا (13) سے آیا۔ وہ حویلی جس میں اٹھارویں عیسوی میں نپولین اعظم مادام ساسیوں کے ہاں جہاں اُترا تھا۔ یہ چند گز کا کوچہ آگے ایک اور ایسے ہی تنگ کوچے میں مل گیا۔ داہنے ہاتھ

وقار خلیل

ادبی رسائل کے مسائل

اُتر پردیش اردو اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں "اُردو کتابوں کے قومی میلہ" کے موقع پر ادبی رسائل کے مسائل پر ایک سیمینار ۲۲ اپریل کو جناب نسیم انہونوی ایڈیٹر "حریم" لکھنؤ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ ملک کے دور دراز ادبی رسائل کے مدیروں یا ان کے اداروں سے وابستہ اصحاب نے اس سیمینار میں مقالے پڑھے۔ حیدرآباد سے اس سیمینار میں جناب وقار خلیل نے "سب رس" (ادارہ ادبیاتِ اُردو) کی نمائندگی کی تھی اور مندرجہ ذیل مقالہ سیمینار میں سُنایا تھا۔ (ادارہ)

آزادی کے ۳۲ سال بعد اُردو زبان، اس کا ادب اور کلچر مسلسل اور گوناگوں مسائل سے دوچار ہے۔ ہر نئی ساعت اور ہر نیا دن اُلجھنوں سے عبارت نظر آتا ہے۔ ادبی رسائل کے مقدر میں لگتا ہے روزِ اول سے ہی مشکلات لکھی گئی ہیں۔

آزادی سے پہلے اور ذرا بعد تک برصغیر سے جتنے بھی ادبی مجلے شائع ہوتے رہے۔ معیار کی طرف مدیروں نے توجہ کی تو وقفۂ اشاعت میں توازن نہ رہ سکا۔ جیسے تیسے مواد فراہم ہوا تو کتابت اور طباعت کے مسائل نے راہ روکی۔ جب ان سے گذر کر ادبی جریدہ مطبوع ہوا تو چند سال رہا اور پھر مشکلات کے تسلسل کے سبب بند کر دیا گیا۔

اُردو کے معیاری ادبی رسائل کی نمایاں فہرست پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ "نگار" لکھنؤ نے اپنے معیار کو کس طرح سے سہارا۔ "معارف" اعظم گڈھ اور "جامعہ" دہلی نے کتنے ہفت خواں طئے کئے۔ "شاہراہ" دہلی پر کیا کچھ بیتی۔ "معاصر" پٹنہ کو کتنی ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ "شاعر" بمبئی کو زندگی دینے اور باقاعدگی سے شائع کرتے میں مرحوم اعجاز صدیقی کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ "سب رس" حیدرآباد اور "فروغِ اُردو" لکھنؤ کو کن حالات سے گذرنا پڑا۔ ان میں جن حضرات اور ادارہ نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ قرار واقعی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

اُردو کے شہر لکھنؤ سے عابد سہیل صاحب نے ادبی ماہنامہ "کتاب" کو بارہ سال آٹھ مہینے جس طریق اور جس معیار سے جاری رکھا۔ اس سے تو ہم آپ سبھی واقف ہیں جولائی ۱۹۷۵ء میں اسے بند کرتے ہوئے ان کے دل پر کیا کچھ بیتی ہوگی۔ اس کا اندازہ کیجئے۔ کچھ ایسا ہی سانحہ محمود احمد ہنر کے ادبی ڈائجسٹ "شاہکار" الہ آباد کے ساتھ بھی ہوا۔ انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا سہ ماہی مجلہ "نوائے ادب" جو ٹائپ میں چھپنے والا ہندستانی ریسرچ میگزین ہے۔ اب

اپنی ششماہی اشاعتوں میں مقررہ حجم سے کم صفحات پر نکل رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی مجلہ "اردو ادب" بھی اپنے مسائل کے سبب باقاعدہ نہیں نکلتا ہے۔ جدید ذہنوں کے شعری و ادبی کاوشوں کا ترجمان ماہنامہ "شب خون" الہ آباد کئی سال سے تین تین چار چار مہینوں کی مشترکہ اشاعتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔

حیدرآباد سے ڈاکٹر مغنی تبسم نے سہ ماہی معیاری مجلہ "شعر و حکمت" شائع کیا تھا جس کا ن۔م راشد نمبر ناگپور اور جموں یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ بنا۔ اور ایسا معیاری تخلیقی ادب کا حامل مجلہ بھی ادبی رسائل کے مسائل کا شکار ہوگیا اسے جاری نہ رکھا جاسکا۔ سلیمان اریب مرحوم کے "صبا" کی بڑی شہرت تھی۔ اریب نے حیات تک اسے سہارے رکھا۔ بالآخر وہ بھی ان کے ساتھ اللہ کو پیارا ہوگیا۔ "عصری ادب" اور "تحریر" دہلی سے نکلتے ہیں اور اپنے معیار کی بدولت سرمۂ صاحب نظراں بھی ہیں۔ مگر یہ دونوں جریدے بھی مسائل اور مشکلات کا شکار ہیں۔ کلام حیدری کا "آہنگ" (گیا)، کمار پاشی کا "سطور" دہلی۔ شاہد ماہلی کا مجلہ "معیار" دہلی۔ مالیگاؤں کا ادبی ترجمان "جواز" اور دو ایک ایسے ہی ادبی رسالے جو نکل رہے ہیں۔ بس نکل رہے ہیں۔ سرکاری ادبی رسائل میں "آج کل" اور "نیا دور" قابل ذکر ہیں۔ آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات کا اردو ماہنامہ "آندھرا پردیش" کے نام سے نکل رہا ہے۔ مگر ابھی اس کے ادبی معیار کے بارے میں کہنا مشکل ہے۔ بہار اردو اکیڈیمی کا "زبان و ادب" سہ ماہی سے ماہنامہ ہو چکا ہے۔ اور اتر پردیش اردو اکیڈیمی بھی اپنے خبرنامہ کے ساتھ ایک ادبی جریدہ کی اشاعت کرنے چلی ہے۔ غرض "بہلہ کشتی" ہے۔ "ڈگر پنگھٹ کی" کے مصداق ادبی رسائل کا سفر جاری ہے۔ اور اس سفر میں شوق آبلہ پائی ہی صحرا نوردی کے لئے نئی نئی راہیں تلاش رہا ہے۔ منزل اور انجام سے بے نیاز۔

ملک کی تقسیم کا اثر جہاں ادبی کتابوں کی اشاعت اور نکاسی پر پڑا وہیں ادبی رسائل بھی اس کی زد میں آ گئے۔ پنجاب جو اردو کے ادبی رسائل کا بڑا مرکز تھا اور جہاں کا حلقہ پنجابیوں کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں متحرک تھا۔ آج ہندوستانی پنجاب کی نئی نسل اردو سے ناآشنا ہوگئی ہے جس کے سبب پنجاب اور دلی کے علاوہ دوسرے شہروں سے ویسے معیاری علمی و ادبی رسائل شائع نہیں ہو رہے ہیں۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان میں اردو کے ادبی رسائل کی تعداد میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ تو دوسری طرف چند ایک ادبی رسائل جو شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد اشاعت بھی محدود ہے۔ رسالے جاری ہوتے ہیں اور چند ماہ یا چند سال بعد دم توڑ دیتے ہیں۔ اس صورت حال کے اسباب گوناگوں ہیں۔ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے جاننے والوں میں بتدریج کمی کے سبب ادبی ذوق انحطاط پذیر ہوگیا ہے

اردو زبان کے مستقبل کے تعلق سے گذشتہ تیس برس سے جو مایوسی کی فضا رہی ہے۔ اس کے باعث اردو والوں کا اپنے کلچر سے وہ رشتہ قائم نہیں رہا۔ جس کے بغیر ادب اور فنون لطیفہ کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اردو والے اب تک بھی "بے زمینی" کے احساس کا شکار ہیں۔ یہ صورت حال اسی وقت بدلے گی جب حکومت کی طرف سے اردو زبان کے تحفظ اور بقا کی ضمانت حاصل ہوگی۔ اردو زبان کے تعلق سے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی پالیسی تبدیل ہو رہی ہے ترقی اردو بورڈ کے علاوہ مختلف ریاستوں میں اردو اکیڈیمیوں کا قیام اور نظم و نسق میں اردو کو اس کا جائز مقام دینے کے سلسلہ میں جو اقدامات کئے جارہے ہیں ان سے امید بندھتی ہے کہ اردو والوں کا اپنی زبان اور ادب سے لگاؤ ہے اور رفتہ رفتہ ادبی رسائل کی مانگ میں بھی اضافہ

ہوگا۔

کسی زبان کے ادب کو پروان چڑھانے میں ادبی رسائل جو اہم رول ادا کرتے ہیں اس کے پیشِ نظر اربابِ حکومت، ترقی اُردو بورڈ اور اُردو اکیڈیمیوں کو ایسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے جس سے ادبی رسائل کے فروغ میں مدد ملے۔

ادبی رسائل آج کے بدلتے ہوئے حالات میں "کلاسیک لڑیچر" بن گئے ہیں۔ جن کی فائیلوں سے یونیورسٹی کے اسکالرز ملک کے مختلف کتب خانوں میں استفادہ کرتے ہیں اور بعض تو اپنے موضوع کی مناسبت سے ان ادبی جرائد سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور بس۔

اب چند تجاویز پیش ہیں:۔

۱)۔ ادبی رسائل کو ملک کی سرکاری اکیڈیمیوں کی طرف سے خریدار فراہم ہوں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی حیدرآباد، تین ماہنامے "سب رس" "پونم" اور "شگوفہ" ریاست کی تقریباً ۲۵ لائبریریوں کے لئے یکمشت زرِ سالانہ ادا کر کے خرید رہی ہے۔

۲)۔ ادبی رسائل کو مرکزی اور ریاستی محکمہ ہائے اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کی طرف سے اُن کے کم از کم نصف اخراجات کی پابجائی کے لیے اشتہارات کے ذریعہ معاونت کی جائے۔ اس باب میں اب تک مرکز کا رویہ اُردو کے ادبی رسائل کو اشتہارات جاری کرنے میں یکساں اور سہولت بخش نہیں ہے۔

۳) ادبی رسائل کو اشتہارات ان کے ادبی معیار کی مناسبت سے جاری کئے جائیں اور تعدادِ اشاعت کو نظر انداز کیا جائے تاکہ قدیم و جدید مثبت ادبی رجحانات کی بہتر ترسیل ہو سکے۔

۴)۔ ادبی رسائل ماہنامے، دو ماہی، سہ ماہی اور ششماہی بھی شائع ہوتے ہیں۔ بالعموم ماہناموں کو ریاستی اور مرکزی حکومتوں سے اشتہارات ملتے ہیں۔ اس قاعدے میں ترمیم کی جائے کہ دو ماہی، سہ ماہی اور ششماہی جریدوں کو بھی شامل کیا جائے۔

۵)۔ ادبی رسائل اپنے مواد، ضخامت اور تزئین کے سبب گراں اخراجات کا بوجھ سہتے ہیں اور انھیں نہ تو اپنے قارئین سے حوصلہ افزا، تعاون ملتا ہے اور نہ ہی حکومت سے سہولت حاصل ہوتی ہے۔ آئے دن کتابت، طباعت، نیز کاغذ کی گراں ترقیوں کے باعث ادبی رسائل مشکلات سے دوچار ہیں۔ اکیڈیمیوں کے توسط سے اس سلسلے میں اخبارات کی طرح ادبی رسائل کو نصابی کتابوں کی اشاعت کا کاروبار کرنے والے اداروں کے برابر رعایتی نرخ پر کاغذ کی خریداری کا انتظام کیا جائے۔

۶) محکمۂ ڈاک کی طرف سے ادبی رسائل کی پوسٹنگ میں ماہناموں اور روزناموں کی طرح رعایت دی جائے اور اس رعایت سے دو ماہی، سہ ماہی اور ششماہی مجلّے بھی یکساں استفادہ کر سکیں بیشتر ادبی مجلّے پوسٹل اخراجات کی زیادتی کے سبب پڑھنے والوں تک نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔ رجسٹری اور وی پی کے اخراجات میں ادبی رسائل کو بھی خصوصی رعایت ملنی چاہیئے۔

۷) اُردو رسالوں اور کتابوں کا بہت بڑا مارکیٹ ہمارا پڑوسی ملک پاکستان ہے۔ ماضی میں جب ہندستان اور پاکستان کے تعلقات خوش گوار تھے اور کتابوں اور رسالوں کی ترسیل و فروخت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی، اُردو رسائل اور کتابیں بڑی تعداد میں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن جب دونوں ملکوں کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تو اُردو کتابوں اور رسالوں کی اشاعت پہ اس کا برا اثر پڑا۔ یہ بات نہایت امید افزا اور مسرت بخش ہے اب ہندستان اور پاکستان کے تعلقات خوش گوار ہو رہے ہیں۔۔۔

(کہانی)

سوُدا

عبدالوحید قاسمی

اس نے بھی فیصلہ کر ہی لیا مگر شاید یہ فیصلہ شرمندۂ عمل نہ ہو سکے گا۔ چہار دیواری کے باہر والی سڑک پر بوجھ تلے دبے انجنوں کی آوازیں کچھ زیادہ ہی بھیانک تھیں۔ مگر یہ آوازیں بھی شہر کی ہماہمی میں نہ معلوم کہاں ڈوب جاتی تھیں۔ آج چہل پہل زیادہ ہونے کے باوجود اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ کائنات پر سکتہ طاری ہے، زمانہ کی نبض رُک سی گئی ہے۔

اس کے قدم آگے بڑھ رہے تھے، استقلال میں کمی نہ تھی۔ حرکت و عمل میں توانائی بھی زیادہ تھی۔ مگر پھر بھی اسے یہ احساس نہ معلوم کیوں تھا کہ اس کے پاؤں تلے زمین نہیں ہے۔ بظاہر اس کی پیش قدمی ایک رُخ پر تھی، مگر کیا اس رُخ پر کوئی منزل بھی ہے، اس کا پتہ نہ تھا۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ گیٹ پر رُکی۔ آگے پیچھے جھکولے کھانے کے بعد اس نے ایک بار پلٹ کر دیکھا اور سواریوں کو حیرت سے تکتے ہوئے تیزی سے اُتر گئی۔ چند قدم چلنے بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے اس کا نام تین چار بار ایک ہی سانس میں لے ڈالا۔ آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو بے اختیارانہ طور پر معذرت کے الفاظ زبان پر جاری ہو گئے۔ بس سے اُترتے ہوئے اس نے کسی موٹر کار کے رُکنے کی آواز ضرور سُنی تھی، مگر سواریوں پر دھیان نہ دیا تھا۔ دو ملنے والے ہاتھ بندھے رہے اور چار قدم باتوں کے آہنگ کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ زمین پر پڑنے والا سایہ دونوں کا یکساں تھا مگر سایہ شاید صرف ہیئت اور ہیولی کا ہی غماز ہو سکتا ہے۔

درختوں کے نیچے کھڑے اور لان پر آڑے ترچھے بیٹھے لڑکوں کی نظریں پہلے سے ایک طرف لگی ہوئی تھیں۔ خوش فعلیوں نے کچھ اور کو متوجہ کر لیا۔ تندرستی اور تر و تازگی اور اس پر بلند بانگی، بے حجابی اور جسارت۔ ایک تر ہنسی، جب کہ دوسرے چہرے کے خطوط پر نشیب و فراز کے بدلتے روپ ہنسی کا ابہام پیدا کر رہے تھے۔

ٹن ٹن کی آواز گونجی، دو پاؤں میں آواز کے ساتھ تیز حرکت ہوئی، جب کہ عین اسی وقت پیچھے سے آنے والی ایک آواز نے دونوں ہاتھوں کو جُدا کر دیا۔ کلاس میں اس نے بہت سے ہم جماعتوں کو ہنستے مسکراتے دیکھا، وہ بھی ان میں ضم ہو گئی، باتیں، قہقہے، اور سوریک لخت بند ہو گیا۔ ٹرم پیپر جمع ہونا شروع ہوئے، جو ابھی مکمل نہ کیے گئے تھے انہوں نے دو روز کی مزید مہلت مانگ لی۔ مہلت کے دن بھی ختم ہو گئے، مگر ابھی تک دو تین نے اسائنمنٹ جمع نہیں کیا تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ حاضری معمول کے مطابق کم رہی۔ آج کے دن بہت سے لڑکے لڑکیوں کو صرف ایک دو پیریڈ کے لئے شہر کے دور دراز فاصلوں سے آنا پڑتا

بس اسٹاپ پر بھیڑ تھی۔ جو بس آتی، لدی پھندی ہوتی، تیسری بار اس نے بھی وقت کے خوف سے ٹھس پڑنے میں عافیت

کبھی ہم جماعتوں کے درمیان کھڑے کھڑے بہت سی باتیں سُننے میں آتیں اور کبھی کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دینا پڑتا جبکہ پوچھنے والے پر تجاہل کا یقین ہوتا۔ مردانہ اور زنانہ سیٹوں پر دو کی جگہ تین تین مسافر پھنسے ہوئے تھے۔ پیچھے سے آگے کو اُترنے کے لئے جانے والے اگرچہ ہاتھ پاؤں سنبھال سنبھال کر رکھ رہے تھے مگر پھر بھی اسی دوران بیچ بیچ میں کھڑی سواریوں کے چہروں پر مختلف تاثرات پڑھے جا سکتے تھے۔ کبھی کچھ آوازیں بھی اٹھتیں، جو شور میں دب جاتیں

اگلے ہفتہ میں انٹرنل اسسمنٹ کے لئے ٹیسٹ ہونے والا ہے۔ رات کافی گزر چکی تھی، اُس نے کتابوں کاپیوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور تکیہ سیدھا کر کے وہیں دراز ہوگئی۔ ٹیسٹ کی تیاری کے دوران بار بار اس کو ایک خیال آتا کچھ دیر کے لئے کچھ سوچنے پر مجبور ہوتی مگر پھر ٹیسٹ اور ایک شعوری جبر کتابوں میں گم کر دیتا۔ بستر پر لیٹ جانے کے بعد اُس نے بار بار دوپٹے سے آنکھوں کو باندھا کھولا، مگر نیند پر اس کو اختیار نہ تھا۔ کبھی کبھی وہ بے اختیارانہ طور پر اُٹھ بیٹھتی، اس کے دل و دماغ پر تشنج طاری ہو جاتا، اس کے ہاتھ پاؤں میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ یہ گھڑی بڑی صبر آزما ہوتی۔ چند لمحوں کے بعد ہیجان ختم جاتا اور سانس کی رفتار اپنے معمول پر آجاتی، یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ آج کی رات اتنی لمبی کیوں ہے، نہیں اب تو پھٹنے کو ہے۔

کالج کی چھٹیوں میں کمی آتی گئی۔ لان بھی کچھ سونے پڑ گئے، اسٹیچو میں اب بھی وہی صلابت تھی، مگر گداز لمس کا اشتیاق بڑھ گیا تھا، شاید وہ پہلے اس لذت سے ناآشنا تھا۔ لائبریری کے در و دیوار کو نظروں کا تعاقب کرنے کی ڈیوٹی سے بڑی حد تک فرصت مل گئی تھی، شعوری ہو یا غیر شعوری، جبر سر کو جھکا دیتا ہے۔ ایک، دو، چار، چھ، کل پہلا پرچہ ہے۔ آج کا دن بھی گزر گیا آٹھ بجنے کو تھے۔ وہ گھنٹہ بھر پہلے ہال کے شمالی گوشہ میں بیٹھی تیزی سے کاپیوں کے اوراق پلٹ رہی تھی، اُسی آن کسی نے قہقہے کے ساتھ ایک دھپ رسید کیا، سر اٹھایا تو وہی اس کی شوخ، نٹ کھٹ سہیلی، جس کو سب ہپیوش کہہ کر پکارا کرتے تھے، نام بہت کم لوگ جانتے تھے، تھی۔ اُس نے لجاجت آمیز انداز میں مسکرا کر پلیز کہا اور کاپی پر جھک گئی۔ ہپیوش ہی" پگلی ہے" کہہ کر ہال کے مین دروازے پر کھڑے ایک خوش وضع جھنڈ میں جا ملی۔

انتظار کی گھڑیاں کٹتے کٹتے کٹ گئیں۔ آج دوپہر کو نوٹس بورڈ بہت سوں کو روتے ہنستے دیکھے گا، لیکن وہ بے حس ہے اس لئے کسی قسم کا تاثر اس کے چہرہ پر نہ ہوگا۔ لڑکے، لڑکیاں قیاس آرائیوں میں مصروف تھے اور جو ساتھی وہاں نہ تھے، اُن کے بارے میں پوچھ پاچھ کر رہے تھے۔ ہپیوش کا چرچا زیادہ تھا۔ وہ اب تک نہ آئی تھی۔ مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ دیر ہو چکا تھا۔ کسی وجہ سے نتیجہ کے اعلان میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اِتنے میں ایک پھٹ پھٹی بے ہنگم شور کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئی۔ بہت سے لڑکے اور لڑکیاں اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے، کیوں ہوگئی لیٹ؟ کسی نے پوچھا۔

جواب ہنسی میں گم ہوگیا۔ اُسی لمحہ لڑکے اور لڑکیاں نوٹس بورڈ کی طرف دوڑتے نظر آئے۔ شاید نتیجہ چسپاں ہو رہا تھا۔ ہپیوش بھی بے نیازی کے ساتھ اس طرف بڑھنے لگی۔

چہروں پر افسوس اور مسرت کی کیفیت دکھائی دینے لگی۔

ہپیوش سب کے لئے ایک سوالیہ؟ تھی، جس کا نتیجہ کم و بیش اُن جیسا ہی تھا۔

اُردو نامہ

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم مارچ: جناب ابوالفضل سید محمود قادری، ریڈر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کو ان کے مقالہ "وجدی کرنولی کی مثنوی تحفۂ عاشق کا تنقیدی جائزہ" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ ڈاکٹر محمود قادری نے ڈاکٹر غلام عمر خاں، اقبال پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی زیر نگرانی ریسرچ کی تکمیل کی۔

تلنگانہ کلچرل فرنٹ کی طرف سے ریاستی اُردو اکیڈیمی کے ڈائرکٹر و سکریٹری جناب چندر سری واستوا کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر اے آر باجی ناظم اعلیٰ ریاستی محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ نے صدارت کی۔ مولانا حافظ ابو یوسف چیرمین مجلسِ انتظامی اُردو اکیڈیمی، بیرسٹر سردار علی خاں، جناب اعجاز قریشی ایڈیٹر بھارت نیوز، ملک محمد علی خاں ایڈیٹر "آندھرا پردیش" اور کئی مقررین نے مسٹر چندر سری واستو کی اُردو خدمات کی ستائش کی۔ ڈاکٹر باجی نے کہا کہ اُردو کو اس کا مستحقہ مقام دلانے میں اور مشترکہ تہذیب، مساوات اور سیکولرازم پر مبنی نئے معاشرے کی تشکیل میں اُردو کو اس کا کلیدی رول ادا کرنے کے مواقع فراہم کرنے میں آندھرا پردیش کو مثال قائم کرنی ہوگی۔ مسٹر یوسف ندیم نے جلسہ کی کاروائی چلائی۔

۳ مارچ: حیدرآباد کے ممتاز صحافی جناب کریم سنوسی، سب ایڈیٹر "دکن نیوز" طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔

- اقامتی اُردو ٹرسٹ لائبریری میں "حلقۂ اربابِ ذوق" کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب رشید الدین، مددگار مترجم ریاستی ٹرانسلیشن آفس نے ممتاز ادیب مرحوم اشفاق حسین کی تصنیف "سرودِ رفتہ" پر تبصرہ سنایا۔

۴ مارچ: ریاستی انجمن ترقی اُردو کے ایک وفد نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قیادت میں چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی سے ملاقات کی اور ریاست میں اُردو کے تعلیمی مسائل اور نظم و نسق میں اُردو کے چلن کے تعلق سے ایک جامع یادداشت پیش کی۔ وفد نے چیف منسٹر پر واضح کیا کہ حکومتی احکامات اُردو کے تعلق سے غیر تشفی بخش ہیں اور ان سے اُردو والوں کے مطالبات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ چیف منسٹر نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ ان مطالبات پر ہمدردانہ غور کریں گے نیز گجرال کمیٹی کی سفارشات کو بھی ملحوظ رکھیں گے۔ چیف منسٹر سے ملنے والے وفد میں جناب عابد علی خاں، جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ اور مسٹر سری نواس لاہوٹی شامل تھے۔

۸ مارچ: نامور غزل گو شاعر حضرت خورشید احمد جامی کی نویں برسی کے موقع پر ہفت روزہ "برگِ آوارہ" اور "شاہکار پبلیکیشنز" کی طرف سے سالانہ فاتحہ اور ختم قرآن کا اہتمام کیا گیا اور مزارِ جامی پر چادرِ گل چڑھائی گئی۔

- ریاستی اُردو اکیڈیمی کی طرف سے مرحوم صحافی کریم سنوسی کی بیوہ کو ایک ہزار روپے کی امداد دی گئی۔

۹ مارچ: آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے کہا کہ حکومت چھوٹے اخبارات کی مدد کے لئے ممکنہ تعاون دیتی رہے گی۔ موصوف نے مدیرانِ جرائد پر زور دیا کہ وہ ملک کی بدلتی ہوئی سیاسی و سماجی صورتحال کو مدنظر رکھیں اور اخبارات و جرائد کے ذریعہ قومی و ملی شعور اور جذبۂ یگانگت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کریں۔ جناب ایم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اُردو اکیڈیمی نے بھی مخاطب کیا اور کہا کہ حکومت ریاست میں اُردو کی ترقی کے لئے کئی ترقی پسند اقدامات کر رہی ہے۔ کانفرنس کے صدر جناب داس اختر (قومی دہلی) نے اُردو اخبارات کے

دیرینہ حل طلب مسائل کی یکسوئی کے باب میں پریس کمیشن میں ایک اُردو صحافی کی شمولیت پر زور دیا۔ نائب صدر استقبالیہ کمیٹی جناب وقار الدین ایڈیٹر "رہنمائے دکن" اور جناب معین فاروقی ایڈیٹر "آندھرا ... " نے بھی جلسہ سے خطاب کیا۔ کانفرنس میں اُردو اخبارات و رسائل کے کئی مدیران اور نمائندوں نے شرکت کی۔

ھ گولکنڈہ فیسٹول کے زیر اہتمام "محبوب علی پاشاہ کے دور کا حیدرآباد" کے موضوع پر تصویری نمائش کا جناب اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں افتتاح کیا۔ اور آصفجاہی کی قومی یکجہتی کی روایات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ ریاستی وزیر سیاحت محترمہ روڈا مستری نے کہا کہ حیدرآباد جو ہندو مسلم اتحاد کے لئے ملک بھر میں شہرت رکھتا ہے۔ اس شہر کے قطب شاہی اور آصفجاہی آثار کو سیاحتی مرکز کی حیثیت سے محفوظ رکھا جانا چاہئیے۔ مسٹر وی کے باوا (آئی اے ایس) نائب صدر سوسائٹی نے ابتداً خیرمقدمی تقریر کی محترمہ بلقیس علاء الدین نے شکریہ ادا کیا۔

۱۰ مارچ :- شنکر جی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام چوتھا کل ہند مشاعرہ جناب پی نرسا ریڈی سابق وزیر مال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر رام دیو ریاستی وزیر نے ... کی رسم اجراء انجام دی۔ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یو۔ پی نے شنکر جی کی تعلیمی اور قومی خدمات کا ذکر کیا۔ جناب سید مکرم شاہ چیرمین لجسلیٹو کاونسل مہمان خصوصی تھے مشاعرہ میں مہمان شعراء مسز خمار بارہ بنکوی، زبیر رضوی، شری مجو پالی، اندرجیت سنگھ تلسی، یکتا شبنم، مظہر کامل، بہار برنی اور شوق کریمی اور میزبان شعراء مسز راوج یعقوبی، سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر مغنی صدیقی، خواجہ شوق، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، رحمٰن جامی، رئیس اختر علی الدین نوید، عزیزہ انساء صبا اور شریا بھر نے کلام سنایا۔ جناب زبیر رضوی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

ھ آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس میں جس کی صدارت مسٹر جیتا داس اختر نے کی، مرکزی وزیر مسٹر ایچ این بہوگنا کا پیام سنایا۔ اس جلسہ میں اُردو نیوز پیپرس ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے قیام کی ایک تجویز منظور کی گئی جس کے تحت اُردو اخبارات کی معاشی حالت کو سدھارا جاسکتا ہے۔ مسز محبوب حسین جگر (سیاست، حیدرآباد) رئیس الدین فریدی (کلکتہ) بہار برنی (دہلی) اور دیگر صحافیوں نے کانفرنس کی کاروائی میں حصہ لیا۔

ھ ادارۂ قدر ادب کے زیر اہتمام جشن ہفت سالہ محفل دو بیتی کا انعقاد عمل میں آیا۔ جناب سید رحمت علی سابق ڈپٹی اسپیکر ریاستی اسمبلی نے صدارت کی۔ کرناٹک کے شاعر اکمل الوری کی رباعیات کے مجموعہ کی رسم اجراء انجام دی گئی۔ بانی قدر ادب، بزرگ شاعر جناب عرفی، رائے محبوب نارائن، جناب مغنی اور ارمان قریشی نے ادبی مسائل اور رجحانات پر مخاطب کیا۔ دوسرے دن محفل میں تقریباً ۲۵ شعراء نے رباعیات سنا کر محفل دو بیتی کو گرمایا۔

۱۱ مارچ :- اقلیم ادب کی طرف سے نامور افسانہ نگار ادیبہ محترمہ عصمت چغتائی کا مسز جیلانی بانو، آمنہ انصاری اور احمد ... نے ادبی انٹرویو لیا۔ اُردو دوستوں، معززین اور اساتذہ کی بڑی تعداد نے عصمت چغتائی سے انٹرویو سنا۔

ھ ڈاکٹر حفیظ قتیل ریڈر شعبۂ جامعہ عثمانیہ کے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہونے پر طلبات شعبۂ اُردو کی طرف سے ایک الوداعی تقریب جناب احمد شریف ریاستی وزیر اوقاف کی صدارت میں منعقد ہوئی احمد علی نے قتیل صاحب پر خاکہ سنایا اور طلبات نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی ادبی تدریسی خدمات کو زبردست خراج تحسین ... اسی جلسہ میں ڈاکٹر غلام عمر خاں کو ... پروفیسر شپ دیئے جانے پر انھیں ... پیش کی گئی۔

ھ اقبال اکیڈیمی زیر اہتمام محفلِ اقبال کو پروفیسر صلاح ... مصلح الدین سعدی اور کریم رضا ... نے مخاطب کیا۔

۱۲ مارچ :- نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری کی طرف سے عصمت چغتائی کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ عصمت چغتائی نے لائبریری کا معائنہ کیا۔ جناب عبدالمجید، ڈائرکٹر لائبریری نے لائبریری کی سرگرمیوں سے واقف کرایا۔

۱۳ مارچ :- انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے بصدارت جناب فضل الرحمٰن سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، محترمہ عصمت چغتائی کا خیر مقدم کیا گیا۔ محترمہ جیلانی بانو نے عصمت پر دلچسپ خاکہ سُنایا عصمت چغتائی نے کہانی سُنا کر محفل کی رونق دوبالا کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے شکریہ ادا کیا۔

۱۷ مارچ :- ریاستی انجمن ترقی اردو کے ۵ ادبی سالانہ کنونشن (۱۱ مارچ) منعقدہ کرنول کی تفصیلات پریس کانفرنس میں بتلاتے ہوئے راج بہادر گوڑ اور جناب عابد علی خان نے بتایا کہ ریاستی اردو کنونشن میں اردو کی ترقی و ترویج کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اسی پر ریاستی انجمن کے علاقہ تلنگانہ اور آندھرا کے کئی مندوبین نے شرکت کی اور دیگر مطالبات کے علاوہ اُردو داں عوام کی آبادی خواہ دس فیصد ہی کیوں نہ ہو، حکومت کو اعلامات، قواعد اور ضوابط اردو میں جاری کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ کنونشن نے زبان کے مسائل کو بلا کسی ترغیب یا اثر کے حل کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ کانفرنس نے حکومت سے اُردو کی ترقی اور اُردو اسکولوں سے متعلق تیقنات کو جلد روبہ عمل لانے کا مطالبہ کیا اور اضلاع تلنگانہ، رائل سیما اور گنٹور میں جوڈیشیل اور منسٹریل سروسیز میں تقرر کے لئے اُردو کو بطور علاقائی زبان قرار دینے سے متعلق حکم پر بھی عمل درآمد کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس کنونشن میں مرکزی حکومت سے اُردو کے تعلق سے گجرال کمیٹی کی سفارشات کی اشاعت کا بھی ایک قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا ہے۔

ھ محفل خواتین کی طرف سے "عصمت چغتائی کے ساتھ ایک افسانوی شام" کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ عصمت چغتائی، جیلانی بانو، زینت ساجدہ، بانو طاہرہ سعید، نجمہ نکہت سلطانہ شرف الدین، عظمت عبدالقیوم، انیس قیوم فیاض اور قمر جمالی نے کہانیاں سُنائیں۔

۱۸ مارچ :- آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام بمقام "رائے جانکی پرشاد ہال" انوارالعلوم کالج "اُردو افسانے کے ۲۵ سال" کے زیر عنوان ایک نمائندہ سیمینار منعقد ہوا۔ محترمہ عصمت چغتائی نے سیمینار کی صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ نے کلیدی مقالہ پیش کیا اور افسانہ کے مختلف پہلوؤں اور اس کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ما قبل آزادی اور آزادی کے بعد اردو افسانہ کے ارتقائی رجحانات کا تقابلی جائزہ لیا۔ سیمینار میں افسانہ کے تعلق سے مباحث میں حصہ لینے والوں میں سرز ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر زینت ساجدہ، جیلانی بانو، ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر یوسف کمال، پروفیسر سید سراج الدین، عاتق شاہ، سید رحمت علی، یوسف اعظمی قدیر الزماں، احمد جلیس، محسن علی، نیپال سنگھ ورما اور حامد مجاز قابل ذکر ہیں۔ ابتداء میں جناب چندر سری واستوا ڈائرکٹر و سکریٹری اُردو اکیڈیمی نے عصمت چغتائی کا خیر مقدم کیا اور قلم کاروں کو مشورہ دیا کہ وہ مُردہ موضوعات پر ریسرچ کی بجائے ادب کو عصری بنانے پر توجہ دیں۔ جناب سید مکرم شاہ صدر نشین قانون ساز کونسل نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ محترمہ عصمت چغتائی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے عریاں اور فحش ادب کی اشاعت پر تاسف کا اظہار کیا اور ترقی پسند تحریک اور تجریدی ادب کی پیش رفت پر اپنے خیالات عمدہ پیرائے میں بیان کیے۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد اردو اکیڈیمی نے سیمینار کی کارروائی عمدگی سے انجام دی۔

اسی دن سہ پہر "شام افسانہ" منائی گئی۔ جناب بیم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے اکیڈیمی کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور عصمت چغتائی، جیلانی بانو [illegible] عاتق شاہ، اکرام جاوید، عوض سعید

(باقی صفحہ ۲ پر دیکھئے)





سلطان محمد قلی، قطب شاہی سلسلے کے پانچویں بادشاہ تھے، ان سے پہلے اس خاندان کے چار بادشاہ، ابراہیم قلی، سبحان قلی، جمشید قلی اور سلطان قلی گولکنڈہ میں تخت نشین ہو چکے تھے۔

قطب شاہی خاندان نے اپنی حکومت کے زمانے میں ہندو مسلم دوستی اور رعایا کی بھلائی کے لیے بہت سے اچھے کام کیے۔ سلطان قلی کے والد ابراہیم قلی کا زمانہ بھی شاندار رہا۔ گولکنڈہ میں اُس نے ہندو رعایا کی بڑی خدمت اور تلگو کے شاعروں اور ادیبوں کی بھی ایسی قدردانی کی کہ پرانا تلگو ادب اس کی تعریف سے بھرا ملتا ہے۔ ابراہیم قلی کے دربار میں بڑے بڑے ہندو امیر اور سپہ سالار موجود تھے۔ اور محلات میں بہت سی تلنگی عورتیں بھی کام کرتی تھیں

حیدرآباد شہر بسانے والا، اور چار مینار جیسی عظیم تاریخی عمارت کا جنم داتا، اُردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر، سلطان محمد قلی قطب شاہ ۴ر اپریل ۱۵۶۶ء کو پیدا ہوا، جیسا کہ شاہی گھرانوں میں پیدائش کی خوشیاں منائی جاتی ہیں، اسی طرح اس بلند اقبال شہزادے کی پیدائش پر خوب رنگ رلیاں رچائی گئیں۔

نجومیوں اور رمّالوں نے شہزادہ قلی کا زائچہ بنا کر اُس کی خوش قسمتی، ترقی اور بڑے آدمی ہونے کی پیشین گوئی کی۔ جب یہ ہونہار شہزادہ بڑا ہوا تو مدرسے میں بٹھایا گیا۔ خاص اُستادوں کی نگرانی میں اُس کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ یہ بچپن میں بہت ذہین اور چالاک تھا۔ کہتے ہیں کہ اُستادوں کو سبق دیتا تھا۔ اُس

نے خوش خط لکھنا انتہائی شوق سے سیکھا اور ساتھ ہی ساتھ کشتی لڑنا اور دوسرے جسمانی کرتب بھی زیادہ دلچسپی سے سیکھے۔ لیکن تعلیم کی طرف اُس نے بہت کم توجہ دی۔ کیونکہ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگا تھا۔

محمد قلی کے باپ ابراہیم قلی قطب شاہ ۲۴ جون ۱۵۸۰ء کو دُنیا سے چل بسے، اُس وقت شہزادہ ۱۴ برس، سات ماہ اور آٹھ دن کا تھا، باپ کی وصیت کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کو ۲۵ جون ۱۵۸۰ء کو جمعہ کے دن راج گدّی پر بٹھایا گیا۔ اُس دن گولکنڈہ کے ہندو اور مسلمان امیروں اور رعایا نے جی بھر کر خوشیاں منائیں۔ خود محمد قلی بھی بہت خوش تھا کہ وہ جمعہ ہی کے دن پیدا ہوا تھا اور اُسی دن اسے راج گدّی بھی ملی۔

محمد قلی قطب شاہ کی راجدھانی گولکنڈہ تھی۔ اُس کی انصاف پسندی اور خیر خیرات نے رعایا پر اثر چھوڑا اور خاص و عام دُور دُور سے کھنچ کر آنے لگے تو راجدھانی گولکنڈہ میں اور آبادی کی گنجائش نہ رہی۔ سب سے پہلے وہاں کے امیروں نے اپنے باغ اور محل موسیٰ ندی کے کنارے بنائے۔ اس طرح آبادی بڑھنے لگی، یہاں تک کہ سلطان محمد قلی نے آج سے ۳۸۸ سال پہلے ۱۵۹۱ء میں سرکاری طور پر ایک شاندار شہر "حیدرآباد" کی نیو رکھی۔ اس طرح اس تاریخی شہر میں محمد قلی کے ہاتھوں "چارمینار" کی بھی بنیاد رکھی گئی۔

چارمینار ۱۸۹ فٹ اُونچی عمارت ہے، جس کے اُوپر ایک مسجد اور ایک مندر بنایا گیا۔ چارمینار پر مسجد اور مندر کا بنایا جانا بادشاہ کے انصاف اور ہندو مسلم ایکتا کی کبھی نا جھٹلائی جانے والی حقیقت سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ چارمینار کی تعمیر میں تین لاکھ روپیوں کا خرچ آیا۔ چارمینار کے ساتھ ہی اس نئے شہر میں چار بازار اور چودہ ہزار دوکانیں بھی بنائی گئیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے جس چاؤ اور محبت سے حیدرآباد بسایا اُس کا اندازہ خود اس کے کلام سے ہوتا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ اپنی نظم "مناجات" میں خدا سے جہاں بہت سی باتوں کی دُعا کرتا ہے وہیں اپنے شہر کی آبادی کے لئے بھی دُعا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔ "اے خدا! تو میرے شہر کو لوگوں سے اس طرح بھرپور رکھ جس طرح تو نے سمندروں کو مچھلیوں سے بھر دیا۔"

سلطان محمد قلی، نیک دل، سخی اور فیاض تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ رقم عمارتوں کی تعمیر اور عوام کی بھلائی میں خرچ کی۔ اس کے دربار کے خاص انجینئر میر ابو طالب نے لکھا ہے کہ ستّر لاکھ کے قریب اخراجات عمارتوں کی تعمیر میں ہوئے۔ ہر سال محرم میں محمد قلی ساٹھ ہزار روپیے مجاوروں اور خادموں کے وظیفے اور ایام عاشورہ کے پکوان میں خرچ کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ دسویں محرم کے دن فاتحہ خوانی پر غریبوں اور مستحقوں میں

ہر سال بارہ ہزار روپے تقسیم کیے جاتے تھے اس نے اپنے زمانے میں صرف محرم کے لنگر میں ایک کروڑ چونتیس لاکھ، چالیس ہزار روپے صرف کیے۔ شہر حیدرآباد میں کوئی ضرورت مند ایسا نہ تھا، جسے محمد قلی نے کچھ نہ دیا ہو۔ رعایا میں جس کسی کے یہاں شادی یا کوئی اور تقریب ہوتی، اگر وہ بادشاہ کو اس کی اطلاع کراتا تو فوراً انعام واکرام سے سرفراز ہوتا۔

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے اپنے زمانے میں کبھی بھی کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا، اگر کبھی کوئی مقدمہ پیش بھی ہوا تو اُس پر انصاف کیا گیا اور قانون کے مطابق تصفیہ کر دیا گیا اس کے وسیع دسترخوان کی دور دور تک شہرت تھی، چنانچہ اکثر مسافر اور سیاح اُس شاہی دستر خوان پر موجود ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اُس کے دستر خوان پر ہر وقت ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے تھے اور کسی کو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

وہ اُردو کا پہلا محسن تھا اور اُس نے اس زبان کی ایسے وقت مدد کی جبکہ وہ اُس کی بہت محتاج تھی۔ محمد قلی نے اردو پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر سے نہ ہو سکا۔ اُس نے نہ صرف اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کی قدر کی بلکہ خود بھی اُردو کا ایسا شیدائی تھا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے گویا بارہ سال کی عمر کے بعد سے اوسطاً ہر روز اس نے چار پانچ شعر ضرور لکھے ہوں گے۔ یہ اُردو زبان کی خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی سرپرستی میں محمد قلی جیسا بادشاہ دن رات معروف ہوگیا۔ ▲▼

دیپ جلاؤ

مومن خاں شوق

بسم اللہ کے نام پہ بچو
مکتب مکتب پڑھتے جاؤ
سچائی کے پھول کھلے ہیں
درجہ درجہ قدم بڑھاؤ
جھگڑا، ٹنٹا اور لڑائی
ہرگز اِن کے پاس نہ جاؤ
کوئی کام نہیں ہے مشکل
محنت کو آدرش بناؤ
جدوجہد سے منزل منزل
فتح و ظفر کے دیپ جلاؤ
نئی سحر کا گجر بجا ہے
شوق چلو اب گیت سناؤ —

قابل کاشت اراضی میں اضافہ

آندھرا پردیش کے منصوبہ جاتی اخراجات میں کچھ عرصہ سے آبپاشی پراجکٹوں کے لئے بھاری حصہ مختص کیا جارہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اراضیات کی سیرابی کے لئے گنجائش مہیا کی جائے۔

درج فہرست علاقوں میں ۲۱ء۶۸ کروڑ روپیوں کی تخمینی لاگت کے چھ اوسط پراجکٹ کی عمل آوری کا کام شروع کیا گیا ہے۔ چھوٹی آبپاشی کے تحت ۲ء۲۰ ملین ہیکٹر کی امکانی گنجائش میں سے ۱ء۶۷ ملین ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش اب تک پیدا کی جاچکی ہے۔

سال ۱۹۷۹ء-۸۰ کے دوران میں ۲۶ء۶۸۰ لاکھ روپیوں کے اخراجات سے مزید ۶۳۵۰ ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا کرلینے کی تجویز ہے

ڈائرکٹر جنرل
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز

LNO.384/ADVT/C4/79(A4) D/9-3-79

برقی قوت کی پیداوار میں اضافہ

آندھرا پردیش برقی قوت کی پیداوار کے ہمہ گیر اہمیت والے شعبہ میں اپنی قابلِ رشک سبقت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے وزیر اعظم کے ہاتھوں نومبر ۱۹۷۸ء میں ۲۱۰۰ میگاواٹ کی تخمینی صلاحیت رکھنے والے راماگنڈم سوپر تھرمل پاور اسٹیشن کے سنگ بنیاد کی تنصیب ایک سنگ میل کے مماثل ہے۔

آندھرا پردیش میں برقی کی تنصیبی صلاحیت سال ۷۹-۱۹۷۸ء کے آغاز کے وقت ۱۵۶۳ میگاواٹ سے زیادہ ہوگئی اور توقع ہے کہ ۱۹۷۹ء کے وسط تک مزید بڑھ کر ۱۸۸۸ میگاواٹ ہو جائیگی۔

"رورل الکٹریفکیشن کارپوریشن" دیہاتوں کو برقیانے کے معاملے میں اپنی امدادی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کارپوریشن نے اب تک آندھرا پردیش میں ۲۱۳ اسکیمات منظور کی ہیں جن کے لئے ۸۳ء۷۰ کروڑ روپے قرضہ جاتی امداد فراہم کی گئی ہے۔

ڈائرکٹر جنرل انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز

L.No. 384/ADVT/C4/79 (45) D/9-3-79.

سب رس



اجرا: ۱۹۳۸ء
ن : ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

سب رس
حیدرآباد

ڈاکٹر مغنی تبسم
(مجلس مشاورت و مدیر اعزازی)

وقار خلیل
(معاون مدیر)

قیمت فی شمارہ
روپیہ پچتر پیسے

زر سالانہ : ۲۰ روپے ششماہی : ۱۰ روپے
ا ... مالک ... ۱

... ممالک ... ڈالر پاکستان، سیلون ۸ ڈالر
... ممالک : ۱۴ ڈالر، بنگلہ دیش : ۵ ڈالر

حیدرآباد ۲
حیدرآباد ۴

ترتیب

غذا برائے کام

غذا برائے کام پروگرام کا مقصد یہ ہے کہ جزمعاشی اور بیروزگار افراد کے لئے فائدہ مند روزگار فراہم کرکے انھیں برادری کا ایک پائدار اثاثہ بنایا جائے۔

آندھرا پردیش میں یہ اسکیم فی زمانہ پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے ریاستی حکومت نے اس اسکیم کے تحت تقریباً ۱۴۲ر۵۵ کروڑ روپے لاگت کے کام شروع کر رکھے ہیں۔ اب تک ۱۰۵۶ کیلو میٹر نئی سڑکوں اور ۳۱۷۰ کیلو میٹر پختہ و نیم پختہ سڑکوں کی تعمیر و مرمت ۱۷۰ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر اور ۱۳۴ وسائل آبپاشی کی تیاری کا کام شروع کیا جاکر مکمل کرلیا گیاہے جس کی بدولت تقریباً ۴۹۳۹۲ لاکھ کام کے دن پیدا ہوئے۔

اپنی بات

کسی زبان کے شعروادب کی ترقی اور نشوونما میں ادبی رسالوں کا نہایت اہم رول ہوتا ہے اس ذریعے سے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات جلد شائع ہوکر قارئین تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس طرح نہ صرف ادیب اور قاری کے درمیان مسلسل ربط قائم رہتا ہے، بلکہ خود تخلیق کار بھی ایک دوسرے کے کام سے باخبر رہتے ہیں۔ ان رسالوں کی وجہ سے ادیبوں کو لکھنے کی تحریک ملتی ہے اور ادبی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ ادبی رسائل کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات منظر عام پر آتی ہیں تو ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے معیار کو بلند کرنے پر مائل ہوتے ہیں۔ ادب میں نئی تحریکوں اور رجحانات کو فروغ دینے میں بھی ادبی رسالوں کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو ادب ترقی کرے، اس کا معیار بلند ہو اور اردو پڑھنے والوں کے ادبی ذوق کی تسکین اور تربیت ہوتی رہے تو ضروری ہے کہ اردو میں ادبی رسالے زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع کیے جائیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اردو میں معیاری ادبی رسالے دم توڑتے جا رہے ہیں۔ نئے رسالے کم جاری ہوتے ہیں اور جاری ہوتے بھی ہیں تو دو چار اشاعتوں کے بعد بند ہو جاتے ہیں۔ بعض اردو اکیڈیمیوں نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی ضرور ہے لیکن جو مالی امداد ادبی رسالوں کو دی جاتی ہے۔ وہ قطعی ناکافی ہے ہم ملک کی تمام اردو اکیڈیمیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ادبی رسالوں کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے نئے ادبی رسالوں کے اجراء اور موجودہ معیاری ادبی رسالوں کی بقاء کیلئے اپنے بجٹ میں مناسب رقم مختص کریں۔ ادبی رسالوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی اعانت دینا ایسا ہی ہے۔ جیسے جڑوں کو پانی سے محروم رکھ کر پتوں کی آبیاری کی جائے۔

مغنی تبسم

ڈاکٹر یوسف سرمست

پریم چند اور شخصیت

میں نے اپنی کتاب "پریم چند کی ناول نگاری" کو ان الفاظ پر [illegible]

"پریم چند کی ناول نگاری، اردو ناول میں ایسی انفرادیت عظمت اور وقار رکھتی ہے
جس کا جواب اردو کی ساری ناول نگاری میں ملنا ممکن نہیں۔"

پروفیسر آل احمد سرور حال ہی جب حیدرآباد تشریف لاتے تھے تو میں نے یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ کتاب کو دیکھتے ہوئے ان کی نظر جب مذکورہ بالا عبارت پر پڑی تو انھوں نے اختلاف کیا کہ [illegible] اردو ناول نے پریم چند کے بعد بہت ترقی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ناول نے پریم چند کے بعد کئی اہم منزلیں [illegible] اور یقیناً ترقی کی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پریم چند کی ناول نگاری اردو ناول میں [illegible] رکھتی ہے جس کا جواب اردو ناول نگاری میں ملنا ممکن نہیں۔" بظاہر یہ بات [illegible] وقار کے الفاظ میں اگر "ایسی" کے لفظ کو نظر انداز نہ کیا جائے تو [illegible] انفرادیت، وقار اور عظمت اردو ناول کو بخشی ہے اس کا جواب ملنا ناممکن ہے۔ [illegible] اور انفرادیت اردو ناول میں آسکتی ہے اور آتی ہے لیکن پریم چند کی طرح کی نہیں۔ بات یہ ہے کہ پریم چند کی ناول نگاری ایک جینس کی تخلیقی کاوشوں کا ثمر ہے اور کلاسیک کی ساری معنویت اپنے اندر رکھتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے "کلاسیک کیا ہے" سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے۔

"یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ ترین شاعر خواہ وہ کلاسیک ہو یا نہ ہو اس زمین کو جس میں کاشت کرتا ہے بالکل چوس لیتا ہے جہاں تک کہ تھوڑی بہت فصل اگانے کے بعد وہ کچھ نسلوں کے لیے بالکل [illegible] کاشت ہو کر رہ جاتی ہے۔"

اعلیٰ ترین فن کار خواہ وہ کسی بھی صنف کا ہو وہ جس زمین کو اپناتا ہے اس سے امکانی حد تک فائدہ اٹھاتا ہے آنے والوں کے لیے یہ زمین بنجر سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ پریم چند نے ناول نگاری کے اس انداز کو جس کی ابتدا نذیر احمد

نے کی تھی نہ صرف معراج کمال تک پہنچا دیا بلکہ اس قسم کی ناول نگاری کا اس سے اعلیٰ نمونہ پیش کرنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ناول نے پریم چند کے بعد جو ترقی کی ہے اپنا راستہ بدلنے کے بعد ہی کی ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری مقصدی تھی ان کی ادبی سرگرمیوں کا حاصل یہ خواہش تھی کہ وہ چند ایسی تصانیف چھوڑ جائیں جن کا مقصد حصولِ آزادی ہو۔ انھوں نے ہر قسم کی آزادی کے حصول کو اپنی ادبی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ پریم چند نے صرف سیاسی آزادی کے حصول کے لیے اپنا زورِ قلم صرف نہیں کیا بلکہ فرسودہ سماجی بندشوں سے ہندوستان اور ہندوستانیوں کو آزاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر قسم کے جبر و استبداد سے آزادی حاصل کرنے کا سبق دیا ہے۔ اونچ نیچ، ذات پات کے بھید بھاؤ سے آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ معاشی آزادی کو اپنا مطمع نظر بنایا ہے۔ مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے آزادی دلانا ان کا مقصد رہا ہے۔ اس اعتبار سے پریم چند کے ادبی کارنامے پروپگنڈے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ادب کو پروپگنڈے اور مقصدیت کی نذر کر دینا ادب کی بھی تذلیل ہے اور ادیب کی بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پریم چند کی بڑائی اور عظمت میں باوجود مقصدیت کے فرق نہیں آیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک حقیقی، سچے اور اعلیٰ درجے کے فن کار اور معمولی درجے کے فن کار میں فرق یہیں پیدا ہوتا ہے۔ ایک بڑا اور سچا فن کار پروپگنڈے کو ادب اور فن بنا دیتا ہے اور ایک معمولی درجے کے فن کار کے ہاتھوں ادب اور فن بھی پروپگنڈہ بن جاتے ہیں۔

ادب کو پروپگنڈہ بنانے اور پروپگنڈے کو ادب بنانے میں فن کار کی شخصیت کام آتی ہے۔ جب پروپگنڈہ اور مقصد فن کار کی شخصیت کا جزو بن جاتے ہیں تو وہ فن کے دائرے سے باہر نہیں ہوتے اور فن میں شامل ہو کر ترفع حاصل کر لیتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی کثافت یعنی زنگار شیشے کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ زنگار جب شیشے کے پیچھے ہوتا ہے تب ہی وہ جلوے دکھاتا ہے۔ لیکن زنگار اگر سامنے ہو تو شیشہ خود نظروں سے غائب ہوتا ہے اور یوں وہ خود کثیف ہو جاتا ہے۔ پریم چند کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے کثافت کو لطافت بنا دیا ہے۔ ایک سچے اور بڑے فن کار کو جب دنیا کا غم ڈستا ہے تو وہ اس زہر کو پی جاتا ہے اور جی جاتا ہے لیکن ایک دوسرے درجے کا فن کار اس زہر کو اپنی شخصیت میں جذب کر لینے کی تاب و توانائی نہیں رکھتا اس لیے اسے اگل دیتا ہے اور یوں اس کی موت ہو جاتی ہے۔

پریم چند کی ساری فن کاری ان کی شخصیت کا اظہار ہے۔ ان کی شخصیت کا خلوص ان کے سارے فن میں رچ بس گیا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی ہی دلچسپ بات ہے کہ شخصیت کا اظہار فن کو پوری طرح مجروح کر بھی دیتا ہے اور محدود بھی۔ اسی لیے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ادب کا غیر شخصی تصوّر پیش کیا ہے جس سے مقصد یہ ہے کہ ادب جو شخصی ہوتا ہے وہ محدود ہوتا ہے اور غیر دلچسپ۔ وہ کسی ایک کی ذات میں گھر کر گہرائی اور گیرائی کھو دیتا ہے۔ ادب کی وہ عمومیت ختم ہو جاتی ہے جس میں فن کار کی بات ہر ایک کو اس کی اپنی بات معلوم ہوتی ہے ادب جب شخصی ہوتا ہے تو فن میں تقریر کی وہ لذت باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے ہر شخص یہ سمجھنے لگے گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

محدود شخصیت کا ایسا محدود اظہار لازمی طور پر فن کو مجروح کر دیتا ہے لیکن جب شخصیت بے حد وسیع ہو اور جب فن کار کی ذات اپنے دور کے سارے کرب کو جذب کر لے تب ہی کہیں جا کر شخصیت کا اظہار محدود نہیں رہتا۔ فن کار

یسی صورت میں اپنی ذات سے انجمن بن جاتا ہے۔ اب شخصیت کا حال دُنیا کا حال بن جاتا ہے۔ دُنیا کا حال شخصیت کا اور یوں غمِ ذات اور غمِ دوراں کا فرق مٹ جاتا ہے۔ غمِ ذات میں غمِ دوراں کا جلوہ نظر آتا ہے اور غمِ دوراں میں غمِ ذات کا۔ من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے تو پھر شخصیت کا اظہار فن کو محدود نہیں کرتا بلکہ اس کو اس قدر وسیع کر دیتا ہے کہ ادب غیر شخصی بن جاتا ہے۔ پریم چند کی شخصیت کا اظہار ان ہی معنوں میں ان کے فن میں ہوتا ہے۔

پریم چند کی زندگی اور ان کے افکار و خیالات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بڑی ہی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی کو اپنے فن میں سمو دیا ہے۔ کسی جگہ بھی اور کہیں بھی تضاد کا احساس نہیں ہوتا۔ پریم چند تمام عمر معاشی پریشانیوں میں گھرے رہے کبھی خوش حالی نصیب نہ ہوئی۔ گو زندگی بھر تنگ [illegible] لیکن کبھی تنگ دل نہیں ہوئے۔ اسی لیے ان کی فکر و فن میں کبھی بھی بے زارگی یا جھنجھلاہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ ذہنی [illegible] اور مالی طور پر وہ ہمیشہ محنت کش رہے۔ اور انھوں نے کبھی بھی آرام کے ساتھ نہیں کھایا۔ بلکہ بڑے دکھ درد کے ساتھ [illegible] غم کو بیان کرتے رہے۔ شخصیت کا یہی خلوص فن کے سانچے میں ڈھلتا رہا۔

فن کار جب زندگی کی ناہمواریوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے تو اس کے لیے دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی ذات کے حصار کو توڑ کر اس [illegible] پھیلاؤ کا مقابلہ کرے۔ اور جب کوئی فن کار ایسا کرتا ہے تو فن کار کی ذات اور شخصیت اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی شخصیت بن جاتی ہے۔ یہی صورت ہم کو پریم چند کی شخصیت اور فن میں نظر آتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ فن کار اپنی حالات میں اپنی ذات کے اندر سمٹ آتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں قلعہ بند ہو کر حالات کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس بات کی سب سے روشن مثال میر کی فن کاری ہے۔ ایک اچھے بڑے اور سچے فن کار کے لیے ان دونوں راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ یہاں بات وابستگانِ منزل کی ہو رہی ہے۔ جن کے لیے سیدھی سی ایک راہِ حق کھلی ہوتی ہے۔ رہی گم کردگانِ منزل کی بات تو ان کے لیے بے شمار راہیں ہیں۔

پریم چند کی شخصیت اور فن میں جو بات سب سے اہم ہے وہ یہ کہ ان کے پاس وفاداری بہ شرطِ استواری نظر آتی ہے۔ اس لیے ان کے فن کے نگینے پر کبھی آنچ نہیں آئی۔ انھوں نے اپنی فنی زندگی کے ابتدائی دور میں جو راستہ متعین کر لیا تھا اس پر وہ زندگی بھر کار بند رہے۔ انھوں نے ۱۹۰۸ء میں اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے "سوزِ وطن" کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے مضمون میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔"

اور پھر آگے چل کر اپنے فن کے بارے میں اسی راستے پر گامزن ہونے کی بات انھوں نے یوں کی ہے: -

"اب ہندوستان کے قومی خیالات نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا اور حبِ وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر ابھارنے لگے ہیں۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔" یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں۔"

پریم چند نے زمانے کی سچی تصویر اپنے کارناموں میں پیش کرنے کا جو آغاز اپنی ابتدائی فنی زندگی میں شروع کیا اس کا اختتام خود

ان کی اپنی زندگی کے ساتھ ہوا۔ بیسویں صدی کے اوائل سے پریم چند کی فنّی زندگی کا آغاز ہوا جو ۱۹۳۶ء میں ان کی موت کے ساتھ ختم ہوا۔ اس پورے عرصے میں پریم چند اپنے راستے سے بال بھر بھی نہیں ہٹے۔ البتہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان کے فکر و فن میں نکھار آتا گیا۔ ہندوستانی زندگی کے سارے نشیب و فراز اور سارے مسائل کو پریم چند نے اپنے ادبی کارناموں میں سمیٹ لیا ہے۔ پریم چند کے ادبی کارناموں کے ذریعہ ہم ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۶ء تک ہندوستان جن تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشرتی حالات سے دوچار رہا ہے اس سے جس درجہ بہترین طریقے سے واقف ہوسکتے ہیں کسی اور ذریعے سے واقف نہیں ہوسکتے۔ اسی بناء پر میں نے انھیں ہندوستان کا بالزاک کہا ہے۔ مارکس اور اینگلز نے بالزاک کے فن کو سراہتے ہوئے اس کے ناولوں کے بارے میں یہ بات کہی تھی کہ ان کے ذریعے ہم فرانس کی زندگی سے جس تکمیل سے واقف ہوتے ہیں ویسے نہ تو تاریخی کتابوں سے واقف ہوسکتے ہیں نہ ہی معاشی، معاشرتی یا سیاسی کتابوں سے واقف ہوسکتے ہیں۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں دوسری کتابیں جو حقائق پر مبنی ہیں حقائق کا اتنا اور ایسا انکشاف نہیں کرسکتیں جتنی افسانوی کتابیں کررہی ہیں۔ یہاں بھی اصل میں شخصیت اور فن کی مطابقت کرشمہ گری کرتی ہے۔ ادیب بھی سماج کا فرد ہوتا ہے، وہ بھی کسی مذہب کا پابند ہوتا ہے، اپنے ملک کا شہری ہوتا ہے، کسی خاص طبقے کا رکن ہوتا ہے وہ بہ یک وقت مختلف حیثیتوں سے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تجربہ حاصل کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے اس کے اپنے چند معتقدات بھی بن جاتے ہیں اس کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے، وہ بھی چند اخلاقی قدروں کی پاس داری کرتا ہے۔ وہ اس طرح بے شمار چیزوں کو اپناتا ہے اس کے ساتھ ہی بے شمار چیزوں کو رد بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ تمام اس کی شخصیت کی تعمیر میں حصّہ لیتے ہیں۔ اور اس کے تجربات اور مشاہدات کا جوہر ثابت ہوتے ہیں۔ خارجی زندگی سے حاصل کردہ یہ مواد اس کی شخصیت کی گزرگاہوں سے گزر کر اس کے فن میں داخل ہوتا ہے۔ ان بیرونی اور مختلف عناصر کو لے کر ادیب کا تخیل انھیں یک جا اور یک جان کر دیتا ہے۔ اور یہ حقائق اب ایک نئی اور مختلف صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فن کار کا تجربہ جس قدر وسیع اور عمیق ہوگا اسی قدر اس کا تخیل بلند و بالا ہوگا۔ اور اسی قدر تخیل اس کی شخصیت کو ہمہ گیر بنائے گا۔ یہاں پہنچ کر اس کے فنّی کارنامے شخصیت کے جزوی پہلوؤں کے نہیں بلکہ اس کے مجموعی نظامِ فکر کی عکاسی کرتے ہیں اور اسی صورت میں اس کے فنّی کارنامے حقیقت کی ایسی تفسیریں بن جاتے ہیں جو غیر افسانوی ادب خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ، تاریخ ہو یا سماجیات یا اسی قسم کے دوسرے علوم سب سے بہتر اور برتر اور ساتھ ہی سچی اور حقیقی بھی ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تخیل بے پناہ اور بے کراں ہوتا ہے۔ جس میں انسانی اعمال کے سارے محرکات، جذبات، احساسات اور کیفیات جمع ہوسکتی ہیں۔ تخیل اسی طرح سارے کے سارے خارجی حقائق اور باطنی حقائق کو اپنے خام مواد کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ان سے حقائق کی اتنی ایسی سچی اور اچھی اچھوتی تصویریں پیش کرتا ہے جو کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ پریم چند کی شخصیت اور فن پر تخیل کا ہی بے پناہ تصرّف نظر آتا ہے جو ان کی شخصیت اور فن کو یک جان کر دیتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے انھوں نے ہندوستانی زندگی کی ایسی مکمل عکاسی کی ہے جس کا جواب اُردو ناول نگاری کی ساری تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ:

"پریم چند کی ناول نگاری، اُردو ناول میں ایسی انفرادیت، عظمت اور وقار رکھتی ہے جس کا جواب اُردو کی ساری ناول نگاری میں ملنا ممکن نہیں۔"

غزل

لرز رہے ہیں دماغوں میں لاکھ تلخ سوال
طلسمِ شوق جوابوں کی بھی سبیل نکال

مہکتے آنچلوں کی جگمگاتی دُنیا میں
رُخِ حیات سے پونچھی ہے کس نے گردِ ملال

بصد ہزار تماشا و رقص و رامش و رنگ
بہک بہک کے انھیں کی طرف گیا ہے خیال

سا شہر ہے، ساون کی رات ہے اے دوست!
پلٹ کے آئے ہیں بیتے ہوئے وہی مہ و سال

یونہی کھنچے ہوئے رہتے ہیں کچھ عزیز و رفیق
نگاہِ ناز کوئی تازہ تفرقہ تو نہ ڈال

مری نظر کے سوالات پڑھنے والوں کو
خبر نہیں کہ خود اُن کی نظر میں بھی ہیں سوال

لگی ہے آگ اُفق کے قریں کہیں نہ کہیں
دھواں دھواں نظر آنے لگے ہیں ماضی و حال

وہ انگ انگ میں مستی بھری جوانی کی
کبھی شرار، کبھی گُل، کبھی عبیر و گلال

کسی کے قہقہے کی گونج ہی سہی زیدی
رہِ جنوں میں بھی کوئی کرے گا استقبال

علی جواد زیدی

جیلانی بانو

میں

"آدھی رات کو کسی نے خبر سنائی کہ عامر مل گیا ہے۔ میں اندھے بادلوں کی طرح اٹھی۔ جانے کتنا تیز بھاگی۔ عامر کو ٹٹولا [illegible] مجھی سوچتی کہ عامر ہی ہے یا کوئی اور ـــــ"

اماں نے ہزاروں بار یہ قصہ سنایا تھا اور ہر بار میں گھبرا کے اماں سے پوچھتا۔

"اماں، اماں، آپ کو یہ شک کیوں ہوا کہ میں عامر نہیں ہوں"؟

"بس یوں ہی ـــــ میرے دل میں شک تھا کہ کہیں کھوتے ہوئے بچے بھی [illegible]"

اور ہر بار اماں کی اس بات پہ میں لرز اٹھتا تھا۔

کہیں سچ مچ اماں کو کسی نے دوسرا نہ تھما دیا ہو۔ [illegible]
دھتام کر [illegible] ہوگی۔ پھر میں کون ہوں۔ مجھے اماں کا [illegible]

میرے چاروں طرف سوالوں کے پھندے بڑھتے گئے [illegible]

اور پھر جب میں ذرا بڑا ہوگیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں [illegible]
اور وہ ریل آگے بڑھ گئی۔ ایک بار میں نے ریل کی پٹریاں [illegible] !

میں نے جب بھی ابا سے یہ بات پوچھی ـــ وہ ہنسنے لگے۔

"احمق، پٹریاں کہیں ختم نہیں ہوتی ہیں۔ ان کا جال [illegible]"

ایک بچے کو اس کی ماں سے [illegible]
ریلوں میں گھومتے جائے گا۔

اماں بھی کیسی بھولی ہیں۔ مجھ سے بہل گئیں۔ مگر کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے [illegible]

یوں میرے کھوئے کھوئے رہنے پر سب مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھنے لگے [illegible]
جیسے عامر تو کسی اور کا نام تھا۔ میں کیوں جواب دوں!

میری ایسی حرکتوں پہ بڑی آپا کو بڑی ہنسی آتی تھی۔ وہ میرے کان [illegible] پوچھتیں [illegible] ؟

"ریل میں ـــــ؟" میرے جواب پر سب ہی ہنس پڑتے۔

ایک بار اماں بیمار پڑ گئیں [illegible]

آپا کی چیخوں سے ہمارا آنگن پڑوسنوں سے بھر گیا۔ بڑی آپا نے اماں کو دودھ میں گھول کر خمیرۂ مروارید پلایا۔ صابرہ کہتی تھی کہ اس خمیرے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ مُردے کو دے دو تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر اماں نے صرف آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کروٹ بدل کر سو گئیں۔ کئی دن ہو گئے۔ روز رات کو اماں کے پاس سونے کو جی چاہتا تھا۔ مگر ان کی ہائے ہائے سے گھبرا کر میلے کپڑوں کے ڈھیر پہ سو گیا۔ اور پھر سوتے وقت مجھے اس بات پہ رونا آتا تھا کہ اماں مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلاتیں اور پھر ایک دن اماں نے میری طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔

"اسے دیکھو۔ جب سے میں بیمار ہوئی ہوں ایک بار بھی میرے پاس نہیں آیا۔ جیسے میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔"

اماں کی اس بات پہ میں دن بھر سوچتا رہا کہیں سچ مچ اندھیری رات میں لوگوں نے اماں کو دھوکا تو نہیں دیا تھا جبھی تو اماں کی بیماری سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ بڑی آپا، صابرہ اور بھیا پریشان صورتیں لیے سارے گھر میں بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ اماں کو زبردستی دوائیں کھلائی جاتیں۔ لیکن مجھے الٹا غصہ آتا تھا کہ یہ کب تک نخرے کیے لیٹی رہے گی!

کئی بار اماں بیزار ہو کر مجھ پہ جھنجھلا جاتی تھیں۔

"تو ہر وقت باہر کیوں گھومتا ہے۔ اپنے گھر میں جی نہیں لگتا۔ باہر تیرا کون سگا بیٹھا ہے؟"

اماں کی بات سن کر کرکٹ بیٹ میرے ہاتھ سے گر گیا۔ ڈر کے مارے دل دھک دھک کرنے لگا۔ اماں نے یہ بات کیوں کہی آج! کیا انھیں بھی ڈر ہے کہ میں کہیں اپنے سگوں میں نہ چلا جاؤں! دو دن ہو گئے۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ سارا دن پلنگ پہ لیٹا رہا۔ کروٹیں بدل بدل کر سوچے جاتا کہ کیا سوچوں! اب اماں سمجھتیں مجھے کوئی روگ لگ گیا ہے۔ "باہر جاؤ ___ اٹھ کر بیٹھو۔ ہوم ورک کر دے ___"

ہر شخص پاس سے گزرتے وقت مجھے ایک حکم سنا دیتا۔

"کوئی سوال سمجھ میں نہ آئے تو اسے پھیلا کر حل کرو۔" ابا پڑھاتے وقت مشورہ دیتے تھے۔ تو کیا اس سوال کو بھی پھیلا دوں ___؟ مگر وہ تو میرے پھیلانے سے پہلے ہی ہر طرف پھیل چکا تھا۔ دن رات میرے دماغ میں ایک کلکیولیٹر اس سوال کو سمجھائے جاتا جانے کیوں بعض وقت دماغ میں وہی باتیں بھر جاتی ہیں جن کے تصور سے ہی وحشت ہوتی ہو۔"

آخر سب نے یہ بات طے کر لی کہ میرا دماغ اپنی جگہ سے ہٹ چکا ہے اور ایک دن بڑی آپا نے ابا سے شکایت کی۔

"ابا۔ عامر اسکول کا ہوم ورک نہیں کرتے۔ ہر وقت کتاب بند کر کے جانے کیا سوچتے رہتے ہیں۔"

"کبھی ہمارے خاندان میں تو کوئی جاہل نہیں رہا ہے۔ اگر عامر بڑے ہو کر رکشا چلانا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" ابا بے دردی سے کہہ رہے تھے۔

ہمارے خاندان میں ___ یعنی ابا کا خاندان، جو میرا خاندان نہیں ہے ___؟ میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ میرا رنگ بھی تو ابا سے بہت گورا ہے۔ ابا تو نرے کالے ہیں۔

جب میں بہت چھوٹا سا تھا اور ابا مجھے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے تو پھوپی جان ہنس کر کہتی تھیں۔

"اللہ قسم بھیا۔ اتنا گورا چٹا تمہاری گود میں نہیں سجتا۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ کسی اور کا بچہ اٹھا لیا ہے۔"

اور میں ابا کی گود سے اتر جاتا تھا۔ یوں جیسے کسی غیر کی گود میں چلا گیا تھا۔ سب بہن بھائی مجھے اپنے سے دور دکھتے۔ مجھے چپ چاپ دیکھ کر صابرہ اور بھیا سرگوشیاں کرتے ___ غالباً انھیں بھی یہ کہانی معلوم ہو چکی ہے۔

رات کو کبھی کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا تھا تو میں گھبرا کے اٹھ بیٹھتا۔ جیسے مجھے لے جانے آیا ہو ___ مل گیا ___ مل گیا ___ اور

کسی ممتا بھرے سینے سے لگ جاتا اماں کے سینے میں بھدّے میلے کُرتے سے ناک رگڑ کے رونے لگتا۔

"کوئی روشنی کرو۔ یہ عامر ہی ہے نا ـــــ ؟"

پھر روشنی ہو جاتی۔ پل بھر میں اماں دُور ہٹ جاتیں۔ میری کھلی ہوئی باہوں کو ڈھکیل کر وہ غور سے دیکھتیں ـــ نہیں۔ نہیں۔ کہیں کھوئے ہوئے بچے بھی ملے ہیں اور پھر اماں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتیں ـــ "بیچارا"۔

"کیا ہوا مجھے ـــ؟ کیوں کانپ رہا ہے۔" اماں آنکھیں ملتی ہوئی سوتے سے اُٹھ کر میرے پاس آ بیٹھی تھیں۔

"اماں عامر کو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ جیسے کوئی اسے لے بھاگے گا۔" عابدہ مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھ کر کہتی۔

"میں جو ہوں۔ کسی کو کیوں لے جانے دوں گی۔" اماں نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر تھپکنے لگیں۔

"نہیں، نہیں میں جاؤں گا۔" اماں کا ہاتھ جھٹک کر میں ضد کرنے لگا۔

کہاں ـــ؟ کس کے ساتھ ... ؟ اماں نے تعجب سے پوچھا۔

کہاں ـــ؟ کس کے ساتھ ـــ؟ کہاں ـــ؟ کس کے ساتھ ـــ؟ ساری رات یہ سوال میرے کانوں میں گونجتے۔ ننھے کسی کھوئے ہوئے بچے کو کسی کی مدد کے بغیر ڈھونڈنا کتنا کٹھن کام ہے۔ پھر میں اپنے آپ کو کیسے ڈھونڈوں اکیلے بھولے ہوئے رستوں میں۔ دوڑتی ہوئی بسوں میں۔ بھاگتی ہوئی ریلوں میں۔ ایک دن سڑک پر ایک عورت چھوٹے سے بچے کو گھسیٹتی ہوئی مار مار کے کہیں لئے جا رہی تھی۔

راہ چلتی کسی عورت نے غصّہ سے کہا۔

"اری کیوں اتنی بے دردی سے مار رہی ہے۔ کیا بچہ تیرا نہیں ہے ؟"

کہیں وہ بچہ بھی پٹ رہا ہو گا جو میری بجائے کسی اور ماں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ مائیں دوسروں کے بچوں کو اتنا کیوں مارتی ہیں۔ اماں کو بھی جب مجھ پر غصّہ آتا ہے تو پھر وہ پاگل سی ہو جاتی ہیں۔ شاید انھیں غصّہ آتا ہے کہ میں ان کے گھر میں کیوں آگیا۔ میں جو اپنی ماں سے بچھڑ گیا۔ جو کبھی ایک تھا اور پھر دو ہو گیا ـــ ایک حصہ جو اماں کا ہے۔ اور ایک حصہ جو کسی ٹرین کی سر تہ پر بیٹھا اپنے پیچھے بھاگنے والی دنیا کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ نظروں کے سامنے تیزی سے گزرنے والے چہروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ "میں" کب ملے گا! کب میں ایک ہو سکوں گا۔

ادھر بالکنی پر گھنٹوں ٹہل ٹہل کر میں سوچتا ہوں کہ اچانک کوئی دوڑتا ہوا آئے گا۔ تم یہاں کیسے آ گئے! جاؤ اپنے سکوں میں مل جاؤ۔ اور وہ دوڑتا ہوا میں ہوں گا۔ اور پھر میں ـــ لیکن کیا میں اکیلا ہی انتظار کا یہ دُکھ برداشت کر رہا ہوں اور مجھے کوئی اس عذاب سے چھڑانے نہیں آئے گا۔ مگر وہ بھی تو کھو گیا ہے اپنے گھر سے دور کہیں کسی چلتی ٹرین کے ڈبے میں سو رہا تھا۔ سوتا رہے گا۔ اس ٹرین کی پٹریوں کا انت کہیں نہیں ہے۔ وہ زندگی بھر گھومتا رہے گا۔ پٹریاں بدلتی رہیں گی۔

سیاہ انجن اسے خوفناک غاروں میں، اندھیرے جنگلوں میں اور ہیبت ناک پہاڑوں پر لے جائے گا۔

میں اکثر خواب دیکھتا کہ میں نے ریل کی تمام پٹریوں کا سلسلہ کاٹ دیا ہے۔ تمام دنیا کی ریلیں رُکی کھڑی ہیں۔ مگر وہ بے وقوف سو رہا ہے کوئی اُسے اٹھاتا کیوں نہیں ـــ چل بھاگ اپنے گھر جا ـــ

ایک دن اخبار میں ایک خبر دیکھی میں نے ـــ

"اطہر ـــ تم کہاں ہو ـــ؟ جہاں کہیں ہو فوراً چلے آؤ تمہاری ماں تمہارے لیے سخت بے چین ہیں۔ تم سے کوئی شکایت نہیں کی جائے گی۔"

اچھا! تو [illegible] میرے سیے سے ہے۔ میں نے کئی بار اُٹھا [illegible] اور جھپکے سے [illegible] کی سمت روانہ ہو گیا۔

"[illegible] کیا تھا! میں نے [illegible] پر دستک [illegible] پوچھا۔ مگر وہ سب میرے پھٹے کپڑے، خون ٹپکاتے پاؤں اور گرد آلود چہرے کو دیکھ کر سہم گئے۔

"پاگل ہے ـــ پاگل ہے ـــ اندر آجائے نہیں تو مارنے لگے۔" ایک [illegible] کر سے ہوتے کہا۔

میں مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

سامنے سے ایک [illegible] [illegible] تھا مجھ ساسا مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا ـــ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

[illegible]

دو [illegible]

[illegible] تمہارا [illegible] بار میں بیٹیا ہے۔

[illegible]

[illegible] استقبال کہتے ہیں۔ وہ مجھے پہچان لیں گے۔"

[illegible] اپنے گھر واپس آگیا ہوں۔" اس سے مجھے تنگ بھری نظر

[illegible] نے گردن ہلا کر پوچھا

[illegible]

[illegible] پر غور کیا اور پھر خوشی سے اچھل پڑا۔

[illegible] ہو ــ [illegible] اپنے گھر میں آگئے ہیں۔" اور پھر میں خوشی کے مارے بھاگنے [illegible] تصویریں سچوں کی طرف سے آنے والے بچوں کو [illegible] مجھے دیکھتے ہی پہچان لیے۔ ایسے ملے میں لوگ مجھے دیکھنے ہی [illegible]

[illegible]

[illegible] "میں" مل گیا۔

[illegible] سمجھ کر میں نے سوچا۔

[illegible] اپنے پہچان کے شوق سے لوٹا تھا تو لوگ مجھے [illegible]

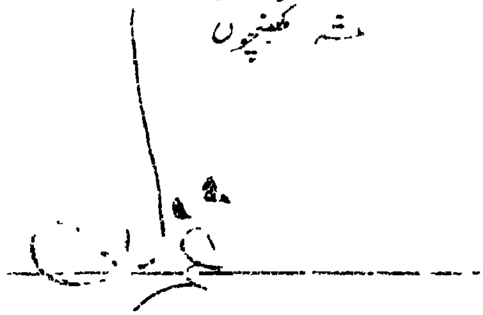
[illegible]

[illegible] تو بھی تمہارا بیٹا آگیا۔ ذرا دیکھو تو اس نے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا۔" لوگوں نے کچھا گود [illegible] دیا۔ [illegible] الله رے [illegible] دونوں ہاتھوں سے میرا چہرا تھام کر غور سے دیکھا تو اچانک یہ [illegible] گیا [illegible] کا مطلب یہ ہے کہ ابھی "میں" نہیں ملا ہوں ـــ؟

میں وہی پیاس ہوں اک سانس میں دریا کھینچوں
تم مجھے دشت نہ دینا کہ بھری وحشت میں
دل کے اسٹیج پہ باقی ہیں ابھی کچھ [illegible]
پیاس ہی پیاس اتر آئی ہے [illegible]
کھینچ لوں دل ترا وحشت [illegible]
دوزخ بھی ساتھ [illegible]

اور بڑھ جاؤں تو دنیا [illegible] تمنا کھینچوں
[illegible] رتی پہ کبھی دامن [illegible] کھینچ [illegible]
[illegible]
[illegible] یہی صحرا کھینچوں
[illegible] کے گریباں ہی اپنا کھینچوں
[illegible] بوجھ اک [illegible] کھینچوں
[illegible] بساطی
[illegible] کھینچوں

رحمٰن جامی



[illegible]

[illegible] جکادی [illegible] سینے کی [illegible]
[illegible]
[illegible] درختوں پہ [illegible] دعا [illegible]
[illegible] سے بھی مگر جب [illegible] کر دیں [illegible]
سفر میں ہر قدم [illegible]
یہ خود ہی کو [illegible]

شفیق احمد

نیچرل شاعری

کسی چیز کو جاننا اور سمجھنا یا پھر اس کو اپنی صحیح شکل میں دیکھنا اور اس کے ذریعے کسی دوسری چیز تک رسائی حاصل کرنا۔ یہ ایک ایسی انسانی جستجو ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی ہے۔ انسانی ذہن ہمیشہ سے حقیقت کی تلاش اور اسرار کی کھوج میں ایک اہم رول ادا کرتا آیا ہے۔ اس لئے ایک اچھا ادیب یا شاعر فلسفی بھی ہوتا ہے۔ جس کا علم فطرت کے رموز کو سمجھنے سے عبارت ہے۔ فطرت اپنے دامن میں اَن گنت سچائیاں لئے ہمارے سامنے جلوہ گر ہے لیکن فطرت کے حسن حقیقی کی پیمائش کرنے کے لئے دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے اور فطرت کے حادواں نغموں کے ذریعہ ذاتِ خدا اور مقاماتِ بشر کی تفسیر کی سماعت کے لیے گوشِ نیوش کی ضرورت ہوتی ہے فطرت کا ہر نقش، ہر رنگ، ہر روپ اپنے اندر ہزاروں اسرار لیئے سامنے آتا ہے۔ ایک شاعر اپنے لئے فطرت کے اس بسیط دامن سے کیا، کتنا اور کس حد تک سمیٹ سکتا ہے اس کا انحصار اس کی اپنی دلچسپی اور صلاحیت پر ہے اور جو کچھ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ عام آدمی تک پہنچاتا ہے اس کا انوکھا اور منفرد ہونا ضروری ہے۔ شاعری کی عظمت کا راز اس امر میں چھپا ہوا ہے کہ اس کی پیش کردہ چیز اپنے انوکھے پن اور انفرادیت کے ساتھ قاری یا سامع کے ذہن پر کس قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتی ہے اچھی شاعری ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتی ہے ورنہ جوش کے اس شعر کو بھلائے ایک زمانہ بیت گیا ہوتا۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے　　اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اب ہم یہ دیکھیں کہ شاعر فطرت کی تہوں کو کس طرح کھولتا جاتا ہے اور تخیل اُسے کہاں سے کہاں اُڑائے جاتا ہے۔ شاعر اپنے آپ کو دیکھی جانے والی شئے کی ذات سے منسلک کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ کبھی طائر بن جاتا ہے تو کبھی پھول یا شجر کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنا وجود کھو کر کسی حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے فرض کیجئے کہ آپ سیر کے لیے نکلتے ہیں۔ راستہ میں ایک ندی ملتی ہے جو اطراف و اکناف کی چیزوں سے بے پروا ایک سمت میں بہہ رہی ہے۔ دل چاہے گا کچھ دیر اس ندی کے دلنشیں نظارے سے لطف اندوز ہوا جائے۔ کچھ دیر بعد آپ کا طفلانہ لطف اندوزی آہستہ آہستہ گہری اور سنجیدہ تر ہو جاتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں شاعر کی سوچ اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ بہتے پانی کا سماں آپ کے ذہن کو اپنی مکمل گرفت میں لے لیتا ہے۔ آپ اپنے وجود کو اس ندی کی گہرائی میں ڈوبتا محسوس کرتے ہیں۔ اور جب آپ مکمل طور پر اس ندی ہی کا ایک حصہ بن جاتے ہیں تو اک نیا آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں یہی آہنگ الفاظ کی مجسم شکل میں شاعرانہ طور پر صفحۂ قرطاس پر ڈھلنے لگتا ہے۔ بہتی ندی کی اس مثال کو میں تین حصوں میں تقسیم کئے دیتا ہوں۔ میری رائے میں یہ تین حصے ایسے تین مرحلے ہیں جن سے

ئز کر شاعر بنتا ہے۔

پہلا مرحلہ : آپ کی نظر بہتے پانی پر پڑتی ہے۔ بعد میں یہی پانی آپ کا موضوع سخن بن جاتا ہے۔

دوسرا مرحلہ : اب آپ کی نظر اس پانی کے اندر سرایت کر جاتی ہے جب آپ کا وجود کھلی فضا سے نکل کر ندی کی عمیق گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ ہم اس عمل کو انگریزی میں To look in to a thing کہیں گے۔

تیسرا مرحلہ : یہ آخری مرحلہ ہے جہاں پر آپ کی نظر پانی کے اندر سے گزر کر کسی ٹھوس چیز پر پڑتی ہے۔ یہ آپ جس کو حقیقت کہتے ہیں۔ ہم اس عمل کو انگریزی میں To look Through a thing کہیں گے اور یہ حقیقت جس روپ میں آپ پر ظاہر ہوکر آپ کو متاثر کرتی ہے اس کی تصویر کشی آپ اپنی قوت مدرکہ کی مدد سے سہل الفاظ میں شاعرانہ طور پر کرتے ہیں۔ یعنی یہی شے الفاظ کی پوشاک میں سج دھج کر اپنے البیلے پن اور انفرادیت کے ساتھ قاری یا سامع کے ذہن کو متاثر کرتی ہے۔

اسی مثال کو سامنے رکھ کر میں یہاں پر صرف ایک حقیقت کی طرف اشارہ کردوں تو اس ساری گتھی کا حل بھی سامنے آجائے گا۔ میری رائے میں بہتا ہوا پانی زندگی کی ایک بڑی حقیقت کا غماز ہے اور یہ حقیقت ہے " تبدیلی " ہماری زندگی ایک بہتی ندی کی طرح ہے جو ہر دم اک نئی تبدیلی کا شکار ہوتی رہتی ہے۔

یونانی فلسفی دیمیطرس (Democritus) نے دیہاتیوں کے کنویں میں جھانکنے کی عادت پر ایک بصیرت افروز تبصرہ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ دیہاتی کنویں میں جھانک کر اس چیز کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جس تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔ اس نے واضح الفاظ میں یہ بھی کہا تھا کہ کنویں کی تہہ میں، یعنی پانی کے بہت نیچے، کوئی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ اسی بات کا سہارا لے کر امریکی شاعر فراسٹ (Frost) نے ۱۹۲۰ء میں ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان ہے For once, Then, something اس نظم کو اس کے Under tones اور overtones کو مد نظر رکھتے ہوئے جانچیں تو معلوم ہوگا کہ آدمی اپنی انا سے پرے کچھ اور دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو جدائی خصوصیات کا پرتو سمجھنے لگتا ہے۔ کبھی ایسا لمحہ بھی اس کی زندگی میں آتا ہے جب اتفاقاً وہ کسی کنویں کی تہہ میں چھپی ہوئی کوئی غیر یقینی، پراسرار سی سفید چیز دیکھ لیتا ہے جب اپنی خودی کے پردے کو چاک کرتے ہوئے اس کی نظر کچھ زیادہ گہرائی میں اتر جاتی ہے تو اس قسم کے حواس خمسہ سے باہر کا تجربہ یعنی Transcendental experience اس کو حاصل ہوتا ہے، تب ہی وہ کسی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا تجربہ صرف آنکھیں رکھنے والے ذہن کے ہی حصے میں آتا ہے۔ ورڈسورتھ (Wordsworth) نے کس قدر سچ کہا ہے کہ ذہن تخیلہ یعنی "perceptive mind" جو کچھ دیکھتا ہے اس کی تخلیق نصف حد تک کر دیتا ہے۔ جس کی صراحت ہمیں طویل نظم Tintern Abbey میں ملتی ہے۔ انا کا شکار ورڈسورتھ جب بھی فطرت پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے پیش نظر یہی ایک اہم بات ہوتی ہے کہ اس کا ذہن فطرت کے اثرات کو قبول کر کے اس کا ردعمل کس طرح کرتا ہے؟ ایسی حالت میں اس کے شعور کا دھارا

کس طرح ہوتا ہے ؟ فراسٹ فطرت کی حقیقی تصویر کشی کو ہی اپنے فن کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھتا ہے۔ میری رائے میں یہی خصوصیت اس کی شاعری کی ایک بہت بڑی خوبی بھی ہے۔ جو کچھ فراسٹ کے ذہن میں ہوتا ہے اس کو وہ باہر کھینچ لاتا ہے تاکہ موضوع کو معروض بنایا جاسکے۔ اس بات کی تشریح فراسٹ اپنے دوست سڈنی کاکس (Sidney Cox) کو مرقومہ ایک خط میں کرتا ہے اس کا یہ جملہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

"A subject must be an object"

یعنی موضوع کو معروض ہونا چاہئیے۔ دنیا کی تباہی کی بابت فراسٹ اپنے ذہن میں پیچھے خوف یا اندیشہ کو اپنی نظم Fire and Ice میں اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ اس نظم میں شعلہ اور برف استعاراتی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ نظم ایک پیشن گوئی کی صورت میں سامنے آتی ہے کہ [illegible] شعلہ [illegible] سے دنیا کی تباہی کا قیاس کیا گیا۔

دنیا [illegible] جمال [illegible] ظاہری اشیائے ارضی مثلاً کوہسار، جھیل، پھول یا شجر کا انسان کی داخلی زندگی اور ان [illegible] بڑی ہی خوبصورتی سے ظاہر کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے یہ احساس بعض اوقات اتنا شدید تر ہو جاتا ہے کہ شاعر اپنے آپ کو فطرت کا ایک لازمی جز تصور کرنے لگتا ہے حتیٰ کہ اشیائے فطرت کی ہمہ رنگی خصوصیات کو بھی تخیلی طور پر اپنے لیے حاصل کر لینا یا ان کا اپنی ذاتی خصوصیات سے مماثلت پیدا کر لینا بعید از قیاس نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ عیش و طرب کی زندگی سے بیزار [illegible] طبیعت کا حامل شاعر عموماً شہری زندگی کی یکسانیت کو خیرباد کہہ کر دیہاتی زندگی کی دل فریب رنگینیوں میں خود کو گم کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ [illegible] کا مقصد فطرت کے اسرار کو سمجھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ فطرت کے انسانی ذہن پر مرتسم ہونے والے اثرات اور انسانی [illegible] ہونے والے خیالات کا تقابل کرنا بھی شاعر کا فریضہ بن جاتا ہے۔ ایسا شاعر تخیل کی خودمختاری یعنی "Autocracy of [illegible]" پر کامل یقین رکھتا ہے۔ فطرت کی اپنی ترتیب و تزئین میں داخلی اندازی [illegible] فطرت اور اس کی حقیقتوں کی پیغام رسانی ہمہ تن مصروف ہو جاتی ہیں۔ کوئی شاعر فطرت سے [illegible] کسی شاعر کا نصب العین فطرت کے حسن کو ہی نہیں بلکہ اس دوسرے پہلو [illegible] کرنا ہوتا ہے۔ یہاں پر ہم کولرج (Coleridge) کا نام لے سکتے ہیں کوئی شاعر کیٹس کی طرح [illegible] تخیل ذہنی طور پر اس کو تسلیم کرتا ہے۔ کوئی شاعر فطرت کو جذبات سے ہم آہنگ کرتا ہے جیسا کہ بائرن جو فطرت کو بحالت سکون اور بحیثیت غیض و غضب پیش کرتا ہے۔ اردو زبان کے کئی شعرا نے فطرت کی حقیقی اور بھرپور عکاسی کی ہے اور مناظر قدرت میں ڈوب کر اس کے حسن کو اپنے افکارات میں سمویا اور سمیٹا ہے مثلاً

جوش — نظر آئی نہیں تو نے کبھی آئین فطرت پر ؛ کیا ہے آج تک شعلے نے برگ یاسمن پیدا "زوال جہانبانی"

" — جس کی لپٹ سے گلشن سارا مہک رہا ہے ؛ جاتی ہے نشتر سے یہ خاک مسکرا کر "زندان مثلث"

مختار — پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی ؛ نیم شب کی خاموشی میں زیر لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی ؛ وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

- - - - - -

ایک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں ؛ جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

مجازؔ۔
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر ✣ دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی ✣ شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

- - - - - - - - -

زد میں کوئی چیز آجائے تو اسکو پیس کر ✣ ارتقائے زندگی کا راز بتلاتی ہوئی　　"رات اور ریل"

اختر شیرانی۔
گلِ فسردہ بھی اک طرفہ حسن رکھتا ہے ✣ خزاں یہ ہے تو مجھے حسرتِ بہار نہیں

احمد ندیم قاسمی۔
غروب ہو کے بھی سورج کہیں طلوع ہوا ✣ اگر غروب ہی ہے سرزمینِ طلسمِ غروب
اگر غروب مسلسل ہے روز و شب پہ محیط ✣ تو کیوں طلوع سے کردی گئی سحر منسوب　　"رم جھم" سے

―――

" ۔ خدا سے ایک خامی رہ گئی ہے ✣ نظامِ گردشِ سیارگاں میں
وہاں لطفِ تصادم ہی نہیں ہے ✣ ستارے مر رہے ہیں آسماں میں　　قطعہ "رم جھم" سے

―――

" ۔ ان بھیانک جلی چٹانوں میں ✣ زندگی کا سراغ پاؤں گا
ہم سفر تو ٹھہر تلہٹے تو ٹھہر ✣ میں تو ان چوٹیوں پہ جاؤں گا　　قطعہ "رم جھم" سے

―――

ابن انشاء
یہ پتیوں پہ بکھرے شبنم کے سبز ہیرے ✣ ٹھنڈی ہوا کا چلنا گلشن میں دھیرے دھیرے
یہ نیلگوں فلک یہ سیال ابر پارے ✣ ٹھہرا ہوا سمندر بہتے ہوئے جزیرے　　"تار گریباں" سے

―――

" جون کا تپتا مہینہ، تمتاتا آفتاب ✣ ڈھل چکا ہے دن کے سانچے میں جہنم کا شباب
" دوپہر اک آتشِ سیال برساتی ہوئی ✣ سینۂ کہسار میں لاوا سا پگھلاتی ہوئی
" وہ جھلستی گھاس، وہ پگڈنڈیاں پامال سی ✣ نہر کے لب خشک سے، ذروں کی آنکھیں لال سی
" چلچلاتی دھوپ میں میدان کو چیرتا بخار ✣ آہ کے مانند اٹھتا ہلکا ہلکا سا غبار
" دیکھ وہ میدان میں ہے اک بگولا بیقرار ✣ آندھیوں کی گود میں ہو جیسے مفلس کا مزار　　"تار گریباں" سے

انیس نے بھی اپنے مرثیوں میں منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی کے اچھے نمونے اردو ادب کو دیے ہیں۔ شاعر خواہ کسی دور کا ہو، نیچر سے اس کو مفر نہیں۔ دورِ حاضر اگرچہ سیاسی، سماجی اور معاشی انقلابات سے دوچار ہے با ایں ہمہ آج کا شاعر بھی حسنِ فطرت کی تصویر کشی میں اپنے پیش روؤں سے پیچھے نہیں۔ مثلاً علی احمد جلیلی نے شب کی ظلمت میں چمکنے والے تاروں اور شبنم کے دامن میں کھلنے والے لالہ و گل کو اپنے ایک قطعہ کا موضوع یوں بنایا ہے ؎

ظلمتیں جس قدر جوان ہوئیں ✣ اور بھی کچھ سنور گئے تارے

بھیگی راتوں کی اداس پی پی کر ✽ بن گئے کتنے پھول انگارے (شہر تمنا سے)

فطرت نگاری کی یہ روایت جو نظموں کی میراث رہی ہے اب دور حاضرہ کی غزلوں میں بھی بڑی حد تک سرایت کر رہی ہے اور اس طرح غزل کی دلکشی میں اضافہ کا باعث بن رہی ہے بعض شاعروں نے غزل میں اس رجحان سے یوں فائدہ اٹھایا ہے ... محبوب کا سراپا پیکر نیچر کی علامت سے مربوط ہو گیا ہے۔ اور کہیں فطرت کے مظاہر مختلف جذبات اور کیفیات کے ترجمان بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

سناٹا ہے کوئی بھولی کہانی
مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی (ناصر کاظمی)

ہوا چلی تو جاگے جنگل
ناؤ چلے تو دریا جاگے (")

راتوں کو کلی بن کے چٹکتا تھا ترا جسم
دھوپ کے بھیس میں چلی آئی نسیم سحری بھی (مصطفیٰ زیدی)

آنکھ جھپک جاتی ہے جب بند قبا کھلتے ہیں
تجھ میں اٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے (")

دھوپ کی تپتی لذت کے شیدائی ہیں
یہ اشجار بھی خواب سے جو ملک پڑے سے ہو گئے (شہریار)

خشک پتوں سے بھر لیتی ہیں سانپیں دامن
کس نے یادوں سے جدائی ہے یہاں دل کے سوا (بشیر نواز)

دل سے نکلا نہ خراش غم ایام کی دھوپ
تیرے ناخن سے کئی چاند بنائے ہم نے (سلیمان اریب)

بند از ہو ہو تری آواز پا کا ...
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا (احمد ندیم قاسمی)

مری مثال کہ اک نخل خشک ... ہوا
ترا خیال کہ بشارت چمن کا ... تو (احمد فراز)

دوڑتے خون کی اک لہر بہت کافی ہے
شفق شام کو اتنی بھی ضیا کیوں آ گئے (شہزاد احمد)

کیا نہ ہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں پانی کی جہاں دھار گرے (شکیب جلالی)

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا (خلیل الرحمن اعظمی)

یہیں کہیں یہ کبھی شعلہ کار میں بھی تھا
شب سیاہ میں اک چشم ... میں بھی تھا (ساقی فاروقی)

یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے (احمد مشتاق)

فضا میں دور تک اڑتے ہوئے پرندے ہیں
چھپا ہوا میں کہیں ان کے بال و پر میں ہوں (محمد علوی)

... کو بکھرنے کو تڑپتی ہے ترا دم
مجھ میں مضمر ہے کوئی چیز سمندر جیسی (پرکاش فکری)

پھر شام کی پلکیں جھکنے لگیں ... کی سانسیں رکنے لگیں
بستی سے جو واپس آ نہ سکے جنگل کے وہ طائر یاد آئے (شاذ تمکنت)

خشک پتوں پہ اپنا نام لکھیں
بین کرتی ہوا کے ساتھ چلیں (مصحف اقبال توصیفی)

... صبح اٹھتے ہیں سناٹے رات کو
جنگل بچھے ہوئے ہیں دلوں پہ جہاں سے شہر (عزیز قیسی)

... صفحۂ ابر رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے نکلا (باقی)

ریت میں ... کشتیاں بھی ریت کی غلافی ہیں
بادلوں سے نیچے تو بھی پا بہ جولاں ہو (شمس الرحمن فاروقی)

کیا نہ خاموش جا رہا تھا کہیں
ہم نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی (محمود ایاز)

ڈاکٹر حسینی شاہد

نیرؔ کا نگار خانۂ شعر

ایک زمانہ تھا کہ شاعر بڑی حسرت سے کہتا تھا کہ

" میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں "

لیکن آج حالات بدل چکے ہیں اور شاعر بڑے ٹھاٹ کے ساتھ ہر دوسرے تیسرے سال ایک نیا مجموعۂ کلام اپنے قدردانوں کی خدمت میں بطور سوغات پیش کرتا ہے اور اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ صلاح الدین نیرؔ بھی انھیں خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۹ء تک ان کے تین مجموعے "گلِ تازہ" "زخموں کے گلاب" "صنم تراش" چھپ چکے ہیں۔ "شکن در شکن" زیرِ طبع ہے، ان کے علاوہ ان کی غزلوں کا تلگو ترجمہ "نیرؔ گیتالو" بھی شائع ہو چکا ہے۔ توقع ہے کہ ان کے پچھلے تین مجموعوں کی طرح چوتھا مجموعہ بھی ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

نیرؔ سے میرا رشتہ پرانا ہے، لیکن یہ رشتہ شاعر اور قاری/سامع کا نہیں، استاد اور شاگرد کا ہے۔ میں کیا استاد ثابت ہوا یہ تو نیرؔ بتا سکیں گے، لیکن میں نے انھیں ایک ذہین، شائستہ، صاحب ذوق اور سعادت مند شاگرد پایا۔ بیس بائیس سال بیت گئے لیکن ان کی سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس وقت وہ ایک مبتدی تھے، مشقِ سخن کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا لیکن آج ان کا شمار حیدرآباد کے مقبول شاعروں میں ہوتا ہے۔ ادبی حلقوں میں انھوں نے اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ عوام انھیں پسند کرتے ہیں اور شہر حیدرآباد ہی میں نہیں آندھرا پردیش کے اضلاع میں بھی کوئی چھوٹا بڑا مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جہاں ان کی آواز کانوں میں رس نہیں گھولتی۔ آندھرا پردیش کے باہر بھی انھوں نے کئی مشاعرے لوٹے ہیں، ہندستان اور پاکستان کے رسائل میں ان کا کلام چھپتا ہے یعنی ایک مبتدی سے مقبول اور مستند شاعر بن گئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی سعادت مندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس سے ان کی وضعداری، شرافت اور شائستگی کا پتہ چلتا ہے، وضعداری، شرافت اور شائستگی شخصیت اور فن دونوں کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔ نیرؔ اس گُر سے خوب واقف ہیں

مشق سخن کے ساتھ چکی کی مشقت حسرت کے حصے میں آئی تھی اور نیرؔ کو نوکرشاہی کے مشین کی گھڑگھڑاہٹ میں فکرِ سخن کا عذاب خود مول لینا پڑا۔ لیکن وہ خندہ پیشانی کے ساتھ یہ عذاب کئی سال سے جھیلے جا رہے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان کی شعریت اور نغمگی اس ناشاعرانہ اور ناسازگار ماحول کے باوجود ابھرتی، نکھرتی اور سنورتی جا رہی ہے اور الل فیتے کا یہ قیدی

حیدرآباد کے خوش گو، خوش فکر اور خوش گلو شعراء میں ممتاز ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ خلوت در انجمن کا رمز ان پر منکشف ہو چکا ہے اور باہمہ و بےہمہ کے اسرار ان پر کھل چکے ہیں۔ یہ ایک عطیۂ الٰہی ہے جو صرف صوفی اور حسن کار کو عطا ہوتا ہے۔

وہ دن بھر سکریٹریٹ میں فائل گردی میں مصروف رہتے ہیں۔ دفتر کے اوقات سے پہلے اور بعد میں جو وقت مل جاتا ہے وہ ادبی ٹرسٹ کے کاروبار میں گزر جاتا ہے۔ رات کی ابتدائی ساعتیں مدینہ ہوٹل کے ایک گوشے میں دوست احباب کے ساتھ خوش گپیوں میں بیت جاتی ہیں۔ چھٹیاں مشاعروں کے اہتمام اور ادارۂ مجلس کے ماہانہ اجلاس کی تیاریوں کی نذر ہو جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود جب مشاعرے میں آتے ہیں تو تازہ غزل ان کی جیب میں ہوتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ شعر کہنے کے لئے کب وقت نکال لیتے ہیں۔ پھر وہ کم گو نہیں پُر گو ہیں۔

نیّر غزل کے شاعر ہیں۔ ویسے انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ آزاد اور پابند دونوں ڈھنگ کی نظمیں کہنے پر وہ قادر ہیں، ان کے ہاں مختلف موضوعات اور مسائل پر نظمیں ملتی ہیں لیکن ان کی وہی نظمیں کامیاب ہیں جن کا رنگ و آہنگ رومانی ہے۔ انھوں نے نعتیں اور منقبتیں بھی کہی ہیں اور اچھی کہی ہیں۔ احساس اور جذبہ کی شدت ہی شعر میں جادو جگاتی اور تاثیر پیدا کرتی ہے لیکن نعت اور منقبت میں تو یہی سب کچھ ہے۔ اس کمی کو زبان، اظہار اور اسلوب کے طلسم سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ نیّر نے نعت اور منقبت جذبۂ عقیدت میں ڈوب کر ایک عالمِ سرشاری میں لکھی ہے۔

نیّر نے بھی دوسرے غزل گو شعراء کی طرح اپنی شاعری کا آغاز روایاتی مضامین سے کیا لیکن جب انھیں شعر گوئی کا سلیقہ آ گیا تو آپ بیتی سنانے لگے۔ اپنے تجربات و مشاہدات اور اپنی واردات و کیفیات کو غزل کے سانچوں میں ڈھالنے لگے۔ یہیں سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہونے لگا اور ان کا لب و لہجہ پہچانا جانے لگا۔ ان مرحلوں سے ہر ایک شاعر گذرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو پا لیتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ نیّر نے اپنے آپ کو پا لیا ہے۔ یہ بڑا طویل اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے اور اس سے گذرنے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اس راہ پر چل پڑے ہیں اور ان کی شاعری میں کیفیاتی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند علامت ہے۔

"گُلِ تازہ" سے "قلم تراش" تک اپنے ہر مجموعے کو نیّر نے گُلِ تازہ کے نام معنون کیا ہے، اس لئے کہ خود ان کے قول کے مطابق وہ ان کا سرمایۂ شاعری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی وضعداری کو برقرار رکھنے کے لیے وہ چوتھا مجموعہ بھی اسی کے نام معنون کریں۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں رہی۔ گُلِ تازہ اب اپنا علاحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ وہ ایک علامت بن گیا ہے، پاکیزگیٔ عشق کا، طہارتِ نفس کا، لب و رخسار کا، رسن و دار کا، نشاطِ غم کا، دلبری و دلداری کا، تشنگی و ناآسودگی کا، دل سوزی و جگر کاری کا، انسان دوستی اور انسان پرستی کا، ایک روشن پسند بہار آفریں مستقبل کا، جس سے نیّر کا نگارخانۂ شعر جگمگا رہا ہے۔

کیا شہر تھا کس طرح سے برباد ہوا ہے ؛ قاتل کے سوا شہر میں اب کون بچا ہے
آسودگیٔ تشنہ لبی کس کو ملی ہے ؛ صدیوں سے جو پیاسا ہے وہ پیاسا ہی رہا ہے

صلاح الدین نیّر

حامد مجاز

اِسکِڈ
SKID

پگھلتی برف کی کیچڑ میں لت پت
زمینوں کو پکڑنے کی سعی میں
میرے جُوتے
اُدھر آگے کوئی ہے کھائی گہری
جہاں گردش لہو کی جم رہی ہے
بڑے رُک کر قدم اُٹھتے ہیں میرے

سُبک رفتار، اُجلی کار کی مانند
میں اِسکِڈ کیسے ہو جاؤں
اچانک کیسے مر جاؤں ؟!

o

التماس

سبو سے ہونٹ سی لو
تشنگی کے جام بھر لاؤ
سجا کر کرچیاں آؤ
مرے چہرے سے گردِ خواب — جھاڑو
مجھے احساس کی سُولی پہ لٹکاؤ!

فرحت قادری

غزل

چھپے گا دُشنۂ آئینۂ ہنر کب تک
انا کا بوجھ اُٹھائے پھرے گا سر کب تک
شبِ سیاہ کی پروردہ اَدھ کھِلی کلیاں
رہیں گی اپنی ہی خوشبو سے بے خبر کب تک
دھواں سی رات کا جادو بھی ختم ہوگا کبھی
رہے گی دُھند میں لپٹی ہوی سحر کب تک
نہ عکسِ ذات کہیں ہے نہ منظروں کا حصار
یوں ہی بھٹکتی پھرے گی مری نظر کب تک
گھٹی گھٹی سی فضاؤں کا ٹھنڈی سانسوں کا
رہے گا لمبی سُرنگوں میں مستقر کب تک
زمیں پہ آ کے ذرا میرے پاس بیٹھو بھی!
اکیلے بھٹکو گے تم آسمان پہ کب تک
نہ کوئی موڑ نہ سایہ نہ عکسِ منزل ہے
بنا رہوں گا میں آذوقۂ سفر کب تک

عوض سعید

گیندے کے پھول

ممکن ہے آپ نے اس منحنی قسم کے خوب صورت نوجوان کو نہ دیکھا ہو۔ لیکن میں ہر روز شام اُسے مارکٹ کے نکڑ پر دیر تک ٹھہر کر ایک ننھی منی لڑکی کے ہاں سے گیندے کے پھول خریدتے ضرور دیکھا ہے۔ مارکٹ کے برابر ہی میری کتابوں کی دکان تھی جہاں وہ کبھی کبھار نئی کتابوں کی تلاش میں آ نکلتا تھا اور جب میں کبھی نفی میں جواب دیتا تو وہ بجھ سا جاتا۔

اکثر وہ مجھے چھ اور سات بجے شام کے درمیان نظر آتا۔ لڑکی اُس کے انتظار میں کھڑی ہوتی اور وہ اس کے گالوں کو محبت سے تھپتھپاتا۔ کوٹ کی جیب سے پیسے نکال کر اس کی ننھی منی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ اور گیندے کے گجرے اس سے لے لیتا۔ اور بہت سی لڑکیاں اور لڑکے چنبیلی اور موتیا کے گجرے لئے کھڑے ہوتے۔ لیکن اس کے قدم کسی کے پاس نہ رکتے۔ وہ بڑی بے نیازی سے ان لڑکیوں کے سامنے سے بھی گزر جاتا تھا جن کی جوانیاں اب پک چکی تھیں۔ لیکن مارکٹ کے قریب آتے ہی اس کے قدم غیر شعوری طور پر پھر اس لڑکی جانب مڑ جاتے جہاں نکڑ پر وہ گیندے کے پھول لیے کھڑی ہوتی۔

پتہ نہیں اُسے گیندے کے پھولوں سے اتنا اُنس کیوں تھا۔ حالاں کہ گلاب اور موتیا کے آگے گیندے کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ پھر نہ خوشبو اور نہ مہکار۔

کبھی کبھار جب لڑکی کے پھول بالکل ہی نہ بکتے تو وہ زیرِ لب مسکراتا ہوا سارے پھول اس سے خرید لے جاتا اور لڑکی مسرت سے گرتی پڑتی فضا میں جیسے اُڑ سی جاتی۔ اور وہ دھیرے دھیرے آگے نکل جاتا۔ ایسے میں وہ بڑا خوبصورت لگتا۔ اس کے ہونٹوں کے باریک خطوط قدرے کھل جاتے اور مسکراہٹ کی ایک حسین سی لکیر سارے چہرے پر پھیل جاتی۔

میں دکان پر بیٹھا بیٹھا اس اجنبی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے کردار کے تار و پود کچھ اتنے بکھرے ہوئے تھے کہ مجھے انھیں سمیٹ کر یک جا کرتے ہوئے بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اگر لڑکی جوان ہوتی اور وہ اس سے پھولوں کے گجرے خریدتا تو میں بہ آسانی بھانپ جاتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ لڑکی عمر میں چھوٹی تھی۔ کوئی آٹھ دس برس کی ہوگی۔ رنگ قدرے سانولا ہی سا تھا لیکن آنکھیں بڑی ہی خوب صورت اور نشیلی تھیں۔

وہ کسی کہانی کے شہزادے کی طرح دھیرے دھیرے بانکپن سے چلتا ہوا پھولوں والی شہزادی کے قریب آ کر اسے محبت بھری نگاہوں سے گھورتا اور پھول لیتے ہوئے اس کے گالوں کو محبت سے تھپتھپاتا۔

لڑکی ہاتھ میں گیندے کے گجرے لیے اُسے چپ چاپ معصومانہ نگاہوں سے ٹکر ٹکر دیکھتی۔ پھر وہ اپنی جیب سے پیسے نکال کر اس کی ننھی منی ہتھیلی میں تھمادیتا اور وہ خوشی سے اٹھلاتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوتی۔

اس کے ساتھ والی لڑکیاں جو سریں اس سے بڑی تھیں دل ہی دل میں جل اُٹھتیں۔ اور وہ لڑکی کو رفتار کی دُھند لاہٹوں میں غائب ہونے تک گھورا کرتا۔

اس کے ہاتھ میں گیندے کے پھول ہوتے، بعض وہ سونگھتا ہوا آگے نکل جاتا۔ وہ ہمیشہ تنہا گھوما کرتا۔ میں نے اُسے کبھی دوسروں کے ساتھ گھومتے نہیں دیکھا۔ جیسے اُسے اس دنیا میں کسی سے تعلق ہی نہ ہو۔

ایک صبح دکان کھول کر کتابوں پر اٹی ہوئی گرد کو صاف کر رہا تھا کہ وہ آدھمکا۔ میں نے ہمہ تن اشتیاق بن کر مودبانہ انداز میں اس سے پوچھا۔ "کیا چاہیے آپ کو؟" "چاہیے تو بہت کچھ۔ پہلے یہ بتائیے کہ کچھ نئی کتابیں آپ نے منگوائی بھی ہیں؟"

اس کی گفتگو سے طنز کا ہلکا سا عکس صاف جھلک رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"آپ نے دکان تو کھول رکھی ہے لیکن نئی کتابیں منگوانے کا شعور نہیں۔"

"چند نئی کتابیں آئی ہیں۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔ اور اس کے سامنے نئی کتابوں کی فہرست رکھ دی۔

"ہونہہ" اس نے عجیب طرح سے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "کون پڑھتا ہے ان کتابوں کو؟"

مجھے اس کے اس جملے سے بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری دکان کے ساتھ دوسرے گاہکوں کی بھی تذلیل کر رہا ہے۔

"ان کتابوں کو پڑھنے والے بھی انسان ہیں۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"میں اُن انسانوں میں سے نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر وہ جھٹکے سے دکان سے اتر پڑا۔

پھر کچھ قدم جانے کے بعد وہ یکایک پلٹا۔ جیب سے قلم نکالا اور کہا۔ "کاغذ رکھتے ہیں آپ؟"

مجھے پھر ایک بار محسوس ہوا جیسے وہ میری توہین کر رہا ہے۔

"جی" میں نے سرپور پیپر ملز کا پیڈ اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

اُس نے اپنی پسند کی کتابوں کے نام اس پر لکھ دیئے۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے غور کیا۔ واقعی اس کی برہمی بجا تھی۔ کتنی بار اس نے نئی کتابوں کی فرمائش کی اور نفی میں سرہلانے کے سوا کوئی جواب بھی تو نہیں دیا تھا میں نے۔ لیکن وہ اپنی پسند کی کتابیں اور دکانوں سے بھی خرید سکتا ہے پھر ایسی کتابیں کون دکان میں لاکر رکھے جن کی عوام میں مانگ ہی نہ ہو۔ ہر شخص اس کی طرح ثقہ مذاق کا مالک تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

ایک دن دوپہر ہی سے طوفانی بارش نے یوں زور پکڑا کہ قیامت ہی آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کے سینے کو کسی نے برچھیوں سے چھید دیا ہو۔

جن دکانوں کے رخ بارش کی سمت تھے وہ جلد جلد بند ہونے لگیں۔ سب دکانداروں نے ایک ایک کر اپنے اپنے کواڑ بھیڑ لیے۔ مارکٹ کے سامنے پھولوں کے گجرے فروخت کرنے والی لڑکیاں سائبان کے نیچے دبکی ہوئی ٹھٹھر رہی تھیں۔ میں نے لڑکیوں کے اس گروہ میں اس معصوم لڑکی کو بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ کچھ دیر بعد

اس نے گھڑی دیکھی۔ چھ بج چکے تھے لیکن بارش کا زور ابھی کم نہ ہوا تھا۔

میں نے دکان کے پٹ کو آہستہ سے کھولا اور مارکٹ کے چوراہے کی طرف دیکھا۔ تو حیرت میں ڈوب سا گیا۔ وہ ننھی قسم کا جوان پھولوں والی لڑکی کے انتظار میں بارش میں بھیگتا ہوا کھڑا تھا۔

ٹین شیڈ کے نیچے سے ایک لڑکی چیختے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ بے کار بھیگ رہے ہیں بابو۔ وہ آج بارش کی وجہ سے نہ آسکے گی۔"

وہ چپ چاپ یوں ہی کھڑا رہا۔ جیسے وہ اب گیندے کے پھولوں کے بغیر گھر نہ جا سکے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ننھی منی سی لڑکی ہاتھ میں گیندے کے پھول لیے بارش میں لت پت دوڑتی ہوئی اس کی طرف آ رہی تھی۔

"مجھے آج دیر ہو گئی بابو معاف کر دیجئے۔ دیکھئے بارش کتنی سخت ہو رہی ہے میں آپ کے لیے گیندے لائی ہوں۔"

وہ اس سے بے طرح لپٹ گیا۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔" اس نے اس کے ہاتھ سے گیندے کے گجرے لے لیے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گالوں کو ہلکے انداز میں تھپتھپایا۔ اور روز کی طرح آگے بڑھ گیا۔

میں سوچنے لگا کیا محبت اتنی بے محابا اور عظیم ہو سکتی ہے کہ ایک خوب صورت نوجوان، ایک چھوٹی سی غریب لڑکی کے لیے بارش میں بھیگتا ہوا اس طرح انتظار کرے؟ نہیں وہ کسی نفسیاتی عارضے کا شکار تو نہیں۔

ایک دن میں نے اپنے ایک دوست سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ اس نے بڑی دلچسپی کے ساتھ میری ساری باتیں سنیں۔ اس کی زندگی میں شاید پہلا واقعہ تھا جو اپنے دامن میں ایک عجیب و غریب قسم کی گمبھیرتا لیے ہوئے تھا۔ اس نے کافی دیر سوچنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں کہا۔ " ایسے آدمی عموماً کسی نہ کسی نفسیاتی بیماری کے شکار ہوتے ہیں یا خبطی ۔"

مجھے اپنے دوست کی پہلی بات میں کچھ وزن دکھائی دیا۔

پھر ایک شام میں نے دیکھا۔ پھولوں والی شہزادی سڑک کے کنارے اداس کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا آخری گجرا ہوا کے ہوئے کانپ رہا تھا جیسے وہ اسے جلد سے جلد اپنے محسن کے ہاتھ میں تھما کر گھر جانے کے لیے بے چین ہو۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ پھولوں کے گجرے بیچنے والی سب لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں اور وہ تنہا اپنے محسن کے انتظار میں کھڑی تھی۔

میں دکان کے دونوں پٹ بند کر کے واپس آیا۔ تالا لگا کر ایک بار زور سے کھینچا۔ جب پوری طرح اطمینان ہو گیا تو میں نے کندھے پر پڑے ہوئے کوٹ کو سیدھا کر کے پہن لیا۔ میں ایک دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ مجھے دور سے اس نوجوان کی چیخ سنائی دی۔ " شہزادی ٹھہرو میں آ رہا ہوں۔"

تم نے میرا تھوڑا سا بھی انتظار نہ کیا۔ دیکھو مجھے بخار ہے۔ ورنہ مجھے دیر نہ ہوتی۔ تم نے ایسا کیوں کیا بولو شہزادی ۔۔۔ بولو؟"

لڑکی کے خالی ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اس کا بھولا بھالا معصوم چہرہ کمھلا گیا تھا۔ اور آنکھیں خفت سے جھک گئی تھیں۔ جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

وہ پھولوں والی شہزادی کو ڈانٹ کر بڑا اداس دکھائی دے رہا تھا۔ " مجھے معاف کر دو شہزادی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے کومل دل کو توڑا ہے لیکن کیا میرا تم پر کچھ بھی حق نہیں ہے۔ وہ رندھے ہوئے گلے سے معافی مانگ رہا تھا۔

ان دو چار ماہ میں بہت کم ایسے دن آئے جو میں نے ان دونوں کی طرف توجہ نہ دی ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے روز ہی زندگی کا یہ عجیب و غریب ڈرامہ ایک کسک لیئے آتا۔ اور میری آنکھیں پتہ نہیں کیوں نم ہو جاتیں۔ اس طرف چار پانچ برس میں یوں کچھ تیزی سے انقلابات آئے کہ بازار کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا۔

دربار ریسٹورینٹ کی جگہ کسی ڈاکٹر نے ڈسپنسری کھول لی۔ سامنے والی لانبی سڑک کا سارا کنکریٹ تارکول کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ مارکٹ کو ڈھاکر از سر نو خوب صورت انداز میں تعمیر کیا گیا۔

پھولوں والی شہزادی اب جوان ہو چکی تھی اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ آج بھی پھولوں کے گجرے لیے اپنے محسن کے انتظار میں کھڑی ہوتی۔ اور وہ مخفی شخص ٹھیک وقت پر آکر اس سے پھول خرید لے جاتا۔

اب اس دبلے پتلے آدمی میں غیر شعوری طور پر ایک تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ شام کو جب وہ شہزادی سے گجرے لیتے ہوئے اس کے گالوں کو محبت سے تھپتھپاتا تو اس کے ہاتھ کانپ کانپ جاتے اور لڑکی کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی تنور میں جھونک دی گئی ہو۔ اس کے کانوں کی لویں پھڑک اٹھتیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ڈوب جانے کے انداز میں اسے گھورتا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے پلکوں پر آکر ٹھہر جاتے۔

وہ روز میری دکان کے سامنے سے گینڈے کے گجرے لیے آہستہ آہستہ گزرتا۔ جیسے اس کی زندگی کے ڈرامے کا کوئی ڈراپ سین ہی نہ ہو۔ پھر ایک منحوس دن ایسا بھی آیا کہ میں شدید طور پر بیمار ہوگیا۔ پانچ چھ ماہ تک دکان پر تالا پڑا رہا۔ اس لیے میں اُن کے بارے میں کچھ زیادہ جان نہ سکا۔ پھر جب میری صحت ٹھیک ہوگئی تو ڈاکٹر نے مجھے چلنے پھرنے کی اجازت دے دی۔

میں اپنی دکان کھولنے کے ارادے سے جب بازار سے گزر رہا تھا تو بہت سے دکان دار سر نکالے ہمدردی میں ڈوب کر میری خیریت دریافت کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کسی دن بھی تو یہ کم بخت مجھے دیکھنے ہسپتال نہیں آئے۔ اب صحت ٹھیک ہوگئی تو خیریت دریافت کرنے چلے ہیں۔ میں نے دکان کھولتے ہی پہلے جھاڑ دی۔ ساری دکان گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ پھر دوپہر کی ڈاک آ گئی۔ پوسٹ مین نے مجھے تازہ کتابوں کے بنڈل دیئے۔ نئی کتابوں کو پاکر مجھے بڑی تسکین ہوئی۔ کچھ اس لیے بھی کہ ان تازہ کتابوں میں اس شخص کی پسند کی دو کتابیں بھی تھیں۔ دوسرے دن شام کی چائے پینے کے بعد میں دکان پر بیٹھا اس شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یکایک میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ کھویا کھویا سا مریل ٹٹو کی طرح سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا جیسے کسی نے اسے زخمی کر دیا ہو۔ اسے دیکھتے ہی یکبارگی مجھے اس کی من پسند کتابیں یاد آگئیں۔ آپ کی کتابیں آگئی ہیں صاحب۔ آپ کی کتابیں۔۔۔۔ "ہوں" وہ ایک لمحہ کے لیے لڑکھڑاتا ہوا رکا۔ اور میرے قریب آکر دلدوز آواز میں دھیرے سے کہا۔

"اب مجھے کتابیں نہیں چاہیئیں۔ گینڈے کے پھولوں والی شہزادی چاہیئے۔ گینڈے کے پھولوں والی۔"

اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ڈھلک گئے۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ مارکیٹ کے نکڑ پر شہزادی کی جگہ اس ہم سن ایک چھچھلی رو لڑکی گینڈے کے پھول ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ساری کتابیں ہوا میں اڑ گئی ہوں۔

٭٭٭

سب رنگ

> اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامینِ نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔
> — (ادارہ) —

مسعود مفتی

عذاب

آسمان کے ایک گوشے میں تین فرشتے اپنا دفتر لگا کر بیٹھے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ دنیا میں ہر مرنے والے کی پوری زندگی کا جائزہ لے کر رپورٹ تیار کریں کہ آیا اُسے جنت میں جانا چاہیئے یا دوزخ میں۔

تینوں فرشتے ہر کیس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اپنی سفارش کرتے تھے اور آسمان کے قریبی گوشے میں اپنے نگران فرشتے کو پیش کر دیتے تھے جو حالات کو از سرِ نو جانچنے کے بعد آخری رپورٹ تیار کر کے اللہ میاں کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔

اللہ میاں کا فیصلہ آخری ہوتا تھا اور اس کے مطابق مرنے والے کی روح کو جنت یا دوزخ میں بھیجا جاتا تھا

دفتر میں ایک نئی روح داخل ہوئی۔ جو دنیا میں ایک آدمی کی موت کے بعد بدن سے رہا ہو کر عالمِ بالا پر پہنچی تھی۔ روح کا مرغولہ سیدھا اڑ کر ان تینوں فرشتوں کے سامنے پہنچا اور ایسا اونچا نیچا ہوا جیسے جھک کر آداب بجا لا رہا ہو۔

اس روح کے پہنچتے ہی مرنے والے کے کراماً کاتبین اس کی زندگی کا جملہ ریکارڈ لے کر وہاں پہنچ گئے اور ہر واقعہ کی تفصیل دھوئیں کی شکل میں وہاں انڈیل دی۔

تینوں فرشتوں نے کمپیوٹر کے انداز میں منٹوں میں ان واقعات کا کچا چٹھا دیکھ ڈالا اور بغیر گفتگو کئے روح سے بھی نوری شعاعوں کے ذریعے رابطہ قائم رکھا۔ جس سے اُن کو مرنے والے کے نقطۂ نظر کا بھی ساتھ ساتھ اندازہ ہوتا گیا۔ یہ گویا رسمی جواب طلبی تھی۔

چند ہی لمحوں میں انہوں نے اپنی رپورٹ مکمل کر لی اور سفارش کی کہ مرنے والے کے چند گناہ ایسے ہیں کہ اسے کچھ عرصہ کے لئے دوزخ میں بھیجا جائے۔

روح سمٹ سمٹا کر، کانپتی ہوئی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ اور آخری فیصلے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے مرغولوں میں کچھ ایسے پیچ و تاب رونما ہوئے۔ جیسے کوئی بدن سجدے میں پڑا دعا کر رہا ہو۔

آسمان کے دوسرے گوشے تک رپورٹ نگران فرشتے کے پاس پہنچ گئی۔

وہاں بھی کمپیوٹر کے انداز میں چند ہی ثانیوں میں رپورٹ کھنگالی گئی۔ مگر اسے آخری شکل دینے کی بجائے نگران فرشتے

نے ابتدائی رپورٹ بھیجنے والے تینوں فرشتوں کو طلب کیا۔

"تمہاری رپورٹ میں بعض کوائف واضح نہیں ہیں۔" نگران فرشتے نے کہا۔ "موت کے وقت متوفی کی عمر پچاس (۵۰) برس تھی مگر یہ واضح نہیں کہ موت کیوں واقع ہوئی۔"

تینوں میں سے سینئر فرشتے نے کہا۔ "اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب تو یہ ہے کہ ۲۳ مئی ۱۹۷۶ء میں دل کے عارضے میں واقع ہوئی۔ مگر دوسرا جواب یہ ہے کہ چند اسباب کی وجہ سے دل کا عارضہ ہوا۔ وہ کئی سال پہلے سے شروع ہو گئے تھے۔"

"وہ کیا اسباب تھے"؟ نگران فرشتے نے پوچھا۔

"متوفی سیدھا سادا انسان تھا۔ وہ سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس نے مکان بنانا شروع کیا لیکن جو مکان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ وہ دراصل اس کی موت کی بنیاد تھی۔"

"وہ کیسے؟"

اس نے اپنے مکان بنانے کا ٹھیکہ ایک ٹھیکیدار کو دیا۔ جب نصف کے قریب مکان بن چکا تو اسے پتہ چلنے لگ گئے۔ تب اس کو اندازہ ہوا کہ ٹھیکیدار بے ایمانی سے خراب مصالحہ اور سامان لگا رہا ہے۔ اس نے احتجاج کیا تو ٹھیکیدار نے کام بند کر دیا۔ اور کہا کہ وہ کام کسی اور سے کروا لے۔ مگر جتنا خرچ ہوا ہے وہ اسے دے دیا جائے۔ جب اس نے حساب کیا تو وہ تقریباً اتنا ہی تھا جتنا شروع میں مکان بنانے کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر یہ پولیس کے پاس گیا۔ مگر پولیس والوں نے کارروائی کرنے سے پہلے اس سے رشوت کی رقم طلب کی۔ تب اس نے محکمہ کے بالا افسران سے شکایت کی تو انہوں نے لمبے چوڑے وعدے کئے مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اتنے میں ٹھیکیدار نے پولیس والوں کو پیسے چڑھا دیئے۔ تو انھوں نے متوفی کے خلاف ہی پرچہ درج کر دیا کہ یہ ٹھیکیدار کے پیسے نہیں دیتا۔"

"پھر؟"

پھر اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا۔ عدالت نے اس کا استغاثہ تو لے لیا۔ مگر عدالتی طریقہ اتنا لمبا تھا کئی ماہ اور گزر گئے۔ اور مقدمہ وہیں کا وہیں رہا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کی وجہ سے مکان کا جو تھوڑا سا ڈھانچہ بنا تھا۔ وہ بھی گرنے لگ گیا۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اس کے گواہ شہادت دینے سے انکاری ہو گئے۔"

"وہ کیوں؟"

"انہیں اس علاقے کے غنڈے نے دھمکایا تھا کہ اگر انھوں نے متوفی کے حق میں شہادت دی تو ان کی بیوی کی بے حرمتی کی جائے گی۔ ورنہ بال بچوں یا لڑکے کو اغوا کر لیا جائے گا۔ اس غنڈے سے خوف سے ہر گواہ نے شہادت دینے سے انکار کر دیا۔"

"مگر غنڈے نے یہ کیوں کیا؟"

"ٹھیکیدار بڑی باقاعدگی سے غنڈے کو غنڈہ ٹیکس ادا کیا کرتا تھا۔ مگر اس کے علاوہ بھی کمینے نے ایک بھاری رقم ادا کی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر متوفی دوبارہ پولیس کے پاس گیا۔ مگر انہوں نے غنڈے کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا کیونکہ غنڈے کی

پشت پناہی اس علاقے کا سیاسی لیڈر کر رہا تھا۔"

"پھر؟"

"وہاں سے مایوس ہو کر متوفی سیاسی لیڈر کے پاس گیا۔ اس نے مدد کا وعدہ کیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ جب متوفی نے سیاسی لیڈر کے گھر کے کئی چکر لگائے۔ تو وہ کہنے لگا کہ وہ غنڈے کو ناراض نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس کا ووٹر ہے۔ اس پر متوفی نے کہا کہ ووٹ تو اس نے بھی اسے ہی دیا تھا۔ مگر لیڈر نے کہا کہ تمہارا تو صرف ایک ووٹ تھا اور اس غنڈے کی وجہ سے کئی ووٹ ملے تھے۔ متوفی نے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ نیکی کرو گے تو میں اس کا چرچا کروں گا۔ اس سے تمہیں میری وساطت سے کئی ووٹ مل جائیں گے۔ مگر سیاسی لیڈر نے کہا کہ خالی اتنی ہی بات نہ تھی بلکہ کچھ اور بھی تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے پچھلے الیکشن میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کیا تھا اور اگلے الیکشن پر بھی کروں گا۔ یہ غنڈہ مختلف طریقوں سے پیسہ بنانے میں میری مدد کرتا ہے۔ اس غنڈے کی وجہ سے میں اپنا پچھلا خسارہ بھی پورا کروں گا اور اگلی دفعہ کے لئے بھی آمدنی کروں گا۔ تم میرے لئے یہ کام نہیں کر سکتے۔"

"پھر؟"

پھر متوفی ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے مذہبی رہنما کے پاس گیا۔ اور اسے کہا کہ وہ لوگوں سے اپیل کرے کہ غنڈے سے نجات دلائے مگر مذہبی رہنما نے کہا کہ جب تک سب لوگ نیک نہیں ہو جاتے اور مذہب کی رسی مضبوط نہیں پکڑتے۔ اس وقت تک وہ کسی غنڈے یا سیاستدان یا پولیس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ اگر سب لوگ بدی چھوڑ دیں۔ تو ایسی مشکلات پیدا ہی نہیں ہوں گی۔ یہاں اگر ان تینوں میں سے کوئی کبھی اس کی مذہبی تقریر سننے آ گیا تو اسے یقین ہے کہ ان کے دل پر اس کی بات کا اثر ہو گا۔ اور اللہ ضرور ان کو سدھار دے گا۔"

"پھر؟"

"پھر متوفی نے تنگ آ کر عدالت سے مقدمہ واپس لے لیا۔ اپنی بیوی کے زیورات بیچے۔ اپنی جوان سال لڑکی کی شادی ملتوی کی اور اس پیسے سے ٹھیکیدار کا بل ادا کیا۔ پھر خود بازار سے سامان خرید کر مکان بنانے لگا۔"

"پھر؟"

"پھر اس نے دیکھا کہ بازار میں سامان یا تو بلیک مارکیٹ میں ملتا ہے یا ملاوٹ والا اور گندہ ملتا ہے۔ اس کے کئی دوکانداروں سے جھگڑے ہوئے۔ مگر اس پچھلے واقعے کے بعد یہ عدالت میں نہیں گیا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ بلیک مارکیٹ سے سامان خریدنے کی وجہ سے اسے بنک سے قرضہ بھی لینا پڑا۔ ایک سال بعد جب بنک کے قرضے کی ادائیگی کا وقت آیا اور اس نے دیکھا کہ اس پر اتنا سود چڑھ گیا ہے تو اسے پہلی دفعہ دل کا دورہ پڑا۔"

"اس کی بیوی نے گھر کی باقی چیزیں بھی فروخت کر دیں۔ کار بھی بیچ ڈالی اور قرضہ اتارا۔ اور پھر یہ سارا کنبہ اپنے اس نئے گھر میں رہنے لگا .. مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ نئے گھر میں ان کا ہمسایہ ایک سمگلر تھا اور متوفی کے بچے سکول میں اس سمگلر کے بچوں کے ساتھ پڑھتے تھے جبکہ اس کی بیوی کا بھی اس کی بیوی سے ملنا جلنا ہو گیا۔"

"پھر جیسے جیسے سال گذرتے گئے متوفی کے بیٹے جوان ہوتے گئے اور اس کی بیوی بوڑھی ہوتی گئی۔ بیوی کو آرام کی ضرورت تھی اور بچوں کو ٹھاٹ کی زندگی شروع کرنے کی۔ اس لئے ان سب کو متوفی سے گلہ ہونے لگا کہ اس نے اپنی زندگی ضائع کی ہے۔ علاقے میں ان کے سمگلر ہمسائے

کی عزت کچھ زیادہ تھی اور اس کے گھر میں روپے پیسے اور دیگر آسائش زندگی کی فراوانی بھی تھی۔ اس کے مقابلے میں متوفی کے گھر میں فراغی بھی نہیں ہے۔ اور لوگ اس کی عزت بھی نہیں کرتے۔

"پھر"؟

"اس سے متوفی کے گھر میں اکثر چخ پخ رہنے لگی۔ اور گھر کا کوئی فرد بھی اپنی جگہ خوش نہ رہا۔"

"تب کیا ہوا۔؟"

"اب متوفی کی اولاد جوان ہوگئی تھی۔ ان میں سے کسی کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ تھا اور کسی کی شادی کا۔ مگر ان کے پاس اتنی فراغی نہ تھی۔ ایک دن شام کو کھانے کی میز پر بات بڑھی تو بیوی بچوں نے متوفی سے کہا کہ اس نے موجودہ وقت کی بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھوئے۔ اس لئے وہ بیوقوف ہے۔ احمق ہے اور ان کا ہمسایہ بہت عقلمند ہے جس نے حالات کا ساتھ دے کر عملی طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔ ان باتوں کا متوفی کے دل پر اتنا اثر ہوا کہ اسی رات اسے پھر دل کا دورہ پڑا۔ اور وہ صبح ہونے سے پہلے مر گیا۔"

نگران فرشتے نے تھوڑا غور کیا۔ اور پھر تینوں فرشتوں کو واپس بھیج دیا۔

بعدازاں وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔۔۔۔ سوچتا رہا۔۔۔۔

بالآخر اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

"متوفی کی موت کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے جس خطے سے یہ فوت ہو کر آیا ہے۔ وہاں کا معاشرہ سلگنے والے عذاب الٰہی کی گرفت میں ہے۔ جس شخص کا کوئی قصور نہیں اسے بھی کوئی سکون نہیں۔ متوفی کو دوبارہ دوزخ میں بھیجنے کا کوئی جواز نہیں۔۔۔۔۔"

نگران فرشتے نے اپنی رپورٹ اللہ میاں کی بارگاہ میں بھجوادی۔ ■■ (سالنامہ نقوش لاہور، جنوری ۷۹ء)

غزل

سید عبدالحمید عدم

ہے عقل یوں ہراس و گماں سے بھری ہوئی
جیسے ہرن کی آنکھ ازل سے ڈری ہوئی

جانے تری نگاہ نے سمجھا تھا کیا اِسے
دل خوں کی ایک بوند تھی وہ بھی مری ہوئی

ہے زیست اک بسیط خلا جس کے اُس طرف
پھولوں کے تخت پر ہے صراحی دھری ہوئی

سو بار آ کے عہدِ بہاراں گزر گیا
لیکن نہ مری شاخِ تمنا ہری ہوئی

پہلے ہی سازِ زیست میں کب جان تھی کوئی
پھر کیا ہوا جو اُس کی کھنک ہے مری ہوئی

دل میں تو خوں کا ایک بھی قطرہ نہ تھا عدم
ہے نوکِ خار کس کے لہو سے بھری ہوئی

(نقوش لاہور سے)

نقد و نظر

تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں (ادارہ)

نام کتاب:۔ علی برادران اور ان کا زمانہ مصنف: جناب سید محمد ہادی
ضخامت: ۲۲۸ صفحات قیمت: ۱۵/۵۰ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

ایک مدت کے بعد محمد علی پر ایک ایسی کتاب پڑھنے کو ملی جو سادہ اور غیر مصنوعی لب و لہجہ میں ایک اہم شخص اور ایک دور کی یاد دلاتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر ایک عظیم انقلابی تھے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کے خواہشمند تھے جو کلچر کے ساتھ آئے۔ کسی انقلاب کا افراط و تفریط کی صورت میں آنا خوش کن نہیں ہوتا۔ انقلاب تو اس طرح آئے کہ عوام ذہنی طور پر تیار ہوں، ان میں جذبۂ وطن پرستی ہو اور ان کے پاس اخلاقی جرأت اور سماجی یکجہتی کا ذوق ہو۔ جوہر کی عظمت یہی ہے کہ وہ ایک سراسر انقلابی رہنما ہی نہیں تھے بلکہ عالم، شعلہ مزاج مقرر اور گوشہ نشیں تھے اور ان کی ذات تہذیبی انفرادیتوں کی بزم تھی۔

سید محمد ہادی نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے ہیں۔ انھوں نے جوہر کو سراسر کمزوریوں سے بالاتر شخص نہیں پیش کیا ہے۔ سید محمد ہادی کی کتاب ایک غیر جذباتی تحریر کا عمدہ نمونہ ہے اور انہوں نے ایک متوازن تبصرہ سے ایک دور کا ذکر کیا ہے جس میں کچھ خود نوشت بھی ہے تو کچھ تذکرہ بھی ہے۔ اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو مولانا جوہر کی زندگی کے چند گوشے تاریکی میں رہ جاتے اور ان کی عظمت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا۔

یہ کتاب جو مناسب طباعت سے آراستہ ہے۔ ایک اچھا معلوماتی تحفہ ہے۔

نام کتاب:۔ الف لام میم (افسانوں کا مجموعہ) مصنف: کلام حیدری
ضخامت: ۱۷۵ صفحات قیمت: ۱۵ روپے
ناشر: کلچرل اکیڈمی، گیا (بہار)

جدید افسانہ نگاری کے میدان میں ایک طرف ایبسٹریکٹ سوچ سے بھرپور فکشن ہے تو دوسری طرف جذبات سے پُر، اکہری

نثر۔ علامت نگاری کا اپنا ایک خاص انداز ہے جو دونوں ہی طرح کے افسانوں میں مختلف صورتوں میں موجود ہے اور جہاں ابسٹریکٹ سوچ میں افسانویت زیادہ ہے، جذبات سے بھری ہوئی نثر میں شعریت ہے۔ کلام حیدری کی افسانہ نگاری میں دوسرا طرز فکر ہے۔ یعنی شعری و جذباتی رویّہ کا۔ کلام حیدری کے ان افسانوں میں کہیں خود کلامی ہے، کہیں کردار ہر شئے کو اپنے زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار تجربات اور فرسٹریشن سے مالا مال ہیں۔ اور ان میں وہ سادگی نہیں جو "دُور" کے کرداروں میں ہوتی ہے، ان میں سوچنے، پس منظر دیکھنے اور اپنے فلسفیانہ مغالطوں میں غلطاں ہونے کی صلاحیت ہے۔ کبھی کبھی تو کلام حیدری کے افسانوں کے کردار البرٹو موراویا اور سامرسٹ مام کے افسانوں کے کردار سے قریب تر لگتے ہیں یعنی سوچ سے پُر، فکر سے معمور، اور کچھ حد تک عملی زندگی سے بالاتر۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ افسانہ نگار، اپنے افسانے میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور اسی لیے افسانے بیانات سے بھرے ہیں۔ مثلاً

"دراصل تم فراڈ ہو۔"

"پھر اصل کیا ہے، سچ کیا ہے؟"

اصل یہ ہے ۔ یہ جام ۔ یہ وہسکی ۔ مگر یہ بھی اصل نہیں ہے، اصل وہ بے خودی ہے جو اس کے بعد طاری ہوتی ہے ۔ اور تم دونوں اس بات سے ناواقف ہو کہ وہسکی ایک چیز ہے اور بے خودی دوسری۔ وہسکی کے بغیر مجھ پر بے خودی طاری نہیں ہوتی۔ اور بہت سے ایسے گذرے ہیں جن کی بے خودی وہسکی کی محتاج نہیں تھی۔" (حاشیائی آدمی)

"سنو تو ___"

تمھیں کہانی سنانا نہیں آتا، نہیں آ سکتا۔!

تم تو خود کو اپنی کہانی کا ہیرو بنائے دیتے ہو۔ یاد کرو تمھاری نانی اماں نے، یا دادی ماں نے جتنی کہانیاں سنائیں، ان میں وہ خود کہاں پر تھیں؟ خود ہوتیں تو کہانیاں کہاں ہوتیں؟" ___ کہانی سنو گے)

کلام حیدری کے افسانے نئی زندگی اور نئے معاشرے سے متعلق ہیں اور ان میں جدید تجربات کو زیر بیان لایا گیا ہے۔ ان کے انداز میں انفرادیت اور خصوصیت ہے جس سے ان کے افسانوں کو جدا طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ اور ان افسانوں میں واقعاتی انداز ہے۔ کلام کے افسانے تجربہ اور ہیئت کے لحاظ سے MODERATE ہیں۔ ان کے پاس جذبہ کی تیزی ہے لیکن بیان اور زبان میں وہ تیزی نہیں جو ان تکازے میں اسطور کو پیش کر سکیں۔

کلام حیدری کی یہ کتاب اچھے جدید ادب کی نمائندہ کتابوں میں شمار کی جائے گی۔ اور اس سے افسانوں پر تنقید و مطالعوں کو راہ ملے گی۔ طباعت، کتابت اور قیمت معیاری ہیں

مبصر:۔ (اسلم عمادی)

نام کتاب:۔ تحفہ (اصلاحی ڈرامہ) مصنف: محمود شکیل صفحات: ۴۰ قیمت: ۱/۰

ملنے کا پتہ:۔ کوہ نور کلچرل اکیڈیمی، نامپلی کوارٹرز۔ حیدرآباد ۔۵۰۰۰۸۹

خاندانی منصوبہ بندی کے مضرات اور فلاحی امکانات کو محمود شکیل نے اس مختصر اور دلچسپ ڈرامے میں روشن کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ یوسف ندیم کی تحریر کے مطابق یہ ڈرامہ مقصدیت کی تکمیل خوش اسلوبی سے کرتا ہے۔ مکالمے طویل اور مسلسل ہونے کے سبب تاثر کی کامیاب ترسیل سے قاصر رکھتے ہیں۔ جدید آبادی بول چال میں تصنع کا پہلو غالب ہے۔ معاشرتی اور سماجی پہلوؤں پر محمود شکیل کی یہ نگارش عمومی طور پر مطالعہ کی حامل ہے۔ کتابت، طباعت اور سرورق سبھی جاذب نظر ہیں۔ (د۔ رخ)

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ، ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں

یکم اپریل: آندھرا پردیش کی جمعیۃ العلماء کی مجلسِ عاملہ نے ایک قرارداد منظور کرتے ہوئے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ انتظامیہ کی مختلف سطحوں پر تلگو کے ساتھ اُردو کے استعمال کو بھی لازمی قرار دیا جائے اور اردو کو ریاست میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

۳ اپریل: جناب محمد علی سابق وزیر کرناٹک نے ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام کارکرد کوچنگ کلاسس کے مرکز کا معائنہ کیا۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن نے خیر مقدم کرتے ہوئے تعلیمی ٹرسٹ اور اردو کالج کی کارکردگی سے واقف کرایا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اُردو کالج نے بھی مخاطب کیا۔

● اقبال اکیڈیمی کا سہ ماہی مجلہ "اقبال ریویو" کا خصوصی شمارہ "اقبالیاتِ ماجد" مسٹر مصلح الدین سعدی کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس شمارہ میں اقبالیات پر فلسفی دانشور مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تخلیقات کو یکجا کیا گیا ہے۔

● اُردو فورم کی طرف سے ریاست میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے مطالبہ پر سلسلہ وار بھوک ہڑتال کے چھٹویں دن فورم کے صدر سیّد افضل الدین نے ریاستی چیف منسٹر سے اپیل کی کہ وہ اردو کے مطالبات کے سلسلے میں کمیشن کے قیام کا اعلان کریں۔

● ساؤتھ انڈیا اُردو اکیڈیمی کی سٹی یونٹ کے سالانہ انتخابات میں مسرز غوث احمد خاں ایڈیٹر علمی "تصویر" صدر، امان اللہ خاں (ایم ایل اے) اور ڈاکٹر غیاث الدین نائب صدور، محمد لطیف الدین معتمد عمومی، محمد اکبر معتمد تنظیمی، تاج مہجور معتمد اشاعت، امجد، ہادی رحیل معتمد تشہیر اور سعادت احمد خازن منتخب ہوئے۔

۴ اپریل: حلقۂ اربابِ ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری میں بصدارت ڈاکٹر زکیان چند جین صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد یونی ورسٹی منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے نامور شاعر ن۔م راشد پر تنقیدی مقالہ سُنایا۔ جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر لائبریری نے خیر مقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر جین نے صدارتی تقریر میں ڈاکٹر تبسم کے مقالہ کی ستائش کرتے ہوئے ان کے تنقیدی شعور کو خراجِ تحسین ادا کیا اور حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول کو مثالی کہا اور بتایا کہ وہ یہاں کے اُردو دوستوں کے ساتھ مل کر اُردو کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف سرمست معتمد حلقۂ اربابِ ذوق نے شکریہ ادا کیا۔

۸ اپریل: ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام "ایوانِ اردو" میں اُردو کی بقا، ترویج اور ترقی سے متعلق جناب ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) کے ۲۰ نکاتی کلیدی خطبہ پر ایک سیمنار پروفیسر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونی ورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس سیمنار کو مسرز ڈاکٹر سری رام شرما، ڈاکٹر حسینی شاہد، پروفیسر سید سراج الدین، چندر سری واستوا، ڈائرکٹر اکیڈیمی اُردو اکیڈیمی، ڈاکٹر محمد ہاشم، اختر حسن، ڈاکٹر یوسف کمال، ہاشم علی اختر اور نظام الدین مغربی نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونی ورسٹی و مدیر اعزازی سب رس نے سیمنار کی کارروائی انجام دی۔ فاضل دانشوروں نے اُردو کے تعلیمی اور ریاستی مسائل پر مکمل کر اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر جین نے اردو والوں کو مشورہ دیا کہ وہ اُردو کو ایک مذہب زبان قرار دینے والوں سے ہوشیار رہیں اور اُردو رسم الخط کی تبدیلی کو قبول نہ کریں۔ موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

۱۴ اپریل: اُردو تعلیمی ٹرسٹ کی جانب سے آصفیہ اسکول میں ایس ایس سی کے ناکام طلباء کے لیے قائم کردہ کوچنگ سنٹر کی افتتاحی تقریب ڈاکٹر حسینی شاہد کی صدارت میں منعقد

ہوئی۔ جناب عابد علی خاں بانی اردو تعلیمی ٹرسٹ نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سنٹر کے پرنسپل جناب علی احمد جلیلی نے رپورٹ سنائی اس سنٹر سے ایک سو کے قریب طلبا اور طالبات نے استفادہ کیا۔

● اردو دوست، قانون داں اور علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کے رکن مرزا جمیل احمد بیگ (نوٹری) عارضۂ قلب [illegible] رحلت کر گئے۔ اردو اکیڈیمی کے معتمد جناب [illegible] ریڈی وزیر پنچایت راج نے جمیل مرحوم کی رحلت پر تعزیتی بیان جاری کرتے ہوئے [illegible] اردو کے مسائل سے [illegible] عقیدت ادا کیا۔

۱۳ اپریل: سروجنی نائیڈو صدی تقاریب کے سلسلے میں ایک ادبی اجلاس محترمہ معصومہ بیگم سابق ریاستی وزیر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسز سروجنی ریگانی، بانو طاہرہ سعید اور عظمت عبدالقیوم نے بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کی شاعری اور قومی اور ملی خدمات پر روشنی ڈالی۔

۱۴ اپریل: ریاستی اردو اکیڈیمی کے نو تشکیل شدہ بورڈ آف گورنرس کے افتتاحی اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر پی وینکٹ رام ریڈی وزیر تعلیم نے اعلان کیا کہ اگلے تعلیمی سال سے منتخب گورنمنٹ ڈگری کالجوں میں متبادل [illegible] ذریعہ تعلیم [illegible] کا آغاز ہوگا وزیر [illegible] نے [illegible] سرکاری زبان [illegible] اردو کو [illegible] تعلیم اور دیگر مقاصد کے لیے سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اردو تعلیم کے معیار کی بہتری کے لیے اقدامات تجویز کرنے کے لیے اردو اکیڈیمی کے مشورے سے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی اور بورڈ آف انٹرمیڈیٹ میں اردو کے لیے ایک اسپیشل افسر کا بھی تقرر کیا جائے گا۔ [illegible] ریڈی وزیر پنچایت راج و صدر اکیڈیمی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے اکیڈیمی کی سرگرمیوں [illegible] اردو [illegible] سرکاری [illegible] خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر ایم [illegible] کہ اردو اکیڈیمی [illegible] اردو اکیڈیمی [illegible] کیا۔ [illegible] دیگر مقررین میں مولانا حافظ ابو یوسف [illegible] عاملہ اکیڈیمی اور جناب محمد ابراہیم خاں رکن اسمبلی و نائب [illegible] اکیڈیمی [illegible] پایا کہ اردو ادیبوں اور صحافیوں کی بہبودی کے لیے ایک ٹرسٹ بھی قائم کیا جائے۔

۱۵ اپریل: انجمن ادب کے ماہانہ شعری و ادبی اجلاس میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے ڈاکٹر گیان چند جین [illegible] ادبی انٹرویو لیا۔ بعض شعر [illegible] ورما، حسام الدین سلیم اور حامد علی نے کلام سنایا۔ جناب جمیل شیدائی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور غنی نعیم صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

۱۷ اپریل: محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ ثریا حسین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ منیرہ کاوس جی نے "سروجنی نائیڈو کی شخصیت اور شاعری" پر مقالہ پڑھا۔ نجمہ نکہت صاحبہ نے کہانی سنائی۔ محفل شعر میں بانو طاہرہ سعید، عظمت عبدالقیوم، مظفر النساء ناز اور فضیلت نے کلام سنایا۔

● ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد کا ادبی اور دستاویزی اہمیت کا "ڈرامہ نمبر" (۱۶۰) صفحات پر مشتمل جناب مصطفےٰ کمال کی ادارت میں شائع ہوا۔ ڈرامہ نمبر میں ملک کی مختلف زبانوں کے نمائندہ ڈراموں کے تراجم اور اردو میں ڈرامائی ادب پر مقالات کے علاوہ تقریباً تین درجن اردو ڈراموں کو یکجا کیا گیا ہے۔

۱۹ اپریل: عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے ڈاکٹر غلام عمر خان کے اقبال پروفیسر شپ کے عہدہ پر انتخاب کی مسرت میں ایک تہنیتی تقریب پروفیسر بی راما راجو ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب میر احمد علی خاں معتمد انجمن ترقی اردو مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر محمد ہاشم علی، ڈاکٹر ابو الفضل محمود قادری اور ڈاکٹر عبدالستار خاں کے علاوہ بزم اردو کے اراکین حبیب اللہ صدیقی معین صدیقی کے علاوہ آرٹس کالج اسٹوڈنٹس یونین کے صدر مسٹر راجیندر

کار نے ڈاکٹر عمر خاں کو مبارک باد دی اور ان کی اقبال شناسی کو خراج تحسین ادا کیا۔

● انوار العلوم ایوننگ کالج کے کالج ڈے تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے اردو ڈگری جامعتوں کے قیام کے لیے انوار العلوم کے انتخاب پر زور دیتے ہوئے اس کالج کے ڈسپلن اور بہتر معیار تعلیم کا ذکر کیا۔ پروفیسر سید علی اکبر صدر ادارۂ ادبیات اردو نے صدارت کی۔ پرنسپل فصیح الدین احمد نے خیرمقدمی تقریر کی۔

● بزم اردو [illegible] کے ترجمان "ضیائے ادب" کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے آندھرا پردیش برقی بورڈ کے صدر نشین ڈاکٹر بی تاتا راؤ نے اردو زبان کی مٹھاس اور اس کی ہمہ گیری اور مقبولیت کو خراج تحسین ادا کیا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ریاست میں اردو کے تعلیمی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اردو تعلیمی ٹرسٹ کے استحکام میں تعاون کی اپیل کی۔ مسٹر ایم اے نعیم (صدر) اور مسٹر کمال الدین علی خاں (معتمد) نے بزم اردو کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

۳۱ اپریل: مسٹر نذیر احمد معتمد [illegible] اردو ٹیچرس اسوسی ایشن نے ایک بیان کے ذریعہ ریاستی وزیر تعلیم [illegible] کا خیر مقدم کیا ہے [illegible] کے نتیجے میں [illegible] تقررات کا تعین [illegible] گیا ہے۔

● عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک پریس نوٹ کے بموجب مس [illegible] لیکچرار اردو [illegible] کالج کو ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا گیا۔ موصوفہ نے پروفیسر آل احمد سرور کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی نگرانی میں مقالہ تحریر کیا تھا۔

● اردو اکیڈیمی کے پریس نوٹ کے بموجب اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹس ویلفیئر ٹرسٹ کے لیے جناب نعمان تمکنت نے اپنے شعری مجموعہ "نیم خواب" کی ۵۰ جلدیں اور جناب [illegible] حیدرآبادی نے احسن علی مرزا کی کتاب "ڈاکٹر ذاکر حسین" کے ۵۰ نسخے تحفتہً عطا کیے۔

● ڈاکٹر کہکشاں [illegible] صدر شعبۂ اردو [illegible] ویمنس کالج نے ایک ادبی و شعری محفل میں ڈاکٹر شاہدہ سعید کی تصنیف "اردو ادب میں خاکہ نگاری" کی رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں اقبال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے کتاب پر اظہار خیال کیا [illegible] اس موقع پر "خاتون دکن" [illegible] مشاعرہ بھی منعقد کیا۔ پروفیسر [illegible] کی صدارت میں مسرز ڈاکٹر مغنی تبسم، کنول پرشاد کنول، [illegible] علی احمد جلیلی، خیرات ندیم [illegible] صلاح الدین نیر، بانو طاہرہ سعید، صادق [illegible] نعیم، حسن خیال [illegible] نے کلام سنایا۔

● اقبال اکیڈیمی نے [illegible] "اقبال" کا اہتمام کیا۔ جہاں [illegible] دہلی یونیورسٹی کے علاوہ ڈاکٹر غلام [illegible] ظہیر الدین احمد، رحیم [illegible] پرنسپل [illegible] اسد حسینی نے اقبالیات کے مختلف گوشوں [illegible] پڑھے۔ کاظم نواز جنگ نے اقبال ریویو کے خصوصی شمارہ اور ایک انگریزی کتاب "اقبال کے تین خطبے" کی جلد کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب عبدالحمید اشرف [illegible] اردو ٹرسٹ نے نقش اقبالیات کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر دکن کی نامور اقبال شناس شاعرہ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر مرحومہ کی ادبی یادگار کے طور پر ان کے شوہر جناب [illegible] علی [illegible] کی طرف سے اقبال اکیڈیمی کے کتب خانہ کو [illegible] اور الماریوں کے تحفہ کا اعلان کیا گیا۔ جناب کریم رضا نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

۲۳ اپریل: جناب [illegible] دکن ترقی اردو [illegible] بھوک ہڑتال کیمپ [illegible] کرتے ہوئے اردو فورم کے اراکین کو مشورہ دیا کہ اردو کے مسائل کو حکومت سے منوانے کے لیے تمام سیاسی اور تہذیبی اداروں کا تعاون حاصل کریں [illegible] اور [illegible] کیا۔

۲۹ اپریل: انجمن [illegible] کا ماہانہ ادبی اجلاس [illegible] شاہد [illegible] پرنسپل اردو کالج کی صدارت میں منعقد [illegible] نے "اردو [illegible] آزادی سے پہلے" کے زیر عنوان مقالہ پیش کیا۔ [illegible] شعری [illegible] شکریہ ادا [illegible]

۳۰ اپریل: [illegible] عثمانیہ یونیورسٹی [illegible] شعبۂ اردو [illegible] جس [illegible] پروفیسر خواجہ [illegible] نے "اردو میں [illegible] تعلیم" [illegible] کے [illegible] فکر انگیز مقالہ [illegible] ڈاکٹر غلام عمر خاں نے خیر مقدم [illegible] کیا۔



پھوپھا میاں کو کتوں سے وہ بیر تھا کہ خدا کی پناہ۔ جہاں کسی محلے کے کتے نے بھولے بسرے گھر میں پاؤں رکھ دیا وہاں ان کے مزاج گئے۔ پاس کے گھر میں موتی نام کا ایک بڑا پیارا کتا تھا۔ وہ جانے انجانے کبھی بھی ہمارے گھر میں گھس آتا تو پھوپھی بی اُسے بڑے پیار سے گوشت کا ٹکڑا یا روٹی کا ٹکڑا کھلا دیتیں۔ یہ نہیں تو ہڈی ہی سہی۔ موتی صاحب کی بڑی ساری فیملی تھی۔ موٹی تازی بیگم صاحبہ تھیں اور دو چار موٹے تازے بچے۔

ایک دن بارو والی خالہ نے تنگ آکر بچوں کو پھنکوانا چاہا تو ہمارے گھر میں طوفان آگیا۔ سارے بچے اور پھوپھی بی کی رائے تھی کہ ایک پلا اپنے گھر کے لئے لے لیا جائے اور پھوپھا میاں کا یہ حال تھا کہ مارے غصے کے پھنکے جا رہے تھے۔

"یا تو کتا گھر میں رہے گا، یا میں .... دونوں کا رہنا محال ہے۔"

چار برس کے ٹلو میاں باپ سے ڈرے بغیر بولے:

"تو پھر آپ چلے جائیے، کتے کو رہنے دیجئے۔"

پھوپھا میاں دیدے گھما گھما کر صاحبزادے کی بات سنی اور پھر بھیر کر بی بی سے بولے:

"کچھ سُنا صاحبزادے کیا فرما رہے ہیں۔ یہ بس تمہاری وجہ سے بگڑے جا رہے ہیں۔ بھلا کوئی باپ کو یوں کہا کرتا ہے۔" پھوپھی بی ہنسی روک کر بولیں:

"اے ہے بچہ ہی تو ہے۔ آخر کیا قصور کر دیا۔"

مگر پھوپھا میاں کے تیور یوں ہی رہے اور اب تو وہ کسی حال اجازت دینے پر راضی نہ تھے۔ مگر کتا پالنا بھی ضروری تھا۔ اب سب نے باری باری کتے کی شان میں قصیدے پڑھنے کی ٹھانی:

"چور اُچکوں کا زمانہ ہے۔ کتا رہے تو بے فکری ہی بے فکری۔ نہ چوکیدار کی ضرورت نہ دربان کی۔"

"اور جناب کام کتنے کرتا ہے۔ رشید چچا کے پاس جو کتا ہے وہ ان کے جوتوں پر پالش کرتا ہے۔"

"ہاں ہاں یہ کیوں نہیں کہتے کہ ان کے ہاں کتیا کھانا پکاتی ہے۔" پھوپھا میاں چڑ کر بولے۔

"آپ غصہ سے بھر رہے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے جناب، سدھائے ہوئے کتے اس سے بھی بڑھ کر کام کرتے ہیں۔" چچا میاں ہنس کر بولے۔

"ہمارے ہاں انشاءاللہ بہت سارے نوکر ہیں۔ کتے کو خواہ مخواہ کیوں تکلیف دی جائے۔"

پھوپھا میاں روکھائی سے بولے۔

"اُئے توبہ! ایسی بھی کیا ڈھٹائی۔ ذرا بچوں کا دل رکھنا نہیں جانتے۔ بھلا آپ کا کیا جاتا ہے، کتا رکھ لیں۔"

پھوپھی بی اُلجھ کر بولیں،

"بہت ناپاک جانور ہے۔ برتنوں میں منہ ڈالے گا۔ باورچی خانے کی سیر کرے گا اور..."

"ہم اس کو زنجیر سے باندھ کر رکھیں گے۔"

کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں اور پھر اتنی چیخ و پکار رہی کہ پھوپھا میاں ہار مان گئے۔ مگر غصہ ابھی تک اترا نہ تھا، بولے:

"اور جو کبھی میرے کمرے کے پاس پھٹکا تو ایک دم شوٹ کر دوں گا۔"

ننھا سا پلّا پیوں پیوں کرتا ہمارے گھر آ گیا۔ سب کے صلاح و مشورے سے 'ٹابی' نام رکھا گیا۔ ٹابی میاں کی شان نرالی تھی۔ سب کے لاڈ دلار نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ گلے میں گھنگھرو، پیٹھ میں جھولنا۔ پیروں میں جھنک جھنک چھاگلیں۔ وہ لاکھ جتن کر، زیور اتارنا چاہتے مگر کوئی انھیں اتارنے نہ دیتا۔ گھر کے کونے میں نیم کے پیڑ سے ان کی زنجیر بندھی رہتی۔ بے چاروں کو کہیں آنے جانے کی اجازت نہ تھی اور پھوپھا میاں کے کمرے کی سرحد سے تو وہ یوں بچائے جاتے کہ بس۔ اب جناب ان کو اچھی اچھی باتیں سکھائی جانے لگیں۔ کوئی گیند دور تک پھینک دیتا اور ٹابی میاں اٹھا لاتے۔ مہمانوں کے وزیٹنگ کارڈ لے کر بھائی جان کو لاکر دیتے۔ مہمان جانے لگتے تو ایک ہاتھ سے سلام جھاڑتے۔ بڑی کوششوں سے ان کو دروازہ کی زنجیر کھولنا سکھایا گیا۔ اگر کوئی پوچھتا،

"کیوں ٹابی میاں! ذرا بتاؤ تو دم کدھر ہے۔"

تو وہ آگے آگے بھاگتے جاتے اور پیچھے ڈرائنگ روم کے سامنے رُک جاتے اور تو اور ایک بار انہوں نے ایک چور بھی پکڑ دکھایا۔ ہوا یوں کہ محلے کے کوئی صاحب اپنی قمیص کے دامن میں ہمارے ہاں کا مرغی کا چھپا کے بھاگ رہے تھے کہ ٹابی میاں نے موقع پر پکڑ لیا۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر ٹابی میاں کے چرچے۔ غرض وہ اچھے خاصے ہیرو بن کر رہ گئے۔

مگر پھوپھا میاں کی تیوریاں ایسی بھی نہ اُترے۔ وہ ہر لمحہ اسی تاک میں رہتے کہ ٹابی میاں کو نیچا دکھانے کا موقع مل جائے۔ مگر وہ بھی ایسے حالانکہ کبھی مالک کو شکایت کا موقع نہ دیا۔ روزانہ پانچ بجے جب پھوپھا میاں آفس سے واپس آتے تو وہ وہیں کھڑے کھڑے دُم ہلا ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے مگر ذرا قریب نہ پھٹکتے۔

جب پھوپھا میاں آفس جاتے تو خوشی خوشی پھاٹک تک آتے۔ پھوپھی بی کو اب سچ مچ یوں اطمینان مل چکا تھا جیسے گھر میں کوئی بڑا بوڑھا آ گیا ہو۔ مزے کی بات یہ تھی کہ بچے شام کو سیر کے لیے جاتے تو خود ٹامی میاں ان کی نگرانی کے لیے ساتھ ہو جاتے۔ یہ تو خیر ان کا معمول تھا کہ جو بھی باہر جائے اس کا ساتھ دیں اور پھر ساتھ ہی ساتھ گھر کا خیال بھی انھیں لگا رہتا۔

کبھی کبھار پھوپھی بی بولتیں:

"خواہ مخواہ منہ پھلائے رہتے ہیں۔ بھلا بتائیے ٹامی نے اب تک آپ کا نقصان کیا؟"

پھوپھا میاں ہٹ دھرمی سے جواب دیتے:

"اور مجھے تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ خواہ مخواہ سب گرویدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔"

ایک بار جاڑوں کے دن تھے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سارے گھر میں گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا پھوپھا میاں کہاں تو پانچ بجے ہی آفس سے لوٹ آتے تھے یا اب دس بجے کے باوجود بھی آنے کا پتہ تھا۔ ٹامی رہ رہ کر پھاٹک پر جاتا اور پھر اپنے ٹھکانے پر آ کر بیٹھ جاتا۔ بڑی دیر تک وہ اسی طرح بے تاب رہا اور پھر آخرکار بڑی بڑی آوازیں نکال کر رونے لگا۔ [illegible] بجتے وہ نکلے تو وہ اٹھا اور جھولا [illegible] کر باہر دوڑ گیا۔

رات کے دس گیارہ بجے ہم سب گہری نیند میں تھے کہ [illegible] سے ہم [illegible] جاگ پڑے۔ برآمدے میں لائٹ جل رہی تھی۔ ہم سب دوڑ کر باہر آئے تو دیکھا کہ پھوپھا میاں کے کپڑے خون سے تر بتر ہیں اور سامنے ٹامی کی لاش پڑی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے پھوپھی بی سے کہہ رہے تھے۔

"چوروں نے اندھیرے میں اکیلا پا کر مجھے گھیر لیا۔ ایک پستول تانے میرے سینے پر کھڑا رہا اور ایک جیبوں کی تلاشی لیتا رہا۔ میرا کام یوں تو سارے جیب ہی [illegible]۔ اتنی رات گزری بھی نہ تھی کہ چوروں کا خوف ہوتا۔ مگر بارش کی وجہ سے راستے میں اندھیرا تھا [illegible] لائٹ کے فیوز اڑ گئے تھے۔ میں یوں ہی دم سادھے کھڑا تھا۔ ہاتھ پیروں میں ذرا سی بھی طاقت نہ رہ گئی تھی۔ اتنے میں مجھے پیروں کے پاس گیلا گیلا سا محسوس ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ چور تیورا کر زمین پر گر پڑا، جس نے پستول تھام رکھا تھا۔ کسی چیز نے اسے کاٹ لیا تھا۔"

پھوپھا میاں نے نم بھری آنکھوں سے ٹامی میاں کی طرف دیکھا۔

"... میں سمجھ گیا یہ کوئی اور نہیں ٹامی ہے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایک دم دوڑ کے جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسرے چور نے غالباً اپنا شکار ہاتھ سے جاتے دیکھا اور ساری جلن کتے پر اتاری اور غریب اور بے زبان ٹامی دو گولیوں میں تمام ہو گیا۔"

اب جب کبھی پھوپھا میاں کے دوست ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی [illegible] کتے کی تصویر دیکھتے

دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں: "ارے میاں، تم تو کتوں سے اتنی نفرت کرتے تھے۔ یہ بایاں جانور کی تصویر اپنے کمرے میں کیوں لگا رکھی ہے..."

پھوپھا میاں کچھ جواب نہیں دے پاتے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

ماموں موٹے ہو

جوتے لولیوں چھوتے ہو؟ ماموں ماموں موٹے ہو
کتا، بلی، چھوٹے ہو
بلی لولی طوطے سے، آؤ میاں جی دھیرے سے
اوپر سے یا نیچے سے
جوتے لو کیوں چھوتے ہو؟ ماموں ماموں موٹے ہو
کتا، بلی چھوٹے ہو
طوطا بولا خالہ بلی! آپا جی سے لو پوچھا بھی!
ہو گی ابھی بھاگا دوڑی
جوتے کو کیوں چھوتے ہو؟ ماموں ماموں موٹے ہو
کتا، بلی چھوٹے ہو
شیر کی دُم تو لمبی ہے، چچا کی داڑھی چھوٹی ہے
مونچھ ذرا سی ٹیڑھی ہے
جوتے کو کیوں چھوتے ہو؟ ماموں ماموں موٹے ہو
کتا، بلی، چھوٹے ہو
چڑیا بی بی لڈو کھا!! گڑیا جی بی لٹو لا!!!
پیڑ پہ چڑھ کے جھوم جا
جوتے کو کیوں چھوتے ہو؟ ماموں ماموں موٹے ہو
کتا، بلی چھوٹے ہو

لطیفے

— عتیق الرحمٰن عتیق

اُستاد: (جانوروں کی آوازوں کے متعلق بتاتے ہوئے) اچھا بتاؤ منّے! تمہیں سب سے اچھی آواز کس کی لگتی ہے؟

منّا: (جلدی سے) چھٹی کے گھنٹے کی ماسٹر صاحب

احمد: ہمارے ماسٹر صاحب کی بات کا کوئی بھروسہ نہیں۔

مزمل: کیوں؟

احمد: کل وہ بتا رہے تھے کہ چار اور چار آٹھ ہوتے ہیں اور آج کہہ رہے ہیں تین اور پانچ آٹھ ہوتے ہیں۔

ماں: (بیٹے کو لوری دیتے ہوئے) آجا ری نیندیا! جلدی جلدی آ، منّے کی آنکھوں میں سما جا۔

منا: (کسمساتے ہوئے) امی آپ نے ساری کھڑکیاں، دروازے تو بند کر دیئے ہیں، نیند کدھر سے آئے گی؟

صنعتوں کا کلیدی کردار

ملک کے قلب میں واقع آندھرا پردیش کو قدرت نے وافر مقدار میں وسائل عطا کئے ہیں تاریخ نے اس ریاست کے دارالخلافہ کو آفاقی اور مشترکہ تمدن دیا ہے جس میں زمانہ ماضی کی بو باس بھی ہے اور عصری صنعتی دور کے نئے اسرار بھی ۔ آندھرا پردیش امیدوں اور امنگوں کی سرزمین ہے

اوسط اور بڑی صنعتیں جو تعداد میں ۲۶۰ ہیں اور جن میں ۲۷۸ کروڑ روپیوں کی متاثر مقدار سرمایہ مشغول ہے ریاست کے صنعتی چہرے کے نکھار میں مصروف عمل ہیں ۔ گزشتہ چار برسوں کے دوران ادارہ جاتی مالیہ سے استفادہ میں چار گنا اضافہ عمل میں آیا ہے ۔ کاکی ناڈا میں ۱۳۲ کروڑ روپیہ کی لاگت والی جس فرٹیلائزر فیکٹری کا سنگ بنیاد ۸ جولائی ۱۹۷۸ء کو رکھا گیا تھا وہ ۱۹۸۱ء میں پیداوار دینا شروع کر دے گی ۔

ترقیاتی کارپوریشنز جیسے آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (اے پی آئی ڈی سی) آندھرا پردیش اسٹیٹ فینانشیل کارپوریشن ۔ آندھرا پردیش انڈسٹریل انفرااسٹرکچر کارپوریشن (اے پی آئی آئی سی) ان تمام برسوں کے دوران ریاست میں متوازن علاقہ جاتی ترقی کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں ۔

دیہی علاقوں میں پینے کا پانی

آندھرا پردیش میں دیہی علاقوں کے لئے پینے کے پانی کی سربراہی کے مسئلہ پر ترجیحی توجہ دی جارہی ہے۔

سال ۱۹۷۸ء کے دوران تقریباً ۲۵۰۰ سالانہ اوسط کے مقابلے میں ۳۹۲۰ بور ویلز کی کھدائی عمل میں لائی گئی۔

مزید برآں ایک ماسٹر پلان تیار کی گئی ہے جس کے ذریعہ سرگرمی سے علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ریاست میں فلورائڈ سے متاثرہ ۱۷۱ مواضعات میں محفوظ پانی کی سربراہی کے ایک پراجکٹ کو حکومت نیدرلینڈز کی اعانت سے مستقبل قریب میں روبہ عمل لانے کی تجویز ہے۔

D.G I & P R. 49/ ... 4/ADVT/C4/79
D/9.3.79

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۴۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جون ۱۹۷۱ء

جلد : ۳۴ شمارہ : ۶

قیمت فی شمارہ : ایک روپیہ پچہتر پیسے

زرِ سالانہ ——— ۲۰ روپے
ششماہی ——— ۱۰ روپے

زرِ سالانہ بیرونی ممالک ہوائی ڈاک سے

مشرق وسطیٰ کے ممالک : ۱۰ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون : ۸ ڈالر
امریکہ : ۱۲ ڈالر
برطانیہ اور یورپی ممالک : ۱۴ ڈالر
بنگلہ دیش : ۵ ڈالر

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان۔
مقامِ اشاعت : ادارہ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ۔ حیدرآباد — ۴

ترتیب

چیلنج کے مماثل ایک مسئلہ

آندھرا پردیش میں دیہی ترقیات کا مسئلہ ایک چیلنج کے مماثل ہے۔ اس لئے حالیہ زمانہ میں سرعت کے ساتھ شہروں کے فروغ کے پیش نظر ایک ایسے ادارہ کی ضرورت ناگزیر ہوگئی جو نہ صرف ہمارے شہروں کے پھیلاؤ میں باقاعدگی پیدا کرے بلکہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی شہری ترقی کے لئے منصوبہ سازی کا کام بھی انجام دے۔

چنانچہ حیدرآباد۔ وشاکھاپٹنم اور وجے واڑہ میں تین شہری ترقیاتی اداروں کی تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ ادارے اس وقت ماسٹر پلانس اور زونل پلانس کی تیاری میں نیز شہری ترقیاتی پروگراموں کی عمل آوری میں مصروف و سرگرم ہیں۔

شہری ترقیاتی منصوبے مستقبل میں ہمارے
شہروں کی توسیع و ترقی کے آئینہ دار ہیں

DIPR 52/662/ADVT/C4/79 DT 24.5.79

ابراہیم یوسف

اندر سبھاؤں کا پس منظر

محرکات اور تاریخی اہمیت

بعض کتابیں اس قدر خوش قسمت ہوتی ہیں کہ ان کی حیثیت تاریخ ساز ہو جاتی ہے، ان پر کتنی ہی تنقید کیوں نہ کی جائے۔ ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی، بلکہ یہ تنقید اس کی شہرت اور مقبولیت کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسی ہی خوش نصیب کتابوں میں سے ایک "اندر سبھا" امانت بھی ہے۔ اگرچہ بقول مصنف یہ "دو چار گھڑی دل لگی کی صورت" پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی تھی اور اول اول امانت نے اسے خود سے منسوب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا، مگر ان کو شہرت اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی، باوجود اس کے کہ اندر سبھا قبول عام اور شہرت دوام حاصل کر چکی تھی۔ پھر بھی ان کے چھوٹے صاحبزادے فصاحت اسے قبول نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں، "ان کے چھوٹے صاحبزادے فصاحت کو میں نے دیکھا ہے۔ ان کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی ان کے والد کا ذکر اندر سبھا امانت کے مصنف کی حیثیت سے کرتا تھا تو ان کو ناگوار ہوتا تھا اور بعض اوقات کہہ دیتے تھے کہ انہوں نے اتنے قصیدے، مخمس، مسدس، غزلیں اور مرثیے کہے مگر آپ کو صرف اندر سبھا یاد رہ گئی!" (اردو ڈراما اور اسٹیج (حصہ دوم) از مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۵۷) اس کے علاوہ مولوی نذیر احمد اس کی "ہر جلد کو موقتی اور دریدنی" سمجھتے تھے۔ اور ناصر لکھنوی کے نزدیک اس کے دیکھنے سے "ہزار ہا مرد لوطی اور مغلم" ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود اس کی مقبولیت اور اہمیت کم نہیں ہوئی۔ اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ عرصہ تک لوگ لفظ اندر سبھا کو ناٹک کے معنوں میں استعمال کرتے رہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اندر سبھا نے نہ صرف تفریح کا ایک نیا ذریعہ پیدا کر دیا، بلکہ ایک ایسی روایت کی بھی بنیاد ڈالی، جو عرصے تک اردو ڈرامے اور اسٹیج پر حکمرانی کرتی رہی۔ اس کے تتبع میں بے شمار سبھائیں لکھی اور کھیلی گئیں۔ یہاں تک کہ اردو کا تجارتی اسٹیج جو عرف عام میں پارسی تھیٹر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگرچہ اس نے اپنی عمارت کی بنیاد مغرب کی مضحکہ خیز نقالی پر قائم کی تھی۔

ان سبھاؤں کی سب سے بڑی خصوصیت ہندو دیو مالا کے مشہور کردار راجا اندر کی شخصیت کے گرد کسی قصہ یا کہانی کی ترتیب ہے جو رقص، موسیقی اور شاعری کے اشتراک سے ترتیب دی جاتی ہے اور ان میں بالعموم پری اور انسان کے عشق کی داستان بیان کی جاتی ہے۔ ان سبھاؤں میں راجا اندر کبھی راجا اندر ہی ہوتا ہے، لیکن کبھی اس کا نام فیروز شاہ

کبھی شاہ جن اور کبھی سلیماں شاہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن سب کی خصوصیت ایک ہی ہوتی ہے کہ وہ پرستان میں رہ کر دیو اور پریوں پر حکومت کرتا ہے اور رقص و موسیقی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ ایسی سبھاؤں کو جن میں دیو مالائی کردار ہوتے ہیں" اندر سبھا کی ناٹک کہا جا سکتا ہے جو دیگر منظوم ڈراموں سے لپے ان مافوق الفطرت کرداروں کے باعث علیحدہ صنف کے طور پر قبول کئے جا سکتے ہیں۔

اندر سبھا امانت' اردو ڈرامے کا نقش اوّل ہے۔ جس نے رقص و موسیقی اور شاعری کے اشتراک سے جنم لیا ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ڈراما رقص' موسیقی اور شاعری کے اشتراک سے پیدا ہوتا ہے تو کیا اس کی کوئی انفرادیت ہے یا وہ صرف رقص' موسیقی اور شاعری کی مکمل یا نا مکمل نقل ہے۔ اور پھر اس کا زندگی سے کیا تعلق ہے۔ رقص' موسیقی اور شاعری انسانی جذبات کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں۔ جب انسان کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے تو وہ کبھی اعضا کی جنبش سے' کبھی آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اور کبھی الفاظ کو ایک آہنگ میں ترتیب دیکر ان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ وہ لمحات ہیں جب انسان جذبات سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کی روح ایک بے چینی سی محسوس کرتی ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس بے چینی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اب خواہ وہ اعضا کی جنبش سے ہو' خواہ آواز کے اُتار چڑھاؤ سے' خواہ الفاظ کے منظم آہنگ سے۔

انسان جب بھی علاحدہ علاحدہ ان ذریعوں کو اظہار کا وسیلہ بناتا ہے تو اس کا احساس اور احساس کا اظہار ایک محدود دائرے میں سمٹا ہوا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جب وہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار ان سب کو یکجا کرکے کرتا ہے تو اس کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے اور اس جذبے اور احساس کا اظہار اپنی مکمل شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور یہی ڈرامے کی منزل ہے یہاں وہ زندگی کی نقل نہ رہ کر' زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ یہاں زندگی کے مجرّد تصورات اور اخلاقیات کی بے روح اور بے جان پیکر تراشی نہیں ہوتی' بلکہ حقیقی زندگی اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کائنات بطور ایک آئینہ کے ہوتی ہے' جہاں انسان محض ایک ذرہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ کائنات کو اپنی تخلیقی قوتوں سے سنوارتا نظر آتا ہے' یہاں اس کی حیثیت نقال کی نہیں ہوتی' بلکہ معمار اور خالق کی ہے جو غیر محسوس طور پر انسان کی تخلیق میں شریک ہو جاتا ہے" اس طرح ڈراما صرف نقالی کا نام نہیں رہ جاتا' بلکہ ایک تخلیقی قوت کا نام ہو جاتا ہے' جو شاعری' موسیقی اور رقص سے تراشے ہوئے پیکر میں ایسی روح پھونک دیتا ہے' جو نہ صرف زندگی بلکہ زندگی کی ایک علامت بھی بن جاتا ہے۔ اس لئے یہ عام خیال کہ ڈراما زندگی کی نقل ہے' ڈرامے کو محدود نظر سے دیکھنا ہے۔

ڈراما انسانی زندگی کی گہما گہمی اور پیچیدگیوں کو پیش کرتا ہے مگر زندگی میں یہ گہما گہمی اور پیچیدگیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ انسان ضد کے اصول پر سوچتا ہے یعنی کالے کے مقابلے میں سفید' نیکی کے مقابلے میں بدی وغیرہ۔ درحقیقت کائنات تضادات سے بھری ہوئی ہے اور ان تضادات سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے ڈراما اسی ٹکراؤ سے اپنا مواد حاصل کرتا ہے پھر مختلف زاویوں میں بکھری ہوئی زندگی کو بے نقاب کرتا ہے۔ جب انسان اپنے آس پاس کی زندگی کو بے نقاب دیکھتا ہے تو وہ ایک روحانی لذت محسوس کرتا ہے اور اس لذت سے وہ زندگی کے متعلق ادراک و آگہی کی تہی دستیاں حاصل کرتا ہے۔ عام انسان

جب ڈراما دیکھا جاتا ہے تو وہ اخلاق، فلسفہ اور مذہب پر وعظ سننے کا خواہشمند نہیں ہوتا کیونکہ یہ وعظ اور لیکچر زندگی کا جو مجرّد تصور پیش کرتے ہیں، وہ تھکے ہوئے ذہن اور عضویاتی نظام کے تشنج کو دور کرنے میں مدد نہیں کرتے بلکہ اس کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ مگر ڈراما اس کے برعکس حقیقی زندگی کو پیش کرتا ہے اور زندگی کی ناہمواریوں کو ایسی شکل دیتا ہے کہ تھکے ہوئے ذہن کو سکون اور عضویاتی نظام کی بے ربطی اور بے نظمی میں ایک ربط اور نظم پیدا ہو جاتا ہے، جس سے انسان کو ایک سکون کا احساس ہوتا ہے اور کوئی مخصوص تصورِ حیات اس طرح جذباتی انداز میں سامنے آتا ہے کہ انسان مسرت اور لذت سے خود کو ہمکنار پاتا ہے۔ یہی نہیں کہ ڈراما دیکھنے کے بعد انسان مسرت اور لذت حاصل کرتا ہے بلکہ اس کے مزاج میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک مزاج بھی پیدا ہوتا ہے، جو زندگی میں ایک تازگی پیدا کرتا ہے، جس سے ایک نیا جوش اور ولولہ جنم لیتا ہے۔

اگر ہم ڈرامے کی اس محدود تعریف کو کہ یہ زندگی کی نقل ہے، نظر انداز کر کے اس کو کائنات کی وسعتوں میں پھیلا ہوا دیکھیں تو ان اندر سبھاؤں میں انسانی زندگی کے کچھ نئے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انسان نے ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے گرد کچھ ملائم اور دلکش جال بن رکھے ہیں اور پھر ان کے اندر خود کو مقید کر لیا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی ایک تو وہ ہے جو خول کے اندر بند رہ کر سانس لینے کے لئے ہے اور جس میں گھٹن کا قدم قدم کا شدید احساس ہوتا ہے، دوسری وہ ہے جو ریشم کے ملائم دھاگے کی طرح اس زندگی کا حصہ بن گئی ہے اور جس کے ذریعہ انسان گھٹن کے احساس کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اس کی وہ تصوراتی زندگی ہے، جس سے وہ غمگین لمحات میں روشنی اور مسرت حاصل کرتا ہے۔ اس کی کوئی سائنٹفک بنیاد تلاش کرنا تو مشکل ہے مگر یہ عقائد اور روایات کی بنیادوں پر مضبوطی سے کھڑی ہے۔ جس طرح کائنات کے بہت سے عقیدے ابھی تک حل نہیں کئے جا سکے ہیں، اسی لئے یہ بھی لاینحل ہوتے ہوئے بھی زندگی میں ایسے داخل ہو گئے ہیں، جیسے صدیوں پہلے انھیں حل کر چکا ہو۔ اس کو عرفِ عام میں ضمنیاتی زندگی کہا جاتا ہے۔ اس ضمنیاتی زندگی نے انسان کی زندگی کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے، اگرچہ یہ حقیقی زندگی کی نمائندگی نہیں کرتی۔ پھر بھی عقائد اور تصوراتی زندگی کی ضرور نمائندگی کرتی ہے۔ اس لئے ڈرامے کے میدان سے خارج کر دینا، انسان کو اس کی زندگی کے ایک اہم حصے سے محروم کر دینا ہے۔

ان اندر سبھاؤں کا ایک پہلو ضمنیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ڈرامے کی ترقی انہی اقوام اور ممالک میں ہوئی، جہاں اصنام پرستی اور دیومالا کی بنیادیں مضبوط اور گہری تھیں۔ وہ ہندوستان ہو یا یونان۔ دونوں جگہ مذہب کی جڑیں دیومالا پر قائم ہیں اور پھر ان ہی سے معاشرت اور تہذیب کے گل بوٹے پھوٹے ہیں۔ یہ ضمنیاتی زندگی ہی وہ چیز ہے جو بظاہر حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتی ہے، مگر حقیقتاً وہ زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جو تھکی اور ٹوٹی زندگی کے لئے پیغامِ مسرت ہے۔ انسان جب مایوسیوں کی گہرائیوں میں کھو جاتا ہے تو اسے زندگی کا یہی پہلو روشنی دکھاتا ہے۔ انسان کتنا ہی ترقی پسند بن کر ان خیالات کا مضحکہ اڑاتا ہے جو دیومالائی زندگی سے متعلق ہیں لیکن ایک وقت وہ یہ ضرور محسوس کرتا ہے کہ اس زندگی میں سچائی نہ ہوتے ہوئے بھی اس میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے، جو اس کی زندگی میں ولولہ اور جوش پیدا کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کہ اندر سبھاؤں کے مافوق الفطرت کردار سچائی اور حقیقت سے دور ہیں۔ زندگی کے اس حصے کو نوچ کر پھینک دیتا ہے، جہاں سے زندگی کی تاریکیوں میں سورج طلوع ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک اور نقطۂ فکر سے اس پر غور کریں تو ہمیں ایک نیا ہی پہلو ان اندر سبھاؤں میں نظر

آتا ہے۔ راجا اندر کا کردار ہو یا سلیمان شاہ کا۔ جب اس کو ان اندر سبھاؤں میں پیش کیا جاتا ہے تو وہ اپنے عمل کے باعث انسان سے مختلف کوئی مخلوق نظر نہیں آتا بلکہ انسان کا ایک ایسا روپ نظر آتا ہے جو عام انسان سے تھوڑی بلندی پر بیٹھا ہوا ہے۔ برخلاف اس کے دیو اور پریاں ایسی صورت میں پیش کی جاتی ہیں جو مافوق الفطرت قوتوں کی مظہر ہیں اور جب راجہ اندر یا سلیمان شاہ کو ان پر حکومت کرتے دکھلایا جاتا ہے تو انسان فخر و غرور کا احساس کرتا ہے۔ اور اسے طمانیتِ قلب کا احساس ہوتا ہے۔ راجا اندر یا سلیمان شاہ کو انسان خود سے الگ کوئی مخلوق تصور نہیں کرتا، لیکن دیو اور پریوں کو وہ اپنے میں شامل نہیں کر سکتا اور پھر راجا اندر یا سلیمان شاہ کا وجود اس کا اپنا وجود بن جاتا ہے اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ جیسے کائنات کی غیر مرئی قوتوں کو اس نے تسخیر کر لیا ہے۔ اس لئے اندر سبھاؤں کو صرف اس لئے معتوب قرار دینا کہ اس کے کردار عام زندگی سے تعلق نہیں رکھتے نہ صرف عقائد اور روایات اس سے چھین لینا ہے بلکہ اس احساسِ برتری کو بھی ختم کر دینے کی کوشش کرتا ہے جو کہ انسان ان کرداروں کے ذریعہ کائنات میں اپنے لئے محسوس کرتا ہے۔

اندر سبھاؤں کا ایک دوسرا پہلو رقص و موسیقی کی بہتات ہے اور ان کا یہی پہلو سب سے زیادہ تنقید کی زد میں آیا ہے کہ ان میں رقص و موسیقی کا عنصر اتنا غالب ہے کہ اس کے باعث ڈرامے کے دیگر عناصر مفقود ہو گئے ہیں۔ یہ اعتراض مغربی ڈرامے کی اس ترقی یافتہ شکل کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے جو صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ہندوستان آیا ہے اور جس میں تعمیر و ہیئت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ ڈرامے کا ایک روپ وہ بھی ہے جو رقص و موسیقی اور شاعری کے اشتراک سے پیدا ہوتا ہے یہ اندر سبھائیں اسی روپ کا مظہر ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان میں جہاں رقص و موسیقی کو مذہبی اہمیت حاصل ہے، وہاں ڈرامے کے اس پہلو پر تنقید کرنا ہندوستانی تہذیب، روایات، اور مذہب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مسلمانوں کے فلسفۂ مذہب میں رقص و موسیقی کو کوئی جگہ حاصل نہیں ہے، لیکن جب وہ ہندوستان آئے اور یہاں کی زندگی میں گھل مل گئے تو رقص و موسیقی کو اپنی زندگی میں اسی طرح اپنایا، جیسے ان کی نامکمل زندگی کی تکمیل ہو گئی ہو۔ بالخصوص موسیقی کو تو ایسے گلے لگایا جیسے ہندوستانی فنِ موسیقی کو ان کا انتظار تھا۔ ایک فرقہ نے تو موسیقی کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھ لیا۔ یہ فرقہ ان انسانوں کا نہیں تھا جو مذہب سے لاعلم ہو، بلکہ اولیائے کرام کا تھا جو مذہب کی روح سے پوری طور پر واقف تھا اور یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے موسیقی کو لہو و لعب کا ذریعہ نہ بنایا ہو اور پھر ان اندر سبھاؤں میں موسیقی کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان اندر سبھاؤں میں جو رقص و موسیقی اور شاعری کا اشتراک ہے اس کے ذریعہ کائنات کے ان تضادات کو جس سے ٹکراؤ پیدا ہو کر ڈرامے کی شکل پیدا ہوتی ہے، پیش کیا گیا ہے یا نہیں تو پہلی نظر میں ہمیں مایوسی ہوتی ہے مگر بات اتنی آسان نہیں کہ اسے آسانی سے قبول کر لیا جائے۔

عام طور پر اندر سبھاؤں پر کئے جانے والے اس اعتراض کا کہ ان میں زندگی کی وہ روح نہیں ہے، جو ڈرامے کو زندگی کا نمائندہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ جواب دے کر مطمئن ہونے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کے مصنف ڈرامے کے فن، اس کے فلسفے اور انسان کی نفسیات سے واقف نہیں تھے لیکن یہ اعتراض اردو کے تمام ابتدائی ڈراموں پر کیا جا سکتا ہے۔ ان معترضین کا خیال ہے کہ یہ ڈراما نگار کسی داستان کو لنگڑے لولے انداز میں مکالموں کے ذریعہ بیان کرنے کو ڈراما سمجھتے ہیں اور ڈراما ان کے نزدیک

صرف تفریح کا ذریعہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اندر سبھاؤں اور ڈراموں کی اس کم مائیگی میں پوری دو نسلوں کے نفسیاتی، تہذیبی، معاشرتی اور کاروباری عوامل شامل ہیں، جن پر غور کیا جانا ضروری ہے، جس سے ان اندر سبھاؤں کے بارے میں کوئی صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

ان سبھاؤں کا آغاز لکھنؤ کے تعیش پسند معاشرہ میں امانت کی اندر سبھا سے ہوا۔ اس سے پہلے واجد علی شاہ اپنا رہس "رادھا کنہیا کا قصہ" اسٹیج کر چکے تھے اس میں شک نہیں کہ واجد علی شاہ غیر معمولی ذہن اور طباع فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک روشن خیال حکمراں بھی تھے مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی چیرہ دستیوں نے اودھ کے معاشرہ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں اور بے بس حکمران کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ راگ رنگ میں ڈوب کر اپنے اس روحانی کرب کی تلافی کرے جس نے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔ راس لیلائیں اس کے پیش نظر تھیں۔ ان کے مذہبی پہلو سے قطع نظر کر کے ان کا تفریحی پہلو اس کے لئے باعثِ کشش تھا چنانچہ رادھا کنہیا کا قصہ لکھ کر اس نے اپنی بے بسی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ "رادھا کنہیا کا قصہ" میں صرف ایک عاشق کی مجبوری نہیں ایک حکمراں کی مجبوری ہے اگرچہ اس کو شعوری نہیں کہا جا سکتا۔ مگر لاشعوری ہونے پر شک کی گنجائش کم ہے رادھا کی خوشامد، پنہارنیوں کی خوشامد، گھمن والیوں کی خوشامد کو صرف جاگیردارانہ نظامِ حیات کی دین کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ بلکہ شکست خوردہ ذہنیت کی وہ علامت ہے جو معاشرہ میں فاسد خون کی طرح گردش کرنے لگا تھا۔

"رادھا کنہیا کا قصہ" کے بعد امانت کی اندر سبھا نوابی تفریح کا ذریعہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ امانت نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اسے "دو چار گھڑی دل لگی کی صورت" پیدا کرنے کے لئے لکھا تھا۔ ایک طرف تو عظیم مغلیہ سلطنت دم توڑ چکی تھی۔ دوسری طرف سلطنت اودھ ایک کٹھ پتلی حکمراں کے زیر فرمان تھی۔ ہر طرف تاریکی اور اندھیرا تھا۔ ایسی صورت میں دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہی غنیمت تھی۔ یہاں بھی ہم کو وہی شکست خوردہ ذہنیت نظر آتی ہے۔ جو عوامی سطح پر زہر بن کر زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی اور زہر کی گولیوں پر مٹھاس کی پرتیں چڑھا کر عوام اس کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندر سبھا کا ہیرو گلفام ایک شہزادہ ہے جو شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہے جس میں عمل اور جدوجہد کا فقدان ہے۔ سبز پری کے کردار میں تھوڑی بہت عمل و حرکت اور جدوجہد نظر آتی ہے مگر اس میں بھی راجہ اندر سے دو بدو ہونے کی ہمت نہیں بلکہ صرف انعام و اکرام کی طالب ہوتی ہے، جس سے اس دور کے ذہنوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان دونوں ابتدائی کوششوں کو دیکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عوام اور خواص شعوری طور پر شکست خوردگی کا شکار ہو چکے تھے۔ جس سے تصادم کا خیال ہر سطح پر ختم ہو چکا تھا اس لئے اگر ان سبھاؤں میں تصادم کا فقدان ہے تو اسے کوئی غیر معمولی حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ جب ہم ہندوستانیوں کے فلسفۂ حیات کو پیش نظر رکھ کر ان سبھاؤں کو دیکھتے ہیں تو مایوسی کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں۔ قناعت پسندی ہندوستانیوں کا فلسفۂ حیات ہے اور قناعت پسندی سے ٹکراؤ کا فلسفہ جنم نہیں لیتا بلکہ جیو اور جینے دو کا فلسفہ معرض وجود میں آتا ہے۔ آج کی دنیا میں جیو اور جینے دو کا فلسفہ اپنی اہمیت کھو چکا ہے لیکن پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ زندگی کا ایک شریفانہ رویہ ہے۔ ان اندر سبھاؤں میں قناعت پسندی کا جذبہ ملتا ہے اس میں چوں کہ احتجاج کا پہلو نہیں ہوتا ٹکراؤ کی وہ صورت

نہیں ملتی جو مغربی ڈراموں میں نظر آتی ہے۔ مغرب میں صنعتی انقلاب نے جہد للبقا کو زندگی کا ایک حصہ بنادیا تھا بلکہ وہاں کی پوری زندگی ہی جہد للبقا ہو کر رہ گئی تھی، اس سے قدم قدم پر تصادم پیدا ہونا ناگزیر تھا جو وہاں کے ڈراموں میں نظر آتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں ہندوستان میں اللہ ہو کے نعرے تھے۔ اللہ ہو کے نعروں سے تصادم، کشمکش اور جدوجہد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو طبقہ اللہ ہو کے نعروں سے دور تھا وہ تن آسانی اور عیش و عشرت کا خوگر تھا اور جو کچھ اس کے پاس تھا اس سے مطمئن تھا اس لئے وہ حضرات جو اندر سبھاؤں کو مغربی معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں ان بنیادی حقائق سے چشم پوشی کر لیتے ہیں یا پھر ان کے پیش نظر پارسی تھیٹر کے ڈرامے ہوتے ہیں جو نہ تو مغربی ڈراموں پر پورے اترتے ہیں اور نہ ہی ان کی کامیاب نقالی کرتے نظر آتے ہیں۔ مغربی ڈراموں کا سرچشمہ یونانی ڈرامے کے اصول ہیں جن میں حالات کے پیش نظر تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں اور جو برسوں کے تجربات کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد ہندوستان آئے ہیں جب ہم قدیم یونانی ڈراموں کا سنسکرت کے قدیم ڈراموں سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں کے اصولوں میں ہمیں بین فرق نظر آتا ہے۔ یونانی ڈرامے کی بنیاد ٹریجڈی پر ہے جب کہ سنسکرت ڈرامے میں ٹریجڈی کی کوئی جگہ نہیں بلکہ وہ ایسے سین جس میں زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش کیا گیا ہو جو انسانی دل و دماغ پر برا اثر ڈالے یا اخلاقی نقطہ نظر سے معیوب ہو اسٹیج پر دکھانے کی ممانعت کرتا ہے۔ غیر شعوری طور پر ان اندر سبھاؤں میں بالعموم ایسے مناظر نہیں ملتے جو سنسکرت ڈرامے کی نفی کرتے ہوں برخلاف اس کے پارسی تھیٹر کے ڈراموں میں قتل و غارت گری اور دس د تار دکھلانے کا عام رواج تھا جو ہندوستانی تہذیب اور معاشرت سے مناسبت نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے اندر سبھائیں ہندوستانی معاشرت اور تہذیب سے زیادہ قریب ہیں جب کہ اس دور کے وہ ڈرامے جو پارسی تھیٹر میں اسٹیج کئے گئے ہندوستانی معاشرت اور تہذیب سے اتنے ہی دور ہیں بلکہ وہ ایک طرح سے وہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کا مضحکہ اڑاتے نظر آتے ہیں ایسی صورت میں اندر سبھاؤں کو اس لئے نظر انداز کر دینا کہ وہ مغربی اصولوں پر پوری نہیں اترتیں خود اپنی تہذیب، معاشرت اور روایات سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ ان اندر سبھاؤں میں ہمیں زندگی کا وہ رویہ نظر آتا ہے جو حریف نہ ہے اور جس کو رقص، موسیقی اور شاعری کے ذریعہ اور زیادہ تابناک بنا کر پیش کیا گیا ہو مگر ان میں تصادم کا وہ نظریہ نہیں ملتا جو مغرب نے دیا ہے اس بنا پر یہ قابل گردن زدنی قرار نہیں دی جا سکتیں۔

ڈرامے کی تخلیق کے لئے ایسے معاشرہ کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اقدار حیات پر سکون معاشرے میں منظم اور متعین ہوں معاشرے میں پھیلی ہوئی بے سکونی اور بے چینی ڈرامے کے لئے سازگار نہیں ہوتی۔ یونان میں جب ڈرامے نے ترقی کی اس وقت یونانیوں کی زندگی خوش حالی، بے فکری اور صحت مندی سے عبارت تھی اس لئے وہاں کے ڈراموں میں ایک صحت مند تنقید حیات ملتی ہے اسی طرح سنسکرت ڈرامے کی ترقی اس زمانے میں ہوئی جسے ہندو معاشرہ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ شیکسپیئر بھی انگلستان کے عہد زرین کی پیداوار ہے لیکن جس زمانے میں یہ اندر سبھائیں عالم وجود میں آئیں، ہندوستانی معاشرہ میں متعین اقدار حیات کا شکست و ریخت کا دور شروع ہو چکا تھا۔ ایک طرف تو سیاسی افراتفری تھی دوسری طرف ان اقدار کی شکست تھی جن کو عوام خواص سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے۔ ایسی صورت میں نہ صرف اندر سبھاؤں بلکہ دوسرے منضبط ادب میں افراتفری پیدا ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ اندر سبھاؤں کا المیہ تھا کہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوئیں جب کہ ذہنوں میں شکست خوردگی اور تخلیقی..

قوتوں میں جمود پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

اندر سبھاؤں سے قطع نظر کر کے اگر ہم پارسی تھیٹر کے ڈراموں پر نظر ڈالیں تو ان میں اور بھی افراتفری، کم مائیگی اور جمود نظر آتا ہے۔ پارسی قوم موقع شناسی اور کاروباری ذہنیت کی حامل ہے۔ اس نے اس راز کو پا لیا کہ قوم شکست خوردگی کا بری طرح شکار ہو چکی ہے اور اپنے درد اور غم کو صرف قہقہے لگا کر بھول جانا چاہتی ہے۔ چناں چہ انھوں نے جو ڈرامے اسٹیج کرنے کے لئے تیار کئے ان میں ڈرامے کے اسکرپٹ کو ثانوی حیثیت بھی نہیں دی، بلکہ گانوں کی بھرمار، چمک بھڑک والے ناچ اور کرتبی اسٹیج کے ذریعہ عوام کو نیند کی گولیاں دیتے رہے۔ اور پارسی تھیٹر، جس کو غلط فہمی کی بنا پر اردو اسٹیج کا بہترین عہد سمجھ لیا گیا ہے، ڈرامہ کے اصل منصب سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ چوں کہ کاروباری مصلحتیں صرف نفع اور نقصان کی مصلحت کو سمجھتی ہیں اس لئے پارسی تھیٹر بھی ڈرامے کو صرف نفع اور نقصان کی مصلحت کو سمجھتی ہیں اس لئے پارسی تھیٹر بھی ڈرامے کو صرف نفع اور نقصان کی ترازو میں پرکھتا رہا۔

یہ اردو ڈرامے کی بدنصیبی تھی کہ اندر سبھاؤں کے مقابلے میں پارسی تھیٹر عالم وجود میں آ گیا، جس کا کوئی تعلق ہندوستانی روایات، ہندوستانی فلسفۂ زندگی اور ہندوستانی تہذیب سے نہیں تھا۔ لیکن اس کی چمک بھڑک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھی اور اس کا کرتبی اسٹیج لوگوں کو حیرت زدہ کر دیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندر سبھاؤں کے روپ میں جو خالص ہندوستانی روایات اور فلسفۂ زندگی سے ہم آہنگ ڈراما اور اسٹیج وجود میں آ رہا تھا وہ پنپ نہ سکا۔ اگرچہ خود اندر سبھا امانت سیکڑوں بار پارسی اسٹیج پر کھیلی گئی۔ مگر اس کی پیش کش میں وہ سادگی نہیں تھی، جس سادگی سے وہ عالم وجود میں آئی تھی بلکہ پارسی تھیٹر کے کرتبی اسٹیج کا شکار ہو گئی تھی اور وہاں وہ اندر سبھا نہ رہ کر جادوگری کا مظاہرہ معلوم ہوتی تھی۔ اگر اندر سبھائیں قدرتی راستے پر چل کر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہتیں تو آج اردو کا خالص اپنا اسٹیج وجود میں آ گیا ہوتا اور آج جو اردو ڈرامے کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے، وہ نہ ہوتا۔

تصوف اور خدمتِ خلق ص ۲۴ سے آگے...

سے ادا کیا اور مجموعی طور سے عام انسانوں سے ہمدردی، محبت اور غم خواری کے آداب سکھائے تکبر سے روکا اور انکساری کی تعلیم دی۔ خود بھوکا رہ کر بھوکوں کو کھلایا۔ بنی نوع انسان کو قناعت کی تعلیم دی۔ تونگری کے بجائے تنگ دستی، افراط کے بجائے قلت اور انکساری میں خوش رہنے کے آداب سکھائے۔ سیدھی سادھی زندگی پر زور دیا، لینے میں نہیں دینے میں اطمینانِ قلب محسوس کیا۔ اور اسی کی تلقین کرتے رہے۔ قول و فعل اور حال و قال میں ہم آہنگ رہے اور ہم آہنگ رہنے کے طور بتلائے۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی؎:

'ہمارے زمانہ کے مشائخ، پیرزادوں، اور صاحبانِ سجادہ کے رئیسانہ و شاہانہ طرز معاشرت کو اس صحیح درویشی اور فقیری سے کوئی نسبت ہے؟' اگر ایسی نسبت نہیں ہے تو ایسی نسبت پیدا کی جانی چاہیے' اور یہ ہر طرح ناگزیر ہے۔ اول تو اس لئے کہ آج ہم جن صوفیا کا نام لیتے ہیں اور ہم میں سے بہت سے جن سے نسبت رکھتے اور اس پر اظہار تفخر کرتے ہیں، اس کی کچھ تو لاج رہے۔ اس سے ہمارے درجات ہی بلند ہوں گے۔ اگر ہم ان صوفیانِ باصفا کی تعلیمات کو اپنی زندگی کے لئے مشعلِ راہ قرار دیں تو صوفیائے کرام کی انسان دوستی اور خدمتِ خلق کا یہ مشن محکم رہے گا۔

غزل

شاذ تمکنت

وہ گداگرانِ جلوہ سرِ رہگزار چپ تھے　　جنھیں تجھ سے تھیں امیدیں وہ امیدوار چپ تھے

وہ قطارِ گمرہاں تھی لئے مشعلیں رواں تھی　　وہ جو منزل آشنا تھے وہ پسِ غبار چپ تھے

یہ عجیب سانحہ تھا جسے چشمِ گل نے دیکھا　　کہ طیورِ دامِ دیدہ سرِ شاخسار چپ تھے

یہ دل و نظر فگاراں ہمی تھے وہ وضعداراں　　پسِ کوئے یار گریاں سرِ کوئے یار چپ تھے

ہمیں کم ملیں سزائیں کہ زیادہ تھیں خطائیں　　ترے سہو کیا گنائیں ترے شرمسار چپ تھے

کسے جرأتِ تسلی کہ وہ بات ہی تھی ایسی　　شبِ انتظار چپ تھی مرے غمگسار چپ تھے

ہوئی ہم پہ سنگ باری مگر اپنی وضع داری
کہ تھی شاذ جن سے یاری وہی اپنے یار چپ تھے

افشاں آفتاب

غزل کی مقبولیت کے اسباب

غزل کی ایجاد کا سہرا ایرانیوں کے سر ہے۔ ایران میں پہلے قصیدہ گوئی کا رواج تھا۔ رفتہ رفتہ قصیدہ کی تشبیب کو غزل کا نام دیا جانے لگا۔ کافی عرصہ تک تشبیب کو ہی غزل جانتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ غزل کی داغ بیل پڑنا شروع ہوئی۔ رودکی پہلا ایرانی شاعر ہے۔ جس نے ابتدائی خطوط استوار کر کے غزل کی باقاعدہ بنیاد ڈالی۔ رودکی کی ابتدائی کوشش میں بھی اتنی رنگینی اور دلکشی تھی کہ ایک دوسرے ایرانی شاعر کو کہنا پڑا کہ۔

"رودکی کی طرح میری غزل نہیں ہوتی۔"

فارسی میں اس نئی صنفِ شعر یعنی غزل کا جو پودا رودکی نے بویا وہ سعدی۔ حافظ۔ خسرو۔ عرفی۔ کلیم کی آبیاریوں سے پروان چڑھا اور بالآخر ایک سرسبز و شاداب درخت کی شکل میں، فارسی ادب کے چمن کے لئے لازوال رونق کا سبب بنا۔ جس کے خوش رنگ پھولوں نے نہ صرف فارسی ادب کو مہکایا، بلکہ اردو کے اکثر شعر کے لئے بقاء دوام کا سہرا بنے۔

غزل کے لغوی معنی "سخن با یار گفتن" کے ہیں اور ظاہر ہو کہ جس کلام کا موضوع محبوب سے یا محبوب کی باتیں کرنا ہو، اس میں عشق و محبت کی داستانوں، طلب و شوق کے دلنواز نغموں اور ہجر و فراق کے جانگداز نالوں کی کارفرمائیاں اور سحر کاریاں ایسی ہوتی ہیں کہ جو انسان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، انسان کی مصروفیات میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے، سائنس کے تجربوں کا میدان کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے۔ عشق و محبت کے حقیقی اور روحانی جذبات اپنا رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ فطرتِ انسانی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کائناتِ ہستی کی تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے عالموں، صوفیوں اور زاہدوں کی پیشانیوں نے بارگاہِ عشق و محبت میں سجدہ ریزی کی ہے۔ جب عشق و محبت کے جذبات کی کارفرمائی سے وحوش و طیور بھی محفوظ نہ رہ سکے تو تو انسان تو اشرف المخلوقات میں ہے اور اس کا احساس لطیف تر ہے۔

فارسی غزل کی روحِ رواں ہیں، عشق و محبت کی داستانیں اور رندی و سرمستی کے مرقعے۔ پھر یہ رندی

وسرمستی اردو میں کیسے نہ آتی۔ آئی اور خوب آئی۔ فرق یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں لوگ "کارہائے کردنی در کنج وخلوت می کنم" کا ذکر مستی و رندی، جام و سبو، بادہ و جام کے الفاظ کے پردہ میں کیا کرتے تھے۔ اگر حقیقتِ حال یہی اور صرف یہی نہیں تھی تو پھر اس قسم کے اشعار کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے : ؎

ہر گنا ہے کہ کنی در شب آدینہ بکن | تاکہ از صدر نشینانِ جہنم باشی

یہاں گناہ اور جہنم کے معنی صاف ظاہر ہیں۔ رمز آشنا حریفوں کے قحط الرجال سے دل شکستہ ہو کر غالب کو یہ راز آشکار کرنا پڑا ؎

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام! | چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو! | بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کچھ امتدادِ زمانہ کے باعث اور کچھ تقلیدِ محض کی بدولت، ایسا وقت آیا کہ شراب اور اس کا نشہ دونوں خالص مادی ہو کر رہ گئے پھر وہ دور بھی آیا کہ بے پیئے بھی مست ہونے لگے۔ بڑے بڑے پرہیزگار شراب و کباب کے مضامین محض اس وجہ سے باندھتے کہ غزل کی مقبولیت ان کے بغیر مشتبہ تھی۔ خمریات کے عناصر میں شراب۔ ساقی۔ پیرِ مغاں۔ جام و ساغر، مستی و سرشاری، باغ و بہار، ابر و ہوا سب ہی آ جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایک خاص بات اور تھی کہ مے خانہ کا مقابلہ مسجد سے ضرور ہوتا تھا اور واعظ، محتسب یا زاہد کی پگڑی اچھالنا، غزل کا ایک لازمی جزو قرار پا گیا تھا۔ یہی مضامین فارسی میں صدیوں تک باندھے گئے۔ چوں کہ ریاکار صوفیہ، علماء اور مشائخ کی پردہ داری میں ایسا مضمون تھا کہ اگر وہ ایک طرف خواص کے لیے تازیانۂ عبرت تھا تو دوسری طرف عوام کے لیے دلچسپی کا موجب۔ اس مضمون نے غزل میں ایک مستقل جگہ حاصل کر لی۔ اور غزل کی مقبولیت کا ایک اہم سبب بنا۔

سعدی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کار پردازیوں کی قلعی کھول دی ہے۔ خیام نے بھی رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا۔ لیکن صاف صاف اور کھلے کھلے الفاظ میں نہیں، بلکہ چھپی چھپی اور چبھتی ہوئی چوٹیں کی ہیں۔ جن سے ریاکاروں کے دل بیدا جائیں۔ خیام کی ایک رباعی ملاحظہ ہو، جس میں ریاکاری، ظاہری بدکاری کے مقابلہ میں زیادہ بڑا گناہ ہے۔ خیام اپنے... مخصوص انداز میں یوں کہتا ہے ؎

زاہد بزنے فاحشہ گفتا مستی۔! | ہر لحظہ بدامِ دگرے پابستی!
زن گفت چنان کہ می نمایم ہستم! | تو نیز چنان کہ می نمائی ہستی۔؟

شیخ نے اس گروہ کو بالکل ننگا کر کے منظرِ عام پر لا کر رکھ دیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں، کوتوال رندوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ لیکن شاہد باز صوفیوں کی اس کو خبر نہیں کہ وہ تصوف کی آڑ میں کیا کیا گل کھلاتے ہیں ؎

محتسب در قفائے رندان است
غافل از صوفیانِ شاہد باز

حافظ نے اس بے باکی اور دلیری سے ان رازہائے سربستہ کو فاش کیا کہ زہد و ریا کاری کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔

واعظان کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چون بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند!

اسی طرح سودا نے بھی واعظ کی تضحیک کی ہے اور اس کی پند و نصیحت کا مذاق اڑایا ہے ؎

سودا کبھی نہ مانیو واعظ کی گفتگو! آوازۂ دہل ہے خوش آیندہ دور کا!

جس طرح فارسی شاعری کے آغاز میں تصوف کا اثر زیادہ ملتا ہے۔ اسی طرح اردو کی ابتدائی شاعری بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب شاعری اور درویشی مترادف الفاظ سمجھے جاتے تھے تصوف کے مضامین کو اس طرح بیان کرنا کہ غزل کی لطافت قائم رہے اور معرفت الٰہی کے مضامین عشق مجازی سے بالکل بے میل نہ ہو جائیں۔ یہی فنکار کا کمال تھا۔ اردو میں ولی سے لے کر درد تک اساتذہ کا کلام دیکھیے، شراب کے مضامین ان بزرگوں کے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی ان کے یہاں شراب کے مضامین سے وہی شراب معرفتِ الٰہی مراد ہے۔

یہ مضامین تغزل کے دائرے میں بیان ہوتے ہیں۔ جیسے ولی اورنگ آبادی فلسفۂ جبر کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

آلودہ کیوں نہ ہووے دامانِ پاک زاہد
جب دستِ نازنین میں جام و شراب ہووے

چکبست نے کہیں کہیں بادہ و ساغر کے پردہ میں 'مشاہدۂ حسن' کی گفتگو کی ہے اور 'نوحۂ قومی' چھیڑا ہے۔ اپنے زمانہ کی نیم مختار حکومتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے! ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے!
یہ کیسی بزم ہے اور کیسے اس کے ساقی ہیں! شراب ہاتھ میں ہے اور پلا نہیں سکتے

آخری دور میں علم و ادب کے بازار میں جب مشرقی فن کاروں کی صناعیوں کے ساتھ مغربی اہل قلم کی گلکاریوں کی جنس ہوش ربا رونق افزا ہو تو واعظ و خانقاہ۔ رند و مےخانہ کے مضامین کی جاذبیت کم ہونے لگی، جس کے نتیجہ کے طور پر اس کی موجودہ حالت میں غزل کی مقبولیت پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ اس دور میں اقبال نے اردو غزل میں تصوف کے اس رنگ اور پہلو کا آغاز کیا، جس کا اب تک ہماری شاعری میں فقدان تھا۔ اب تک شعراء نے تصوف کی روشنی میں زندگی اور فلسفہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اقبال نے فلسفہ تاریخ و ارتقاء اور اجتماعی زندگی پر تصوف کی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں! کار جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر!

غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک خیال یا ایک تاثر نظم کیا جاتا ہے، اور عام طور.. سے ایک شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر بعض بعض حلقوں میں غزل پر یہ اعتراض کیا

یک عام رجحان ہوگیا تھا کہ شاعر ایک ہی وقت میں بظاہر غیر متعلق بلکہ متضاد خیالات کا اظہار اپنی ایک غزل میں یسے کرسکتا ہے ؟ شاعر کے دماغ میں ایک وقت میں مختلف خیالات موج زن ہوسکتے ہیں اور قوتِ بیان اور رتِ اظہار کے ذریعہ وہ ہر خیال کو الگ الگ ایک ایک شعر میں نظم کرکے غزل کی شکل دیتا ہے۔ ظاہر ہے صرف دو مصرعوں میں اور بعض اوقات صرف چند ہی الفاظ میں ایک طویل مضمون باندھنا مشکل کام ہے۔

دل کا تڑپنا ہائے نہ پوچھ ہجر کی شب اور آخر شب
رمزِ حقیقت، حسن کی ذات عشق اسی کی تعریفات

اسی لئے مسعود حسین رضوی نے کہا ہے: "غزل کا ایجاز ہی اس کا اعجاز ہے"۔

انسان کی فطرت تنوع پسند واقع ہوئی ہے۔ اس کی طبیعت میں انتشار بھی فطری ہے۔ یہی وجہ ہے جب وہ زل میں یہ خصوصیات پاتا ہے تو اس کے ذہن کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ غزل کا انتشار اور تنوع اس کی بڑی خوبی ہے۔ ہر حسین چیز میں کچھ نہ کچھ انتشار اور بے ربطی کے باوجود بھی ایک ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ ویسے تو شعراء نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور اقبالؔ، کی متعدد غزلیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں، جن کے خیالات میں بظاہر کوئی تسلسل نہیں، لیکن پوری غزل میں ایک ہی نوع کی فضا اور ایک ہی قسم کی کیفیت طاری محسوس ہوتی ہے

موجودہ دور بے حد مصروفیت کا دور ہے۔ انسان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ طویل اور مسلسل نظمیں لکھے اور ان میں اپنے خیالات، احساسات وجذبات کا پورے طور پر اظہار کرسکے۔ اس مشغولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ دوسری طرف سننے والوں کے لئے بھی "کار جہاں دراز" ہوکر رہ گیا ہے۔ اس لئے شاعر کو غزل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ شاعر غزل کے دو مصرعوں میں اپنے خیالات کو بہت کم وقت میں پیش کرکے اپنے فطری اور ذہنی اضطراب کی تسکین کرلیتا ہے۔ اسی طرح مطالعہ کرنے والے کی ایک بڑی ضرورت غزل کے ذریعہ پوری ہوجاتی ہے۔

غزل کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کی داخلیت ہے۔ عام طور پر غزل میں وہ سارے مضامین ادا کئے جاتے ہیں، جن کا تعلق انسان کے فطری احساس، رجحان اور وجدان سے ہے۔

کوئی شخص، کسی عالم میں ہو، غزل میں ایک نہ ایک شعر ایسا ضرور نکل آئے گا، جو اس کے دلی جذبات کی عکاسی کررہا ہوگا۔ اور اس وقت یہ کہنا ایک سچی حقیقت ہوگا کہ:

"جو سنتا ہے، اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے"۔

ڈاکٹر سیفی پریمی

دبستانِ دہلی کا سخنور ابرؔ احسنی گنوری

زندگی اور ثقافت کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ زندگی ایک واحدہ ہے۔ ثقافت بھی ایک واحدہ ہے۔ مسلسل اور افاقی۔ عمودی اور افقی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ثقافت ایک مشترکہ ورثہ ہے۔ وہ دراصل تمام انسانوں کی جانب سے تمام انسانوں کے لئے ایک انمول دین ہے۔ یہ نادر ورثہ، مرکزی شہروں سے قصبات اور دیہات تک پہنچتا ہے۔ اس فاصلے اور عرصے میں مقامی ردّ و قبول کے بدولت ثقافت کی ایک امتزاجی شکل رونما ہوتی ہے۔ اس میں صحت مند اور بعض غیر صحت مند روایتیں بھی داخل ہو جاتی ہیں۔ انھیں سے سماج کا مزاج بنتا ہے۔ اسی سماج میں افراد جنم لیتے ہیں: تربیت پاتے ہیں شخصیتیں بگڑتی اور بنتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں مولانا ابرؔ نے جس سماج میں، احمد بخش کے نام سے زندگی پائی۔ وہ طبقاتی سماج تھا۔ برطانوی سامراج کا غلبہ تھا۔ اور ایک مخصوص ثقافت کا دور تھا۔ اس وقت قصبہ گنور میں صرف ایک ورنا۔ کیولر مڈل اسکول تھا۔ چند مکتب تھے۔ مولانا معظم علی سنبھلی باوقار اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے مشرقی تہذیب کا مکمل نمونہ۔ ان کے مکتب میں مولانا ابرؔ نے ابتدائی تعلیم پائی۔ ۱۹۱۶ء میں مڈل پاس کیا۔ وہاں مولوی تمیز الدین سکرامپوری جیسے نفاست پسند اور سلامت روی کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے استاد تھے۔ نہایت خوش وضع۔ خوش پوش۔ سرمہ اور عطر کا استعمال سنّت سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ پان کھانے اور فرشی حقہ پینے کے دلدادہ۔ ان کی کلاس میں پان دان رکھا رہتا تھا۔ معائنہ کے وقت بھی اس کو ہٹایا نہیں جاتا تھا۔ قاضی نصیر الدین قائم مقام انسپکٹر آف اسکول بریلی.. ڈویژن معائنہ کو آئے۔ ہیڈ ماسٹر نے بہت التجا کی۔ مگر مولوی صاحب نے پاندان کو نہیں ہٹایا۔ برسوں بعد گنور میں ٹریننگ اسکول قائم ہوا۔

منشی نوبت رائے اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ سخت گیر، منتظم، پابندیٔ اوقات کے عامل۔ ان کی نگرانی میں ابرؔ صاحب نے ۱۹۲۲ء میں اردو پی ٹی سی کا امتحان پاس کیا۔

گنور میں تعلیم اور ملازمت کی سہولتیں کم تھیں۔ وسائل ناپید تھے۔ گنور سے بدایوں کو اور دوسری تحصیلوں کو ملانے والی کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ مگر وہاں کی آبادی اپنی محصور زندگی میں سرشار تھی کشتی لڑنے کے اکھاڑے تھے بیسی گدکا پھری کے اکھاڑے تھے۔ مرثیہ خوانی، نعت خوانی، تعزیہ داری کا زور تھا۔ رام لیلا اور رہس کا شور تھا رات کو چوپالیوں میں الف لیلیٰ، داستانِ امیر حمزہ اور جنگ نامہ حضرت علی وغیرہ سننے کو ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا۔ برسات

میں ڈٹ کر آرا و دل سُنی جاتی تھی۔ مذہبی مناظرے ہوتے تھے۔ قوالی، مجرے اور نوٹنکی کے جھگڑے تھے چنانچہ ان کی منڈلی پہ دل کھول کر رقم خرچ کی جاتی تھی۔ چنانچہ شاعر نے کم و بیش ان مشاغل میں حصہ لیا۔ استاد ظفر کریم کے اکھاڑے میں کشتی کا فن سیکھا۔ برسوں نعت خوانی کی۔ اللہ دین کا تعزیہ مشہور تھا۔ ہر برس اس کا نیا نقشہ مولانا تیار کرتے تھے۔ نہایت باریک، نفیس اور پُر فن کارانہ جالیاں کاٹ کر دیتے تھے۔ سرکاری ملازمت سے چند برس پہلے کان پور کی ایک شو فیکٹری میں جوتے بنانے سیکھے۔ وہیں منشی سخا شاہ جہاں پوری سے کلام پر اصلاح لینی شروع کی۔ ۱۹۱۹ء سے ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور ۱۹۲۲ء میں تربیت یافتہ معلم کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔

تخلیقی ذہن کا انسان فنون لطیفہ اور اس کی بعض شاخوں میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔ مغل تاجداروں کے عہد میں خوش نویسی یا کتابت اور جلد بندی کو فن مصوری کے برابر رتبہ ملا ہوا تھا۔ دنیا کا ہر ملک اس ہندوستانی فن کی بلندی معیار کا معترف تھا۔ یہ فن ہندوستانی کلچر کا ایک جزو بن گیا تھا۔ شہروں سے قصبوں میں پہنچا۔ مولانا اس فن سے بخوبی واقف تھے۔ اپنے کلاس کے ہونہار طلبہ کو خوشنویسی کا فن سکھاتے تھے۔ ان کی نگرانی میں بعض طلبہ قابل رشک کتبے بناتے تھے۔ اور حاشیہ پر بیل بوٹے اور سجاوٹ کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے پاس تکنیک اور متعلقہ اوزار رہتے تھے۔

مولانا نے مڈل اسکول کی سند پر قناعت نہیں کی۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۳ء کے درمیان اعلیٰ قابلیت، منشی، کامل اور ہندی۔ بی۔ٹی۔سی کے امتحانات پاس کر لئے۔ فارسی کی تعلیم پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے والد محترم مولوی رفیع احمد عالی بدایونی سے حاصل کی۔ اور مسعودہ حیات کے والد محترم یعنی میرے حقیقی چچا مولانا حکیم عبدالحکیم کامل سے عربی کا درس لیا۔ مولانا ابر نے اپنے جملہ اساتذہ کی کسی نہ کسی خوبی کو اپنا کر اپنی زندگی میں چمک پیدا کی۔

قصبہ گنّور میں شعر و شاعری کی فضا قائم تھی۔ مولانا ابر احسنی کا شمار تیسرے دَور کے شعراء میں ہوتا ہے۔ دورِ اوّل کے قابلِ ذکر شعراء فضل الدین اعجاز، محمد روشن، مولانا فضل الدین، میاں جی، دوست محمد اور منشی سُکھ لال ہیں۔ یہ شعراء عموماً فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ دوسرے دور میں حافظ اشفاق علی، حکیم شاہ محمد شاکر، افتخار علی، مشتاق علی، قاضی اطہر حسین، سجاد علی، منشی عبادت اللہ داخل ہیں۔ ان کے علاوہ شمشاد علی فارسی گو شاعر تھے اور حکیم عبدالحکیم کامل نے بزرگان دین کی شان میں عربی قصیدے لکھے۔ تیسرے دور کے اہم شعراء میں مولانا ابر احسنی، قدرت اللہ طالب، اور قاضی شمشاد علی ست ہے۔ اس دور کی فہرست طویل ہے اور آج بھی گنّور میں تقریباً ۴۵ شاعر ہیں۔

گنّور میں مشاعرے قدیم سے ہوتے رہے ہیں۔ نواب امداد حسین امداد سنبھلی کی گنّور میں رشتہ داری تھی۔ ان کی آمد اور قیام پر ہر ہفتہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ ابر گنّوری اور ست گنّوری ۱۹۲۲ء میں راز احسنی کی وساطت سے علامہ احسن مارہروی کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا ابر فارغ الاصلاح ہو گئے۔ لیکن اپنے مرشد کی وفات یعنی ۱۹۴۰ء تک اصلاح کا سلسلہ جاری رہا۔ طالب گنّوری نے مولانا ضیاء القادری بدایونی سے فیض

سدح پایا۔ ان تمام شاعروں نے گنور میں منظم طور پر آل انڈیا مشاعروں کا اہتمام کیا۔

اخبار و رسائل میں اپنے کلام کی اشاعت کی۔ ست گنوری نے ایک طویل تمدیہ نظم کتابچہ کی صورت میں یادگار چھوڑی ہے وہ علی گڈھ میں مدفون ہوئے۔ طالب گنوری نے لاہور کو مستقر بنا لیا۔ ادب لطیف، لاہور کے ادارے میں شامل رہے۔ انھوں نے علم عروض پر چند کتابیں لکھیں۔ لاہور میں ان کا مدفن ہے۔ مولانا ابر کا مستزاد کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اصلاح پر توجہ کی۔ اور فیض اصلاح کو ملک گیر پیمانہ پر عام کیا۔ وہ استاد، شاعر اور عروضی کی حیثیت سے معروف ہوئے انہوں نے کہانیاں اور مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کی تالیفات و تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ اصلاح الاصلاح ۱۹۴۹ء) ۲۔ نگینے، دیوان غزل، ۱۹۵۲ء ۳۔ سفینے، نظمیہ شاعری..... ۱۹۵۲ء ۴۔ میری اصلاحیں، حصہ اول، ۱۹۵۶ء ۵۔ قرینے غزلیات ۱۹۶۳ء ۶۔ میری اصلاحیں۔ حصہ دوم، ۱۹۶۶ء ۷۔ تبیینے (حمد، نعت، سلام) ۱۹۶۸ء ۸۔ خزینے، نظم غزل ۱۹۷۱ء

مولانا نے رسائل کی بھی سرپرستی کی۔ رہنمائے تعلیم۔ لاہور، دہلی کی ادارت میں نام شامل رہا۔ ۱۹۴۸ء میں رام پور سے ماہنامہ 'احسن'، جاری کیا۔ اس میں ملشی میغرا حسنی کا بھرپور تعاون تھا۔ ملک کے موقر اخبار و رسائل میں ان کا کلام چھپتا تھا۔ ملک کے مشاعروں میں ان کی شرکت ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔ حکومت یو۔پی نے ۶۴۔۱۹۶۳ء میں ادبی خدمات کے صلہ میں ۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ جاری کیا۔ ان کے تلامذہ نے بڈیالہ میں ۱۹۷۰ء میں جشن ابر منایا اور نذر ابر کی پیش کش کی۔

مولانا کی پوری زندگی معلم کی حیثیت سے گزری۔ آخر میں نواداد اسکول میں حسب مرتبہ تعلیم۔ کے اینڈ نٹس آفیسر بھی رہے۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو رام پور منتقل ہو گئے۔ اور مدرسہ عالیہ رام پور کے اسٹاف میں شامل رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ریٹائر ہوئے اور مستقل طور پر اپنے وطن گنور میں قیام پذیر رہے۔

مولانا نے کلاسیکی ادبی روایات کو مذہب کی طرح سینہ سے لگائے رکھا۔ مگر اپنے مذہب کو بدلتے رہے۔ پہلے وہ کٹر سنی تھے۔ پھر دیوبندی خیالات سے متاثر ہوئے۔ اور آخر میں بہائی مذہب کے معتقد بن گئے۔

اردو میں ایک روایت ادبی معرکہ آرائی کی بھی رہی ہے۔ متقدمین، متوسطین، متاخرین شعراء میں ان کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے اچھے اور برے نتائج بھی نکلے۔ عموماً یہ ادبی معرکہ ذاتیات پر منتج ہوتا تھا۔ آج بھی اس کا چلن ہے مگر منظر نامہ بدلا ہوا ہے۔ مولانا بھی اس قدیم روایت کے راہ رو رہے ہیں۔

مولانا کا مزاج شعلہ و شبنم سے مرکب تھا۔ وہ انتہائی ضبط و تحمل سے کم لیتے تھے لیکن بعض اوقات مشتعل ہو جاتے تھے۔ اس عالم میں ان کی زبان و قلم خود ان کے لئے ضرر رساں بن جاتے تھے۔ ہر مشاعرے کے بعد کوئی اپنا قدردان یا نیا شاگرد پیدا کر لیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ معاندین کی صف میں اضافہ بھی کر آتے تھے۔

یوں تو مولانا باغ و بہار آدمی تھے۔ بذلہ سنجی مزاج میں داخل تھی۔ دوستوں کے علاوہ تلامذہ کی محفل میں بھی بے تکلف فضا قائم رکھتے تھے۔ جوتش پر بھروسہ تھا۔ ہر برس اپنا زائچہ تیار کراتے تھے۔ اچھے اثرات کے لئے..

مختلف نگینوں کی انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ بلیو بلیک انک اور مقوی ادویات خود تیار کرتے تھے۔ عطر حنا اور خس کے قلم جیب میں رکھتے تھے۔ بیاض ہمیشہ ساتھ رہتی تھی۔ فاؤنٹن پن، کلینڈر اور ڈائریاں فرمائش کرکے منگاتے تھے۔

مولانا کی زندگی کا نمایاں وصف پابندیٔ اوقات تھا۔ سفر کے موقع پر ایک گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہنچ جاتے تھے۔ مقامی مشاعروں اور تقریبات میں بھی کم و بیش ہی پابندی کارفرما تھی۔ چار بجے صبح اُٹھ کر تلامذہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ خطوط کے جوابات دو لکھتے تھے۔ تمام چیزوں کی تاریخیں محفوظ رکھتے تھے۔ ناشتہ کے بعد ڈاک خانہ جاکر خود ڈاک اور منی آرڈر وصول کرتے تھے۔ وہیں پاس بک میں رقم جمع کر دیتے تھے۔ کفایت شعاری پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ آخری عمر میں روپے پیسے کے معاملہ میں ڈاکٹر نذیر احمد کے معتقد بن گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی دوست یا شاعر کو قرض بھی دے دیتے تھے۔ وہ اولاد کے معاملے میں خوش نصیب تھے۔ ایک بیٹی اور چار بیٹے موجود ہیں۔ انہوں نے حسبِ استطاعت ان کے لئے روٹی، کپڑا اور مکان کا معقول انتظام کر دیا تھا۔

مولانا کے حلیہ اور پوشش کا نقشہ کچھ اس طرح ہے: " قد دراز، چھریرا بدن، انگریزی بال، سیدھی مانگ بھوؤں پر بالوں کے دو نصف دائرے، فرنچ کٹ داڑھی، نوک دار مونچھیں، لباس میں قمیض، جواہر جیکٹ، چوڑی دار شیروانی، جاڑوں میں اور کوٹ، مفلر میں پن لگی ہوئی، غالباً تقسیم ہند تک یہ عالم برقرار رہا۔ پھر انگریزی بال بڑھ کر کاکلوں میں تبدیل ہو گئے۔ چہرے پر نورانی داڑھی کا ظہور ہوا۔ ڈھیلا پاجامہ، کمر میں قفل کی تالیوں کا گچھا جس میں ایک چھوٹا چاقو وزن و آہنگ بڑھاتا۔ چھڑی ہمیشہ ہاتھ میں رہی۔ عمدہ گھڑیاں رکھتے تھے۔"

محبت اور نفرت کے موضوعات نہ صرف دوش بدوش قائم رہتے ہیں، بلکہ خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ مادرِ وطن کی محبت، وطن فروشوں کے خلاف نفرت کو جنم دیتی ہے۔ جب کہ فرد اور انسانیت کی محبت عموماً استحصال پسند اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ مولانا میں یہ امتزاجی جذبہ راسخ تھا جس کا اظہار ان کی نظمیہ شاعری میں برملا ہوا ہے۔ وہ وطن پرست اور انسان دوست تھے۔

گنّور کا یہ باشندہ اور دبستانِ دہلی کا ایک فرد، محفلِ رنگ و بو سے نکل کر نومبر ۷۳ء میں آسودۂ خاک ہو گیا۔ مگر فن کار کبھی نہیں مرتا۔ فن کا عشق، وطن کا عشق اور انسانیت کا عشق اسے زندہ رکھتا ہے۔

اثر احسنی کا نام ان کے ادبی کارناموں کے باعث امر رہے گا۔ حافظ شیرازی نے برمحل کہا ہے ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

تبصرے کے لئے
ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں۔
سب رس کی توسیع اشاعت میں ادارہ سے تعاون کر کے
اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیجئے۔

غزل

سید اختر نعمانی

خلوت میں شمع یاد جو دل کے قریب کی
پھرنے لگی نگاہ میں صورت حبیب کی

قربت ہوئی نصیب جو بچھڑے حبیب کی
ہر چیز دور ہو گئی اپنے قریب کی

آیا تھا راہِ عشق میں ایسا بھی اک مقام
محسوس ہو رہی تھی ضرورت رقیب کی

تنگ آ کے جس نے بھوک سے کل کی تھی خودکشی
میت اٹھی ہے دھوم سے آج اس غریب کی

دن رات جد نے پہ بھی ملتا نہیں حساب
ہستی "بہی" ہے جیسے اناڑی منیب کی

وہ سر بلند اور سرافراز ہو گیا
باہوں سے جس کی مل گئیں باہیں صلیب کی

سنتے ہیں کل عوام خود آپس میں لڑ پڑے
یوں رنگ لائی شعلہ نوائی خطیب کی

بچپن میں اس کی طرح تھی جو آرزو
گھیرے ہے اب وہ شکل میں دیو مہیب کی

میرے وطن کے راہبر اتنے ہیں دور بیں
صورت انھیں نظر نہیں آتی قریب کی

غیروں نے آ کے لوٹ لیا سارا میکدہ
ہم مانگتے ہی رہ گئے اپنے نصیب کی

آتا تھا لطف اور ہی کچھ عرضِ حال پر
پرچھائیں جب تھی فکر و نظر پر صلیب کی

اختر یہ کیا ہوا کہ پرستارِ شب بھی اب
دینے لگے دہائی سحر کے نقیب کی!

ـب رامش

شاید اب اُسی روز یہ طاقت کہ ہوس جائے
جب اپنی ہی پرچھائیں کو انسان ترس جائے

وہ دھوپ ہے سر پر کہ ہر اک سوچ رہا ہے
آنگن کی جواں سال چمیلی نہ جھلس جائے

چہرے پہ بہت دھول کتابوں نے چڑھا دی
پانی سے بھری کوئی گھٹا اب تو برس جائے

تنہائی کے اس شہر میں رسوائی بھی ناپید
بیتاب ہوں کب سے کوئی آوازہ ہی کس جائے

اس کالے سمندر میں کوئی جال تو پھینکو
ممکن ہے کہ ڈوبا ہوا خورشید ہی پھنس جائے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

تصوف اور خدمتِ خلق

لفظ "تصوف" کے اشتقاق اور اس کے لغوی معنوں سے یہاں بحث نہیں۔ جہاں تک تصوف کی تفہیم اور اس کی تعبیر و تشریح کا تعلق ہے اس سے بھی صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی تعبیروں سے خواب کے پریشاں ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تاہم تصوف کے مختلف مکاتیبِ فکر کا جائزہ لیں تو جن نکات پر زیادہ اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے وہ یہ ہیں کہ "تصوف اخلاص و عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے"۔ "تصوف کا اصل مقصد مرتبۂ یقین کی تحصیل ہے۔" اور "تصوف کا منتہا رضائے حق ہے"۔ حضرت ابوالحسن نوریؒ تصوف کی تعریف میں فرماتے ہیں "تصوف حظِ نفس کا چھوڑنا ہے یعنی غیر شرعی حظوظِ نفسانی کا ترک کرنا، صوفی ہوا و ہوس سے آزاد ہوتا ہے"۔ حضرت ابو محمد الجریریؒ کا ارشاد ہے: "تصوف ہر نیک خصلت سے مزین ہونا ہے اور تمام بری عادتوں سے قلب کا تخلیہ کرنا ہے"۔ اور حضرت محمد بن القصابؒ کے نزدیک "تصوف اخلاقِ کریمہ ہیں جو بہتر زمانے میں بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں"۔

ان چند توضیحات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ تصوف اگر ایک طرف نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے کہ خود کو رفیقِ اعلیٰ کی صحبت کے لئے تیار کیا جائے تو اسی کے ساتھ احکامِ خداوندی کے بموجب ایک بہتر زندگی گزارنے کا ذریعہ بھی۔ لیکن جب آگے چل کر تصوف 'ترکِ دنیا' کے مفہوم میں بھی استعمال کیا جانے لگا اور کاروبارِ دنیا سے بے تعلق ہو کر درونِ ذات ہی ذاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھنا 'شانِ تصوف' قرار پایا۔

؎ دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی —

تصوف کے باب میں تصویر کا یہ محض ایک رخ ہے اور جیسا کہ تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے تعلق سے پیدا شدہ شکوک و شبہات کے بارے میں مولانا محمد اویس احمد ندوی رقم طراز ہیں: "پہلی قسم اُن شکوک و شبہات کی ہے جو عموماً یہی خانقاہوں اور یہی سجادہ نشینوں کو دیکھ کر یا ان کے ہفوات سن کر پیدا ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جس شخص کو کتاب و سنت کی ادنیٰ واقفیت بھی ہے وہ معمولی غور و فکر کے بعد سمجھ لے گا کہ یہ سب فریب ہے اور حقیقت اس سے بہت دور ہے"۔ چناں چہ اگر کوئی گمراہ کن مشائخ کے من گھڑت اصولوں، اجنبی افکار اور مختلف خرافات اور اباطیل کو تصوف کا نام دے لے تو اور بات ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کا تصوف سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ تصوف دنیا سے فرار اور کشاکشِ زندگی اور عمل سے گریز کا نام نہیں۔ تصوف میں ترکِ دنیا ضرور ہے لیکن ترکِ دنیا کا وہ مفہوم روحِ تصوف نہیں جو خود ساختہ صوفیا میں رائج ہے۔ یہاں بے جا نہ ہوگا کہ "ترکِ دنیا" کی وضاحت کر دی جائے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سلطان المشائخ کی تصنیف "فوائد الفواد" میں درج ہے: "ترکِ دنیا کے معنی یہ نہیں کہ انسان اپنا لباس اتار دے یا لنگوٹہ باندھ لے — ترکِ دنیا کے معنی یہ ہیں کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے۔ البتہ جو کماتا ہے وہ خرچ کرتا رہے، جوڑ جوڑ کر نہ رکھے اور دل کو کسی چیز میں اٹکائے نہ رکھے۔ یہ ترکِ دنیا ہے۔" اقبال کے ان اشعار کا مطالعہ کس نے نہیں کیا ہے ؎

کمالِ ترک نہیں، آب و گِل سے مہجوری کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

اسی کے ذیل میں "ترکِ اسباب" کی ماہیت بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔ "ترکِ اسباب" اور "رویتِ ترکِ اسباب" کا فرق بنیادی ہے اور "صحیح تصوف" میں اس فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک "ترکِ اسباب نہیں" "ترکِ رویتِ اسباب" ضروری ہے۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب رقم طراز ہیں: توکل "اپنے حول و قوت سے بری ہونا ہے۔" اعتصام باللہ ہے.... توکل قلبی عمل ہے۔ یعنی قلب میں یقینِ جاگزیں کہ مجھ میں اور کسی شئے میں نہ اثر ہے، نہ قوت ہے نہ حرکت ہے۔ مجھ میں اور ہر شئے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں۔ وہ جس طرح میرے خالق ہیں، میرے افعال کے بھی خالق ہیں خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ۔ میرے اقتضاء، فطریاتِ عین کے مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں۔ میرا اقتضاء میرا اختیار ہے لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے اس لئے اسبابِ قطعیہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے۔ حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں۔ جانتا ہوں اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو میں جماع ترک نہیں کر سکتا۔ بھوک کی تشفی کے لیے نوالہ کا اٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اتارنا قطعی ضروری ہے۔ توکل یہاں ترکِ عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حرکت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے اور اس یقین کا نام ہے کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل، یہ سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، اُن کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ چاہیں تو نوالہ منہ تک نہ پہنچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا چھن جائے، نظر اُن کے فعل پر ہے، فضل پہ ہے۔ اپنے زور بازو پہ نہیں، کسب پر نہیں، دست بکار، دل بیار، توکل، ترکِ اسباب نہیں، ترکِ رویتِ اسباب ہے"

میں نے ان نکات کی وضاحت اس لئے کی کہ دنیا اور کاروبارِ دنیا کی اہمیت روشن ہو تو خدمتِ خلق کی حقیقت بھی واضح ہو گی۔

تصوّف دنیا سے بے تعلق ہو جانا نہیں ہے اور نہ ایسا ہونا چاہیئے، نہ ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان دنیا سے تعلق اتنا ہی رکھے جتنا کہ ضروری ہے۔ نہ وہ دنیا پرست ہو جائے اور نہ رہبانیت اختیار کرے۔ یہ دونوں رخ تصوّف کے منافی ہیں۔

دنیا سے تعلق کا حال بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ صوفی اسی تعلق کو قائم رکھ کر سلوک کے منازل طے کرتا ہے۔ وہ بے نیاز رہتا ہے لیکن یہ بے نیازی اس کو خلق میں رہ کر خلق سے علاحدہ کر دیتی ہے وہ انسانوں میں رہتا ہے لیکن اس کا دل خالقِ حقیقی کی سمت متوجہ رہتا ہے۔ یوں وہ بتدریج قربِ الٰہی حاصل کرتا ہے جو مقصودِ تصوّف ہے

حافظ ابن قیمؒ نے "مدارج السالکین" میں ارشاد فرمایا ہے "تصوّف سنت ہی پر عمل کا نام ہے" اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنی تصنیف "عوارف المعارف" میں تحریر فرمایا ہے "تصوّف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً ہر حیثیت سے اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا" حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کو خواہ دین کے لئے ہو کہ دنیا کے لئے، کس طرح بسر کرے۔

حدیث شریف ہے: جس شخص کا یہ حال ہو کہ اللہ ہی کے لئے محبت کرے (جس سے محبت کرے) اور اللہ ہی کے لئے بغض کرے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لئے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ ہی کی رضا کے لئے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔ (مشکوٰۃ شریف) — یہ ترکِ دنیا کے نہیں، دنیا میں رہ کر زندگی گزارنے کے آداب ہیں۔ ترکِ دنیا کا صحیح اور صحت مند مفہوم بھی یہی ہے کہ فرد دنیا میں رہ کر دنیا کی آلودگیوں سے دور رہے۔ وہ خالق

سے بھی قریب رہے اور مخلوق سے بھی ۔ ہر اس صوفی نے جس نے قربِ الٰہی حاصل کیا ہے، مخلوقِ خداوندی سے بھی قریب رہا ہے۔ خالق سے خوشنودی اور رضاجوئی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی تاآں کہ وہ بندگانِ خدا کی دل جوئی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا ۔ تصوّف کے نظامِ اخلاق میں حق العباد، حق اللہ سے زیادہ اہم ہے ۔ خواجہ میر دردؔ نے یہ بات کتنی عمدگی سے سمجھائی ہے ؎

یارب درست گو نہ رہوں عہد پہ ترے — بندے سے پر نہ ہو کوئی بندہ شکستہ دل

یہ درست ہے کہ صوفیا آبادی سے دور رہے، انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی، خانقاہوں میں بسیرا کیا اور عوامی شور و شغب کو پسند نہ کیا ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مخلوق سے اپنے رشتوں ناتوں کو انہوں نے منقطع نہیں کیا ۔ یہ بات ان چند صوفیا کی حد تک ممکن ہے درست ہو جن کے ہاں تصوّف کی حیثیت مذہب کے جامد تصوّر کی ہے ۔ جن کے ہاں درونِ ذات کا نظارہ اور دست و بازو توڑ کر بیٹھ رہنے کا نام تصوّف ہے ۔ کیوں کہ صحیح تصوّف تو دین یا جنگ و شکوہ کی تعلیم دیتا ہے ۔ بتاتا ہے کہ سخت کوشی سے تلخ زندگانی کو کس طرح انگبیں بنایا جاسکتا ہے ۔ ایسے صوفیا نے خانقاہوں میں بھی اپنے اہلِ حلقہ، اپنے معتقدین اور اپنی آل و اولاد کے توسط سے ایمانی و اخلاقی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا ۔ انہوں نے نہ صرف اپنے نفس کی تطہیر کی بلکہ ایک اچھے اور سچے معاشرے کی تکمیل کے لیے صالح صحت مند روایات کو نشو و نما پانے اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا ۔ پیار و محبت اور اخلاص و اپنائیت کے ساتھ ان قدروں کو لوگوں کے دل نشین کرنے اور جزوِ زندگی بنادینے کی سعیٔ مشکور کی اور اس میں سرخ رو اور بلند رہے ۔ وہ خاموش نہیں، باعمل رہے ۔ البتہ ان کے عمل کی نوعیت جداگانہ تھی ۔ حضرت امام ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ اپنی کتاب " الیواقیت الجواہر " میں ارشاد فرماتے ہیں " جان لے، خدا تجھ پر رحم کرے کہ صوفی درحقیقت فقیہہ ہوتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے "!

حقیقی صوفیا کی زندگی، ان کے ملفوظات، تعلیمات، ارشادات، تصنیفات اور ان کی تالیفات کا مطالعہ کیجیے اور کچھ واضح نہیں بجز اس کے کہ وہ عوام سے بظاہر دور رہ کر بھی عوام سے دور نہیں رہے ۔ ذاتِ الٰہی نے جس مشن کی تکمیل کے لئے ان کو مامور کیا انہوں نے پرخلوص طریقے پر اس کی تکمیل کی ۔ اس مقصد کے لئے ان کو جن وسائل اور ذرائع اختیار کرنا چاہیئے تھا جن کو انہوں نے اختیار کیا ۔ صوفیا سچ پوچھئے تو حضرت سعدیؒ کے اس شعر کی عملی تصویر رہے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

ورنہ سوچیے، اگر ان کا مقصد خدمتِ خلق نہیں ہوتا تو ان کا اپنے اہلِ حلقہ سے بھی ربط کیوں کر ہوتا ۔ وہ " اللہ ہو، اللہ ہو " ہی میں مست ہوتے ۔ اپنی تعلیمات کی اشاعت کیوں کرتے ۔ صوفیائے کرام کے حالاتِ زندگی اس بات کی شہادت ہیں کہ انھیں جس قدر کہ اپنی عبادت ریاضت کی فکر تھی اسی قدر بنی نوعِ انساں کی بھی ۔ حضرت غوث پاکؒ نے اپنے فرزند کو جو وصیت کی تھی " فتوح الغیب " کے باب (۱) میں یوں درج ہے : " میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو اور احکامِ شریعت کی پابندی کو لازم رکھو اور اپنے سینہ (خباثتِ نفس سے) صاف رکھو اور نفس میں جواں مردی رکھو اور کشادہ رو رہو اور جو شئے عطا کرنے کے قابل ہو اُسے عطا کرتے رہو ایذا دہی سے باز رہو اور خود آزارِ خلق کا تحمل کرتے رہو ۔ اور آدابِ درویشی نگاہ میں رکھو اور بزرگوں کی بزرگداشت کرتے رہو ۔ اور بھائیوں سے حسنِ معاشرت رکھو اور خردوں کو نصیحت کرتے رہو اور اپنے رفیقوں سے جنگ نہ کرو ۔ اور ایثار کو اپنے اوپر لازم کرلو ۔ اور ذخیرۂ مال فراہم کرنے سے بچو "۔

"فتوح الغیب" کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوّف کے اور جو بھی عناصر ہوں، خدمتِ خلق سب سے اہم عنصر ہے۔ "فتوح الغیب" کے مقالۂ دوم میں درج ہے "جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو" اور آگے چل کر تصوّف کو ان آٹھ خصلتوں پر مبنی بتایا گیا ہے۔ "سخاوتِ ابراہیمؑ پر، رضائے اسحاقؑ پر، صبرِ ایوبؑ پر، مناجاتِ زکریاؑ پر، غربتِ یحییٰؑ پر، خرقہ پوشیٔ موسیٰؑ پر، تجرّدِ عیسیٰؑ پر اور فقرِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر"۔ یہ وہ خصلتیں ہیں جن کا مظہر ایک ایک نبی ہوا ہے۔ اور جن کے نقشِ قدم کی پیروی سالک کے لئے ناگزیر ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ انبیا علیہ السلام نے خدمتِ خلق کی روشن مثالیں قائم کی ہیں۔ اور یہ وہ صفات ہیں جن کا اختیار کرنا خدمتِ خلق کے لئے ازبس ضروری ہے۔

تصوّف میں اعمال و اشغال، عبادات، صحبتِ شیخ اور اذکار و مراقبات پر زور دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر قربِ الٰہی ممکن نہیں۔ لیکن صوفیائے کرام نے دیگر سنتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو یوں پیش کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے سامنے حضرت یوسف بن اسباط (متوفی ۱۹۳ھ) کی کثرتِ عبادات کا ذکر کیا گیا۔ آپ نے فرمایا تم نے ایسے لوگوں کا نام لیا کہ ان کے نام کی برکت سے شفا حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر سارے مسلمان انہی کا طرز اختیار کرلیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر سنتوں (مریضوں کی عیادت اور جنازے کی نماز اور اس قسم کی طاعات) کو کون ادا کرے گا۔ مطلب یہ کہ ان سنتوں پر عمل کرنا مجاہدہ فی العبادۃ سے زیادہ افضل ہے۔ انہی خیالات کی تصدیق حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے اپنی گراں قدر تصنیف "ہمعات" میں کی ہے کہ جماعت کی طرف سے سالک پر جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے، سالک کی طرف سے ان میں کوتاہی نہ ہونی چاہیئے۔ مثلاً اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیمار کی عیادت اور مصیبت زدہ کی تعزیت کرے۔ عزیز و اقارب کے جو صلۂ رحمی کے حقوق ہیں انہیں بجا لائے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوّف اور خدمتِ خلق ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

خدمتِ خلق کا ایک اور پہلو جہاد بھی ہے۔ تصوّف کے عام اور مروّجہ مفہوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے "تصوّف اور جہاد" میں کوئی ہم آہنگی دکھائی نہیں دیتی لیکن بیشتر صوفیا کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ صوفیا خانقاہوں اور حجروں میں نہیں رہے۔ انہوں نے زندگی کی جدوجہد میں بھی عملاً حصہ لیا۔ ایک سپاہی کی طرح وہ میدانِ کارزار میں بھی رہے۔ ظالم و جابر طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ استحصال کرنے والوں کی کلائیوں کو مروڑا، غاصبوں کو پابند کیا کہ وہ کمزوروں اور مظلوموں کا حق جانیں اور ادا کریں۔ بے کسوں اور مجبوروں کی کمزوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ ظاہر ہے ایسا کرنے میں ان بندگانِ خدا کو کیا کچھ مصائب برداشت نہیں کرنے پڑے ہوں گے لیکن ان کے پیشِ نظر اللہ کے بندوں کی خدمت تھی۔ انھوں نے اپنی ذات کی پروا کیے بغیر ہر دشواری اور مصیبت کو برداشت اور اس طرح تصوّف کے راہ میں نئے چراغ روشن کرتے گئے۔

تاریخِ عالم ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ بیان کرنا چاہیں تو سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے۔ محض دو ایک مثالیں دیتے ہوئے آگے بڑھوں گا۔ "المواقف" کے مصنف الجزائر امیر عبدالقادر (المتوفی ۱۸۸۳ء) سے تصوّف کا کون طالبِ علم ہے جو واقف نہیں۔ ان جیسے مجاہد، ذوقاً و عملاً صوفی اور شیخِ طریقت نے فرانسیسیوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۳ء تک نہ خود چین سے بیٹھے اور نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا۔ مغربی مصنفین نے ان کی شجاعت، عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی دل کھول کر ستائش کی ہے۔ ۱۸۱۳ء میں داغستان پر جب روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیوخ تھے۔ اس تحریک کے اہم

قائد غازی محمد تھے جن کو روسی قاضی ملا کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ۱۸۳۲ء میں غازی محمد کی شہادت کے بعد ان کے جانشین حمزہ بے اور ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی جو بقول امیر شکیب ارسلان، امیر عبدالقادر الجزائری کے طرز پر تھے اور مشیخت سے امارت ہاتھ میں لی تھی ۔ شیخ شامل نے ۲۵ سال تک روسیوں سے مقابلہ کیا اور ۱۸۵۹ء میں اسلحہ ڈالے ۔ تصوف اور جہاد کی ایک اور مثال سیدی احمد الشریف السنوسی کی ہے ۔ اطالیوں نے برقہ اور طرابلس کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا لیکن یہ سنوسی درویشوں اور ان کے شیخ طریقت سیدی احمد الشریف کی مجاہدانہ جدوجہد تھی جس نے اطالیہ کو پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمانے سے باز رکھا ۔ امیر شکیب ارسلان نے سیدی احمد الشریف کے بارے میں لکھا ہے کہ "ایک طرف اپنے تقویٰ اور عبادت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے زمانے کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل تھے تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے دلیرانِ زمانہ کے صف میں شامل ہونے کے مستحق!" سنوسیوں کا جوش و غضب صرف جنگ طرابلس کے موقع ہی پر ظاہر نہیں ہوا بلکہ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۲ء میں بھی جب کہ وہ علاقہ کانم اور وادیٔ سوڈان میں فرانسیسیوں سے برسرِ جنگ تھے ۔ ہندوستان میں امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ نے عملی طور پر جو بھی کہا ہے وہ اظہر من الشمس ہے ۔ من بعد تصوف اور جہاد کا یہ عجیب و غریب امتزاج حضرت سید احمد شہیدؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسین دیوبندیؒ اور ان جیسی شخصیتوں میں موجود تھا ۔ یہ لوگ برطانوی سامراج کے خلاف برسرِ جنگ رہے ۔ ان صاحبانِ طریق کی یہ جدوجہد ظاہر ہے ان کی اپنی ذات کے لئے نہیں تھی بلکہ انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف خود کو سرگرم ستیز رکھا ۔ غاصب طاقتوں کے خلاف سدِّ راہ بنے رہے ۔ مذہبی ہی نہیں ہماری معاشرتی، سیاسی اور قومی تاریخ میں بھی خدمت خلق کے ان کارناموں فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔

انسان دوستی بھی خدمت خلق کی ایک اہم روایت ہے ۔ اس روایت کو حافظ و سعدیؔ اور ادھر ہندوستان میں مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اور خواجہ میر دردؔ جیسے صوفی شعرا نے نئی حیات بخشی جس کو خانقاہ نشین مشائخ نے ترک کر دیا تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے تصوف کی عظمت ان کی شاعری کی گرد سے دھندلا گئی ۔ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ معتبر، آزاد خیال اور وسیع المشرب صوفی گزرے ہیں ۔ یہ صوفیا کے اس مکتب فکر کے ہم نوا ہیں کہ جو بغیر تحقیق کے کسی کو کافر کہنا بھی دل آزاری قرار دیتا ہے ۔ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جن لوگوں نے دوسرے مذاہب کو قبول کر لیا تھا وہ گمراہ نہیں تھے ۔ اسی کے ساتھ وہ اس نقطۂ نظر کے بھی حامل تھے کہ کسی دلیل کے کسی کو کافر کہنا آسان نہیں سمجھنا چاہیئے ۔ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی انسان دوستی، وسیع القلبی اور جذبۂ خدمت خلق کا اندازہ اس مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک خلیفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کو جو اپنے مزاج کی سختی کے لئے مشہور تھے، نف کرتے ہوئے تحریر کیا، لکھتے ہیں: "اگر تمہاری سچائی اور دیانت داری لوگوں کی تکلیف کا سبب ہے تو ایسی راستی سے باز آؤ۔ لوگوں کی دل جوئی اور حفظِ حرمت کے لئے تاویل سے کام لیا کرو ... لوگوں کی ناراضگی، رشد و ہدایت کے سلسلے کو نقصان پہنچاتی ہے"

خواجہ میر دردؔ نے بھی جو اپنے دور کے اہم صوفی بلکہ تصوف کے ایک نئے مکتبِ خیال اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں ایک طریق 'محمدی' کے داعی ہیں، آداب دل داری اور راحت رسانیٔ خلق کو صوفی کا طرۂ امتیاز قرار دیا ہے ۔

صوفیا کے خدمت خلق میں لگے رہنے اور خالق کے ساتھ مخلوق سے بھی نزدیک ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ صوفیا ہمیشہ رشد و ہدایت مشغول رہے ۔ انہوں نے ترکِ دنیا نہیں کیا بلکہ اکثر صوفیا تو صاحب اہل و عیال رہے اور اپنے خانگی و معاشرتی معاملات کو ذمہ دار افراد کی ح

باقی صفحہ ۹ پر دیکھئے

محسن جلگانوی

سُلگ رہا ہوں ہر اک لمحہ کچھ بجھاؤ مجھے
نہ جینے دے گا مرے کرب کا الاؤ مجھے

یہ حرف حرف مری ذات مسئلہ کیوں ہے
میں گذرے کل کا ہوں اخبار بھول جاؤ مجھے

میں اُجلے ہاتھ کا لکھا ہوا صحیفہ ہوں
جو ہو سکے تو کہیں روح میں چھپاؤ مجھے

پگھل پگھل کے میں سب اس کی آگ پی جاؤں
اس احتیاط سے اس کے قریب لاؤ مجھے

یہ ریت ریت کا جینا، لہو لہو بینا
نفس نفس دیئے جاتا ہے تازہ گھاؤ مجھے

کرن کرن میں وجود اپنا بانٹ آیا ہوں
بکھر گیا ہوں بہت اب سمیٹ لاؤ مجھے

فقیہہ شہر یہ محسن گراں سہی لیکن
بہت پسند ہے اپنا یہ رکھ رکھاؤ مجھے

شہیر رسول

بڑی عجیب فضا ہے مری کہانی کی
کہ میرے شہر پہ جنگل نے حکمرانی کی

غموں کی دھوپ بھی جھلسا نہیں سکی مجھ کو
ترے خیال نے کس درجہ سائبانی کی

غبارِ جاں تھا مقید دلوں میں برسوں سے
کہ اب زبان کھلی ہے تو داستانی کی

ہر ایک بھولے مسافر کو موہ لیتی ہے
بڑی عجیب سی خوشبو ہے رات رانی کی

میں وہ چراغِ تمنا ہوں جس کی اے شہیر
تمام عمر اندھیروں نے پاسبانی کی

غزلیں

جمیل مجاہد

وہ ایک لفظِ وفا جب مری زبان پہ تھا
دماغ سارے زمانے کا آسمان پہ تھا

صراطِ عشق پہ ہم کیسے ڈگمگا جاتے
ہمارا پاؤں ترے پاؤں کے نشان پہ تھا

چلو حصار تو ٹوٹا حیات کا ورنہ
پرائے غم کا جو اک بوجھ میری جان پہ تھا

وہ پتھروں کا زمانہ بھی کیا عجیب تھا جب
وفا کا نقش محبت کے پھولدان پہ تھا

گلی کے موڑ پہ جب قاتلوں کا قتل ہوا
میں گھر سے دور اک اخبار کی دکان پہ تھا

یہ قرض ماں کا ہے چلتا رہے گا محشر تک
یہ بوجھ قرض کا پہلے بھی ہر جوان پہ تھا

مجال کیا تھی کسی کی جو پھینکتا پتھر
ترے خیال کا سایہ مرے مکان پہ تھا

ڈاکٹر یوسف کمال

ہیرے

ایک بہت قدیم ایرانی حکایت کے مطابق خدا نے جب اس کائنات کی تشکیل کی تو حضرت شیطان نے بھی باغ عدن سے پھولوں کے رنگوں اور ان کی تازگی کو چرا کر زمین کے اندر چھپا دیا کہ یہ دلکش اور خوب صورت چیزیں یا زمرد، یاقوت، لعل اور پکھراج جیسے ان گنت ہیروں کی صورت میں انسان کو للچاتے رہیں! ہیروں کو حاصل کرنا گو کہ شیطانی خواہش نہیں مگر پھر بھی انسان نے ہیروں کو زمانۂ قدیم سے پُر اسرار قسم کے اثرات سے وابستہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں کے خیال میں کچھ ہیرے خوش بختی کی ضمانت ہیں تو بعض ہلاکت خیز حد تک منحوس بھی۔ ہیرے اپنی زبردست خیرہ کن چمک دمک، دلکش رنگینی اور کم یابی کی وجہ ہزاروں سال سے انسانوں کو لبھاتے رہے ہیں۔ اپنی زبردست مانگ اور کم یابی کی وجہ سے دنیا میں ہیرے سب سے قیمتی اشیاء میں آج بھی سر فہرست ہیں اور ان کی قیمت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ء میں ایک کیرٹ کے بے لوث ہیرے کی قیمت نو ہزار ڈالر تھی جبکہ ۱۹۷۹ء میں اتنے ہی وزن کے ہیرے کی قیمت بیس ہزار ڈالر ہے۔

شاہانہ کروفر اور زیورات میں سجاوٹ کے علاوہ ہیرے دولت کو یکجا جمع کرنے کا بھی ایک آسان طریقہ ہیں۔ لیکن آج کے صنعتی دور میں ہیرے اپنی ان روایتی حیثیتوں کے علاوہ الکٹریکل، طبی اور کان کنی کی صنعتوں میں بھی لازمی طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ زمین کے اندر کان کنی اور ڈرلنگ کے ذریعہ بے شمار دھاتی وسائل اور ایندھن حاصل کر کے آج دنیا صنعتی ترقی کی جس معراج پر پہنچی ہے یہ بڑی حد تک ہیروں کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔ ہیرے اپنی زبردست سختی کی بنا پر ڈرلنگ میں استعمال کیے جاتے ہیں جس کی وجہ سے سخت سے سخت چٹانوں کو چیر کر کان کنی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر دنیا ہیروں سے محروم ہو جائے تو پھر توانائی اور صنعتی پیداوار کے تمام ذرائع مسدود ہو جائیں گے۔

ہیرا کیا ہے۔ کیمیائی اعتبار سے ہیرا کاربن کا بہروپ ہے۔ اس طرح ہیرے، کوئلے اور گرافائٹ میں کوئی فرق نہیں۔ کوئلے کے بھُربھُرے پن اور گرافائٹ کی نرمی کے مقابلے میں ہیرا دنیا کا سب سے سخت مادہ ہے۔ ہیرے کی یہ بے مثال سختی اس کے اپنے ایٹمی ساخت کی دین ہے۔ ہیرے میں کاربن کے ہر ایک ذرے دوسرے کے ساتھ اتنے قریب جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کو بیرونی دباؤ سے علاحدہ کر کے توڑنا تقریباً ناممکن ہے۔ ویسے مثل مشہور ہے کہ ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے۔ اپنی اس مخصوص اور مضبوط ایٹمی ساخت کی وجہ سے ہیرے کی کثافت پانی کے مقابلے میں ۳٫۵ گنا زیادہ ہے۔

ہیرا فطری طور پر قلموں یعنی (CRYSTALS) کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ان قلموں کی شکل مکعب

جیسی ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہیرا مکعبی قلموں یعنی شش پہلو ہی ہو جس کا ہر پہلو یا ضلع مربع ہو۔ مکعبی نظام کے قلم بسا اوقات ہشت پہلوی، ۲۴ پہلوی اور کبھی کبھی ۴۸ پہلوی بھی ہو سکتے ہیں۔ ہیرے کے فطری قلموں میں اضلاع یا پہلوؤں کی تقسیم اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے ہیرے کو تراشنے میں مدد لی جاتی ہے۔ ویسے تو ہیرا دنیا کی سخت ترین شئے ہے مگر اسے بعض مخصوص سمتوں میں تراشا بھی جاتا ہے۔ بعض سمتوں میں ہیرے کے کٹ جانے کی اس خاصیت کو ترکیدگی (CLEAVAGE) کہا جاتا ہے۔ ہیرے کی ترکیدگی کو جانچنا اور پھر اس کو تراشنا بہت مشکل فن ہے۔ اس فن کو انگریزی میں (LAPIDARY) کہتے ہیں۔ ہیرے کو تراشنے کے فن نے بلجیم، اسرائیل اور ہندوستان میں بہت ترقی کی ہے اور آج بلجیم اور اسرائیل کے بعد ہندوستانی میں ہیرے بڑی مہارت اور فن کاری سے تراشے جاتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ تراشیدہ ہیرے کی قیمت غیر تراشیدہ کے مقابلے میں کم سے کم دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔

کسی بھی رنگ کی فضا میں ہیرے کی چمک دمک غیر معمولی ہوتی ہے۔ ہیرے کی یہ چمک دمک ہیرے کی انعکاس اور انعطاف کی خواص کی مرہون ہے۔ ہیرے شیشے کے مقابلے میں ۲۰ فیصد زیادہ انعکاس کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ ان کا انعطاف نما ۴ر۲ ہے۔ انعکاس اور انعطاف کی اس بے مثال یکجائی کی بنا پر ہیرے رنگ و نور کا ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں جس کو ہیرے کی آگ یا FIRE OF DIAMOND کہا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ نور کی شعاعیں ہیروں کے اجسام سے ہو کر گذر جاتی ہے بلکہ لاشعاعوں کے لیے بھی ہیرے شفاف واسطوں جیسا کام دیتے ہیں۔ ان کی اس خاصیت کی بنا پر ہیروں کو لاشعاعوں کے ذریعہ طبی علاج میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

ہیرے کے خواص :۔ تجارتی اصطلاح میں دراصل چار باتیں ہیروں کو جواہرات کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ جن کو انگریزی میں FOUR CS کہا جاتا ہے۔ ایک COLOUR یعنی رنگ۔ دوسری CLARITY یعنی بے نوٹی تیسری CUT یعنی تراش اور چوتھی CARAT یعنی ہیرے کا وزن۔ کسی بھی ہیرے میں ان چار خواص کی زیادتی نہ صرف اسے جواہر کا درجہ عطا کرتی ہے بلکہ اس لحاظ سے ان کی قیمت کا بھی تعین کیا جاتا ہے۔ "ایک آنچ کی کسر" کے مصداق کسی نہ کسی امر کی کمی ہیروں کو جواہر کا درجہ دلانے میں حائل رہتی ہے۔

ہیروں میں رنگوں کا بڑا تنوع ہوتا ہے۔ ہیرے شفاف اور رنگ دار بھی ہوتے ہیں۔ رنگ کے تاثر کو تیز کرنے کے لیے تراش سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہیرا لازمی طور پر بے لوث ہے۔ ان خواص کے ساتھ تجارتی اعتبار سے یہ بات بھی اہم ہے کہ ہیرے کا وزن کم سے کم دس کیراٹ (قراط) ہو۔ جب کہ ایک کیراٹ کا وزن ۵/۱ گرام یا ۱۴۲/۱ اونس کے برابر ہوتا ہے۔ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہیرے تراش اور کٹائی کے بعد گھٹ کر اپنے وزن میں بہت کم رہ جاتے ہیں اس لیے عملی طور پر کم سے کم ایک ہیرے کو ۵ تا ۱۰ کیراٹ وزنی ہونا ضروری ہے تاکہ اسے مناسب تراش کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

دنیا کا سب سے وزنی ہیرا (CULLINAN) ہے جو جنوبی افریقہ کی کانوں سے دستیاب ہوا ہے۔ اس کا ابتدائی وزن ۳۱۰۶ کیراٹ تھا جو تراش کے بعد دو ہیروں یعنی اسٹار آف افریقہ (۱) اور اسٹار آف افریقہ نمبر ۲ کی صورت میں آج تاج برطانیہ میں موجود ہے اور ان کا وزن علی الترتیب ۲ر۵۳۰ کیراٹ اور ۴ر۳۱۷ کیراٹ ہے۔ اسی طرح کوہ نور کا ابتدائی وزن ۸۰۰ کیراٹ تھا جو دوبار بڑی بے رحمی سے تراشا گیا اور اب اس کا وزن (۱۰۸) کیراٹ رہ گیا ہے۔

ہیرے کہاں اور کیوں؟ دنیا میں ہیرے تاریخی طور پر نایاب رہے ہیں [illegible] اپنی بڑھتی ہوئی صنعتی افادیت کے باعث ہیروں کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ افریقہ کا ایک ملک [illegible] ہیروں کی پیداوار میں [illegible] ہے جو [illegible] دوسرے نمبر پر سوویت روس اور تیسرے نمبر پر جنوبی افریقہ ہے۔ ان تین اہم ممالک کے علاوہ افریقہ کے دوسرے ممالک [illegible] سیرالیون اور [illegible] ہیرے پیدا کرنے والے اہم ممالک ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے ان بڑے ذخائر سے حاصل شدہ ہیروں کا خریدار بلجیم کی ایک خانگی کمپنی ڈی بائرس لمیٹیڈ ہے جو برسوں سے دنیا کی ہیروں کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کیے ہوئے ہے۔ ڈی بائرس لمیٹیڈ خام ہیروں کو مختلف ملکوں سے خریدتا ہے اور پھر تراش و جلا کاری کے بعد منہ مانگے داموں فروخت کرتا ہے۔ [illegible] ایسے ہیروں کے خریدار وہی ممالک ہوتے ہیں جہاں سے خام ہیرے خریدے جاتے ہیں۔

مختلف سائنس داں اور بالخصوص ماہرین ارضیات ہیروں کی پیدائش اور ان کے ذخائر کی وقوع پذیری کو سمجھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں [illegible] ذخائر کی تلاش کو زیادہ سے زیادہ بامقصد اور نتیجہ خیز بنایا جا سکے۔

یقین کے ساتھ نہیں [illegible] لیکن طبعیات اور ارضیات کے ماہرین کی تحقیق سے [illegible] کیا جاتا ہے [illegible] کیلو میٹر کی گہرائی پر [illegible] دباؤ اور [illegible] حرارت [illegible] انتہائی کیمیائی تعاملات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ گرانائٹ اور ہیرے [illegible] پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہیرے کو ۲۰۰۰ درجہ حرارت تک [illegible] کیا جائے تو وہ پھر گرافائٹ کی شکل میں [illegible] اس کے برعکس اگر گرانائٹ کو ۱۵۰۰ درجہ [illegible] زبردست دباؤ کی موجودگی میں [illegible] پہنچایا جائے تو وہ ہیرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان تجربوں کی روشنی میں خیال کیا جاتا ہے کہ ہیرے زمین کی گہرائیوں میں بھی ایسے ہی تعاملات کی بنا پر وجود میں آئے ہوں گے۔ تجربہ خانوں کے نتائج اور ہیروں کی کان کے نمائندوں میں پائے جانے والے حجرات کے مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جنوبی افریقہ میں ہیروں کی کانیں [illegible] آتش فشانی حجرات سے وابستہ ہیں جو (۱۶۰) کیلو میٹر کی گہرائی پر ہی وجود میں آ سکتی ہیں۔ ان حجرات کو جو قیف نما پائپ کی شکل میں پائی جاتی ہیں کیمبرلائٹ (BERLITE) کہا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ (۱۶۰) کیلو میٹر کی گہرائی سے کیمبرلائٹ کے پائپ نما حجرات آخر کس طرح سطح زمین پر آ سکتی ہیں۔ کیمبرلائٹ حجرات بلاشبہ زمین کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہیں لیکن ارضیاتی اعتبار سے یہ حجرات زمین کے بہت قدیم حجرات میں سے ہیں۔ [illegible] عام طور پر (۳) ارب سال سے کم نہیں۔ ظاہر ہے کہ (۳) ارب سال کی ارضیاتی تاریخ میں یہ حجرات زمین کے مختلف حرکیاتی اور [illegible] عوامل کی بنا پر زمین کی گہرائیوں سے اچانک یا رفتہ رفتہ بلند ہو کر سطح زمین کی طرف پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اتنے طویل عرصہ میں موسمی عوامل بھی ان کو زمین کی سطح پر یا سطح زمین کے قریب لانے میں مددگار رہتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان عوامل کی دیرینہ اور مسلسل کارکردگی کے نتیجہ میں کیمبرلائٹ ابھر کر سطح زمین تک پہونچ جاتے ہیں اور ان میں پائے جانے والے ہیرے دوسرے آتش فشانی کچ دھاتوں کے ساتھ یا تو جوں کا توں موجود رہتی ہیں جیسا کہ جنوبی افریقہ کی کانوں میں دیکھا گیا ہے یا پھر رفتہ رفتہ ٹوٹ کر ذروں کی صورت وادیوں، میدانوں اور دریاؤں کی مٹی [illegible] میں شامل ہو جاتے ہیں جیسا کہ جنوبی ہند [illegible] کی ریت میں ہیروں کی موجودگی سے ظاہر ہے۔

ہندوستان اور ہیرے ہندوستان میں بھی ہیروں کی تلاش، تراش، جلاکاری اور تجارت کی ایک عظیم روایت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ گولکنڈہ کی ہیروں کی منڈی کے ذکر کے بغیر ہیروں کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا کے جتنے مشہور ہیرے جیسے کوہ نور، اکبر شاہ، دریائے نور، مغل اعظم، سپال اور ریجنٹ وغیرہ غالباً پہلی بار گولکنڈہ کی منڈی ہی میں فروخت ہوئے

گولکنڈہ ہیروں کی منڈی دراصل ان ہیروں کی پیداوار کی نکاسی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی جو رائل سیما کے علاقوں اور جنوبی ہند کی دریاؤں سے حاصل کئے جاتے تھے اور جو اب بھی کبھی کبھی ہاتھ آتے ہیں۔ ایک حالیہ تحقیق کے مطابق ان ہیروں کا منبع بھی وہ کمبرلائٹ ہیں جو حال ہی میں ضلع اننت پور میں (ستاورم) اور وجراکرور میں دریافت کیے گئے ہیں۔ کرشنا، گوداوری اور تنگبھدرا کی وادیوں کے علاوہ ضلع کرنول میں راملا کوٹا، بنگن پلی اور یمانی جیسے مقامات پر بھی تاریخی شہادتیں موجود ہیں جہاں پر سو سال (مٹی) کو چھان کر ہیروں کو حاصل کیا جاتا تھا۔ آندھرا پردیش کے ان علاقوں کے علاوہ مدھیہ پردیش میں وادی پنا، اڑیسہ میں دریائے مہاندی کے کنارے سنبل پور، رائے گڑھ اور چاندہ میں بھی ہیروں کی کانکنی کی نشانیاں موجود ہیں۔ ہندوستان کی ہیروں کی عالمی منڈی میں اہمیت اس وقت کے ابتدا تک مسلم رہی جب تک برازیل اور جنوبی افریقہ کے نئے دریافت شدہ ہیروں کی کانوں کی پیداوار کی مسابقت کی وجہ ۱۹۰۴ء تک بھی ختم ہو گئی۔

۱۹۶۷ء سے جیالوجیکل سروے آف انڈیا اور نیشنل منرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن [illegible] مصروف ہے۔ آندھرا پردیش میں ضلع کرنول میں بنگن پلی اور مدھیہ پردیش میں ریوا (...) کے علاوہ وادی پنا میں کمبرلائٹ حجرات کی نشان دہی کی جا چکی ہے اور ان سے متعلق دریاؤں اور وادیوں اور میدانوں میں ہیروں کی تلاش کا کام جاری ہے۔ وجراکرور اور ستاورم میں چھ اور وادی پنا میں تین کمبرلائٹ حجرات دریافت ہو سکے ہیں۔ ضلع اننت پور میں گنتاکل کے قریب تقریباً ۲۵ ہزار مربع کیلو میٹر کے اس وسیع علاقے میں بھی کھوج جاری ہے جہاں بارش کے موسم میں ایک نہ ایک ہیرا کاشت کاروں کے ہاتھ آتا ہے۔

۱۹۰۶ء میں [illegible] آندھرا پردیش میں راملا کوٹا کے مقام پر ہیروں کی آزمائشی کانکنی کا تجربہ کیا گیا تھا جو دو تین سال کی مسلسل تلاش کے بعد اس علاقہ کو ترک کر دیا گیا۔ [illegible] میں ہیرے تو موجود ہیں لیکن وہ تجارتی پیمانے پر مفید نہیں۔ تجارتی پیمانے پر کانکنی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک ٹن چٹان کو توڑنے کے بعد کم سے کم ۵ یا ۶ کیرٹ کا ہیرا حاصل ہو۔ ضلع کرنول کے ان حجرات کے علاوہ موجودہ دریاؤں یعنی کرشنا، تنگبھدرا اور پنا رکے رسوبات کے تفصیلی جائزے بھی اس لحاظ سے مفید ثابت نہ ہو سکے کہ ان میں بھی ہیروں کی وقوع پذیری تجارتی پیمانے پر نفع بخش ہو۔ ان حالات میں مدھیہ پردیش کی وادی پنا میں مجھگاؤں ہی ہندوستان میں ہیرے حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ [illegible] ۱۹۶۶ء [illegible] ہیرے حاصل کئے جاتے ہیں۔

ہیروں کی عدم دستیابی کے باوجود ہندوستان دنیا میں ہیروں کی صنعت میں بلجیم اور اسرائیل کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ ہندوستان میں ہیروں کی تراشی اور جلا کاری کی صنعت سے کم از کم ایک لاکھ افراد وابستہ ہیں جو بمبئی، سورت اور احمد آباد [illegible] علاوہ کیرالا میں بھی آباد ہیں۔ ہندوستان میں ہیروں کی صنعت برآمداتی صنعت کا درجہ رکھتی ہے چنانچہ ۱۹۷۶ء میں ہیروں کی برآمدات سے حکومت ہند کو ۲۳۱ کروڑ روپے کا زر مبادلہ حاصل ہوا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس صنعت کو سائنسی بنیادوں پر منظم اور مستحکم کیا جائے۔

مصنوعی ہیرا:۔ مصنوعی ہیرا تیار کیا جانا ایک دیرینہ خواب تھا جو صدیوں سے سائنسدانوں کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ تجربہ خانوں میں ہیرا تیار کیا جائے۔ ان کا یہ خواب اس وقت شرمندہ تعبیر ہوا [illegible] ۱۹۵۵ء [illegible] معلوم کر لیا گیا کہ ہیرا دراصل کاربن کی ایک شکل ہے۔ ہیرے کی مصنوعی تیاری اور ماہیت کے دریافت ہونے کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد یعنی ۱۹۵۵ء میں امریکہ کی جنرل الیکٹرک کمپنی بالآخر زبردست دباؤ اور ۲۵۰۰ درجہ حرارت کی موجودگی میں گرافائٹ کو [illegible] کامیاب

بقیہ صفحہ ۳۸ پر دیکھئے

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ادارہ)

نام کتاب: نیل کنٹھ پاکھی کی ٹوہ ۔ اتین بندو پادھیائے۔ مترجم راشد سہسوانی
صفحات: ۷۴۴ قیمت: ۱۵ روپے
ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ نئی دہلی۔

اتین بندو پادھیائے کا پورا نام اتیندر شیکھر بندو پادھیائے ہے۔ اتین ۱۹۳۰ء میں رائی ناد گاؤں (ضلع ڈھاکہ) میں پیدا ہوئے۔ مغربی بنگال کے ضلع بہرام پور سے پرائیوٹ طور پر میٹرک کیا۔ ۲۳ سال کی عمر میں وہ ادیب کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے اور انھیں مانک بندو پادھیائے کی یاد میں قائم شدہ یادگاری انعام بھی ملا۔ ۱۹۶۰ء میں "سمدر مانش" ناول کی اشاعت کے ساتھ انھیں ایک اہم ادبی مقام حاصل ہوگیا۔ انھوں نے اب تک کوئی ۲۲ ناول لکھے ہیں۔ ان کا سب سے بہترین ناول "نیل کنٹھ پاکھی کی ٹوہ" ہے۔

ناول میں نیل کنٹھ پاکھی کی ٹوہ میں رہنے والا شخص منیندر ناتھ ہے جو ایک زمیندار مہندر ناتھ کا بڑا لڑکا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ دوران تعلیم اس نے ایک عیسائی لڑکی "پلن" سے محبت کی، اس سے شادی کا خواہش مند تھا لیکن مہندر ناتھ نے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ غیر قوم میں شادی کرے۔ اور اپنی ہی ذات برادری کی لڑکی سے منیندر ناتھ کا بیاہ رچا یا۔ اس صدمے سے منیندر ناتھ پاگل ہوگیا۔ جب بھی موقع ملے وہ گھر والوں کی نظروں سے بچ کر گھر سے بھاگ جاتا ہے جنگلوں کی طرف ندی میں کھوجتے ہوئے۔ دراصل یہ کھوج کس کی ہے اس کے بارے میں اکھلیش گوہ نے لکھا ہے۔

منیندر ناتھ نیل کنٹھ پاکھی کی شکل میں جسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں وہ پلن ہے جس سے ملاقات کے امکانات اب نہیں رہے۔ وہ ان کی رسائی سے باہر چلی گئی ہے۔ پھر بھی اسی کی کشش سے منیندر ناتھ ہاتھی کی پیٹھ پر اچانک لاپتہ ہو جاتے یا پھر درختوں کی شاخوں میں خود کو باندھ رکھتے ہیں۔ ندی میں منزل بھول جاتے ہیں۔ کوئی مخصوص شخصیت نہ رہ کر اب پلن محض ایک تصوراتی سچائی ہے۔ حاصل نہ ہوسکنے والی لیکن منتہائے مقصود .... "نیل کنٹھ پاکھی کی ٹوہ" ایک رومانی تجسس ہے۔ ایک ایسے حسن کی تلاش ہے جو غیر مجسم ہونے پر بھی امید کی سرحد سے ماورا نہیں۔"

اس ناول میں مشرقی بنگال کے ملاحوں اور دیہاتیوں کی زندگی کو محور بنا کر جہاں بہت سے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کو ابھارا گیا ہے وہاں روز مرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی وساطت سے اس کرب و اضطراب کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے انسان کی زندگی

کشمکش عبارت ہے یہ ناول ایک ایسے وسیع سمندر کے مانند ہے جس کی سطح پر رواں نوعیت موجیں مارتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن ان لہروں کے نیچے حقیقت کی وہ وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے جس کی مرقع کشی میں بنگالی فن کاروں نے کمال حاصل کیا ہے۔ اس طرح اس ناول میں ٹیگور کی روایت اور جدید حقیقت پسندی کا ایک دل کش امتزاج ملتا ہے۔

اس ناول کو نہ صرف بنگالی ادب کا بلکہ ہندوستانی ادب کا شاہ کار ناول کہا جا سکتا ہے (مبصر: ناز صدیقی)

نام کتاب: اک چاند چمکتا ہے — شاعرہ: حُسنیٰ سرور
اشاعت نومبر ۷۸ء — قیمت ۱۲ روپے
ناشر: شالیمار پبلی کیشنز۔ نیا ملک پیٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶

حُسنیٰ سرور کرناٹک کی معروف و مقبول شاعرہ ہیں۔ ایک عرصہ سے ان کا کلام ہندوپاک کے ممتاز رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ "اک چاند چمکتا ہے" ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ قبل ازیں ۷۳ء میں "خواب زار" شائع ہو چکا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں غزلیات (۱۱۰) صفحات پر محیط ہیں بقیہ (۶۶) صفحات نظم کے لیے وقف ہیں غزلوں کی ابتدا نعتوں اور نظموں کی ابتدا حضرت امام حسین سے متعلق نوحوں سے ہوتی ہے۔

"اک چاند چمکتا ہے" کے صفحات عام طور پر درد کی خوشبو، یاد کی قندیل، آرزو کے گلاب اور کچھ نئے خواب سے بھرے پڑے ہیں لیکن بعض نظموں میں شاعرہ اس ڈگر سے ہٹ بھی گئی ہیں جیسے "نئے افق"، "تمام منظر بہشت دانش"، "اے عروس وطن"، "ہمارا شاعر"، "آنسوؤں کا خراج"، "آفاق میں گم نغمہ" اور "نذر اقبال" وغیرہ۔

حُسنیٰ سرور رومانی شاعرہ ہیں "خواب" ان کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے عصری حسیت اور مسائل سے پرے ایک عرصہ سے نہ صرف خواب کی وادیوں میں بھٹک رہی ہیں بلکہ اب بھی سنہرے خواب بُننے کا عمل جاری ہے، ذیل کا مصرعہ ان پر صادق آسکتا ہے ؂

ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگے ہیں خواب سے

حُسنیٰ سرور کے نظریہ شعر کی مزید وضاحت ان کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے

دن کے ہنگاموں میں کس کو فرصت ہے مل بیٹھنے کی — یاد وہ آتے ہیں تو حُسنیٰ مل لیتے ہیں خوابوں میں

اگرچہ "خواب زار" سے "اک چاند چمکتا ہے" تک ان کی شاعری روایت سے چھٹکارا نہ پا سکی لیکن ان کے تازہ کلام میں زندگی سے محبت، جینے کی اُمنگ اور مستقبل کو سنوارنے کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

حوصلہ دیکھیئے اپنے دل کا — روز اک زخم نیا مانگے ہے
کس کی چشم عنایت کا صدقہ ہے یہ — لمحہ لمحہ سنورتی گئی زندگی
روشنی قلب و نظر کی جو سلامت ہے تو دوست — تیرگی میں بھی نظر آئیں گے ساحل کتنے

شالیمار پبلی کیشنز حیدرآباد کی اس ۲۱ ویں پیشکش کو ممتاز صحافی محمود خاور نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت اطمینان بخش اور گٹ اپ عمدہ ہے۔ (وہاب عندلیب)

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ، ادبی اور تہذیبی خبریں

۳ مئی : ممتاز افسانہ نویس ادیبہ محترمہ جیلانی بانو نے ڈاکٹر انور جمشید پور کے فسادات میں ہلاکت کو اردو ادب کے لیے المیہ قرار دیتے ہوئے دانشوروں اور مصنفوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ ایسے فسادات کے انسداد کے بارے میں ایسی تدبیر کریں کہ جن کے ذریعے جمہوری اقدار کے ساتھ ادب اور آرٹ کی بھی حفاظت ہو سکے۔

۴ مئی : جناب حیدر رسول استو ڈائرکٹر سکریٹری اُردو اکیڈیمی اردو میں یامین رٹ فارمس کی اجرائی کے بارے میں مرکزی وزیر خارجہ کو ایک مکتوب کے ذریعہ توجہ دلائی اور بتایا کہ آندھرا پردیش کی دوسری علاقائی زبان اُردو ہے اور یامین رٹ کی درخواست دینے والوں کی ... فیصد تعداد ریاست میں اُردو داں اصحاب پر مشتمل ہے۔

محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ سلطانہ عبدالقیوم نے مضمون اور محترمہ بالو طاہرہ سعید نے کہانی سنائی۔ خواتین شعراء نے کلام پیش کیا۔

۵ مئی : ادبی ٹرسٹ کا ۱۴ واں کل ہند مشاعرہ جناب یم باگا ریڈی صدر اُردو اکیڈیمی و ریاستی وزیر پنچایت راج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب یم آر اے انصاری صدر نشین اقلیتی کمیشن حکومتِ ہند مہمانِ خصوصی تھے۔ ریاستی وزیر آبکاری مسٹر پی گنگا ریڈی نے ساوونیر کی رسم اجرا انجام دی۔ صدر ٹرسٹ جناب محمد علی خیامی نے مہمانوں کی گلپوشی فرمائی۔ بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے خیر مقدمی خطاب کیا اور ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے مقصدی مشاعرہ کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ جناب یم باگا ریڈی نے اردو کی تعلیمی اور تہذیبی قدروں کے فروغ کے لئے ادبی ٹرسٹ کی خدمات اور جناب عابد علی خاں کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا اور کہا کہ ریاستی حکومت اردو سے مکمل انصاف کی حوالی ہے۔ شاذ تمکنت اور زبیر رضوی صاحبان نے مشاعرہ کی نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ مسرز علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، ... بیکوی، ندا فاضلی، عالم فتح پوری، عزیز قیسی، یکتا شبنم، جگناتھ کمال، ... بھارتی، یوری، زبیر رضوی، ڈاکٹر مغنی تبسم، شاذ تمکنت اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، نیرات ندیم، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیّر، رحمٰن احقر، علی الدین نوید، عزیز النساء صبا، اور ثریا مہر نے کلام سنایا۔

۶ مئی : ادبی ٹرسٹ کے زیر اہتمام نگراں کمیٹی کی رپورٹ "بہ اُردو زبان میں ایک سیمینار جناب رفیع الدین احمد انصاری صدر نشین اقلیتی کمیشن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک قرارداد کے ذریعہ صدارت سے منظور کی گئی جس میں حکومتِ ہند سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ فروغِ اُردو سے متعلق نگراں کمیٹی کی سفارشات کو قبول کرتے ہوئے ... فوری عمل آوری کے لیے موثر اقدامات کرے۔ سیمینار کو مخاطب کرنے والوں میں نگراں کمیٹی کے چار ارکین مسز ڈاکٹر ثریا حسین جلیبی، ... علی خاں اور ڈاکٹر خلیق انجم کے علاوہ میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی، علی سردار جعفری، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر رام ... قابل ذکر ہیں۔ جناب انصاری صدر سیمینار نے اس موقع پر سلسلۂ مطبوعات روزنامہ سیاست کی دو کتابوں (حیدرآباد ... اور ... گراں ...) کی رسم اجرا ... اور ... ستوں میں ... اردو تعلیم ... انعامات ... تقسیم کیے۔

... ادبی ... کی محفل ... جناب ... احمد سابق ... کی صدارت میں منعقد ... جناب ... مہمانِ خصوصی تھے۔ ... خمار بارہ بنکوی، جگن ناتھ آزاد، عزیز قیسی، عالم فتح پوری، یکتا شبنم، ڈاکٹر مغنی تبسم، نیرات ندیم، ... حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ اور عزیز النساء ... کلام سنایا۔ صلاح الدین نیّر معتمد مشاعرہ تھے۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے خیر مقدمی تقریر ...

۷ مئی : فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ ... کے خلاف حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں اور ... نمائندہ اجتماع ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبۂ حیدرآباد یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ...

جیلانی بانو نے قرارداد پیش کی جس میں فسادات کو جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم کے لیے تم قاتل قرار دیتے ہوئے قلمکاروں کو اتحاد اور یکجہتی کے استحکام کے لیے رائے عامہ بنانے میں تعاون کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور جمشید پور کے فسادات میں ہلاک ہونے والے ممتاز اردو ادیب ذکی انور کے پسماندوں کے لیے فنڈ جمع کرنے کا ذکر ہے۔ اس جلسہ کو ڈاکٹر عالم خوندمیر، مسٹر چندر سریواستو ڈائرکٹر اسکریٹری اردو اکیڈیمی، ڈاکٹر انور معظم، اختر حسن، عزیز قیسی نہپال سنگھ ورما، سید رحمت علی سابق ڈپٹی اسپیکر اور یوسف اعظمی نے مخاطب کیا جناب قدیر زماں (داعی جلسہ) نے شکریہ ادا کیا۔

● بزم اردو اسوسی ایشن کے انتخابات میں مسٹر معین الدین احمد برنی صدر، ڈاکٹر محمد انور حسین نائب صدر اور فصیح الدین معتمد منتخب ہوئے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس اسوسی ایشن کے ذریعہ اردو کوچنگ سنٹر اور دارالمطالعہ کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔

۸ رمئی :- آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے بورڈ آف گورنرس کے اجلاس میں طئے پایا کہ وجے واڑہ اور کرنول میں اکیڈیمی کے علاقائی مرکز قائم کیے جائیں۔

۱۲ رمئی :- ہندی بیٹھک سنگھ کی جانب سے شب افسانہ میں اردو کے معروف افسانہ نویس مسز عوض سعید اور انور رشید کے علاوہ ہندی کے مسز زادم پرکاش نرمل، نہپال سنگھ ورما، ڈاکٹر گیان استھانہ، راجیو سکسینہ اور یم او پینیدر نے افسانے سنائے۔

● ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کے ایک تہنیتی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے جناب یم باگا ریڈی صدر ریاستی اکیڈیمی و وزیر پنچایت راج نے اردو کے مسائل کی یکسوئی کے تعلق سے حکومت کے حوصلہ افزا تعاون کی تعریف کی۔ اس جلسہ میں ریاستی اردو اکیڈیمی کے عہدہ داروں کی گلپوشی کی گئی۔ مسٹر چندر سریواستوا ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے اردو زبان اور ثقافت کی ترقی کے بارے میں اکیڈیمی کے منصوبوں پر اظہار خیال کیا۔ مولانا حافظ ابو یوسف، پیرمن انتظامی کمیٹی اور مسٹر کے پربھاکر ریڈی ڈپٹی اسپیکر کے علاوہ جناب اکرام جاوید معتمد عمومی ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈیمی نے بھی مخاطب کیا

● بزم طالب رزاقی کی شعری محفل میں ڈاکٹر اسد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ بشیر وارثی، راز عابدی، علی سرور، ہلال آفاقی، محوی سروشی ناقد رزاقی، مسرور عابدی اور شکیل رزاقی نے کلام سنایا۔

۱۳ رمئی :- غزل اکیڈیمی کے زیر اہتمام محفل سوز و ساز کا ثقافتی اور خوب صورت تہذیبی پروگرام جناب سید ہاشم علی اختر معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر اے این ماتھر منیجر اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد مہمان خصوصی تھے۔ ممتاز موسیقار ڈاکٹر رضی الدین اور بیگم رضی نے اس مقصدی پروگرام کو اپنے نغمات سے کامیاب بنایا۔ پروگرام کی آمدنی سے ایک معذور بچی وجے لکشمی کے تعلیمی آمدنی اخراجات اور مرحوم بزرگ شاعر حضرت تاج قریشی کی اہلیہ کی اعانت کی گئی۔

۱۹ رمئی :- ادارۂ شہنائے ادب کی علمی و شعری نشست رضا صمیم کی صدارت میں ہوئی۔ آذر نیلوری مہمان خصوصی تھے۔ علی سرور نے مشاعرہ کی صدارت کی۔

● :- بزم عرفان ادب کا مشاعرہ جناب احمد سعید الدین برنی کی صدارت میں ہوا۔ بزرگ شاعر جناب بشیر وارثی مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر اسد انصاری، بشیر وارثی سراج حیدرآبادی، برق یوسفی، محوی سروشی، اکبر یوسفی، ساغر مظہری نے کلام سنایا۔

۲۰ رمئی :- مرکز ادب کا ادبی اجلاس و طرحی مشاعرہ جناب سلطان محی الدین سیف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عقیل ہاشمی نے جدید نظم پر مضمون سنایا۔ مشاعرہ میں آنند راؤ آنند، قمر رضا، پاگل عادل آبادی، ناقد رزاقی، علی سرور، بشیر، مسرور عابدی، طالب اسلامی، سالک، سرپت حیدرآبادی، دنکر سائدنگر، راجہ ثاقب، وجہ، وحید کمندان، منوہر لال بہار، عزیز بھارتی، ارمان قریشی، مشتاق علی مشتاق، عبدالکریم ماہر اور صدر مشاعرہ نے کلام سنایا۔ عزیز بھارتی نے معتمد مشاعرہ

کے فرائض انجام دیئے۔

٭ بزم بقائے ادب کے زیر اہتمام اردو صحافت پر ایک سمینار جناب میر احمد علی خاں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب یم باگا ریڈی صدر اردو اکیڈیمی مہمان خصوصی تھے۔ جناب لطیف الدین قادری ایڈیٹر رہنمائے دکن "مسٹر یدھ ویر ایڈیٹر "ملاپ" جناب نور محمد ایڈیٹر پرواز شاہین، جناب غوث خاموشی اور اختر جمالی صاحب نے خطاب کیا۔

۱۲ مئی :۔ اردو تعلیمی ٹرسٹ کی مجلس امنا کا اجلاس نواب میر احمد علی خاں کی صدارت میں ہوا۔ منیجنگ ٹرسٹی جناب عابد علی خاں نے بتایا کہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ کی آمدنی کو شامل کرکے تعلیمی ٹرسٹ کا سرمایہ ۲ لاکھ ۶۲ ہزار ہوگیا ہے۔ اور نئے تعلیمی سال کے آغاز سے تعلیمی ٹرسٹ کی جانب سے شہر میں اردو ماڈل اسکولوں اور محبوب نگر میں ایک سنٹر قائم کیا جائے گا

۲۲ مئی :۔ ممتاز عثمانین دانشور ڈاکٹر سید محمد محسن محشر عابدی سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر عابدی اردو میں سائنسی موضوعات کے علاوہ دکنستان کے مصنف، مترجم، ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

اردو اکیڈیمی کے ماہانہ خبرنامہ کی رسم اجرا جناب لطیف الدین قادری ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن "نے انجام دی۔ مسٹر چندر سریو استو ڈائرکٹر اکیڈیمی نے خبرنامہ کی اشاعت کے تعلق سے تقریر کی۔ مولانا حافظ ابو یوسف صدر انتظامی کمیٹی اردو اکیڈیمی نے جلسہ کی صدارت کی۔ مسٹر سرینواس لاہوٹی نے شکریہ ادا کیا۔

۲۴ مئی۔ مرحوم صحافی کریم سنوسی کی بیوہ کو روزنامہ سیاست اور ادبی ٹرسٹ کی طرف سے مالی اعانت دی گئی۔

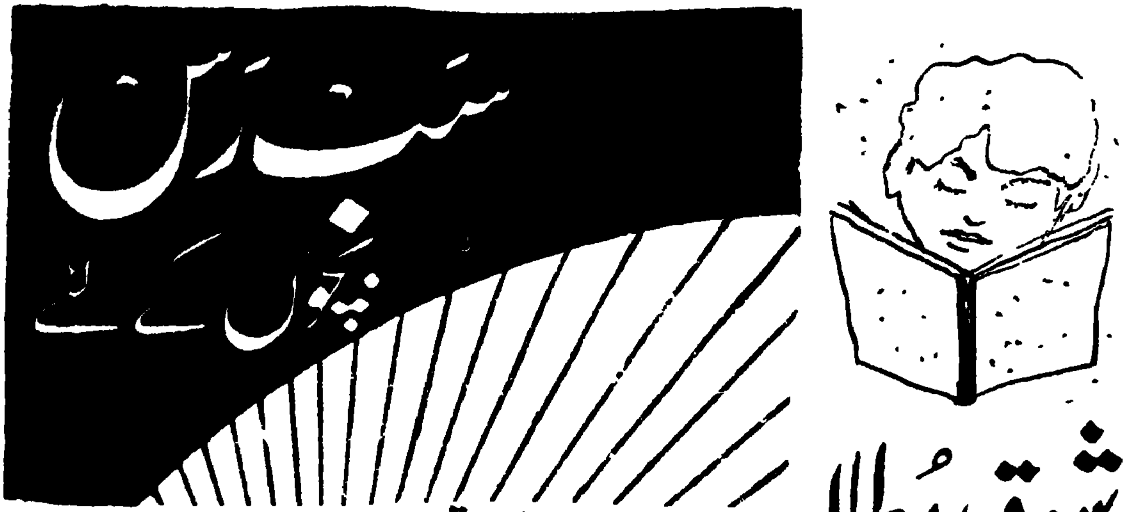
۲۶ مئی :۔ جناب خاکی حیدرآبادی کے شعری مجموعہ "ناز" کی مسٹر گنگا ریڈی ریاستی وزیر آبکاری نے رسم اجرا انجام دی۔ مسٹر چندر سریو استوا ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب احسن علی مرزا نے تقریر کی۔ مسٹر غلام مرجان ایڈیٹر "تیشہ" کی صدارت میں محفل شعر منعقد ہوئی۔ سرزا اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی، وقار خلیل، انور رشید، صلاح الدین نیر، فیض انجم، خیال، حسام الدین سلیم، عرشی، ممتاز قادری، اور نور النساء شکیل نے کلام سنایا۔ اوج یعقوبی نے شکریہ ادا کیا۔

٭ ادارہ "قدر ادب" کی محفل دوبیتی و غزل بصدارت جناب مظفر الدین خاں صاحب منعقد ہوئی۔ صدر کے علاوہ قدر عریضی، خورشید حبیبی، ارمان قریشی، سراج حیدرآبادی، اسمعیل ظریف، فرید سرفی، علی سرور اور جگجیون استھانہ سحر نے کلام پیش کیا۔

٭ بزم خلوص کی طرف سے جناب تاج مہجور کی صدارت میں ادبی و شعری محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر یوسف کمال اور جناب رضا الجبار مہمانان خصوصی تھے۔ رضا الجبار، عاتق شاہ، یم مظہر الزماں اور بشیر الور صاحبان نے افسانے سنائے۔ مسیح انجم، یم اے حنان اور راشد علی خاں نے فکاہیہ تخلیقات پیش کیں۔ آخر میں شعری محفل بھی ہوئی۔

۲۷ مئی :۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے " اردو میں تحقیق" کے مسائل پر مقالہ پڑھا۔ محفل شعر میں شکیب، ڈاکٹر یوسف کمال، صلاح الدین نیر، مصلح الدین سعدی، رحمن جامی، کیف رضوانی (پاکستان) مضطر مجاز، تاج کرمنگری، حامد مجاز، بانو طاہرہ سعید، صادق نقوی، قدیر انصاری، رحمت یوسفزئی اور منیر الزماں منیر نے کلام پیش کیا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

۳۰ مئی :۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دانشور نقاد ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے سماجی لسانیات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو میں نئے طریق سے اصطلاحات سازی کے کام کو آگے بڑھانے پر زور دیا۔ جناب فضل الرحمن سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے صدارت کی اور جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ ادا کیا۔



شوقِ مطالعہ

محمد عبدالقادر فاروقی

امریکہ کا صدر مرحوم جمہوریہ لنکن ایک نہایت ہی غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کو لڑکپن میں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ مگر غریبی اور تنگدستی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے ذاتی صرفہ سے کتابیں خرید کر پڑھے اور نہ اس زمانے میں اخبارات و رسائل کی افراط تھی اور نہ ہی ایسے دار المطالعہ تھے کہ جن سے عوام مستفید ہو سکیں۔ اس کے اپنے مکان میں چند پرانی کتابیں تھیں۔ جن کو وہ اکثر و بیشتر پڑھتا تھا۔ ان مخصوص کتابوں کے کثرت مطالعہ کے سبب وہ ان کا حافظ ہوگیا تھا۔

اسی زمانہ میں اس کو پتہ چلا کہ کرافرڈ نامی ایک شخص اس کے پڑوس کے گاؤں میں مقیم ہے اور اس کے پاس 'مشاہیر واشنگٹن' نامی کتاب ہے۔ لنکن کو یہ معلوم ہوتے ہی وہ پیدل ہی کرافرڈ کے گاؤں کو جو اس کے گاؤں سے ۵ میل دور تھا چلا گیا۔ کرافرڈ کے پاس پہنچ کر لنکن نے نہایت اشتیاق سے سوال کیا:

'کیا آپ مجھ کو اپنی کتاب مشاہیر واشنگٹن' مطالعہ کے لئے مستعار دے سکتے ہیں؟'

کرافرڈ نے لنکن کے لب و لہجہ اور حرکات و سکنات سے اس کے علمی ذوق کا پتہ چلا لیا اور جب اس کو اطمینان ہوگیا کہ .. واقعی لنکن اپنی علمی تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے تو کرافرڈ نے کتاب دے کر کہا:

'دیکھو! یہ کتاب بہت قیمتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بد احتیاطی سے اس کو خراب کر دو۔' لنکن نے جواب دیا:

'نہیں، ہرگز نہیں!! یہ جوں کی توں آپ کو واپس کر دی جائے گی!' کتاب لے کر لنکن نہایت فاتحانہ انداز سے اپنے گاؤں کی طرف لوٹا، مگر چونکہ اس کا شوقِ مطالعہ حد درجہ بڑھ گیا تھا' اس لئے اس سے صبر نہ ہو سکا کہ وہ گھر جا کر اطمینان سے مطالعہ کرے۔ چنانچہ وہ راستے ہی میں چلتے چلتے مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ لنکن نے جب دیکھا کہ تاریکی بڑھ رہی ہے

تو کتاب بند کر کے دوڑتا ہوا اپنے گھر آیا اور نہایت اشتیاق سے چراغ کی روشنی میں "مشاہیرِ واشنگٹن" کے مطالعہ میں غرق ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ کتاب کو تپائی پر رکھ کر سو گیا۔ رات جب کہ لنکن میٹھی نیند سو رہا تھا، دھواں دھار بارش ہوئی اور لنکن کے گھر میں اندھیرا اتر آیا۔ کیوں کہ لنکن کا گھر کوئی محل نہ تھا، بلکہ ایک غریب کی جھونپڑی تھی۔

جب لنکن بیدار ہوا تو اس کو کتاب کا خیال آیا اور وہ گھبرا کر اٹھا کہ آیا کتاب خراب تو نہیں ہو گئی۔ اس نے فوراً کتاب کو دیکھا تو کتاب بھیگ کر بہت خراب ہو گئی تھی۔ اس کے اوراق ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ اور جلد تو بالکل گل گئی تھی کتاب کی یہ بُری حالت دیکھ کر لنکن کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیوں کہ اس نے کرافرڈ سے کتاب کے جوں کی توں واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کتاب کی یہ بُری حالت دیکھ کر اس کی نیند کافور ہو گئی۔ اور اس نے فوراً کتاب کو آگ سے سینکنا شروع کیا اور اس کے درست کرنے کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر دیں۔ مگر افسوس کہ کتاب اپنی اصلی حالت پر نہ آ سکی، بلکہ آگ پر سینکنے کی وجہ اس کے اوراق میں سختی پیدا ہو گئی تھی۔

لنکن کو کتاب کے خراب ہو جانے کا بے حد رنج تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے جھٹلائے جانے کا بھی از حد ملال تھا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمت و جرأت سے کام لیا اور دوسرے دن کتاب لے کر کرافرڈ کے پاس پہنچا اور کتاب واپس کر دی۔ کرافرڈ نے اپنی کتاب کو خستہ حالت میں دیکھ کر درشت لہجے میں پوچھا:

"تم نے تو کتاب کی حالت بدل ڈالی، کیا تم نے اپنے الفاظ کی یہی قدر کی؟" یہ سن کر لنکن مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ اور نہایت سنجیدگی سے جواب دیا:

"مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں آپ کی کتاب کو جوں کا توں واپس نہ کر سکا۔ لیکن میں بالکل بے قصور ہوں۔ کیوں کہ یہ اُس اچانک بارش کا سبب ہے کہ آپ کی کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ میں اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہوں، لیکن معاوضے کے لئے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں، آپ مجھ سے جو چاہیں خدمت لے سکتے ہیں"، کرافرڈ اس کی گفتگو سن کر مبہوت ہو گیا اور خیال کیا کہ واقعی لڑکا بے قصور ہے، مگر پھر اس کے دل میں یکایک لنکن کی آزمائش کا خیال پیدا ہوا کہ آیا وہ اپنے اس قول پر کہ اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے، پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اس نے لنکن سے کہا:

"تم کو اس کتاب کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے تین دن تک میرے پاس کام کرنا ہوگا"۔ لنکن نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا اور مسلسل تین دن تک لنکن کو جو کام بھی دیا گیا، نہایت مستعدی سے پورا کیا۔ تین دن بعد جب لنکن نے کرافرڈ سے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو اس وقت تک کرافرڈ لنکن کی خودداری، استقلال اور عزمِ راسخ کا گرویدہ ہو گیا۔ اور نہایت مشفقانہ لہجہ میں یہ کہتے ہوئے کتاب اس کے حوالے کی:

"لنکن! بے شک میری کتاب بہت قیمتی ہے، مگر تمہارا معاوضہ بھی کتاب سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ کتاب انعام دیتا ہوں"۔ کتاب کے اس طرح مل جانے سے لنکن کو انتہائی مسرت ہوئی۔ وہ عالمِ کیف میں ڈوبا ہوا گھر لوٹا۔ اب لنکن کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر اس کتاب "مشاہیرِ واشنگٹن" کا مطالعہ کرتا اور اس کے مطالعہ میں اس کو بے حد سرور حاصل

ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس کتاب کو اس نے ایک گراں معاوضے پر حاصل کیا تھا۔ جب تک لنکن امریکہ کا صدر جمہوریہ رہا، ہمیشہ اپنی تقریروں میں یہ ضرور کہا کرتا تھا کہ اس کا یہ اعزاز محض 'مشاہیر واشنگٹن' کے مطالعہ کی بدولت ہے۔

مزمل گلریز

سورج

اورینٹل کالج کا وسیع لان کالج کے لڑکوں سے بھرا پڑا تھا۔ لڑکوں کے چھوٹے بڑے گروپس انڈول کے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میدان کے بیچوں بیچ بیٹھا تنویر، جمشید، ضیا اور پرویز پر مشتمل گروپ قہقہوں کا طوفان اٹھائے ہوئے تھا۔ ان تمام کا تعلق دولت مند گھرانے سے تھا۔ اچانک ان لوگوں کی نظر ریحان پر پڑی، جو دائیں جانب ایک گوشے میں بیٹھا اپنے دوستوں کو نوٹس لکھا رہا تھا۔ ریحان پر نظر پڑتے ہی ان سب کے قہقہے رُک گئے اور اُن کی آنکھوں سے نفرت جھلکنے لگی۔ تنویر اور جمشید ریحان سے صرف اس لئے حسد کرتے تھے کہ وہ انتہائی دولت مند ہونے کے باوجود غریب لڑکوں سے دوستی رکھتا تھا، ان کے ساتھ ہنسنا، کھیلنا، پڑھنا، لکھنا، ان کی دل جوئی کرنا، یہ سب باتیں ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے ریحان صرف ان ہی کے ساتھ ملے جلے، ہوٹل ہو کہ پکچر، کوئی تفریحی مقام ہو کہ کھیل کا میدان، وہ چاہتے تھے کہ ریحان ان کے دوش بدوش رہے، لیکن ریحان ان باتوں پر ذرا بھی توجہ نہ دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ غریب ہو کہ امیر، سب کے سینے میں ایک دل ہے اور وہ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر دولت مند ہونے کی وجہ سے وہ غریب دوستوں کا ساتھ چھوڑ دے تو لوگ اسے گھمنڈی کہیں گے۔ وہ یہ بھی سوچتا کہ ہوٹلوں میں بیٹھنا، پکچرز دیکھنا، طالب علموں کو زیب نہیں دیتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ تنویر وغیرہ سے بالکل نہیں ملتا۔ وہ ان لوگوں سے ملتا ضرور تھا، لیکن وہ ان کی فضول مصروفیات میں بالکل ساتھ نہ دیتا۔

'ریحان ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتا؟' تنویر نے اپنے دوستوں سے سوال کیا۔

'شاید وہ اپنے کم تر دوستوں پر رعب جماتا ہے۔' ضیا نے خیال ظاہر کیا۔

'ہمارے سامنے تو وہ شرافت کا لبادہ اوڑھے رہتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ہم جیسا ہی ہے۔' پرویز مضبوط لہجے میں بولا۔ 'تو پھر کیوں نہ اس کے چہرے سے نقاب الٹ دیں۔' جمشید نے رائے دی۔

جمشید کی رائے کی سب ہی نے تائید کی۔ اور وہ سب موقع کی تلاش میں رہنے لگے کہ کبھی ریحان کو اس کے ساتھیوں کے ہمراہ کسی تھیٹر وغیرہ میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ لیکن اس میں انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تو انہوں نے ریحان کے ساتھیوں کو کریدنا شروع کیا۔ لیکن یہاں بھی اُنھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک دن جمال بازار کے قریب اُنھیں ریحان کا ایک ساتھی اطہر مل گیا۔ اسے زبردستی ایک ہوٹل میں لے گئے اور ریحان کے متعلق سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ اطہر پہلے تو کچھ بتانے سے انکار کرتا رہا، لیکن جب تنویر اور پرویز نے ریحان

کے بارے میں بدگمانی کرنے لگے تو وہ برداشت نہ کر سکا اور بولا: "ریحان نہ صرف ہمارا مخلص دوست ہے بلکہ نیک اور رحمدل انسان کے روپ میں ہمارا محسن بھی ہے۔"

"اچھا...! کیا احسانات کئے ہیں بھئی اس نے؟"

جمشید کے لہجے میں طنز تھا۔ "... تمہیں کیا معلوم وہ کالج کے کتنے ہی لڑکوں کی فیس وہ ادا کرتا ہے، جن بچوں کو کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہی ان کی مدد کرتا ہے۔ سیلاب فنڈ ہو یا کسی یتیم خانے کے لئے عطیہ، وہ اپنا تمام جیب خرچ دے دیتا ہے۔ وہ احسان کرتا ضرور ہے، لیکن.. جتانے کے لئے نہیں..." اظہر کچھ رک کر بولا:

"ریحان نے ہمیشہ مجھے ان باتوں کو راز میں رکھنے کی سخت تاکید کی تھی، لیکن تم لوگوں کے لگائے ان جھوٹے الزامات نے مجھے اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔"

اظہر.... اپنی دُھن میں مسلسل بول رہا تھا، لیکن تنویر، جمشید، پرویز اور ضیاء کی نگاہوں میں صرف ریحان کا چہرہ گھوم رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے ریحان سورج بن کر آسمان کی بلندیوں سے ساری دنیا کو منور کر رہا ہے۔

امیر احمد خسرو

دیکھو وہ صبح آئی

تاروں نے منہ چھپایا ہونے لگا سویرا
وہ روشنی سی پھیلی بھاگا کہیں اندھیرا
دیکھو وہ صبح آئی

ہر سو ہوا اُجالا جاگی وہ زندگانی
وہ پھول مسکرائے کیا صبح ہے سہانی
دیکھو وہ صبح آئی

بادل کی کھڑکیوں سے سورج نے سر نکالا
لو جاگ اُٹھا زمانہ وہ ہو گیا اجالا
دیکھو وہ صبح آئی

کہتی ہے روز آ کر اے کام کرنے والو
آرام چھوڑ دو اب اب نیند کو بھگا دو
دیکھو وہ صبح آئی
دیکھو وہ صبح آئی

ہیرے صفحہ ۲۹ سے آگے

ہو سکی۔ اس عمل کو کئی بار دہرانے کے بعد جو مصنوعی ہیرا تیار ہوتا ہے۔ اس کی سائز عام طور پر ۲۔۰ ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اس کا وزن بھی کیراٹ کے ایک ہزارویں حصہ کے برابر ہوتا ہے۔ اب ایسے مصنوعی ہیرے مخصوص صنعتی ضروریات کے پیش نظر بنائے جاتے ہیں، اس لئے صنعتی میدان میں مصنوعی ہیرے فطری ہیروں سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوئے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق دنیا میں ہر سال ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کیراٹ مصنوعی ہیرے امریکہ، جاپان، سویڈن، جنوبی افریقہ، روس، چیکوسلواکیہ اور مغربی جرمنی میں بنائے جا رہے ہیں۔ ایک حالیہ اطلاع کے مطابق ہندوستان کی نیشنل فزیکل لیبارٹری (دہلی) میں مصنوعی ہیروں کی تیاری امید افزا تجربوں کے مراحل میں ہے۔ گذشتہ ۲۵ سالوں میں مصنوعی ہیروں کی تیاری میں اس قدر مہارت اور اعتماد حاصل ہو گیا ہے کہ امریکہ کی جنرل الکٹرک کمپنی اب جواہر کے درجہ کے ہیرے تیار کرنے کے موقف میں ہے۔

طوفان کے امداد کی ہمہ وقتی مہم

آندھرا کے ساحلی اضلاع میں ۱۲ مئی ۱۹۷۹ء کے بھیانک طوفان نے عظیم تباہی و بربادی مچادی جس کے باعث (۶۰۰) افراد ہلاک ہوگئے۔ مجموعی طور پر ۱۶۸ کروڑ روپیوں کا نقصان ہوا۔ آج باز آباد کاری اور امداد کا کام جنگی سطح پر کیا جارہا ہے

اب تک امدادی کاموں پر ۸۵۳ر۳۴۸ لاکھ روپے صرف کئے جاچکے ہیں ۱۲۳۸۶ ٹن چاول اور زائد از ۵۰ لاکھ دھوتیاں اور ساڑیاں طوفان سے متاثرہ عوام میں تقسیم کئے جاچکے ہیں۔

اضلاع پرکاشم اور نیلور میں ۸۸ر۱۷ کروڑ روپے کاشت کاروں کو دیئے جائیں گے تاکہ وہ دوبارہ کاشت کرسکیں۔

ابتدائی طور پر ۲۵ کروڑ روپے کے سرمایہ سے دو اضلاع نیلور اور پرکاشم میں ایک لاکھ مکانات تعمیر کئے جائیں گے۔

D.I.P.R, SPL/ADVT/C4/79 DT.1-6-79

صنعتی محاذ پر پیش رفت

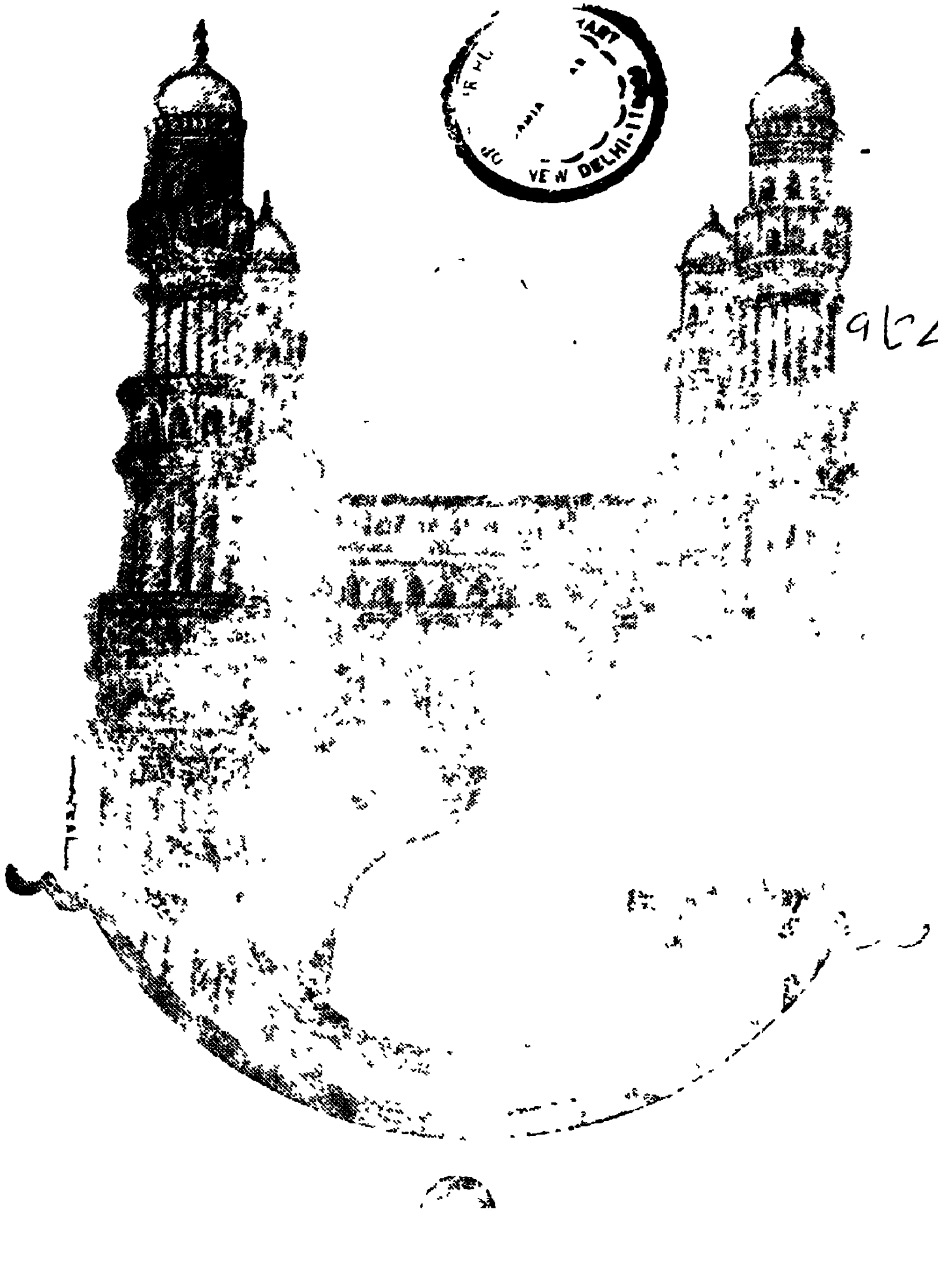
آندھرا پردیش صنعتی محاذ پر نئی سرحدوں کی سمت پیش رفت میں مصروف ہے۔ آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے اب تک کوئی ۱۸۰ پراجکٹوں کو آغاز کیا ہے یا ان کے آغاز میں مدد دی ہے۔ ان پراجکٹوں میں جملہ ۶۶۵ کروڑ روپیوں کا سرمایہ مشغول کیا جائے گا اور ان میں ۱۷۵۰۰۰ افراد کے لئے روزگار کی گنجائش بہم دستیاب ہوگی۔

ریاست کے گیارہ اضلاع میں ضلعی صنعتی مراکز کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ جن کا کام چھوٹی صنعتوں کے آغاز کے سلسلہ میں رہنمائی کرنا اور سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ یہ مراکز ایک صنعت کار کو نہ صرف صنعتی سرگرمیوں کے شعبہ کے انتخاب میں مدد دیں گے بلکہ صنعت کے قیام سے لے کر خام مال کی فراہمی۔ قرض کی بہم رسانی اور مشنری کے حصول تک ہر معاملے میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔

وہ دن دور نہیں جب آندھرا پردیش

ایک عظیم صنعتی ریاست بن جائیگی

سب رس



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اجراء : ۱۹۳۸ء

ن : ۳۸۴۶۹

ماہنامہ

سب رس

مجلس مشاورت سب رس

حیدرآباد

ڈاکٹر مغنی تبسم (معتمد مجلس مشاورت و مدیر اعزازی)   وقار خلیل (معاون مدیر)

جلد : ۴۲   جولائی تا ستمبر ۱۹۷۹ء   زر سالانہ : ۲۰ روپے، ششماہی : ۱۰ روپے فی شمارہ ایک روپیہ پچاس پیسے
شمارہ : ۷ تا ۹   بیرونی ممالک سے : مشرق وسطی ۱۰ ڈالر، پاکستان ۲۰ روپے، یورپ ۸ ڈالر، امریکہ ۱۶ ڈالر

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

مقام اشاعت : ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴

ترتیب

بہ یادِ فانی بدایونی

~~ o ~~

نقد و نظر

اردو نامہ

بچوں کا سب رس

منصوبے نئے خدوخال کے ساتھ

آندھراپردیش کے وسط مدتی منصوبے پر جملہ ۳۹۷ کروڑ روپیے خرچ کئے جائیں گے جبکہ اس کے مقابلہ میں ۷۹-۱۹۷۴ء کی مدت میں پانچویں منصوبے پر بتدا ۵۰۰ اکروڑ روپیے کا خرچ پیش نظر تھا۔

آندھراپردیش کمزور طبقات کی فلاح و بہبود اور ان کی ترقی کا بالکلیہ تہیہ کر چکا ہے اس لئے ہمارے منصوبوں میں روزگار کے مواقعات کی گنجائیش نظر ثانی شدہ اقل ترین ضروریات کے پروگراموں کی عمل آوری اور درج فہرست اقوام۔ درج فہرست قبائل۔ پس ماندہ طبقات اور دوسرے عام طبقات کے لئے بہبود کے کاموں پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

چنانچہ اس سمت میں پہلا قدم ۲۰ کروڑ روپیے مالیت کی ایک ایسی اسکیم کی تیاری ہے، جس کی بدولت پندرہ ہزار سے زائد بیروزگار افراد کے لئے روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے اور علاوہ ازیں ان کو سودمند اور منفعت بخش پیشوں کی تربیت بہم دست ہوگی۔

ہمارے منصوبے روزگار کے
نئے نئے مواقعات فراہم کرتے ہیں

D.I.P.R 662/ADUT/C4 '79 DT 24. 5.79.

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

مرزا علی لطف — ایک تعارف

مرزا علی لطف کا شمار اردو کے اولین تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ لطف سے قبل اردو شاعروں کے بہت سے تذکرے مرتب ہوئے لیکن یہ سب فارسی زبان میں ہیں۔ لطف پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں تذکرہ نگاری کی بنا ڈالی۔ ان کا تذکرہ "گلشن ہند" کہنے کو فارسی تذکرہ "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ ہے لیکن اس میں لطف نے اتنے اضافے کیے ہیں کہ ہم بغیر کسی تردد کے اس کو لطف کی تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔

عام طور پر لطف کا شمار فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین میں کیا جاتا ہے لیکن اس کالج سے لطف کا براہ راست تعلق نہیں رہا۔ [illegible] ایک بار وہ شیر علی افسوس کے توسط سے ڈاکٹر جان گلکرسٹ پروفیسر ہندستانی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے متعارف ہوئے اور [illegible] گلکرسٹ نے ان سے فرمائش کی کہ وہ علی ابراہیم خان خلیل کے فارسی تذکرہ "گلزار ابراہیم" کا اردو میں ترجمہ کریں چنانچہ ان کی [illegible] لطف نے اس تذکرے کو اس زمانے کی سلیس اور سادہ زبان میں لکھ کر گلکرسٹ کی خدمت میں ۱۸۰۱ء میں پیش کیا جسے گلکرسٹ نے بے حد پسند کیا لیکن نامعلوم وجوہ سے یہ تذکرہ شائع نہیں ہوا۔ حسن اتفاق سے اس کا ایک نسخہ رود موسیٰ کے سیلاب میں بہتا ہوا مولوی [illegible] محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا جس کو انہوں نے شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے حوالے کیا جو ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے بعد تصحیح و تحشیہ اس کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا لیکن انجمن چند اسباب [illegible] اس کو نہ چھاپ سکی۔ بعد میں مولوی عبدالحق کے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ عبداللہ خان نے اس کو رفاہ عام پریس لاہور سے [illegible]ء میں شائع کیا پھر ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے مقدمے کے ساتھ اس تذکرہ کا ایک ایڈیشن شائع کیا اس میں گلزار ابراہیم کے وہ حصے شامل کر دیئے گئے ہیں جن کا ترجمہ لطف نے نہیں کیا تھا۔

لطف نے تذکرہ گلشن ہند میں اردو کے ۶۹ شعرا کے حالات زندگی ان کے نمونۂ کلام کے ساتھ دیئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے [illegible] حالات زندگی میں تو کوئی ترمیم نہیں کی مگر لطف کے دیئے گئے نمونۂ کلام میں تحریف کر دی اور صفحوں کے صفحے حذف کر دیئے [illegible] رسے بھی اسی طرح مولوی عبدالحق کی من و عن تقلید کی ہے۔ راقم الحروف نے تذکرہ گلشن ہند کے اصل نسخوں سے جب [illegible] نسخوں کا موازنہ کیا تو اس میں کافی فرق پایا۔

لطف ایک اچھے نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک پُرگو شاعر بھی تھے عام طور پر ادبی حلقوں میں لطف کو ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے جبکہ وہ میر درد [illegible] کے ایک خوش گو اور اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے۔ اب تک لطف کی شاعرانہ حیثیت کو کسی نے متعین کرنے کی کوشش نہیں کی [illegible] ان کا دیوان ہنوز منظر عام پر [illegible] ایک

نسخہ دستیاب ہوتا ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کے مطالعہ سے بحیثیت شاعر لطف کا مقام متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اُردو کے تذکروں اور تواریخ میں لطف کے بہت کم حالاتِ زندگی دستیاب ہوتے ہیں۔ لطف کی حیات پر سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی ہے جو "حیاتِ لطف" کے نام سے ۱۹۶۲ء میں مجلسِ تحقیقات اُردو، حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔

لطف نے اپنے تذکرے "گلشنِ ہند" میں اپنے نام کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے:۔

"لطف تخلص، مرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا۔" [۱]

اس بیان کے پیشِ نظر لطف کے نام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن بعض تذکروں میں مرزا علی لطف کی بجائے کچھ اور نام لکھے گئے ہیں۔ "تذکرہ طبقات الشعراء" میں جو "گلشنِ ہند" سے ستائیس برس پہلے لکھا گیا ہے لطف کا نام مرزا علی ہی لکھا گیا ہے اس کے علاوہ "مجمع الانتخاب" "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا" "خطبات گارساں دتاسی" اور "بیاضِ سخن" میں بھی یہی نام بتایا گیا ہے "گلستانِ بےخزاں" میں لطف کا نام مرزا عالی لکھا ہے [۲]۔ لیکن فہرست میں مرزا علی ہی چھپا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ نمونۂ کلام لطف ہی کا دیا گیا ہے۔

"عمدۂ منتخبہ" میں مرزا علی لطف کا ذکر دو بار اس طرح آیا ہے گویا یہ دو الگ اشخاص ہیں۔ صفحہ ۵۰ پر لطف کے جو حالات لکھے ہیں وہ مرزا علی لطف کے ہیں اور نمونۂ کلام بھی انہی کا ہے [۳] مثلاً یہ شعر ؎

روشن ضمیر کیوں کہ نہ ہوں دل کے داغ سے
خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

یہ شعر "دیوانِ لطف" میں موجود ہے [۴]۔ اس کے بعد ایک اور جگہ لطف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "لطف تخلص مرزا علی ساکن لکھنؤ، شاگرد شاہ ملول" [۵] یہاں بھی نمونۂ کلام مرزا علی لطف کا دیا گیا ہے مثلاً یہ شعر دیوان میں صفحہ ۱۰ پر ملتا ہے [۶]

آپ تو بات میں بگڑتے ہیں
واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں

صاحب تذکرہ کو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہوا ہے جس کا سبب لطف کا شاگردِ ملول بنایا جانا ہے۔ پہلے لطف سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور چند روز ان کا قیام عظیم آباد میں رہا۔ دوسری بار لطف کو شاگردِ ملول اور لکھنؤ کے ساکن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

---

[۱] لطف مرزا علی۔ گلشنِ ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶
[۲] باطن قطب الدین "گلستانِ بےخزاں" (لکھنؤ ۱۸۷۵) ص ۲۰۲
[۳] سرور نواب اعظم الدولہ میر محمد خان بہادر عمدۂ منتخبہ (تذکرہ سرور) مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) دہلی ۱۹۶۱ء
[۴] لطف مرزا علی دیوانِ لطف (قلمی نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ) ص ۱۴ (ب)
[۵] عمدۂ منتخبہ ص ۵۰۱
[۶] دیوانِ لطف ص ۱۰

کسی وجہ سے انھیں دھوکہ ہوا کہ یہ دو مختلف لطف ہیں۔ گارساں دتاسی نے ان کی غلط فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"سرور انھیں لکھنو کے مرزا علی لطف سے مختلف شخص سمجھتے ہیں جو طپاں کے شاگرد اور "گلشن ہند" کے مصنف ہیں
میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہیں۔" [1]

سرور کا لکھنو کے لطف کو دہلی کے لطف سے مختلف سمجھنا تعجب خیز بھی ہے جبکہ انھیں کے ہم عصر تذکرہ نگار شاہ کمال لطف سے لکھنو میں مل چکے ہیں اور ۱۸۰۴ء میں اپنا تذکرہ مکمل کیا تھا جس میں لطف کے حالات بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے لطف کو شاگرد میرزا بتایا ہے [2] ایسی ہی غلط فہمی تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کے مصنف سعادت خاں ناصر کو ہوئی ہے۔ لطف کے بارے میں اس طرح کی غلط فہمیوں کا سبب ان کی شاگردی کے بارے میں اختلافات بھی ہیں کوئی انھیں میر کا شاگرد کوئی سودا کا اور کوئی طپاں کا شاگرد بتاتا ہے جبکہ لطف نے صاف لفظوں میں یہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہیں۔ جہاں تک میر اور سودا کی شاگردی کا تعلق ہے۔ بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ لطف اس سے انکار کریں۔ میر یا سودا کا شاگرد کہلانا ان کے لیے باعث افتخار ہو سکتا تھا اس لیے قیاس اغلب ہے کہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر انھوں نے خود کو میر یا سودا کا شاگرد ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

شیفتہ نے لطف کو میر کا شاگرد بتایا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"نسبت شاگردی بمیر تقی داشتہ۔" [3]

گارساں دتاسی بھی شیفتہ کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے

"ہندوستان کے روحانی ادیب مرزا علی لطف گرگان میں استرآباد کے باشندے کاظم بیگ خان کے فرزند . . نے ہندوستانی (اردو) زبان اختیار کی اور میر تقی کی شاگردی کی۔" [4]

محمد حسین خاں [5] اور احمد حسین سحر [6] کی شیفتہ اور گارساں دتاسی کی طرح لطف کو میر کا شاگرد ہی لکھتے ہیں۔

ایک بات جو قطعی طور سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ لطف کو میر سے تلمذ حاصل نہیں رہا۔ لطف نے جب اپنا تذکرہ لکھا میر زندہ تھے اور لطف نے اپنے تذکرے میں میر کا جو حال لکھا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لطف میر کے قریب رہ چکے تھے اور حیدرآباد آنے کے بعد بھی ان کے حالات سے باخبر تھے اس امکان کے پیش نظر کہ ان کا تذکرہ میر کی نظر سے گذرے گا وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتے تھے اور اگر وہ میر کے شاگرد ہوتے تو اس کا اظہار ضرور کرتے۔

---

[1] گارساں دتاسی۔ ہندوستانی جے لا لترے تیور ہنادوی ایت ہندوستانی (فرانسیسی) (پیرس ۱۸۷۰ء) ص ۱۳۶

[2] شاہ کمال، تذکرہ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۹۷۹ (ب)

[3] شیفتہ، گلشن بے خار (لکھنو ۱۸۳۵ء) ص ۱۶۷

[4] تاریخ ہندوستانی اور ہندوستانی ادب (فرانسیسی) (فرانس ۱۸۷۰ء) جلد دوم ص ۲۳۶

[5] تذکرہ ریاض الفردوس (ترتیب حواشی مرتضیٰ حسین فاضل) (لکھنو ۱۸۶۷ء) ص ۱۲۴

[6] بہار بے خزاں (بہ تصحیح ڈاکٹر نعیم احمد) (دہلی ۱۹۶۸ء) ص ۸۳

تذکرہ نگاروں کی اکثریت نے انھیں سودا کا شاگرد قرار دیا ہے۔ ان میں خوب چند ذکا اور شاہ کمال بھی شامل ہیں جن کے بیانات کو آسانی سے رَد نہیں کیا جاسکتا۔ خوب چند ذکا نے لطف کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "مرزا علی لطف در شغل مغل زاست۔ ساکن بلدۂ لکھنو از مرزا محمد رفیع سودا اصلاح یافتہ" [۱]

شاہ کمال لکھنو میں لطف سے مل چکے تھے اور حیدرآباد میں بھی لطف کے ساتھ رہے وہ لکھتے ہیں۔

"مرزا علی جان لطف شاگرد رشید مرزا صاحب قبلہ" [۲] ان کے علاوہ قاسم [۳]، ناصر [۴]، نساخ [۵]، حسرت موہانی [۶] وغیرہ نے بھی انھیں سودا کا شاگرد لکھا ہے

عشقی نے سودا کے شاگرد ہونے کا ذکر اس طرح سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"نیں جہ۔ خود را بہ شاگردی مرزا متہم کرد" [۷]

گویا لطف حقیقت میں سودا کے شاگرد نہیں تھے لیکن خود کو شاگرد ظاہر کرتے تھے۔ عشقی کے اس بیان سے کسی قدر یہ معمہ حل ہوتا ہے۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ لطف، تو حقیقت میں سودا کے شاگرد تھے اور یہ بات عام طور پر مشہور تھی۔ پھر کچھ بات ایسی ہوئی کہ انھوں نے سودا کو کسی کا شاگرد ظاہر کرنا پسند نہیں کیا جیسا کہ قاضی عبدالودود کا خیال ہے۔

"اس کا امکان ہے کہ لطف نے کسی زمانے میں مشہور کر رکھا ہو کہ انھوں نے سودا سے اصلاح لی تھی لیکن بعد کو اس امر واقعی کا اعلان کر دیا ہو کہ کسی کے شاگرد نہیں" [۸]

لطف نے جب تذکرہ لکھا سودا کا انتقال ہوچکا تھا اس وقت لطف نے شاگردی سے انکار کیا تو کم از کم سودا کے سامنے جو دہ ہونے کا انھیں خوف نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں سودا کے ۳۶ شاگردوں کی طویل فہرست دی ہے لطف کے حالات زندگی تحریر کرتے ہوئے لطف کے تلمذ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"امکان یہ ہے کہ مرزا علی لطف کو سودا سے تلمذ تھا لیکن بعد میں ان کی شاگردی سے وہ منکر ہو گئے" [۹]

ایک قیاس یہ ہوسکتا ہے کہ لطف حقیقت میں سودا کے شاگرد رہے ہوں سودا کا انتقال ہوچکا تھا اور انھوں نے

۱؎ عیار الشعرا (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم) ص ۳۰۱

۲؎ مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالارجنگ لائبریری) ف ۶۷۹ (ب)

۳؎ مجموعۂ نغز ص ۱۴۸

۴؎ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ص ۳۶

۵؎ سخن الشعرا ص ۴۰۵

۶؎ اردوئے معلی (علی گڑھ اکتوبر ۱۹۱۰ء) ص ۳

۷؎ تذکرۂ عشقی (مرتبہ کلیم الدین احمد) پٹنہ ۱۹۶۳ء ص ۱۷۷

۸؎ عبدالحق بحیثیت محقق معاصر سہ ماہی (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء) ص ۳۱

۹؎ مرزا محمد رفیع سودا (دہلی ۱۹۶۶ء) ص ۵۹۱

مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے خود کو مستند شاعر ظاہر کرنے کی غرض سے یہ مشہور کر دیا ہو کہ سودا سے نسبتِ تلمذ حاصل رہا ہے اور بعد میں تذکرہ لکھتے وقت جو حقیقت تھی اسے ظاہر کر دیا ہو۔

لطف ملول کے شاگرد یقیناً نہیں تھے ایسا ہوتا تو وہ تذکرے میں اس کا اظہار ضرور کرتے۔ شاہ ملول فارسی کے شاعر تھے اردو میں بھی وہ شعر کہا کرتے تھے۔ پہلے ان کا تخلص ملول تھا بعد میں انہوں نے الہام تخلص اختیار کیا۔ لطف نے الہام ہی کے تخلص کے تحت ان کے حالات اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں۔ یہ غلط فہمی کہ لطف ملول کے شاگرد تھے غالباً اس بنا پر ہوئی کہ لکھنؤ میں ان کی نشست و برخاست زیادہ تر ملول کے ہاں رہتی تھی اور جیسا کہ لطف نے لکھا ہے کہ بیشتر اہل لکھنؤ کو شاگردی کے سوائے ان سے اعتقاد تمام ہے اسی اعتقاد کی بنا پر لطف کو بھی ملول کا شاگرد سمجھ لیا گیا ہو۔

لطف کے آبا و اجداد کا تعلق ایران سے تھا ان کے والد کاظم بیگ خان استرآباد کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کی افواج کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔ نادر شاہ ہندوستان سے ایران لوٹے تو مرزا کاظم بیگ یہیں رہ پڑے۔ ابو المنصور خان صفدر جنگ (جن کے نام کا ایرپورٹ دہلی میں موجود ہے) سے ان کے تعلقات ایران ہی سے تھے۔ انہی کی وساطت سے دربار شاہی میں باریاب ہوئے۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ مرزا کاظم بیگ خان فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ ہجری تخلص کرتے تھے۔

لطف کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا خود لطف نے اپنے تذکرے یا کسی تصنیف میں اپنی تاریخ پیدائش نہیں لکھی۔ محض قیاس آرائی کی بناء پر سنِ ولادت کا تعین کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر جاوید نہال نے لکھا ہے کہ

"مرزا علی لطف کی پیدائش دارالسلطنت دلی میں غالباً ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۲ء کے درمیان ہوئی کیونکہ جس وقت کلکتے آئے اُن کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی" [1] یہ قیاس آرائی ہی ہے کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کیا ہے جس کی بناء پر یہ تسلیم کیا جائے کہ جس وقت وہ کلکتہ آئے ان کی عمر لگ بھگ چالیس برس کی تھی۔ ڈاکٹر جاوید نہال کی طرح قاضی عبدالودود بھی قیاس آرائی سے نہیں چوکتے وہ لکھتے ہیں۔

"پیدائش کہیں کی ہو صغر سنی سے مقیم لکھنؤ ضرور تھے۔ قیاس ہے کہ ۱۷۷۱ء اور ۱۷۷۵ء کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے۔" [2]

ان قیاس آرائیوں کے سوا تلاش و تحقیق کے باوجود راقم الحروف کو کوئی ایسا مواد دستیاب نہیں ہو سکا جس سے لطف کی تاریخ پیدائش کا قطعی طور پر یقین ہو سکے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے دہلی کو لطف کا مولد قرار دیا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی ہی میں ہوئی۔ لطف نے فارسی کی تحصیل اپنے والد مرزا کاظم بیگ خان ہجری سے کی۔ فارسی کلام پر والد ہی سے اصلاح لی۔ اس زمانے میں دلی شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ اردو شاعری کا زرین عہد تھا۔ دبستانِ دلی کے مشہور شعرا میر، سودا، درد، سوز کے اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر تھے مشاعرے آئے دن منعقد کیے جاتے تھے گمان غالب ہے کہ لطف نے بھی عنفوانِ شباب میں ان مشاعروں میں شرکت کی ہوگی اس زمانے میں دہلی کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ سلاطین مغلیہ کمزور ہو چکے تھے شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سلطنت کے بارے میں یہ ضرب المثل ہر خاص و عام کی زبان پر تھی "سلطنتِ شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ جب بادشاہ کمزور ہو جاتا ہے تو امرا و اعلیٰ عہدہ دار سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہی حال دہلی کے امرا و اعلیٰ عہدہ داروں کا ہوا۔ بادشاہ امرا اور اعلیٰ عہدہ داروں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر

---

[1] جاوید نہال، ڈاکٹر انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۳۲۲

[2] قاضی عبدالودود "عبدالحق بحیثیت محقق" معاصر سہ ماہی (پٹنہ نمبر ۹ ۱۹۵۹ء) ص ۲۱

انگریز اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ہر خاص و عام پریشان تھا۔ ظاہر ہے کہ لطف بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غالباً ان ہی اسباب کی بنا پر لطف دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ چلے آئے۔

نواب آصف الدولہ نواب صفدر جنگ کے پوتے تھے۔* قدیم خاندانی مراسم کی بناء پر لطف کو اپنے پاس بلا لیا اور اپنے زمرہ ملازمتین میں داخل کر کے گذر بسر کے لیے کچھ مشاہرہ مقرر کر دیا۔ لکھنؤ میں لطف کو آرام اور اطمینان کی زندگی میسر ہوئی۔ نواب آصف الدولہ انتقال کے بعد لطف کی ملازمت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لکھنؤ سے روانہ ہونے کے بعد انہوں نے عظیم آباد میں بھی قیام کیا۔ عظیم آباد کا موجودہ نام "پٹنہ" ہے جو ریاست بہار کا پائے تخت ہے۔ لطف عظیم آباد سے مرشد آباد پہنچے۔ مرشد آباد اُن دنوں علم و ادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔ شیر علی افسوس کلکتہ جانے سے قبل مرشد آباد میں وارد ہوئے تھے وہ لطف کے گہرے دوست تھے چنانچہ اُن کا قیام مرشد آباد میں لطف کے ہاں رہا۔ شیر علی افسوس کا تقرر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں منشی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ جو کہ ملازمت سے قبل انھوں نے لطف کے ہاں قیام کیا۔ شیر علی افسوس کے کلکتہ روانہ ہونے کے کچھ عرصے بعد لطف بھی افسوس کی دعوت پر مرشد آباد سے کلکتہ پہنچے۔ افسوس نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے لطف کا تعارف کروایا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لطف نے ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلشن ہند لکھا۔ لطف کلکتہ محض افسوس کی دعوت پر گئے تھے ان کا ارادہ وہاں طویل قیام کا نہ تھا۔ وہ چند روز کلکتہ کی سیر کر کے حیدرآباد دکن جانا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اپنی فرمائش کو ایسے اخلاق و خوبی سے بیان کیا کہ لطف انکار نہ کر سکے اور گلشن ہند کی تدوین میں مصروف ہو گئے۔

ڈاکٹر جاوید نہال نے "انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" میں لکھا ہے کہ "لطف کو کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ لطف نے ملازمت کے حصول کی کوشش ہی نہیں کی اگر وہ چاہتے تو یہ وقتی منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو سکتا تھا کیونکہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ان کی قابلیت سے متاثر تھے اور شیر علی افسوس جو ان کے دوست اور بہی خواہ تھے انگریز حکام اور کالج کے عہدہ داروں سے اچھے مراسم رکھتے تھے۔

لطف نے بہت ہی قلیل عرصہ تک کلکتہ میں قیام کیا۔ تذکرہ گلشن ہند کی تالیف (۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء) کے بعد وہ حیدرآباد دکن روانہ ہوئے۔ لطف حیدرآباد دکن اپنے بھائی علی رضا کی ایما پر آئے تھے۔ رضا نواب ارسطو جاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ لطف کے دو بھائی تھے۔ مرزا رضا اور حاجی مرزا جان۔ دونوں نے اپنے زمانے کے مشہور سوز خوان تھے۔ لطف کے دوسرے بھائی حاجی مرزا جان کے حالات کا علم نہ ہو سکا۔ صرف حیدر جوہر کے بیان سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ چوروں نے انہیں قتل کر دیا تھا۔

حیدرآباد دکن میں اس وقت بڑے بڑے شعرا موجود تھے جن میں مقامی شاعر بھی تھے اور بیرونی شعرا بھی ان میں قابل ذکر حفیظ دہلوی، ماہ لقا بائی چندا، صدیق قیس، شیر محمد خاں ایمان، حیدر علی حقا لکھنوی، شاہ کمال، احسن اللہ خان بیان دہلوی، شاہ علی تجلی، شاہ تصیر وغیرہ ہیں۔ نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی نے لطف کی بڑی سرپرستی کی چار سو روپیہ ماہوار و پالکی سے سرفراز کیا۔ درباری شاعر ہونے کے علاوہ لطف نواب ارسطو جاہ کے مصاحب بھی تھے۔ حیدرآباد دکن میں لطف فارغ البال تھے۔ نواب ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد میر عالم مدار المہام ہوئے۔ انہوں نے اپنے پیش رو کی طرح لطف کو بھی اپنے الطاف سے سرفراز کیا۔

* لطف کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عبدالجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرے میں لطف کا سن وفات ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء درج کیا ہے محمد عبداللہ خان ضیغم نے بھی لکھا ہے کہ لطف ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء میں فوت ہوئے۔ لطف کا صحیح سن وفات ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء ہے۔

طارق سعید

ہندی کہانی۔ آغاز و ارتقاء

قصہ گوئی کے لئے ہندوستان کی سرزمین بہت زرخیز ہے۔

ویدک زمانے کی سب سے عظیم کتاب "رگ وید" ہی سے قصہ گوئی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ رگ وید کے تین حصہ ہیں جو عبادت اور علم سے عبارت ہیں۔ عبادت کا حصہ کہانیوں سے لبریز ہے۔ رگ کے مختلف حصوں میں تو پورُو رَوا' یَدو' شانتنوں' تروشٹو' یتیہ' یدر' انو وغیرہ دیوتاؤں سے متعلق دلچسپ کہانیاں ہیں۔ رگ وید کی طرح ہی ہندوستان میں کہانی آغاز ویدک زمانے میں ہی ہوگیا تھا۔ یم یمی' پورو' رَوا' اُروشی' وغیرہ کے مکالمے اپنشدوں کی مرقع نگاری نہش' براہمانڈ وغیرہ سحر بیانی اور خیر سے متعلق قصے ملتے ہیں۔ ہندوستان کا یہ قدیم ترین نمونہ سنسکرت زبان میں ملتا ہے۔ سنسکرت کے بعد پالی' پراکرِ اور اپبھرنش میں کرداری اور بیانیہ قصوں کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے۔ اور جس کی تاریخ بالکل محفوظ ہے۔ یہ ہندوستان کی قصہ گ کے پہلے دور کے نمونے ہیں۔

ہندی میں جدید دور کی کہانی کا آغاز قدیم دور کے بعد سنسکرت اور پراکرت کی قدیم قصہ گوئی کی روایت کے بطن سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی پہلی شکل منظوم ہے جس میں تاریخی' پورانک قصوں میں دلیری اور شجاعت کی تخیلی مینا کاری کے ذریعہ کردار نگاری کی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ مہابھارت اور رامائن نے جدید کہانی کے ارتقا کے راستے کو سازگار کیا۔ رامائن کے زیر اثر سوم دیو کتھاسرت ساگر چھیمندر کی برہت کتھا منجری' داسودیو کی کتھا اور اننت بھٹ کی رام کلپ دُرم قصے تخلیق کئے گئے۔

ان کہانیوں میں نیز رامائن میں "جاتک" کا کردار ہمیشہ بہت اہم رہا ہے۔ بقول ایک ہندی نقاد " ان قصوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو ان قصوں میں مذکور نہ ہو۔ اگر مستقبل میں ہماری تاریخ راجاؤں کی زندگی' موت کی روداد نہ رہ کر عوام کی زندگی موت کی تاریخ کو حقیقت پسندانہ انداز میں رقم طراز کرنے کو ہے تو قدیم دَور میں ویسی تاریخ کے لئے ان قصوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے "۔

سنسکرت دور کے بعد پراکرت اور اپبھرنش کا دور دکھلائی دیتا ہے۔ اپبھرنس شاعروں نے قصہ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ خصوصاً سوئے بھو کی پرچرت' پشت دنت کی ناگ کمار چرتر' دھون کی ہری دنش' پراں کی ویرامی چرتر'

دروت کی کمارپال پرتی بودھ، عبدالرحمٰن کی سندیش راسک، شرنی چندر کی کتھا کوش، اور بہری بھدر کی بھی نام چراؤ کافی مشہور ہیں۔ قصہ نگاری کی دوسری روایت صوفیوں کے ذریعہ پھیلی اور ہندی کہانی کی ارتقاء میں مددگار ثابت ہوئی۔ مرگاوتی، مدھومالتی، پدماوت، چترادلی، گیان دیپ، اندراوتی وغیرہ ایسے ہی منظوم قصوں سے مزین ہے۔

ہندی کہانی کا تیسرا قدیم نمونہ، کتھا اور ورتانت وغیرہ کی شکل میں ملتا ہے۔ ہندی کہانی کا پہلا قدیم دور جو "بھاتیندو دور" سے عبارت ہے، اسی قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ سنہاسن بتیسی، بیتال پچیسی، مادھوانل کام کندلہ، راجہ بھوج کا سپنا، رانی کیتکی کی کہانی، دیورانی جٹھانی وغیرہ اسی قسم کی کہانیاں ہیں۔ اس طرح سنسکرت میں قصہ گوئی کی جو روایت شروع ہوئی تھی وہ ایک مخصوص تبدیلی کے ساتھ بھارتیندو دور تک چلی آئی۔ یہ کہانیاں، کتھا، قصہ، مکالمہ، نصیحت، ورتانت اور بیانیہ شکل میں لکھی جاتی تھیں۔ مگر ان کا کوئی مخصوص فنی رنگ متعین نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ کہانیاں نظم اور نثر دونوں کے میڈیم سے لکھی جاتی تھیں۔ ان میں مافوق الفطرت عناصر مثلاً بھوت پریت، پری، تیز توہمات کے ساتھ چرند پرند حیوانات کے قصوں کی بھی کثرت پائی جاتی ہے۔ یہ کہانیاں ماورائے عقل اور حیرت انگیز ہوتی تھیں۔ ان میں حقیقت نگاری کا تقریباً فقدان تھا۔

جدید ہندی کہانی کی فنی روایت اور ادبی نظریہ قدیم سے مختلف ہے۔ آج کی کہانی کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ وہ غیر فطری واقعات اور غیر انسانی تجربات پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ آج کی کہانی زندگی سے بہت نزدیک ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کی غماز ہے۔ وہ انسان کے مضبوط احساسات و جذبات اور افکار کی ترجمان ہے۔ اور وہ انسانی زندگی کی عمیق حقیقتوں کی آئینہ دار ہے۔ اس کا رشتہ انسان اور اس کے ماحول سے ہے اور وہ حقیقت کو پیش کرتی ہے۔

یورپی کہانی کا اثر ہندی کہانی پر بنگلہ کہانی کے ذریعہ پڑا۔ امریکہ اور یورپ میں جدید کہانی کا جنم انیسویں صدی کے پہلے دور میں ہو گیا تھا۔ وہاں اس دور میں آف مین، جیکب، گرم، ہاتھرن، پو، بریٹ ہارٹ وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ پو، نے سب سے پہلے کہانی کا ڈھانچہ اور اس کی خصوصیات متعین کیں۔ اسی دور میں تورگنیف روس میں انقلابی کہانیاں لکھ رہے تھے۔

جدید ہندی کہانی کا آغاز دراصل ایک طرح سے "دیویدی دور" میں ہوا ہے۔ بنگلہ زبان سے تعلق، جدید تعلیمی نظام، سماجی اور سیاسی انقلاب اور نثر نگاری کی طرف میلان وغیرہ کے نتیجہ میں نئی کہانی کی بنیاد پڑی ہے۔ سرسوتی، اندو اور سدرشن وغیرہ رسائل نے کہانیوں کے جنم میں ماں کا کردار ادا کیا ہے۔

ہندی کی پہلی جدید کون ہے" ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں سات کہانیوں کے نام لئے جاتے ہیں۔ رانی کیتکی کی کہانی، اندومتی، گل بہار، پلیگ کی چڑیل، گیارہ برس کا سمے، پنڈت اور پنڈتانی، اور دلائی والی ــ تخلیق کے لحاظ سے انشاء اللہ کی کہانی "رانی کیتکی کی کہانی" سب سے قدیم ہے۔ لیکن فن کے نظریہ سے اسے جدید کہانی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کی تخلیق قدیم قصہ گوئی کے فن پر مبنی ہے۔ قصہ کردار اور زبان سبھی اسے قدیم قصوں کے قریب لے جاتے ہیں۔ بقیہ چھ کہانیوں میں کشوری لال گوسوامی کی "اندومتی" سرفہرست ہے۔ یہ ۱۹۰۰ء میں "سرسوتی" میں شائع ہوئی تھی۔ شروع میں کچھ نقاد اسے نئی کہانی تسلیم نہیں کرتے تھے اور وہ اسے شیکسپیئر کے ٹیمپسٹ کا ترجمہ بتلاتے تھے۔ اور رام چندر شکل کی کہانی "گیارہ برس

کا سپنا" (۱۹۰۳ء) یا بنگ مہیلا کی "دلائی والی" کو ہندی کی پہلی کہانی مانتے تھے لیکن اب متفقہ طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ "اندومتی" فنی اصولوں پر اترنے والی پہلی کہانی ہے۔ غرض کہ اندومتی کو پہلی جدید کہانی کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے۔

دویدی دور کے بعد کا دور ہندی کہانی کے فنی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں نہ یہ کہ صرف جدید کہانی کا آغاز ہوتا ہے بلکہ کہانی کے فن اور مزاج میں بھی بلوغت پیدا ہوتی ہے۔ دراصل یہ دور ہی ہندوستان کی تاریخ کی زندگی اور بیداری کا زمانہ تھا۔ معاشرتی نظام بیزدہ توہمات اور وہ مافوق الفطرت عناصر جن کا احساس اور وجدان سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا اس نئے چیلنج اور انقلاب سے بوکھلا اٹھے تھے۔ ہر علاقے سے تحریک کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ ملک کے اس نشاۃ الثانیہ سے کہانی کو بھی ایک نئی زندگی اور ایک نئی حرارت ملی۔

دویدی دور میں شخصی اور غیر شخصی دونوں قسم کی کہانیاں لکھی گئیں۔ ایک طرف سنسکرت، بنگلہ، انگریزی وغیرہ زبانوں سے ترجمے ہوئے تو دوسری طرف حیات اور کائنات کا منظر پیش کرنے والی تصوراتی اور حقیقی کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ اس دور کے اہم کہانی کاروں میں کشوری لال گوسوامی، گرجا کمار گھوش، گوپال رام گہمری، وشمبھر ناتھ شرما، کوشک، جے شنکر پرساد، اور پریم چند کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کہانی کاروں نے معاشرتی، معاشی، سیاسی، اور زندگی میں نئے اٹھنے والے مسائل کو کہانی کا پیکر بخشا۔ اور اتفاقی، کرداری فضا آفرینی اور احساس سے بھرپور کہانیاں قلمبند کیں۔ اسلوب بیان کے لحاظ سے اس دور میں خود کلامی اور سوانحی انداز سے لے کر خیالی اور رومانی انداز تک کے نمونے ملتے ہیں۔ اس دور میں پردتی نندن، سوریہ نرائن دکشت، اور روپ نرائن زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ گدادھر سنگھ نے "کادمبری" جگن ناتھ پرساد چترویدی نے "ہرش چرت" اور "رتناولی" اور سوریہ نارائن دکشت نے "جیمنی کمار" کا ترجمہ کیا ہے۔ بنگلہ کہانیوں کا ترجمہ پاروتی نندن اور بنگ مہیلا وغیرہ نے پیش کیا ہے۔

حقیقت نگاروں میں کشوری لال نے اہم معاشرتی کہانیاں لکھیں۔ "چندریکا" "اندومتی" اور "گل بہار" آپ کی کہانی کے مجموعے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر جاسوسی ناولوں کا کافی اثر پڑا ہے جس کو عام طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ رام چندر شکل بنیادی طور پر سنجیدہ مقالہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ مگر انھوں نے "گیارہ برس کا سپنا" ایک کہانی بھی لکھی ہے۔ اسی زمانہ میں مہاویر پرساد دویدی نے کچھ کہانیاں لکھیں جو سرسوتی کی مختلف اشاعتوں کے ذریعہ منظر عام پر آئیں۔ "سورن کی جھلک" آپ کی مشہور کہانی ہے۔ جاسوسی کہانی لکھنے والوں میں گوپال رام گہمری کا نام سرفہرست ہے۔ "ترویبی" "بن تحقیقات" اور "سکھ پتگ" آپ کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ ان کہانیوں میں پیام اور تبلیغ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

دویدی دور کے بعد کہانی میں ایک دوسرے قسم کی رجحان نظر آتی ہے۔ اس میں فن کی تزئین نظر آتی ہے۔ طرز نگارش میں بلوغت آتی ہے۔ اور واقعات کے بہ نسبت کردار پر زیادہ زور دکھائی دیتا ہے۔ گلیری کی مشہور کہانی "اس نے کہا تھا" اسی دور میں سرسوتی میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ دو مختلف کہانیاں "سکھمے جیون" اور "بدھو کا کانٹا" بھی شائع ہوئی۔ "اس نے کہا تھا" کہانی میں فنی بلوغت، ادبی تہذیب، اور عمیق نفسیاتی جائزہ موجود ہے۔ یہ کہانی اس دور تک سب سے اہم کہانی تصور کی گئی ہے۔ چترسین شاستری اس دور کے آخری مصنف ہیں۔ "رج کڑ" "انجھت" "باہر بھیتر" "دکھوا میں کاسے کہوں" وغیرہ آپ کے اہم مجموعے ہیں۔ آپ کی کہانیاں سماجی حقیقتوں کو لے کر چلیں ہیں۔ جے شنکر پرساد اور پریم چند بھی اسی زمانہ میں ہندی کہانی گھر میں داخل ہوئے۔

۱۹۰۹ء میں "اندو" نام کے ایک رسالہ کی اشاعت شروع ہوئی۔ اور اسی سال پرساد کی پہلی کہانی چھپی۔ اس کے بعد جے شنکر پرساد "اندو" اور مختلف رسالوں میں برابر لکھتے رہے۔ ان کہانیوں کے پانچ مجموعے چھایا، پرتیدھونی، آکاش دیپ، آندھی اور اندر جال شائع ہوئے۔ پرساد اخلاقیات کے پس منظر میں کہانیاں لکھتے ہیں جس میں جذبۂ تخیل اور رومان کی آمیزش ملتی ہے۔ ان کا میلان عشق و محبت کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ اسی لئے ان کی کہانیوں میں محبت کے مختلف پہلو اور دوشیزگی کی مختلف تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کہانیوں میں ڈرامائی عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ آکاش دیپ اور پرسکار وغیرہ میں ڈرامائی مکالموں اور کردار نگاری کے ذریعہ ڈرامائی فضا کے ساتھ ساتھ سیرت کو مزید موثر بنایا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں کی زبان بیانیہ اور مبلغانہ ہے۔ اور ہندوستانی تہذیب کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں یہ کہانیاں اصول اور آدرش پسندی کے ذیل میں آتی ہیں۔

ہندی میں پریم چند کی پہلی کہانی "سوت" ۱۹۱۵ء میں سرسوتی میں چھپی تھی۔ جب کہ اس کے قبل گھن پت رائے اور نواب رائے کے نام سے اردو میں کئی کہانیاں لکھ چکے تھے۔ ۱۹۳۶ء تک پریم چند نے تقریباً تین سو کہانیاں لکھیں جو ہندی کے اہم رسالوں (سرسوتی، مایا، جاگرن، مریادہ، مادھری، ہنس، وشال بھارت وغیرہ) میں شائع ہوتی رہیں۔ پریم چند اپنے دور کے سب سے عظیم کہانی کار تھے۔ انہوں نے ہندی کو وسعت عطا کی اور اس کو تفریح تک محدود نہ رکھ کر زندگی سے اس کا رشتہ جوڑا۔ تقسیم کی بنیاد پر ان کی کہانیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ واقعاتی، کرداری اور جذباتی ـــ انہوں نے اپنے وقت تک رائج تمام اسالیب پر طبع آزمائی کی اور معاشرتی، سیاسی، تاریخی اور انقلابی وغیرہ تمام موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ پریم چند کی شروع کی کہانیوں میں واقعاتی انداز زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ بعد میں معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل پر غور و فکر اور ان کے حل کی تلاش بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور سب سے آخر میں پریم چند بالکل تصور اور آدرش پسند نظر آنے لگتے ہیں۔

پریم چند نے اپنے دور میں فن کاروں کو بہت متاثر کیا اور ایک نئی روایت پر چلنے کے لئے لوگوں کو آمادہ کیا۔ یہی ان کا کمال تھا۔ پریم چند کے دور میں ہندوستانی حالات کے تناظر میں کافی زماں و مکاں کی تبدیلیاں ہوئیں۔ قدامت کا جادو ٹوٹنے لگا۔ مشینی دور نے کروٹ لی، روس نے مزدور زندہ باد کا انقلاب انگیز نعرہ بلند کیا۔ اور سب سے بڑھ کر ادبی دنیا میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ اور کہانی میں طبقاتی کشمکش، جاگیردارانہ نظام کی مخالفت، پرولتاری طبقے کی حمایت، مزدور کے مسائل اور آزادیٔ نسواں کے عنوان سے مسلسل بحث چل پڑی اور تنقید حیات کا دروازہ کھل گیا۔ "کفن"، پوس کی رات، نشہ، مدھوا، گنڈا" کے علاوہ "کوشک اور سدرشن" کئی کہانیاں اس ضمن کی کڑیاں ہیں۔ آگے چل کر پرساد، جی کی نیرا، ورنداون لال ورما کی "شرناگت اور دھنی رام" پریم کی بہن، کہانیاں ایسے حقیقت پسندانہ عناصر کو بھی اجاگر کرتی ہیں جو انسان کو انسان کے قریب لے آئے۔ اور اس طرح پریم چند کا انسان دوستی کا پیغام وسعت پاتا گیا" یہ پریم چند کی معراج ہے۔

پریم چند اپنے زمانے کا سب سے بڑا فن کار ہے۔ اس لئے اس کے زمانے کو پریم چند دور سے ہی تعبیر کرتے ہیں۔ اس دور کے دوسرے کہانی کاروں میں سے راجہ رادھیکا رمن پرساد سنگھ آدرش پسند فن کار ہیں۔ آدرش نگاری کی آمیزش سے حقیقت بیانی میں زندگی پیدا ہوجاتی ہے۔ حقیقت کے امتزاج سے آدرش سچائی کا مصداق شاعر رویندر نے حقیقت اور آدرش کو امر واقعہ اور سچائی سے عبارت کیا ہے۔ گویا جیسا کچھ ہے اسے اسی شکل میں بیان کرنا امر واقعہ ہے اور اس واقعے کو جن ذرائعوں سے بیان کیا گیا ہے

۔ہ آدرش ہے۔ آدرش نگاری کی داغ بیل بھی پریم چند نے ڈالی ہے۔ پریم چند کے مطابق نچلے طبقے کو اس قدر اوپر اٹھایا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے لگیں۔ رادھیکارمن پرساد سنگھ پریم چند کے اس جلوس میں شامل ہیں۔ ان کی اس ضمن کی مشہور کہانی "کانوں میں کنگنا" ہے۔ اس جلوس میں وشمبھر ناتھ اور جوالہ دت شرما بھی شامل ہیں وشمبھر ناتھ نے عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بیان خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ 'گھونگھٹ والی' آپ کا مجموعہ ہے۔ شرما جی پریم چند کی روایات پر گامزن رہے۔ اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ معاشرتی برائیوں اور مذہبی توہمات پر سخت ضرب لگائی۔ وہ فن کار سے مبلغ کے مرتبے پر فائز ہوگئے۔ ورندابن شرما بھی اسی دور کے تاریخی کہانی کار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بلند کھنڈ کی زندگی چھائی ہوئی ہے۔ 'راکھی' 'کلاکار کا دنڈ' 'بدھ کے موچے سے' آپ کی مشہور کہانیاں ہیں۔ جی۔پی۔ شری واستو کی کہانیوں میں ظرافت کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ "لمبی داڑھی" ان کی بہترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

پریم چند کے دور کے بعد ہندی کہانی کے فن اور موضوع دونوں میں بڑی تبدیلی آئی۔ گوکہ یہ دور بہت مختصر تھا مگر اس نے کہانی کی روایت اند تاریخ میں ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔ اور اگلے دور سے ایک منطقی رشتہ قائم کیا۔ اس لئے پریم دور کے بعد والے دور کو ہندی میں "سندھی یگ" اور اردو میں "عبوری دور" کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب سیاست کے میدان میں بہ بورت کہرام اور غلغلہ مچا ہوا تھا۔ گاندھی جی کی قیادت میں آزادی کی تحریک مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ انگریزی ظلم بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۴-۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی۔ ملکی اور غیر ملکی حالات اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس، ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم، ۱۹۴۲ء کی عوامی جنگ اور انقلاب اور ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کا آزاد ہونا' ان واقعات اور حالات کے پس منظر میں کہانی کی شکل و صورت کا تبدیل ہونا فطری تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گھٹن' مایوسی' ناکامی اور پست ہمتی کی آواز کہانی میں داخل ہوگئی ۔

اس دور میں بیداری اور آگہی پیدا کرنے والی کہانیاں لکھی گئیں۔ اس دور میں دو قسم کی کہانیاں عمومی طور پر ملتی ہیں۔ عمیق اور باریک مشاہدے اور مطالعے پر مبنی اور عمومی اور سطحی مشاہدے پر مبنی موضوعات کے لحاظ سے معاشرتی' سیاسی' نفسیاتی' تاریخی اور فلسفیانہ کہانیاں اہم ہیں۔ مجموعہ "چنگاریاں" ظلم و تشدد کے خلاف اعلان انقلاب تھا اس لئے اسے ضبط کر لیا گیا ۔ مجموعہ "بلات کار" میں مذہبی غلط فہمیوں' رنگ و نسل کی تقسیم' عورت کی بدحالی اور معاشرے کی بدلتی فضاء کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ مجموعہ "دوزخ کی آگ" میں فرقہ داریت کے آپریشن کو موضوع بنایا گیا۔ مجموعہ "نرلجتا" طبقاتی کشمکش' نسلی امتیاز' مسائل نسواں' خانگی زندگی پر طنز آمیز انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجموعہ "چاکلیٹ" کا موضوع امرد پرستی ہے۔ "شیطان کی منڈلی" میں بندی سے غیر متعلق لوگوں کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ مجموعہ "کرانت کاری کہانیاں" میں مختلف بھارتی روایت کے المناک نتائج کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح مختلف مجموعے 'گنگا جل' 'ریشمی' 'جب سارا عالم سوتا ہے' 'پنجاب کی مہارانی' 'سنکی امیر' 'کلا کا پرسکار' اور 'پولیٹی امارت' میں آزادی' مساوات' جمہوریت' انقلاب' اور نئے نظام کی ترسیل ارتقا اور فروغ کا ذریعہ بنے ہیں۔ اس دور کی بنیادی خصوصیت اسالیب بیان کی تنوع پسندی ہے۔ ایش پال اور رانگے راگھو کی ڈرامائی طرز نگارش گپتا کا خطوطی انداز' الہ چندر جوشی کا ڈائری اسلوب' جینندر کمار (کہانی پازیب) میں علامتی انداز اور اگیہ کا ہی "چڑیا گھر"

کہانی میں رعنائی اور لطیف انداز دعوتِ غور و فکر ہے۔

اس دور کے اہم فن کار ہیں، جینندر کمار، سیارام سرن گپتا، اگیہ، الاچندر جوشی، یش پال، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر، اوپیندر ناتھ اشک، رنگیے راگھو، وشنو پربھاکر اور امرت رائے وغیرہ۔ جینندر کمار فلسفیانہ اور سنجیدہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں میں زندگی کے فلسفہ کا لطیف امتزاج ہے۔ ان کے خطوط ذہنی کشاکش اور روحانی اضطراب کے تجزیے کی بہترین مثال ہیں۔ جینندر جی کے مجموعے ہیں: واتاین، نیلم دیش کی راجکنیا، دو چڑیاں، اسپردھا، دھرو یاترا، پازیب، ایک دن، ایک رات، پھانسی اور جے سندھی۔ ان مجموعوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ جینندر کمار فلسفی پہلے ہیں کہانی کار بعد میں۔ انھوں نے انسان کی شخصیت کو قدر و منزلت بخشی ہے۔ اسے اس کی عظمت سے روشناس کرایا ہے اور اس کی زندگی کے عمیق پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا آرٹ خارجیت سے داخلیت کی طرف مائل بہ ارتقا ہے۔ انہوں نے درمیانی طبقے کو لے کر اپنے تصورات کو کہانی کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اس ضمن میں اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ نفسیاتی زمین پر لکھی گئی کہانیوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱. کسی زندگی کے ایک طویل عرصہ پر تشکیل کہانی، جیسے "استری"۔

۲. ایک رات یا کچھ گھنٹوں کی زندگی کے چکر سے تشکیل دی گئی پوری زندگی کی عکاسی کرتی ہوئی کہانی جیسے "ایک رات"

۳. مخصوص فضا میں مخصوص تصویر کاری پر لکھی گئی کہانی مثلاً "کیا ہو"۔

۴. محض شخصیت کا تجزیہ اور اس کے مطالعے پر لکھی گئی کہانی مثلاً "مترو دھیا دھر"۔

غرض کہ کہانی کے اس موڑ پر جینندر جی نے کہانی کو بہت کچھ سرمایہ دیا اور اسے آگے بڑھایا۔ سیارام سرن گپت آدرش پسند فن کار ہیں۔ وہ پرانی روایتوں سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کہانیوں کا مجموعہ "مانسی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ سیارام انھیں اصولوں کے پیرو ہیں جن کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے۔ اگیہ ایک نفسیاتی کہانی کار ہیں۔ وہ فرائڈ کے نظریے سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی کہانیوں میں جنس سے متعلق اضطراب اور گھٹن کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ان کے کہانی کے مجموعہ "وپ تھگا"، "پرمپرا"، "کوٹھری کی بات"، "شرنارتھی"، "امر ولری" اور "جیبدول" وغیرہ ہیں۔ ان مجموعوں کو تین عنوانوں کے تحت منقسم کیا جا سکتا ہے:

۱. انقلاب انگیز زندگی سے متعلق موضوعات، ۲. عشق و محبت، ۳. نفسیات۔

اگیہ بورژوا طبقے کے خلاف جہاد بھی کر رہے ہیں۔ حسن سے عشق بھی فرما رہے ہیں اور مرد اور عورت کی نفسیات کا مطالعہ بھی کر رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں "میں" واحد متکلم کا ہونا، ان کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ اندرون کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے انھیں بڑے انقلاب سے عشق و محبت کے ساتھ نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ بہر کیف بحیثیت افسانہ نگار اگیہ ہندی کہانی کے ارتقا میں ایک بڑا نام ہے۔ اگیہ کے بعد یش پال ترقی پسندی اور مارکس کے نظریہ کے ہمنوا دکھائی دیتے ہیں۔ طبقاتی تناؤ اور معاشی بحران ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ان کے اہم مجموعے ہیں "پنجرے کی اڑان"، "ترک کا طوفان"، "وہ دنیا"، "گیان دان"، "ابھی شپت"، "بھسماورت"، "چنگاری"، "پھولوں والا"، "دھرم یدھ"، "اترا"، "ادھیکاری"، "چتر کا شیرشک"، "تم نے کیوں کہا کہ میں سندر

اتی کی ماں'، 'اُدبھیروی' 'سچ بولنے کی بھول' 'خچر کا آدمی'، ان مجموعوں کی بنیاد پر یش پال کی کہانیوں کو چار خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ اقتصادیات' ۲۔ جنسیات' ۳۔ مذہبی اور روائتی باتوں پر سخت طنز۔ ۴۔ فن اور ادب سے متعلق کہانیاں۔

جنسیات سے متعلق کہانیوں میں یش پال کے یہاں تھوڑی پراگندگی بھی آگئی ہے۔ اس ضمن میں 'اپنی چیز' 'عورت' 'پرائی اور زبردستی' کا مطالعہ اہم ہے۔ اقتصادی کہانیاں مارکسی نظریہ کی ترسیل ہیں۔ 'وہ دنیا' 'ردی کا مول' اور 'مکھی یا مکڑی' قابلِ مطالعہ کہانیاں ہیں۔

بھگوتی چرن ورما درمیانی طبقے کی عکاسی کو حقیقت نگاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں انفرادیت اور فنی لطافت موجود ہے۔ ان کے مجموعے 'کھلتے پھول' 'انسٹالمنٹ' اور 'دو بانکے' وغیرہ ہیں۔ ان کے یہاں طنز، مزاح کے ساتھ لطیف رومانس بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ورما جی کی حقیقت نگاری کو رومانٹک حقیقت نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس اسکول کے دوسرے فن کار' امرت لال ناگر' اشک' رانگیے راگھو' امرت رائے پہاڑی اور وشنو پربھاکر ہیں۔

یہ تمام مصنفین بنیادی طور پر حقیقت پسند مصنف ہیں۔ دیہات کی برہنہ اور حقیقی زندگی ان کو بہت پیاری ہے۔ ان کا اسلوب بیان طنز سے لبریز ہے۔ ترقی پسند تحریک کے سماج وادی نظریہ سے متاثر ہیں۔ ان کی کہانیوں میں میلی کچیلی اور غریب زندگی کی تصویر کاری ان کا فرض ہے۔ امرت رائے کی کہانی "ایک سانولی لڑکی" اور "قصبے کا ایک دن" کے علاوہ اشک کا مجموعہ "پلنگ" اسی امر کی مثال ہے۔ اشک کے دس مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ اشک نے تاریخی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کہانیوں کے ذریعہ اشک نے قدیم زمانے کی زندگیوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ 'راج کمار' 'ڈاکو' 'مالو یا دالو' اور 'چین کی ابھیلاشا' اس ضمن کی اچھی کہانیاں ہیں۔ گویا اس طرح اشک کی کہانیاں مندرجہ ذیل خانوں میں منقسم ہیں۔

۱۔ تاریخی' ۲۔ حمایت نسواں' ۳۔ معاشرتی اور طبقاتی امتیاز' ۴۔ نچلے اور متوسط طبقے کی وکالت۔

رانگیے راگھو کے سات مجموعے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سماجیات' سیاسیات' تاریخ' روایت اور یہاں تک حیوانات کو بھی ان کا مناسب مقام ملا ہے۔ راگھو نے ترقی پسند تحریک کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اور زنجیر امرت رائے کے ہاتھوں سونپ دی ہے۔ امرت رائے کی ۹ کہانیوں کا مجموعہ دستیاب ہے۔ امرت رائے نے اخلاقیات کے سوال کو مارکسی نظریہ کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کہانیاں آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ رائے جی کے بعد وشنو پربھاکر نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ روایت ہسیج' پہاڑی اور بھیرو پرساد گپت سے ہوتی ہوئی ۱۹۴۷ کی آزادی پر ختم ہوگئی۔

آزادی کے بعد کہانی میں پھر ایک انقلاب آیا۔ نفسیاتی فارمولوں اور حقیقت نگاری کے نعروں میں کشش اور تازگی کم ہونے لگی۔ نئے تجربات کی ضرورت پڑی۔ آزادی کے بعد نئے مسائل' نئی زندگی اور نیا ماحول نصیب ہوا۔ فن کاروں پر بھی نئی نئی ذمہ داریاں عائد ہونے لگیں۔ اب کہانی کاروں کو فکر کے نئے پیمانے متعین کرنے پڑے اور ذوقِ جمال کو تسکین پہنچانے کے لئے نئے راستے تلاش کرنے پڑے۔

پریم چند کے بیس سالوں تک درمیانی شہری اور نچلے طبقے کی عکاسی ہوتی رہی۔ اور بعد میں فن کاروں کا نظریہ گاؤں پر جم گیا۔ اب گاؤں کی زندگی تیزی سے بدل رہی ہے۔ ان کی حقیقتیں بھی بدل رہی ہیں۔ آزادی کے پس منظر میں ایک طرف

جوش و ولولہ اور تحریک کو موضوع بنایا جاتا تو دوسری طرف ذہنی الجھن، مایوسی اور اضطراب کا بھی ذکر کیا جاتا۔ جدید دور میں ان موضوعات سے خوبصورتی سے عہدہ برآ ہونے والوں میں رینو، مارکنڈے، امرکانت، بھارتی، نرگن، شلیش، مٹیانی، شیو پرساد سنگھ، شیکھر جوشی، شیوانی وغیرہ سرفہرست ہیں۔ اس فہرست میں رینو اور مارکنڈے اہم فن کار ہیں۔ رینو کے چار مجموعے ہیں۔ ان مجموعوں میں گاؤں کی زندگی کا عمیق مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس روایت کو پریم چند نے چھوڑا تھا اس کو زندگی بخشی گئی ہے اور گاؤں کے گرد و غبار کو برقی ریزوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مارکنڈے کے چھ مجموعے ہیں۔ مارکنڈے کا موضوع بھی رینو کا ہی موضوع ہے۔ مارکنڈے اپنے منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کسی لیڈر، وزیر، ممبر بی ڈی او، یا کسی سرکاری دباؤ کی پرواہ نہیں کرتے۔ مارکنڈے کے بعد موہن راکیش، کملیشور، راجندر یادو، منو بھنڈاری، نرمل ورما، رگھو ویر سہائے، بھیشم ساہنی، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ان فن کاروں میں گہرائی اور گیرائی ہے۔ انہوں نے شہری زندگی کے گنجلک مسئلوں پر بڑی نزاکت سے غور کیا ہے۔ ان میں لفظوں کا استعمال اور اسالیب کی ترکیب بدلی ہوئی ہے۔ علامت اور استعارے کے نئے نئے مزین طریقے دکھلائی دیتے ہیں۔ ان میں معاشرتی اضطراب، تناؤ اور بے صبری کے نمونے زیادہ ملتے ہیں۔ علامتی کہانیوں میں چھوٹے چھوٹے تاج محل، ٹوٹے ہوئے پنکھ والے کبوتر، ملبے کا مالک، وہ سانپ، پرندے، پرشنو ایک پیڑ، جلتی جھاڑی، کبھے دھلے گے کیوڑے کا پھول، ڈوبتا ہوا چاند اہم کہانیاں ہیں۔

نئے کہانی کاروں میں جگانن، مادھو کتی بودھ، کے دو مجموعے، دھرم ویر بھارتی کے دو، موہن راکیش کے سات، کملیشور کے چار، راجندر یادو کے دس، رام درش مشر کے دو، نرمل ورما کے چار، نریش مہتہ کا ایک، "تتھاپی"۔ مہندر بھلّہ کا ایک "تین چار دن"، دودھ ناتھ سنگھ کے دو، گنگا پرساد ومل کے دو، گیان انجن کا ایک "بھٹکے ادھر اور ادھر"، رویندر کالیا کا ایک "نو سال چھوٹی پتنی"، گیری راج کشور کے دو، بھیشم ساہنی کے تین، سدھا اروڑہ کا ایک، "بغیر تراشے ہوئے"، سے۔را۔ یاتری کے دو، منہر چوہان کے دو، مہیپ سنگھ کے چار، اوشا پریم ونڈا کے چار، منو بھنڈاری کے چار، رام کمار کا ایک "تیا چہرہ"، کرشن بلدیو کے دو، رمیش و کچھی کے دو، رگھو ویر سہائے کا ایک "سیڑھیوں پر دھوپ"، پریوگ شکل کا "ایکی اکرتیاں"، پرنو وندھوا پادھیائے کے دو، کاشی ناتھ سنگھ کا ایک، "لوگ بستروں پر" گیان پرکاش کا "اندھیرے کا سلسلہ"، شلیش مٹیانی کا "میری تینتیس کہانیاں"، رام نارائن شکل کا "سہارا اور انیہ کہانیاں"، سریش سنہا کا "کئی آوازوں کے بیچ" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انیتا اولکی، شری کانت، شر سبتی، دیجے چوہان، اور جگدیش چترویدی کی بہترین کہانیاں شائع ہو چکی ہیں اور مزید مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ شری کانت کی کہانی "جھاڑی" بہترین علامتی کہانی ہے۔ بہرکیف ہم ان جدید فن کاروں میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ نہیں سکتے۔ اور نہ ان کی اہمیت سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہاں پر اس تفصیلی فہرست سے کہانی کے اس ارتقاء پر روشنی ڈالنا مقصود تھا جس کے سفر کے مختلف مراحل میں مختلف فن کاروں نے ساتھ دیا ہے۔ اور اس کے نامور مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

نئی کہانی کا نیا انقلاب جنم پا رہا ہے۔ جدید اور قدیم پر بحث ہو رہی ہے۔ کہانی نئے نئے لباسوں میں جامہ زیب ہو رہی ہے۔ تجربات کی گنگا بہہ رہی ہے اور فن کو پختہ و کارآمد بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس ذیل میں راج کمل چودھری، مدرا راکھشس، گیان رنجن، ڈاکٹر مہیشور، کرشن سوبتی، دودھ ناتھ سنگھ، گیری راج کشور کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے اور نئے فن کار جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہانی کو وسعت، گہرائی اور گیرائی کی سمت لے جانے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

عبدالقادر حبیب حیدرآبادی
(لندن)

ساقی فاروقی
اچھا شاعر ــ اچھا دوست

دس بارہ سال پہلے کی بات ہے حیدرآباد سے صدیقہ کے بھائی ڈاکٹر معین مسعود نے اپنے ایک خطوط میں ساقی کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ہمیں لکھا تھا کہ ہم ساقی سے ضرور ملیں۔

۱۹۵۸ء میں ہمارا انگلستان آنا ہوا تھا۔ یہاں آنے کے بعد زندگی کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالنا پڑا۔ اسی سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے دنیا ادھر کی ادھر ہو گئی۔ انسان چاند پر پہنچ چکا۔ جس وقت حیدرآباد چھوڑ رہے تھے اپنے ادبی شعور میں کوئی خاص پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسی ادبی ناپختگی اور وقت سے چاہی نے اس بات کی مہلت ہی نہ دی کہ ہم ادبی سطح پر وقت کا ساتھ دے سکیں۔ اس کی ایک ہزار ایک وجوہات رہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ اردو کی آئے دن کی تازہ تخلیقات اور اردو ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کے شاہکار ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔ جو کچھ ابتدائی زمانہ میں پڑھ رکھا تھا وہی سرمایۂ حیات بنا رہا اور ہر بات کو ہم اسی پرانی کسوٹی پر جانچتے رہے۔ جیسے جیسے یہاں پر ہمارے معاشی حالات ٹھیک ہوتے گئے ویسے ویسے ہمارے ادبی ذوق کی وسعت اور معیار میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ہم نے جب اپنے آپ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ ہمارے ذہن میں جو اردو ادب لپٹا ہوا ہے وہ صحت مند تو ہے مگر وقت سے ذرا دس پندرہ سال پیچھے ہے۔ ان گزشتہ دس پندرہ سالوں میں جن لوگوں نے ادب کو کچھ دیا ان میں سے ایک ساقی فاروقی بھی ہیں۔ معین کی فرمائش پر میں نے ساقی کے ہاں خط لکھا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ کچھ ہی دنوں بعد لندن میں غالب کی صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ساقی فاروقی اور ڈاکٹر خورشید الاسلام سے بہ یک وقت ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ ہم جنم سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ خوش قسمتی سے سال میں کئی مواقع ایسے نکل آتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے مل لیا کرتے ہیں اور ساقی کی خوش مزاجی سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ساقی کی البیلی طبیعت کو سمجھنے کے لیے چند واقعات کا اظہار ضروری ہے۔ [illegible] ... ہمارے بیٹے شہریار کی خواہش پر ساقی نے اپنے ہاں ایک خوش نشست کا اہتمام کیا تھا۔ اس تعزیتی اجلاس میں [illegible] ساقی کی بیگم حیات گنڈی کے علاوہ ان کے دوست اسلوب احمد ... الدین، وقار لطیف، اکبر حیدرآبادی، نجمہ، علی باقر اور ہم شامل تھے۔ ... ادب پر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کا پرخلوص اور ... ادبی تبصرے ہوتے رہے۔ ان کی محفلیں پرلطف ہوتی ہیں۔ رات کے ... بجے واپسی کے لیے جب میں اٹھنے لگا تو ساقی نے مجھ سے کہا "ہاں یار اور ٹھہرو۔ راشد صاحب کی باتیں کرو۔ شراب پیو ... کھاؤ" راشد صاحب روز روز تو نہیں مریں گے۔"

ان ہی جملوں کے اردگرد ساقی کی زندگی اور شاعری گھومتی ہے۔ ... ادب ... کے اشتقاق ... زیادہ ... ہو سکتا تھا۔ شدتِ غم میں بھی ... کے اظہار کا یہ انداز ... [illegible]

انجمن ترقی اردو کے معتمد تاج بھوپالی نے اپنے ہاں ایک شعری نشست کا بندوبست کیا۔ بہت سے شاعر تھے۔ ساقی بھی موجود تھے۔ نہ جانے ایک شاعر صاحب کو کیا سوجھی۔ اندر جا کر کپڑے اپنے ہاتھ میں اٹھائے محفل میں لے آئے اور سب کو بتلاتے ہوئے کہا کہ جب میں چالیس دن کا تھا تو چھلے کی تقریب میں یہ کرتا مجھے پہنایا گیا تھا۔ مختلف احباب نے مختلف باتیں کیں۔ ساقی نے فوراً کہا کہ صاحب آپ کی شاعری کے بدن پر آج تک وہی کرتا چالیس پچاس سال پرانا نظر آرہا ہے۔ آخر آپ اسے کب بدلیں گے؟

ایک اور محفل میں شہ نشین کے قریب ساقی بیٹھے ہوئے تھے۔ قدیم رنگ میں لکھنے والے ایک شاعر ذرا دیر سے محفل میں آئے۔ انہوں نے ازراہِ انکساری کہا کہ میں یہیں جوتوں کے قریب ٹھیک ہوں۔ ساقی نے برجستہ کہا کہ شاعری کی محفل میں آپ کا مقام وہیں ہے۔

سجاد ظہیر کی لندن میں آمد کے موقع پر ان کی بیٹی نجمہ اور داماد علی باقر نے اپنے مکان پر ایک محفل منعقد کی تھی۔ نجمہ اور علی باقر کے گھر کی محفلیں بڑی یادگار ہوا کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں جس میں کتاب قزلباش، فہمیدہ ریاض، آل حسن، محمد لطیف حبیب، شمیم، بی بی سی کے رضا احمد، یاور عباس، حمیدہ یاور عباس، ساقی فاروقی اور یونس واسطی وغیرہ شریک تھے۔ ساقی کے ایک قریبی دوست جو غالباً ان دنوں ساقی سے کچھ ناراض سے تھے ساقی کی غزل سرائی کے دوران چپ سادھ کر بیٹھے تھے۔ ساری محفل ہی اُن صاحب کی اس ادا کو نوٹ کر رہی تھی۔ ساقی نے اپنی غزل کو روک کر فی البدیہہ ایک شعر پڑھا۔ ع

داد دینے میں جب بخیل ہوئے (شریک محفل کا نام) .... ذلیل ہوئے

پیاس کا صحرا ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ اپنی نظم سحر زدہ شہر میں ایک لفظ کی جمع کو بدلتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"فرعون کی جمع دلیے فراعنہ ہے مگر چونکہ فرعونوں سے میں کچھ الیماز یادہ خوش نہیں ہوں اس لیے ان کی جمع بدل دی ہے۔

فراعین کے مواجین معاف کریں۔ ساقی"

ساقی کے ایک دوست محمود ایاز نے اپنے ایک خط میں انھیں لکھا کہ آپ کی دو نظمیں بہت پسند آئیں۔ تیسری نظم میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس لیے چارے کو اپنی صاف گوئی کی ساقی نے یہ سزا دی کہ اس کتاب میں محمود ایاز کے نام کے ساتھ ایک کند ذہن اڈیٹر کا اضافہ کر دیا اس لئے کہ وہ ان کی تیسری نظم کو نہیں سمجھ سکا۔

ہمارے مکان پر ایک بار ریپا اور بھنڈاری نے اپنا گانا سنایا۔ محفل بڑی دیر تک جمی رہی۔ پاکستان کے بڑے صنعت کار ہائی سن والے منیر صاحب بھی شریکِ محفل تھے۔ کسی محفل میں دو بڑوں کی موجودگی کے ساقی قائل نہیں ہیں۔ چائے کا وقفہ ہوا۔ ساقی اور منیر صاحب مصروف گفتگو تھے۔ بات کچھ اس طرح ہو رہی تھی کہ کسی ایسی محفل میں برنارڈ شاہ تشریف لے گئے۔ جہاں لوگ ان سے واقف نہیں تھے۔ صاحب خانہ نے برنارڈ شاہ کا لمبا چوڑا تعارف لوگوں سے کروایا۔ ساقی نے یہ کہتے ہوئے جب اپنی بات ختم کی تو منیر صاحب نے فوراً کہا کہ چلیئے صاحب آج ہم بھی اس محفل میں آپ کا تعارف کروائے دیتے ہیں۔ اس واقعہ یا لطیفہ کے پس منظر میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہے کہ ساقی کو اپنی اہمیت کا احساس ہے۔ اپنے زمانہ کے اہل قلم نے انھیں نئی نسل کا نمائندہ کہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی اُن کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ساقی فاروقی کی شاعری میری عمر کے شاعروں کو یہ یقین دلاتی ہے کہ اردو شاعری ہمارے بعد بھی زندہ رہے گی"۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں تمہاری شاعری کی ان دنوں شہر میں بڑی دھوم ہے"۔

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں "اب تمہارے یہاں گہرائی اور معنی یکجا ہو رہے ہیں۔"
سلیم احمد کہتے ہیں "تم میں عقاب اور بلبل ملے ہوئے ہیں۔"

جہاں تو ذکر ہو رہا تھا گانے کی پارٹی کا۔ ریبا ایک بنگالی خاتون ہیں۔ اللہ نے آواز سے نوازا ہے۔ خوب گاتی ہیں۔ ریبا کے شوہر ڈاکٹر مجادری میانچسٹر میں واقعی ڈاکٹر ہیں یعنی ایم بی بی ایس۔ ان دونوں نے محفل کا رنگ بھانپ لیا۔ اور صرف وہی غزلیں، بھجن اور گیت سنائے جو اساتذہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ قمر جلالوی کی غزلیں ساقی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ محفل کے اختتام پر ریبا، مجادری اور ساقی کے درمیان بحث کا آغاز ہوا اور ساقی کی طرف سے بات کچھ اس طرح آگے بڑھی کہ قمر جلالوی نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے اردو ادب میں کسی قسم کا بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان کی شاعری حسن و عشق کی چکی میں پیس کر رہ گئی۔ زندگی کے حقائق سے انہوں نے منہ موڑا اور فرار میں امان ڈھونڈتے رہے۔ اگر قمر جلالوی اپنے سارے دیوان کے بدلے صرف دو چار نظمیں ہی اپنی سائیکل کی دکان پر یا سائیکلوں پر لکھ لیتے جو ان کا پیشہ بھی تھا تو ان میں ان کی حقیقت پسندی کی وجہ سے تاثر زیادہ ہوتا اور ہو سکتا تھا کہ ان کی شاعرانہ قادر الکلامی کی وجہ سے ان کی سائیکلوں پر لکھی ہوئی نظمیں اردو ادب میں شاہکار ٹھہرتیں۔

حسن و عشق، گل و بلبل، جام و مینا، ہجر و وصال، حرم و بت خانہ، ناز و نیاز، صیاد و گلچیں، قفس و آشیانہ اور اسی قسم کے سینکڑوں الفاظ جو اردو شاعری میں لاکھوں بار ہزار طریقوں سے استعمال میں آ چکے ہیں کلیشے کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان الفاظ کے مسلسل استعمال سے نہ تو ادب آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی جذباتی محرکات کی ترسیل میں آسانیاں فراہم ہو سکتی ہیں۔

راشد صاحب زندہ تھے۔ ایک شام جبکہ انہوں نے پہلے ہی سے کہہ رکھا تھا کہ ہمارے ہاں فون کریں گے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ صدیقہ نے ریسیور اٹھایا اور ادھر سے کچھ سنے بغیر کہنے لگیں کہ کہئے راشد صاحب آپ کیسے ہیں؟ دوسری طرف سے جواب آیا کہ راشد تو نہیں ہوں لیکن راشد صاحب سے دوسرے نمبر پر جو شاعر ہے وہ آپ سے مخاطب ہے۔ ساقی کے ہاں اپنی شعری عظمت کا احساس ہو سکتا ہے کہ دوسروں کو کھٹکتا ہو میرے لیے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

انگلستان کی مشینی زندگی میں سوائے ان اسکالرز کے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی پڑھنا لکھنا ہے بہت کم لوگوں کو میں نے ساقی جیسے وسیع مطالعہ کا حامل پایا۔ ساقی مطالعہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا مشورہ اپنے دوستوں کے لیے یہی رہتا ہے کہ پڑھو زیادہ اور لکھو کم۔

ساقی کو عام مشاعروں سے ایک چڑھ سی ہے۔ وہ اگر کسی مشاعرہ میں جاتے بھی ہیں تو نیم دلی کے ساتھ۔ ایک وقت تو حد کر دی۔ صرف ایک ہی شعر سنایا۔ اچھے مصرعوں اور اچھے شعروں کی وہ دل کھول کر داد دیتے ہیں قطع نظر اس کے کہ کہنے والا کون ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اچھا مصرعہ کہنے والا ہی اچھا شاعر ہوتا ہے۔ ساقی کی جدیدیت کا مجھے اس وجہ سے بھی قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان سے جب بھی میرا ملنا ہوتا ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ ذہن کے گوشے دور دور تک جاگ اٹھتے ہیں۔

چونکہ میرا یہ مضمون تاثراتی قسم کا ہے تنقید سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں اس لیے یہاں پر میں ان کے وہ اشعار نقل کر رہا ہوں جو مجھے بہت پسند ہیں

عمر بھر کانٹوں میں دامن کون الجھاتا پھرے / اپنے ویرانے میں آ بیٹھا ہوں دنیا دیکھ کر
میں پیاس کا صحرا ہوں تم سیف کے لیے ہوں؟ / تو کالی گھٹا ہے تو برس کیوں نہیں جاتی

جس کی ہوس کے واسطے دنیا ہوئی عزیز واپس ہوئے تو اس کی محبت خفا ملی
مجھ کو مری شکست کی دہری سزا ملی • تجھ سے بچھڑ کے زندگی دنیا سے جا ملی

شاخ سے ٹوٹ کے بے حرمت ہیں ویسے بھی بے حرمت تھے
ہم گرتے پتوں پہ ملامت کب موسم موسم نہ ہوئی

حادثہ یہ ہے کہ ہم جاں نہ معطر کر پائے وہ تو خوشبو تھا اسے یوں بھی بکھر جانا تھا
جانے کیا ہونے والا ہے نیند نہ آئے خوف سے رات ڈرائے شہر ڈرائے ایک اکیلی ذات کو
تجھے سمجھنے کی کوشش نہ کی محبت نے یہ اور بات ذرا پیچ دار میں بھی تھا

اب بھی راکھ کے ڈھیر کے نیچے سلگ رہی ہے چنگاری
اب بھی کوئی جتن کرے تو جوالا مکھی بن جائے

مجھے خبر ہے کہ اک مشتِ خاک ہوں پھر بھی تو کیا سمجھ کے ہوا میں اڑا رہا ہے مجھے
ناموں کا اک ہجوم سہی میرے آس پاس دل سن کے ایک نام دھڑکتا ضرور ہے
ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دو کوئی
یہ آگ ساتھ نہ ہوتی تو راکھ ہو جاتے عجیب رنگ ترے نام سے ہنر میں رہا
رونا تھا بہت لیکن اشکوں کے لیے ترسے آج اپنی محبت بھی نادار نظر آئی
اب گھر بھی نہیں گھر کی تمنا بھی نہیں ہے مدت ہوئی سوچا تھا کہ گھر جائیں گے اک دن
وہ دکھ جو سوئے ہوئے ہیں انھیں جگا دوں گا میں آنسوؤں سے ہمیشہ ترا پتہ دوں گا
جو اہلِ ہجر میں ہوتی ہے ایک دید کی رسم تری تلاش میں وہ رسم بھی اٹھا دوں گا
میں وہی دشت ہمیشہ کا ترسنے والا تو مگر کونسا بادل ہے برسنے والا
صبح تک رات کی زنجیر پگھل جائے گی لوگ پاگل ہیں ستاروں سے الجھنا کیسا
وہ مری روح کی الجھن کا سبب جانتا ہے جسم کی پیاس بجھانے پہ بھی راضی نکلا

اپنی نظم "ایک ویران رات میں" تیسری دنیا کا کتنا اچھا تجزیہ کیا ہے۔۔

تلاشِ رزق میں کچھ کوچہ گرد پھرتے ہیں
فقیر ملکوں کی مانند دُم ہلاتے ہوئے
زمیں سونگھتے ہیں آگے بڑھتے جاتے ہیں
پلٹ کے دیکھتے ہیں گرسنہ نگاہوں سے

اب اور کتنے پہرے ہیں سگانِ ہمسایہ

پھر اپنی فتح سے مسرور ہو کے سوچتے ہیں
نہ پا سکیں گے انھیں ان کے سست گام حریف

اور نظم کا اختتام اس شعر سے ہوتا ہے۔

زمین دیکھ رہی ہے مجھے حقارت سے
میں سر جھکائے کھڑا ہوں بڑی ندامت سے

ساقی کی نظم "مردہ خانہ" کی ن م راشد نے بڑی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نظم سے ایڈگر ایلن پو کی یاد آتی ہے۔ کمال ہے۔ پابند نظم اور اتنی اچھی"۔

بقول سجاد باقر رضوی جدید شعراء میں ساقی فاروقی کی شاعری جدید ہوتے ہوئے بھی باوجود سمجھ میں آجاتی ہے [illegible] ادیب کو ساقی کی مختصر نظمیں بہت پسند ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر نے لکھا تھا کہ "نئے لوگوں میں ساقی کو نظم شروع کرنی اور ختم کرنی آتی ہے"۔ ایک ایک نظم ساقی مہینوں سوچ بچار کرتے رہتے ہیں اور [illegible] کی ساخت اور الفاظ کی بندش ان کی جہد مسلسل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ساقی کے افکار اور ان کے اظہار میں بھی وہ وہی انفرادیت اور [illegible] ملے گا جس سے ان کی زندگی عبارت ہے۔ ان کی نظموں [illegible] ہوگی مگر میں اس مختصر سے مضمون میں [illegible] کچھ لکھنے کی کوشش کروں [illegible] ہر نظم اپنے لیے ایک علیحدہ مضمون کی [illegible] ہے۔ ساقی کے [illegible] کا دوسرا مجموعہ "رادار" بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ [illegible] ساقی کے [illegible] طریقہ سے ہوئی۔ [illegible] اور میرے علاوہ اس یادگار موقع پر اکبر حیدرآبادی، افتخار عارف، مقبول دانش اور حسن اجمل مسرت کو ساقی نے اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ ساقی کے پیاس کے صحرا کو رادار بنانے میں ساقی کی رفیقہ حیات گنڈی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" کے مصداق ساقی کی مشرقی رگوں میں مغربی خون دوڑانے کا انتظام و اہتمام گنڈی نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ گنڈی آسٹرین ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ صاحب فکر اور صاحب نظر ہیں۔ انگریزی اور یوروپین لٹریچر پر گنڈی کی گہری نظر ہے جو ادبی مباحثوں میں دل کھول کر حصہ لیتی ہیں۔ مشرقی اقدار کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں اور ان کی قدر کرتی ہیں۔ پاکستانی معاشرہ کو اپنے گھر میں جگہ دے رکھی ہے۔ خلوص و محبت کا پیکر اور ساقی کے دوستوں کی عزت کرتی ہیں۔ ہندوستانی کھانے بنانے، کھانے اور کھلانے کی شوقین ہیں۔ پاکستانی [illegible] کی دلدادہ ہیں۔ ساقی کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں اور غالباً ساقی کی زندگی میں وہ واحد حزب اختلاف ہیں جو ساقی کے شاعری انا الحق کے باوجود ساقی کو مختلف صلیبوں پر چڑھائے جانے سے بچائے رکھتی ہیں۔ ان دونوں کے آپس کے خلوص و محبت کو دیکھ کر دل خوش ہوجاتا ہے۔ ان دونوں سے ایک بیٹی ہے جس کا نام انگا ہے۔ ماں کی ذہانت اور باپ کی طراری ورثہ میں ملی ہے۔ بہت ہوشیار، سمجھ دار اور ساحر بیٹی ہے۔

میری دعا ہے کہ ساقی، گنڈی اور انگا تینوں ہمیشہ خوش رہیں۔ ساقی کی شاعری میں وہ کیف و مستی آئے جو زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے میں ہماری مدد کرے۔ ان کا قلب مرجع انوار بنے اور ان کے سوز بھرے دل سے جو بات بھی نکلے وہ ایسی روشن اور تاباں ہو جو [illegible] اردو ادب میں صبح امید کے مترادف ہو۔

عزیز قیسی

غزل

گرتے ہوئے گھر مٹتے ویرانے ہوئے چہرے
اے سیلِ فنا کیا کیا، کیا جانے ہوئے چہرے

محراب میں آنکھوں کی شمعوں کی طرح سجے تھے
یادوں کے خرابے میں افسانے ہوئے چہرے

گنجان ہے آبادی تنہائی کے شہروں میں
کیا جانے کہاں گم ہیں پہچانے ہوئے چہرے

بند آنکھوں کو دیکھا تو پہچان گئے کیا تھے
کچھ دیکھے ہوئے چہرے کچھ جانے ہوئے چہرے

ہنستے ہوئے چہروں کی روتی ہوئی یادوں سے
جب بسنے لگیں آنکھیں ویرانے ہوئے چہرے

جلتی ہوئی راہوں کی ہر بھیڑ میں اب تک بھی
پل بھر کو ٹھٹکتے ہیں کچھ جانے ہوئے چہرے

کتبوں کی طرح قیسی جسموں پہ ہیں آویزاں
یہ جانے ہوئے چہرے یہ مانے ہوئے چہرے

عمر انصاری

غزل

یہ ہے زندگی تو اس سے کوئی کیا کلام کرنا
نہ غمِ سحر اٹھانا، نہ دعائے شام کرنا

کوئی آسرا نہ آہٹ، نہ کسی کی آمد آمد
ہے وہ کون جس کی خاطر کوئی اہتمام کرنا

مری منزلِ محبت ابھی دور ہے یہاں سے
یہ ہے پتھروں کی بستی، یہاں کیا قیام کرنا

میں وہی تو ہوں زمانے جسے تو نے پیس ڈالا
تجھے آگیا کہاں سے مرا احترام کرنا

یہ فسانۂ شبِ غم مری عمر کا ہے حاصل
یہ فسانۂ شبِ غم نہ کبھی تمام کرنا

نہ رہے وہ دن، ہے اب تک نگراں کا فیض جاری
وہی جاگنا سحر تک وہی سو کے شام کرنا

ہے عزیز تم کو جینا، تو یہ فن بھی سیکھ لینا
کسے کیا جواب دینا، کسے کیوں سلام کرنا

ہے جہانِ عاشقی کا یہ رواج اک پرانا
پھر اسی کو رنج دینا جسے شاد کام کرنا

کبھی ایسے تو نہ تھے تم، یہ عمر تمہیں ہوا کیا
نہ کسی سے ہنس کے ملنا، نہ دعا سلام کرنا

مضطر مجاز

غزل

تجھ کو ملا ہے حکم یہ میزانِ عدل سے
ہر رہ کے آفتاب کی سولی پہ کھینچ دے

تنہائیوں کے ڈیرے جمانے کی دیر تھی
یادوں کے کارواں مرے دل میں اتر پڑے

ہر کربِ انبساط کو ٹھکرا چکا ہوں میں
تو بھی اب اے نشاطِ الم ! ساتھ دے نہ دے

رت پوچھئے تو اب وہی بہزادِ وقت ہے
جو مورتوں کو توڑ کے پتھر تراش لے

دنیا کا مجھ سے ایک بھی سودا نہ ہو سکا
کتنے قرض مجھ پہ کسی کے بدن کے تھے

مضطر وہی تو عالم و فاضل ہیں آج کل
نکتے ملیں جو الف کے بڑی تمکنت سے بے !

منوہر لال ہادی

سانیٹ

خدا نے ان گنت خادم دیئے ہیں زندگانی کو
دیا جذبہ جو ہے سرچشمۂ جوش و توانائی
یہی ہے بحرِ رنگینی، یہی دریائے رعنائی
اسی کے فیض سے انداز ملتے ہیں جوانی کو
دیا احساس اک دیے کے درد و غم سمجھنے کو
دگرنہ بارِ غم سے زیست جھکنا چور ہو جاتی
حیاتِ لطف پرور لاد دا ناسور ہو جاتی
دیا ادراک تقاریروں کے پیچ و خم سمجھنے کو
جبلت وہ کہ جو ہر موڑ پر رستہ دکھاتی ہے
دگرنہ ہم بھٹکتے رہگزاروں کوہساروں میں
بہکتے مرغزاروں میں، الجھتے خارزاروں میں
یہی تو لا کے کرنیں دل کی گلیوں میں نچاتی ہے
زباں دانوں نے ان کو خادمانِ زندگی سمجھا
مگر مجھ بے زباں نے ناظمانِ زندگی سمجھا

اصیر احمد نصیر گلبرگوی

غزل

ذہنوں کی آگ برف میں تبدیل ہو گئی
جب روشنی شعور کی تحلیل ہو گئی

ہر کوئی اس میں جھانکتا رہتا ہے بار بار
جیسے کہ زندگی بھی کوئی جھیل ہو گئی

اک عمر چارہ گر نے مداوا کیا مگر
دل بجھ گیا تو درد کی تکمیل ہو گئی

بچھڑا ہوا حبیب ملا ہے تو جھکے ہوئے
گویا حدیثِ درد کی تفصیل ہو گئی

یوں جگمگا اٹھی ہے شبِ تار اے نصیر
جب سے حیات راہ کی قندیل ہو گئی

خود نوشت حالات

میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے۔ اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورثِ اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربارِ دہلی نے انھیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کیے جانے کے علاوہ جاگیرات، خطابات، منصب وغیرہ سے سرفراز کیے گئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پردادا تھے۔ صوبۂ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دوسو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی۔ مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورثِ اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت دیانت اور جرأت کے ساتھ گزار دی۔ میری جوان لڑکی نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں۔ میں نے ۱۹۰۱ء میں بی اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء تک آگرہ میں پیشہ وکالت ذریعہ معاش رہا۔ کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک حیدرآباد دکن میں صدر مدرس رہا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد سے اب تک بے کار ہوں۔ آئندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگِ خاندان بھی ہوں اور بارِ زمین بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لیے تو کیا مفید ہوتی خود میرے لیے نہیں۔ میری موجودہ تصنیفات دیوانِ فانی مطبوعہ نقیب پریس بدایوں ۱۹۲۰ء میں باقیاتِ فانی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ ۱۹۲۶ء اور ع فانی مطبوعہ لطیفی پریس دہلی ۱۳۹ باقی تصانیف تلف ہو گئیں۔

غزل

فانی بدایونی

یہاں اب ایک دل بھی درد کے قابل نہیں ملتا
لہو بن کر جو آنکھوں سے بہے وہ دل نہیں ملتا

محبت میں کبھی نومیدئ کامل نہیں،
صلہ دل کو بقدرِ سعیٔ لاحاصل نہیں

زمانے نے مگر آئینِ مظلومی بدل ڈالا!
کہ اب قاتل تو ملتے ہیں کوئی بسمل نہیں ملتا

وہ میرے سامنے تھے اور مجھے دیکھے نہیں
کہیں ڈھونڈے سے بھی اب وہ لمحۂ مشکل نہیں

یہ دریائے محبت سربسر گرداب ہے شاید
کہ اس دریا کی موجوں کو کہیں ساحل نہیں ملتا

محبت کا کچھ ایسا قحط ہے فانی زمانے میں
کہ اب جس پہ نظر پڑتی ہے اس سے دل نہیں

(غیر مطبوعہ: بشکریہ ڈاکٹر مغنی تبسم)

فانی
(۱۹۴۰ء)

بیادِ فانی

علی احمد ـ یدرانجپے سم

فانی بدایونی

زندگی کے آخری پانچ سال

حضرت فانی بدایونی سے میری پہلی ملاقات جون ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ میرے خسر اور فانی کے مکان کے درمیان ایک اونچی دیوار حائل تھی۔ اس زمانے میں فانی ناندیڑ ہائی اسکول پر متعین تھے لیکن طویل رخصت حاصل کر کے مائگریشنی تعطیلات ہونے کی وجہ سے حیدرآباد میں مقیم تھے۔ فانی سے تعارف کے بعد میں کبھی کبھی شام کی مجالس میں شریک ہونے لگا۔ علامہ حیرت بدایونی، عبدالباسط صاحب، عبدالمعطی صاحب، محسن صاحب، لالہ دیوی پرشاد، علی امجد صاحب، ابوالقاسم صاحب، سمر... اور آغا سید حسن صاحب تقریباً روزانہ آیا کرتے تھے۔ آزاد انصاری، علی سید انصار، نواب ہاشم جنگ، نواب ستار جنگ، ماہر القادری اور تابش دہلوی بھی اکثر محفلوں میں شریک رہتے۔ شاہد صدیقی، حسرت ترمذی اور بعض دوسرے کبھی کبھی شامل ہو جاتے۔

فانی نے ناندیڑ سے حیدرآباد تبادلہ کروانے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن حیدرآباد کی بجائے نظام آباد ضلع میں تبدیل ہو سکے چنانچہ ناراض ہو کر رخصت حاصل کر لی۔ کہا جاتا تھا کہ بعض اصحاب نے حضور نظام کو فانی کے خلاف کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کا تبادلہ حیدرآباد سے باہر کر دیا گیا۔ فانی راجہ سرکشن پرشاد کی مجالس میں اکثر شریک رہتے تھے اور شہزادہ معظم جاہ کے کلام پر اصلاح دیا کرتے تھے۔ طلبی پر اکثر دیوڑھی جایا کرتے تھے۔ ابتدائی ملاقاتوں کے زمانے میں میں نے سنا تھا کہ انھیں محکمۂ تعلیمات سے چار سو، معظم جاہ بہادر سے تین سو اور مہاراجہ بہادر سے دو سو روپے ماہوار تنخواہ ملا کرتی تھی۔

فانی صاحب سے ملاقات کے کچھ ہی عرصہ کے بعد میں بھی ان کے متصل مکان میں منتقل ہو گیا۔ اس طرح میرا زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گزرنے لگا۔ فانی ملازمت سے علیحدہ ہو چکے تھے اور مدت ملازمت کم ہونے کی وجہ سے وظیفہ منظور نہ ہوا۔ البتہ چند ماہ کی تنخواہ یکمشت مل گئی جو کہ کوآپریٹیو قرضہ میں محسوب کر لی گئی۔ ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہی فانی صاحب سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ مہاراجہ کے صدارتِ عظمیٰ سے علیحدہ ہونے کے ساتھ ہی وظیفہ بھی بند ہو گیا۔ البتہ مہاراجہ کی مجالس میں شرکت کے مواقع پر انھیں ایک ایک اشرفی عنایت ہونے لگی۔

فانی آرائش بلدہ کے ایک مکان میں رہتے تھے جس کا کرایہ ملازمت کے ابتدائی زمانے میں پابندی کے ساتھ ادا کیا جاتا رہا۔ حیدرآباد سے تبادلہ کے بعد انھوں نے کبھی کرایہ ادا نہیں کیا۔ شہزادہ معظم جاہ آرائش بلدہ کے صدر تھے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ رعایت ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ مہتمم وصولی کرایہ تحریری نوٹسوں کی بجائے زبانی تقاضے کیا کرتا تھا اور فانی ٹالتے رہتے۔ اس طرح سال بھر گزر جاتا۔ رقم بڑھتی جاتی۔ پھر تحریری نوٹس ملتی۔ فانی اے ڈی سی کے توسط سے معظم جاہ سے ملتے اور کسی طرح کرایہ کا مطالبہ ختم ہو جاتا۔ لیکن بعد کو معظم جاہ بھی انجان ہونے لگے۔ کرایہ کے سلسلے میں فانی صاحب اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ دو تین مرتبہ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے مدد کی

خواہش کی تھی۔

حیدر آباد سے تبادلہ ہونے کے بعد معظم جاہ بہادر کی منظورہ رقم بھی بند ہو گئی۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے وہ قرض حاصل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے مخالفین نے یہ مشہور کر دیا کہ اب فانی قرض واپس کرنے کے موقف میں نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک مارواڑی قرقی لے کر آ گیا۔ فانی نے مجھے بلا بھیجا۔ میں نے مارواڑی کو سمجھا بجھا کر مہلت حاصل کر لی۔ لیکن مدت گزرنے پر مارواڑی نے وارنٹ گرفتاری جاری کروا لیا۔ کسی نے فانی صاحب کو قبل از قبل اطلاع دے دی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کسی طرح گرفتاری سے بچایا جائے۔ لیکن کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی۔ پھر فوری کہنے لگے کہ میں مدراس چلا جانا چاہتا ہوں لیکن ٹکٹ کے بھی پیسے نہیں۔ میں نے ساٹھ روپے فراہم کیے۔ فانی نے اپنے فرزند وجاہت علی خاں کے حوالے کیے کہ کلدار میں بدل کر کاچی گوڑہ سرائے سے آئیں مجھے ساتھ لے کر سرائے پہنچے لیکن گاڑی کا وقت نکل گیا۔ وجاہت علی خاں نہ آئے۔ معلوم ہوا کہ بنک بند ہو چکا تھا۔ میں فانی صاحب کو نثار یار جنگ کے گھر لے گیا۔ نثار یار جنگ نے مشورہ دیا کہ چند دن ان ہی کے گھر پر رہیں اور وہ نواب ہاشم یار جنگ سے مل کر انھیں INSOLVENT قرار دیئے جانے کی کارروائی کریں گے۔ معلوم نہیں اس تعلق سے کیا ہو سکا۔ فانی صاحب نثار یار جنگ کے پاس تین دن مقیم رہے۔ بعد کو اپنے گھر چلے آئے۔ دن تمام گھر میں رہتے اور بعد عفونت احباب میں آ بیٹھتے۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ اسی ساہوکار نے کسی دوسری عدالت سے ڈگری حاصل کر لی ہے۔ بقایا نو سو روپے کا تھا۔ میں ہوش یار جنگ سے ملا۔ انھوں نے بتایا کہ سب نے مل کر فانی کے لیے پانچ سو روپے عدالت میں جمع کیے تھے تاکہ وہ وکالت کر سکیں لیکن فانی وکالت کی طرف مائل نہ تھے چنانچہ یہ رقم ساہوکار کے حوالے کر دی گئی اور کامل رقم کی رسید حاصل کر لی گئی۔

فانی ایک تو مالی پریشانیوں سے دوچار تھے۔ تس پہ ستم ان کی بیوی مرض کینسر میں مبتلا تھیں، علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ علاج کے لیے پٹنہ یا مدراس لے جانا ضروری تھا۔ ہوش صاحب نے تجویز کیا کہ سر اکبر حیدری کے نام مالی اعانت کے لیے فانی سے ایک درخواست لکھوائی جائے۔ فانی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ میں نے خود درخواست تیار کی۔ سر اکبر حیدری نے تین سو روپے کی منظوری دی۔ کچھ دن اس طرح گزر گئے۔ ریڈیو اسٹیشن سے فانی کو پندرہ منٹ کے دو پروگرام ملتے تھے جن کا معاوضہ نوے روپے ملتا تھا۔ ہاشم یار جنگ کبھی کبھی ایک کمیشن دلا دیا کرتے تھے جس کے عوض مقدمہ کے لحاظ سے سو یا دو سو روپے مل جایا کرتے تھے۔ نثار یار جنگ اور دوسرے احباب وقتاً فوقتاً امداد کر دیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں فانی کی اہلیہ کا انتقال ہوا۔ بیوی کی موت نے فانی کی کمر توڑ دی۔ رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی فانی کی صحت بھی خراب رہنے لگی۔ نثار یار جنگ چاہتے تھے کہ ان کے دونوں لڑکوں کو صرف خاص میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم رکھوا دیں۔ لیکن فانی اسے پسند نہ کرتے تھے۔ موٹر بھی دو سو میں ہراج ہو گئی۔ کسی طرح دن گزرتے رہے لیکن فانی کی حالت گرتی رہی۔ ہوش صاحب نے حکیم انوار احمد کو مقرر کر دیا تھا جولائی ۱۹۴۱ء میں انھیں ذیابیطس کا مرض لاحق ہوا اور وہ صاحب فراش ہو گئے۔

۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کی دوپہر معلوم ہوا کہ فانی صاحب کی حالت بہت خراب ہے میں دفتر سے فوراً گھر پہنچا فانی کا سر زانو پہ لیے بیٹھا رہا۔ سکرات کا عالم تھا۔ تین بجے کے قریب روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

گئے وہ دن کہ میں امیدوار مرگ تھا فانی
اب ایک مدت سے ماتم دار مرگ ناگہانی ہوں ■

محمد شاہد عظیم

ہوا اور پانی ہمارے دشمن

سائنس اور جدید علم و حکمت کے دامن میں بنی نوع انسان کے لئے پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ پہیئے کی ایجاد سے لے کر چاند کی تسخیر تک ترقی کا ایک ایسا زریں عہد ہے، جس نے انسان کو گوناگوں نعمتوں سے نوازا ہے۔ زمین کے سینے پر کھڑے ہوئے انگنت کارخانے شب و روز مختلف قسم کے سامان تیار کر رہے ہیں۔ بات بیل گاڑی سے لے کر جمبو جیٹ تک پہنچ چکی ہے۔ جدید ترین ادویات نے انسان کو بے شمار مہلک امراض سے چھٹکارا دلا دیا ہے نباتات اور جنگلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے حشرات و جراثیم کش دوائیں بھی تیار کر لی گئیں ہیں۔ ہوا اور ان کے بہتر نکاس و خراج کے معقول معیار مقرر ہو چکے ہیں۔ لیکن سائنس کی ترقی کا مثبت پہلو جتنا خوب صورت اور سود مند ہے۔ منفی پہلو اتنا ہی بھیانک اور نقصان دہ۔ آج کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں فضاؤں میں زہر گھول رہا ہے۔ ایٹمی کوڑا کرکٹ سمندروں میں آبی جانوروں کے لئے پیغام اجل بن رہا ہے۔ کھلی اور تازہ ہوا کو ایک نعمت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بڑے شہروں خصوصاً صنعتی مراکز میں یہ نعمت کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ تمام بڑے شہروں کی فضا آج پہلے سے زیادہ ناگوار اور آلودہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے صنعتی شہروں میں فیکٹریوں اور کارخانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ موٹر کاریں بھی تقریباً ہر بڑے شہر میں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کارخانوں، فیکٹریوں اور موٹر کاروں سے خارج ہونے والی گیس اور دھواں فضا کو بڑے پیمانہ پر آلودہ کرتے ہیں اور فضا کی آلودگی کے اثرات اکثر غیر متوقع اور مہلک ہوتے ہیں، جس کے باعث تشویش پیدا ہونا ضروری ہے۔ امریکہ میں ابھی حال ہی میں ایک قانون منظور کیا گیا، جس کے تحت موٹر کاریں تیار کرنے والوں کو "الٹی میٹم" دیا گیا ہے کہ ۱۹۸۲ء تک دھواں نہ خارج کرنے والی موٹر کاریں تیار کر لیں۔ اب وہاں بیٹری سسٹم اور کیمیائی ایندھن سے چلنے والی کاریں تیار کی جا رہی ہیں۔ سوپر سانک طیاروں کے پروگرام میں بعض تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔

ہوا میں آکسیجن کی جو مقدار پائی جاتی ہے۔ وہ جانداروں کی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ ایک عام آدمی دن بھر میں جس قدر غذا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے، اس سے چھ گنا زیادہ یعنی تقریباً ۳۵ پونڈ ہوا ناک کے ذریعہ پھیپھڑوں میں داخل کرتا ہے ہمارے اس عمل سے فضا میں موجود آکسیجن کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف ہوائی جہاز اور پاور پلانٹ کہیں زیادہ وافر مقدار میں آکسیجن جذب کر کے، کاربن ڈائی آکسائیڈ۔ کاربن مانو آکسائیڈ۔ سلفر آکسائیڈ اور فوٹو کیمیکل آکسی ڈنٹس خارج کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ہوا میں آکسیجن کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مزید ستم یہ کہ ان گیسوں کے صحت پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً کاربن ڈائی آکسائیڈ، آکسیجن کے مقابلے میں خون میں زیادہ آسانی سے حل ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے جسم میں..

ہیموگلوبین کی مقدار کم ہوجاتی ہے۔ اگر یہ صورتِ حال زیادہ طویل عرصہ تک برقرار رہے تو قسم قسم کی بیماریوں مثلاً اختلاج، شدید قسم کی کھانسی، تنفس کی شکایت، دمہ اور پھیپھڑوں کا کینسر جیسی بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔

بڑے صنعتی شہروں میں کارخانے اور ملیں دن رات دھواں اگلتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ سے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جب اپالو ۸ کے ذریعہ زمین کی تصویر لی گئی تو جاپان کے شہر [illegible] اوساکا اور ٹوکیو پر سب سے زیادہ کثیف اور گہرے دھوئیں کے بادل اور آبی بخارات چھائے ہوئے ہیں۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ٹوکیو کے آس پاس جو فیکٹریاں ہیں وہ سال فضا میں ایک کروڑ ستر لاکھ ٹن سلفر ڈائی آکسائیڈ اور دوسری مضر صحت گیس خارج کرتے ہیں۔ بیس لاکھ موٹریں [illegible] اسی پر بس نہیں۔ اوساکا اور ٹوکیو میں ہر ماہ اوسطاً فی مربع میل زمین پر ۴۰ ٹن گوڑ کرکٹ اور غلاظت پھینکی جاتی ہے۔ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلنے والی زہریلی گیسوں کی ہلاکت خیزی کا اندازہ چند حالیہ واقعات سے ہوسکتا ہے۔ ابھی گزشتہ دنوں یوکوہاما میں فیکٹریوں سے خارج ہونے والے دھوئیں سے جس میں زہریلی گیسوں کی آمیزش تھی [illegible] سات بچے ہلاک ہوگئے۔ پہلوالیہ رام میں ۱۹۵۸ء میں دم گھٹنے سے بیس افراد ہلاک اور تقریباً ہزار کھانسی میں [illegible] سب سے زیادہ ہولناک واقعہ ۵ تا ۹ ڈسمبر ۱۹۷۲ء کو لندن میں پیش آیا۔ جس میں چار ہزار سے زیادہ [illegible] اور زہریلی لہر چھائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ملوں اور کارخانوں کا دھواں تحلیل نہ ہوسکا تھا۔

فضا کی آلودگی کے ساتھ ساتھ پانی اور زمین کی آلودگی بھی [illegible] پولیشن کا باعث بن گئی ہے۔ پانی کی آلودگی کے نتیجہ میں جھیلوں اور ندیوں کا قدرتی ماحول درہم برہم ہوجاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں آبی حیوانات بالخصوص مچھلیاں [illegible] براہِ راست متاثر ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں امریکہ نے ۷ ملین [illegible] زہریلے [illegible] کو تباہ کرنے کے لئے جسے اصطلاحاً G.B کہتے ہیں۔ چند لمحوں میں [illegible] سکتی ہے۔ صنعتی کارخانے بتدریج بحرِ ہند کو آلودہ کر رہے ہیں۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۱ء کو بمبئی میں حاجی علی کے قریب لاکھوں مچھلیاں مردہ پائی گئیں۔ تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق شہری گندگی جو [illegible] فاسد مادوں کی شمولیت سے پانی میں زہر پیدا کردیا [illegible] واقعہ پیش آچکا ہے۔ دلی اور آگرہ کے درمیان دریائے جمنا کے ساحل پر [illegible] ڈی۔ ڈی۔ ٹی تیار [illegible] کارخانے ہیں یہ اپنی گندگی جمنا میں انڈیلتے رہتے ہیں۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی [illegible] کا اندازہ [illegible] حقیقت [illegible] قطرہ پانی کے ایک کروڑ قطروں میں بھی زہر کی سی خاصیت پیدا کر [illegible] محفوظ نہیں ہیں۔ مغربی بنگال سے ۱۰۹ سے زائد [illegible] کے کارخانے ہیں۔ [illegible] استعمال [illegible] اور گندگی کو ہگلی میں [illegible] دیتے ہیں۔ بنا دو ہاں مچھلیوں کی تعداد خاصی کم ہوگئی ہے۔ علاوہ ازیں اب [illegible] لاکھوں [illegible] صحت کے خطرہ [illegible] ہگلی ندی میں نہاتے ہیں۔ مدراس کی حالت بھی کلکتہ اور دلی سے زیادہ تشویشناک ہے۔

آندھرا پردیش یونیورسٹی کے پروفیسر [illegible] کے مطابق [illegible] فاسد مادے [illegible] ہیں اسی طرح [illegible] کارخانوں کا [illegible] اور سمندروں میں پھینکے جارہے ہیں۔ سمندر [illegible] کے لئے یا خطرہ [illegible]

ایک ارب ٹن تیل لے گئے اور ۴۰ کروڑ ٹن تیل آمدورفت کنووں سے حاصل کیا گیا جس میں سے ایک بیس لاکھ تا ایک کروڑ ٹن تیل سمندر میں بہہ گیا اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت ہر سمندر سے ایک سال میں پانچ ملین ٹن [illegible] تیل جو سمندر کی نچلی سطحوں پر جم گیا ہے نکالا جا سکتا ہے اور یہ تیل اتنی ہی مالیت کا ہوگا جتنی مالیت کا تیل دوسری جنگ عظیم میں ٹینکروں کے ڈوب جانے سے سمندر میں بہہ گیا تھا [illegible] حال یہ ہے کہ اگلے بیس برسوں میں اس تیل سے چالیس فیصد [illegible] جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ نقصان مچھلیوں کی تجارت کو ہوگا۔ پہلے کا اس [illegible] علاقہ بھی تیل کے اثرات [illegible] ہیں [illegible] اثرات مچھلیوں کی تعداد پہلے سے نسبتاً کم ہوگئی ہے [illegible] سے ایسی مچھلیاں پکڑی جارہی ہیں، جس میں [illegible] اور تیل کی بو آتی ہے گیٹ وے آف انڈیا اور تاج محل ہوٹل کے [illegible] سمندر کا پانی اس حد تک بدلا ہو چکا ہے کہ پانی پر تیل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ سمندر کی آلودگی کے اثرات اگرچہ ابھی تک [illegible] طور پر واضح نہیں ہوتے ہیں تاہم [illegible] اس قسم کے خدشات پائے جاتے [illegible] سمندر بھی غیر محفوظ ہو جائیں گے۔

قدرتی تبدیلیوں کے علاوہ انسان کی لائی ہوئی تباہیوں [illegible] آبادی کی کثرت اور دیگر بہت سے اسباب کی بنا پر بھی آلودگی [illegible] نہیں۔ اس سلسلہ میں ویتنام کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جہاں مسلسل بمباری سے زمین اپنی اہمیت کھو چکی ہے۔ اس کے لئے سیم اور [illegible] کا مسئلہ ہے۔ آسام میں زمینی کٹاؤ کے باعث ہر سال سو ایکڑ زمین ناقابل کاشت بن رہی ہے۔

[illegible] پانی اور زمین کو آلودگی سے بچانے کے لئے اگرچہ بیشتر ترقی یافتہ ممالک قانون سازی کی اصطلاحوں میں سوچ بچار رہے ہیں لیکن اس کے لئے [illegible] قانون [illegible] ہی کافی نہیں [illegible] سمجھتے ہیں عوام [illegible] کی بھی ضرورت ہے اور سب سے [illegible] بات یہ ہے کہ [illegible] عامہ کو آلودگی کے خلاف منظم کیا جانا [illegible] امریکہ نے ایک تحفظ کمیٹی قائم کی ہے جو مختلف تجاویز پر غور [illegible] ہے۔ ہمارا ملک صنعتی میدان میں نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے تاہم مغربی ملکوں سے ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس [illegible] ہوا اور پانی کا مسئلہ اتنا سنگین اور اہم نہیں۔ تاہم ہمارے ملک کو بھی اس مسئلہ پر [illegible] سے سنجیدگی سے غور اور عمل کرنا چاہئے [illegible] قریب میں آلودگی کا مسئلہ مغربی ممالک کی طرح [illegible] اختیار کرے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا فرض [illegible] حکومت کا ہے۔ [illegible] آلودگی کو ختم کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں منظم ایکٹ تشکیل [illegible] ریاستی حکومتوں [illegible] ہے کہ ایک ہمہ گیر پروگرام مرتب کیا جائے اور فوری [illegible] کئے جائیں۔

لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ مہاراشٹرا کے علاوہ کسی اور صوبہ نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے نہیں سوچا ہے۔ مہاراشٹرا سرکار [illegible] اقدام یقیناً لائق تحسین ہے کہ وہاں اس مسئلہ کا عمیق تجزیہ کیا جارہا ہے۔ اس سے متعلق ضروری قوانین کا نفاذ بھی ہو رہا ہے صوبہ کے [illegible] حصوں میں ساحلی ریسرچ اور تحقیق کا کام جاری ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لئے ہمہ گیر پروگرام مرتب کیا جائے اور فوری اقدام کئے جائیں۔

سب رس، اعلیٰ علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں کا ترجمان ہے اس کی توسیع اشاعت میں مخلصانہ حصہ ادا کیجیے۔ (ادارہ)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی
دو جلدوں کا آنا ضروری
ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے
متفق ہونا ضروری نہیں

• نام کتاب : بزم و رزم **فطرت** • شاعر : ڈاکٹر سید عبدالحمید شمس عظیم آبادی • ضخامت (۱۶۰) صفحات
• قیمت : (۱۲) روپیے • ناشر : سائنٹفک پبلی شرز۔ مجیدویلا۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

علم اور اس کا ارتکاز شعری صلاحیت کے لئے جہاں امکانات بڑھاتا ہے وہیں شاعر کے لب و لہجہ میں بازگشت علمیت کے بار سے بوجھل پن اور بے اندازہ احتیاط سے غیر اختلافی بلکہ INERT زبان پیدا کرتا ہے۔ لیکن شمس عظیم آباد بلاشبہ ایک جامع شاعر ہیں۔ پُرخلوص اور فن کار۔ شعر و سخن کی بزم میں ایسے خاموش اور خلاق شاعر کا وجود غنیمت ہے۔ جب میں نے ان کے مجموعہ کو تبصرہ کے لئے لیا تو اس تصور سے کہ ایک اور مجموعہ کلام پیش نظر ہے۔ لیکن مط سے کھلا کہ یہ ایک خاص اور اہم شعری مجموعہ ہے۔ زبان و بیان اور حکیم فلسفے نے شمس کی شاعری میں ایک خاص ماحول کی نمائ کی ہے۔ وہیں زمان کی قید سے آزاد۔ جذبات سے انسلاک نے اس شاعری کو بے زمانی صداقت دی ہے جو اہم ہے شمس کی شاعری کی لفظیات اردو کی دیرینہ لفظیات ہیں۔ ظاہر و باطن۔ جام و مئے۔ شکوہ۔ قضا۔ ساحل و سفر جیسے الف کے اشعار میں عام ہیں۔ لیکن ان کا لب و لہجہ اور ڈکشن پراگندہ طبعی اور مجبور۔ محض انداز سے جُدا اور رجائیت سے مملو ہے نہ تو نے نظموں میں اخلاقی معلم کا سوانگ رچا ہے اور نہ ہی محض نیچرل شاعری کی ہے وہ ایک ناظر شاعر ضرور ہیں لیکن ایک ایسا شاعر جس کا ذہنی رویہ جذبات اور شعری حسیت سے معمور ہے۔ شمس کی شاعری گرچہ نئے دور میں دیرینہ تقلید سی لگتی ہے۔ ان کینوس کی استادانہ شاعری ہے اور یہ شاعری شدتِ فکر اور مشقِ سخن کی دلیل ہے۔ ان کے چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں:

• ظاہری تن سے شُست و شو سے غرض — پاک باطن کو کیا وضو سے غرض
• دیکھ لی جس نے تیری مست نگاہ! — اس کو جام و مے و سبو سے غرض
• یہ اور بات ہے مجھ پہ کبھی کرم نہ ہوا — وہ بے وفا ہے مجھے اعتبار ہو نہ سکا
• زمانہ کیا مرے سوزِ دروں کو پہچانے — جو چوٹ کھائے ہوئے ہیں وہی سمجھتے ہیں
• میری گردش کو نہ پوچھو ہے بیاں سے باہر — ڈھیر ہو جاؤں تو اس خاک سے پیمانہ بنے

ان کی نظموں میں "آئے تھے ابھی کچھ دیر ہوئی"۔ "پھر کہیں پھول کھلا"۔ قابلِ ذکر ہیں۔ اس مجموعہ میں (۴۰) صفحات نذ ہوئے۔ ۲۴ صفحات مثنویوں کی نذر ہوئے اور ۷۴ صفحات غیر متاثر کن ہیں۔ صرف غزلیں اور رباعیاں ہی شمس کی شا قیمتی حصہ ہیں۔ یہ کتاب قابلِ قدر ادبی تحفہ ہے۔

(اسلم عمادی)

● ماہنامہ شگوفہ کا ڈرامہ نمبر ● مدیر: سید مصطفٰی کمال ● مہمان مدیر: ساگر سرحدی
ضخامت ۲۵۲ صفحات ● قیمت بیس روپے ● لائبریری ایڈیشن ۲۵ روپے
پتہ: ۱۳؍ مجرد گاہ۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد ا۔

ماہنامہ شگوفہ نے نہ صرف یہ کہ طنز و مزاح کے ادب کی بازیافت بلکہ اس میں اعتبار پیدا کیا اس اعتبار سے شگوفہ کی ذمہ دارانہ اور بروقت اشاعت اور پابندی کا بھی حصہ ہے۔ ماہنامہ شگوفہ نے ڈرامہ نمبر اور وہ بھی ساگر سرحدی کی زیر نگرانی شائع کر کے ایک اہم ادبی فریضہ ادا کیا ہے۔ پیروڈی کے فن پر بھی اس پرچہ کا خاص نمبر مثالی تھا۔ ڈرامہ نمبر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ نئے ڈراموں (اردو اور تراجم) کے لئے مخصوص ہے۔ اس خاص نمبر کا مقدمہ ساگر سرحدی کا لکھا ہوا ہے مقدمہ مختصر مگر متوازن ہے۔ مگر ڈرامہ کے فن۔ اردو ڈرامہ کی اشارتی تاریخ۔ ڈرامہ کے پس منظر اور تاریخ و لیو دیر ایک اجمالی تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا ذکر بھی برمحل ہوا ہے۔ دیدۂ بینا کے تحت شیکسپیر ین۔ لارسکی اور بریختی اسکولوں کے ڈراموں اور ڈرامہ نگاروں کے رویوں پر مضامین ہیں۔ یہاں پر اگر لکھنؤ کے رئیس۔ کمپنی بہادر کے دور کی نوٹنکیوں اور ہندوستان کے قدیم ڈراموں کی خصوصیات پر بھی مضامین ہوتے تو بہتر ہوتا۔ مذکورہ بالا ڈراموں کے ہمراہ کچھ اہم ڈراموں کے تراجم بھی دیئے گئے ہیں تاکہ ہر اسکول کے انداز کی تشریح ہو سکے۔ ترتیب میں ایک ذرا سی احتیاط کی ضرورت تھی تاکہ امتیاز پیش نظر رہ سکتا۔ ڈرامہ نمبر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مراٹھی۔ سنسکرت۔ گجراتی۔ تلگو اور بنگالی ڈراموں کے تراجم بھی شریک ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مراٹھی اور بنگلہ ڈرامہ نے عالمی تحسین حاصل کی ہے۔ اردو ڈراموں کا حصہ بہتر توجہ کا مستحق تھا۔ مقبول قلم کاروں میں آغا حشر کاشمیری۔ شوکت تھانوی۔ جاوید اقبال۔ محمد حسن۔ کنہیا لال کپور۔ اور ہم عصر ادبا میں خصوصاً یوسف اختر۔ عتیق حنفی اور جمیل شیدائی کی کامل نہیں تو جزوی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ اگر اردو ڈرامہ کی زبان پر ایک مباحثہ بھی شریک ہوتا تو یہ دستاویز اور وقیع ہو جاتا۔ ماہنامہ شگوفہ کا یہ خاص نمبر کئی بنا پر ایک اہم ادبی تحفہ ہے اور جب کبھی ڈرامہ کے فن پر بات کی جائے گی یہ ایک ماخذ کے طور پر استعمال ہوگا۔ کتابت عمدہ۔ طباعت اور ایڈیٹنگ معیاری۔ سرورق معمولی۔ ہر ادب دوست کے لئے اس خاص نمبر کے مطالعہ قابل سفارش ہے۔

● اردو ماہنامہ آندھرا پردیش قومی ایک جہتی نمبر   ایڈیٹر: ملک محمد علی خاں
صفحات: ۲۱۴   قیمت ۵۰ پیسے   پتہ: گرہا کلیا کامپلکس۔ ناظم جاہی روڈ۔ حیدرآباد ا

"آندھرا پردیش" حکومت آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کا رسالہ ہے۔ اس رسالہ کی ایک مدت سے غیر پابندی سے محاورہ کا درجہ لے لیا تھا۔ ماہنامہ کبھی تو سال میں ایک یا دو بار آتا تھا یا کبھی نہیں۔ ملک محمد علی خاں کی بلند ہمتی سے امید ہے کہ یہ پابندی سے نکل سکے گا اور اگر طباعت میں پریس نے تعاون سے کام لیا تو غالباً پابندی قائم رہ سکتی ہے۔ اس خاص نمبر میں تقریباً اکیس گیارہ قلم کاروں کی تخلیقات ہیں اور اس طرح سے ایک اچھے ادب کا قابل حصہ جمع ہو گیا ہے۔ اس مجموعہ میں جگن ناتھ آزاد ابراہیم اختر۔ قیصر سرمست۔ ذکی انور۔ محمد علی اثر۔ ابراہیم خلیل۔ کالیکا پرشاد (ترجمہ)۔ اشفاق انجم ہبرا اور طلحہ تابش کی تحریریں اچھی ہیں۔ مضامین اور نظموں کی ترتیب اور خوب صورت لے آؤٹ مدیر کے فن صحافت سے واقفیت کی دلیل ہے۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ آندھرا پردیش معیاری اور دلچسپ مضامین و منظومات کو اپنائے اور کمرشل طور پر بھی اسے عوام کی رسائی حاصل ہو۔ مجموعی طور پر یہ نمبر اہم اور قومی ادب کا خوب صورت تحفہ ہے۔ قیمت بھی مثالی ہے۔ (اسلم عمادی)

اردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

۴/جون: ترقی پسند تحریک کے سیاسی رہنما اور دانشور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے علمی مقالوں کا پہلا مجموعہ "ادبی مطالعے" کی رسم اجراء اردو ہال میں پروفیسر حبیب الرحمن معتمد ریاستی انجمن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جناب یم۔ ناگار ڈیلی ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈیمی نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔ مسٹر فضل الرحمن سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، ڈاکٹر رعیت ساجدہ، مسٹر اختر حسن نے ڈاکٹر گوڑ کی علمی و ادبی بصیرت پر روشنی ڈالی۔

۵/جون: محفل خواتین کا ماہانہ ادبی جلسہ بیگم طیب انصاری کی صدارت میں ہوا۔ عظمت عبدالقیوم نے مضمون اور امجدی تیسیر نے افسانہ سنایا۔ خواتین شعراء کے کلام پر محفل اختتام کو پہنچی۔

۶/جون: جناب چندر سری واستو ڈائرکٹر سکریٹری اردو اکیڈیمی نے پریس والوں کو سنایا کہ ریاستی حکومت کی طرف سے اردو نصابی کتابوں کی اشاعت کا کام اکیڈیمی کی نگرانی میں شروع ہو چکا ہے۔ اور اب تک مختلف درجوں کی کتابوں کی ترتیب و کتابت تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔

* ساوتھ انڈیا اردو اکیڈیمی کی طرف سے محفل مشاعرہ مسٹر بی گنگا ریڈی ریاستی وزیر زراعت کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کئی شعراء نے کلام سنایا۔ مسٹر عزت احمد خاں ایڈیٹر فلمی تصویر نے اکیڈیمی کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ محمد لطیف الدین سکریٹری اکیڈیمی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ حفیظ قیصر نے مشاعرہ کنڈکٹ کیا۔

۹/جون: ریاستی اسمبلی کے چھ ارکان مسرز تیمور راؤ شنکار، صلاح الدین اویسی، تیمور شاد، ماقرآ عالی سنّدیا، محمد امان اللہ خاں نے ریاستی وزیر تعلیم سے اردو تعلیم سے متعلق مسائل کی غرض سے ماہرین کی ایک کمیٹی کے جلد تقرر کا مطالبہ کیا۔

۱۰/جون: جناب مبارز علی خاں، ایڈیشنل سیشنز نے انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کی طرف سے چار مینار کے پرانے شہر کے مجوزہ میں اردو گھر بلڈنگ فنڈ کے سلسلے میں ایک جلسہ کو مخاطب کیا اور اپنی طرف سے ایک ہزار روپئے کا عطیہ دیا۔ اور اردو دوستوں سے بھرپور اشتراک کی اپیل کی۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ نے صدارت کی۔ نواب میر احمد علی خاں، مسٹر سراس لاہوتی، احمد پاشی، اعظم نجمی اور معتمد انجمن شہر حیدرآباد غلام صادق الدین نے بھی تقریریں کیں۔

۱۵/جون: جواں فکر شاعر جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی کے مجموعہ کلام "روشن لکیریں" کی رسم اجراء کا جلسہ ادارہ شعر و حکمت کے زیر اہتمام ہوا۔ پروفیسر سروجنی ریگانی نے رسم اجراء انجام دی۔ ڈاکٹر مسلم عالم ڈین فیکلٹی آف سوشیل سائنس عثمانیہ یونیورسٹی نے تقریب کی صدارت کی۔ پروفیسر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، چندر سری واستو، امیر احمد خسرو، سراس لاہوتی اور ڈاکٹر یوسف کمال نے صادق کی شعری حیثیت پر خطاب کیا۔ صلاح الدین نیّر نے جلسہ کی کاروائی چلائی۔

۱۶/جون: ادارہ آئیم ادب کی طرف سے نامور افسانہ نویس اور صحافی دانشور جناب خواجہ احمد عباس کا انٹرویو مصلح الدین سعدی نے لیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد صدر محفل کے علاوہ کئی ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دوستوں نے عباس صاحب کی شخصیت اور ان کی قومی، علمی اور ادبی زندگی پر بات چیت اور نظریات سے واقفیت حاصل کی۔

۲۳/جون: اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کا اجلاس مولانا حافظ ابو یوسف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محنت اور لغت کے دانشور مشہور مخدوم محی الدین کی یاد میں سالانہ ادبی ایوارڈ ملک کے نامور مصنف کو دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اسی اجلاس میں وجے واڑہ، کرنول اور نظام آباد میں اکیڈیمی کے علاقائی دفاتر اور کتب خانوں کے قیام کو بھی قطعیت دی گئی۔

* بزم فیضی کے زیر اہتمام پاکستان

کے بزرگ شاعر تاج الشعرا مظہر کامل، حیدرآباد کے تیرہ قدیم میں شعری محفل منعقد ہوئی۔ منوہر لال بہار، راجہ ملا، واجد علی میاں ہانی، نذیر علی عدیل، جاوید نصیب، خورشید جنیدی، احمد کی شعرا نے کلام سنایا۔

۲۴/جون : اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس میں جناب ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) معتمد ادارۂ ادبیات اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وارث شاہ کی تصنیف "ہیر رانجھا" کے اردو منظوم ترجمہ پر مصلح الدین سعدی نے معلوماتی مقالہ پڑھا۔ مسز نیو اسن لاہوتی نے مرد جوانا ئیڈو کے شعری و ثقافتی کارناموں پر مضمون سنایا۔ صدر جلسہ نے حیدرآباد کے تہذیبی اور ادبی پس منظر پر اپنے دانشورانہ خیالات کا اظہار کیا۔ محفل شعر میں مضطر مجاز، حامد مجاز، صادق نقوی، وحید خلیل، یونس کمال، خیرات ندیم، تدبیر انصاری، سعدی اور شہامت ماہ نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر معتمد ادبی اجلاس نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶/جون : پاکستان سے آئے ہوئے جوان نکہت عزکیف رضوانی کا حیدرآباد لٹریری فورم اور ادارۂ "عینیہ" کی طرف سے شعری محفل میں خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے صدارت کی۔

۲۸/جون : مولانا آزاد میموریل سوسائٹی کی طرف سے ایک سمینار بعنوان مولانا آزاد بہ حیثیت صحافی کا چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے افتتاح کیا۔ مسٹر پی گنگا ریڈی ریاستی وزیر نے صدارت کی۔ مسٹر ایم باگا ریڈی صدر اردو اکیڈیمی، جناب عتیق صدیقی اور جناب شہباز حسین ایڈیٹر "آجکل" دہلی کے علاوہ احسن علی مرزا نے مقالے پڑھے۔

۴/جولائی : جنوبی ہند کے معروف تعلیمی ادارہ "الامین ایجوکیشنل سوسائٹی" شاخ حیدرآباد کی طرف سے "اردو میڈیم نرسری اسکول" کا پروفیسر پروفیسر محمد عبدالمنان نے افتتاح کیا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب وحید الدین کنوینر نے الامین سوسائٹی کی تعلیمی خدمات کا تعارف کرایا۔

۶/جولائی : مسٹر میر یوسف لاہوتی معتمد تعلیمی امور ریاستی انجمن ترقی اردو نے ایک مکتوب کے ذریعہ وزیر تعلیم کو اس جانب توجہ دلائی ہے کہ اردو مادری زبان کے طلباء ہنوز ضروری سہولتوں سے محروم ہیں اور کئی مدارس میں طلباء کی مطلوبہ تعداد کے باوجود اردو جماعتوں کا آغاز نہیں ہو سکا۔

۷/جولائی : محفل خواتین کا ماہانہ اجلاس محترمہ سلطانہ شرف الدین کی صدارت میں ہوا۔ لکشمی دیو راج نے آنجہانی جانکی پرشاد کی گنگا جمنی شخصیت پر دلچسپ خاکہ اور عفت یاسمین نے کہانی سنائی اور صدر محفل سلطانہ آپا نے ایک انشائیہ "سرخاب" پیش کیا۔ خواتین شعرا نے اپنی تخلیقات بھی سنائیں۔ مظفر النساء ناز نے شکریہ ادا کیا۔

کو حیدرآباد کے معروف افسانہ نگار ادیب جناب ایس ڈی ایم عاصم نائب صدر انجمن ترقی ادب بعارضہ کینسر رحلت کر گئے۔ اردو تنقید کو عاصم کی وفات سے گہرا صدمہ پہنچا ہے خدا مغفرت فرمائے۔

۸/جولائی : اردو ذریعۂ تعلیم کی پہلی ہندوستانی جامعہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈائمنڈ جوبلی تقاریب کا صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس ڈی شرما نے افتتاح کیا۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے پہلے بیاچ کے اساتذہ کو ایوارڈ دیے گئے جن میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (پاکستان) اور پروفیسر ہارون خان شیروانی شامل ہیں۔ یونیورسٹی کے اردو شعبہ نے اس موقع پر علمی و ادبی اہمیت کا ایک خوبصورت "ارمغان" شائع کیا۔ صدر ہند نے جامعہ عثمانیہ کے اردو کردار کی ستائش کی اور تعلیمی شعبوں میں ڈسپلن اور یگانگت کے فروغ پر زور دیا۔

۱۴/جولائی : اردو اکیڈیمی کی طرف سے نامور ترقی پسند شاعر مخدوم اعظمی کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے تقریب کی صدارت کی۔ صدر اکیڈیمی مسٹر ایم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج نے مہمان شاعر کا خیر مقدم کیا۔ مسٹر جیندر سریواستو ڈائرکٹر و سکریٹری اکیڈیمی نے اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ کیفی اعظمی نے کلام سنایا۔ مسٹر اختر حسن شریک معتمد اردو اکیڈیمی

نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پاکستانی صحافی
سہام مرزا اور رضانہ سہام مرزا (ادارہ
دوشیزہ و خاتون کراچی) بھی شریکِ محفل رہے۔
۱۵/ جولائی: ادارۂ اقلیمِ ادب کے
تعزیتی جلسہ میں جس کی صدارت پروفیسر سراج الدین
احمد نے کی، جواں مرگ افسانہ نویس حاکم کو
خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ رحمٰن جامی، حامد نیاز
اور غنی نعیم صاحبان نے حاکم مرحوم کے افسانوں
کی اشاعت کے تعلق سے اُردو اکیڈیمی یا ادبی
ٹرسٹ کے اربابِ اختیار کو توجہ دلائی۔
۱۷/ جولائی: زندہ دلانِ حیدرآباد
کے زیرِ اہتمام عبادت چند کھنہ کی صدارت
میں ظریفانہ نثری و شعری اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر
زینت ساجدہ، رشید قریشی، کھنہ اور مجتبیٰ حسین
کے علاوہ شعراء نے کلام پیش کیا۔ اور لطائف
بھی سنائے گئے۔
۱۹/ جولائی: جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو
کی طرف سے منعقدہ خصوصی اجلاس میں پاکستان کے
بین الاقوامی شہرت یافتہ مفکر اور سائنس داں ڈاکٹر
رضی الدین صدیقی نے جامعہ عثمانیہ کا اُردو پروگرام
کے موضوع پر لکچر دیا۔ پروفیسر جی رام ریڈی وائس
چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔
۲۱/ جولائی: ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی
طرف سے ایوانِ اُردو میں پاکستانی صحافیوں،
جناب سہام مرزا اور محترمہ رضانہ سہام مرزا کے
اعزاز میں ادبی محفل جناب سید ہاشم علی اختر (صدر
معتمد ادارہ) کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ محترمہ
جیلانی بانو، عوض سعید اور نجمہ نکہت نے افسانے
سنائے۔ محفلِ شعر میں ڈاکٹر مغنی تبسم، وقار خلیل،
محمد منظور احمد، برق یوسفی، صادق نوید، جہات
ندیم، بانو طاہرہ سعید، مظہر کامل، محمد علی اثر،
حمید الظفر صدیقی اور شفیع اقبال نے کلام سنایا۔
مہمان صحافتی جوڑے نے بھی خطاب کیا اور اپنے
تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے حیدرآباد کے
علمی و ادبی ماحول خصوصاً ایوانِ اُردو سے
دیرینہ رفاقت کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم
نے جلسہ کی کاروائی کی۔
۲۳/ جولائی: جناب ایم باگا ریڈی
ریاستی وزیر پنچایت راج و صدر اُردو اکیڈیمی نے
ریاستی اردو اساتذہ کی کنونشن کا افتتاح کرتے
ہوئے کہا کہ تعلیم سے متعلق ریاست میں اُردو
زبان کے مسائل ناقابلِ حل نہیں ہیں اور وہ شخصی
طور پر تعلیمات کے انتظامیہ سے ربط پیدا
کرکے ان مسائل کا حل تلاش کریں گے۔ مسٹر چندر
سری واستوا اکیڈیمی نے بھی مخاطب کیا۔
● مجاہدِ آزادی بیگم حضرت محل صد سالہ
تقاریب کے سلسلے میں جناب ایم باگا ریڈی نے
ایک محفلِ شعر میں تحریکِ آزادی کے علمبردار رہنما
کی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا۔
مسٹر ایم بابیا چیرمین [illegible] نے مشاعرہ کی صدارت
کی جہاں شعراء محمود سروش، نادر لکھنوی، مظفر
شمیم، اور انجم نزاہد کے علاوہ میزبان شعراء
سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، منور
لال بہار، شیولال، داؤد نصیب، یزدی، سحر
حشمت جاہ، انور ہاشمی، اور عزیز النساء
نے کلام سنایا۔
۲۴/ جولائی: حیدرآباد کے نامور
اور افسانہ نویس قیصر اختر صدیقی کا جو عرصہ
لندن میں مقیم تھے، انتقال ہوگیا۔ قیصر مرحوم
ادارہ ادبیاتِ اُردو اور ابوالکلام آزاد ریسرچ
انسٹی ٹیوٹ سے بھی وابستہ تھے۔ اور حوالی
سوسائٹی کے بانی اور معتمد کی حیثیت سے نئی نسل
قلمکاروں کو اسٹیج فراہم کیا تھا۔
۲۹/ جولائی: بزرگ قلمکار جناب
میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری ایوانِ اردو
کی کتاب "ذکرِ سالک" شائع ہوئی۔ غالب کے
باکمال حیدرآبادی شاگرد سالک پر مطبوعہ اس
کتاب کا پیش لفظ جناب مالک رام نے اور
ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے لکھا ہے۔ یہ کتاب
ایوانِ اُردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۴۸ سے
خریدی جاسکتی ہے۔

۴/ اگست: انجمن ترقی اردو کے صدر
جناب میر احمد علی خاں نے گولکنڈہ میں
اردو ماڈل اسکول کا افتتاح کیا۔ جناب
عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے اس تقریب کی
صدارت کی۔ مسٹر شیولال رکن ریاستی
اسمبلی مہمانِ خصوصی تھے۔ بانی اسکول جناب
خواجہ صادق الدین نے رپورٹ پیش کی۔
اختتامیہ تقریر کی۔
۸/ اگست: ادارۂ ادبیاتِ اردو

کی طرف سے ایوانِ اردو میں ممتاز ادیب اور دانشور اسکالر پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ دہلی نے بعنوان "نظیر اکبر آبادی: تہذیبی دیباچہ" مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر پی سی کمار صدر شعبۂ انگریزی حیدرآباد یونیورسٹی نے جلسہ کی صدارت کی پروفیسر آل احمد سرورؔ، اقبال پروفیسر کشمیر یونیورسٹی مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ و مدیر اعزازی "سب رس" نے ڈاکٹر نارنگ کا تعارف کرایا اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

۹/اگست: جناب جوہر ہاشمی کا مجموعہ کلام "نگارِ سحر" شائع ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم اور جناب عابد علی خاں نے علی الترتیب پیش لفظ اور رائے لکھتے ہوئے جوہر کی شعری حیثیت کی ستائش کی۔

۱۵/اگست: یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری نے ادارہ ادبیات اُردو کی بلڈنگ "ایوانِ اردو" پر قومی پرچم لہرایا۔

● آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے اردو ہال میں یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کے ہاتھوں اکیڈیمی کی تین کتابوں کی رسم اجراء انجام پائی۔ اکیڈیمی کے صدر جناب یم باگا ریڈی کی تصنیف "تلگو زبان اور ادب" کے علاوہ مرحوم شاعر طالب رزاقی کا مجموعہ کلام "نوائے طالب" اور بچوں کیلئے حافظ طیب قونوی کی پہیلیوں کا قطعوں کا مجموعہ "چاند تارے" نئی مطبوعات ہیں۔ ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے کہا کہ حکومت اردو زبان اور اقلیتوں کے مفادات کی تکمیل میں خلوصِ نیت کے ساتھ کوشاں رہے گی۔ جناب چندر سری واستو سکریٹری اکیڈیمی نے تعارفی و خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر ریڈی اور جناب یم باگا ریڈی کی اُردو زبان و ادب سے گہری انسیت کو اردو کلچر کے ریاست میں استحکام سے تعبیر کیا۔ مولانا حافظ ابو یوسف صدر نشین مجلس انتظامی اکیڈیمی نے بھی مخاطب کیا۔

۱۸/اگست: دبستان جلیل کے بزرگ شاعر جناب منوہر لال بہار کا دوسرا شعری مجموعہ "تکرارِ تمنا" شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر مغنی تبسم اور جناب عابد علی خاں معتمد ادبی ٹرسٹ نے شاعر کے سخنِ بہار آشنا پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۹/اگست: ہریانہ کے اردو دوست آئی اے ایس عہدہ داروں نے ایوانِ اردو میں منعقدہ ایک خیر مقدمی شعری محفل میں شرکت کی۔ مسٹر دتا، پادھیر اور، جناب بی ڈی کالیہ ہمدم نے ادارہ اور حیدرآباد کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں کو ملک کے لئے مثالی قرار دیا۔ محفل شعر کی صدارت ادارہ کے معتمد جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) نے کی۔ شاذ تمکنت، ڈاکٹر مغنی تبسم، بانو طاہرہ سعید، رحیمہ اختر، فہیم علی خاں ثاقب، وقار خلیل، صلاح الدین نیّر، محمد منظور احمد، علی احمد جلیلی، صاحب حیدرآبادی، بشیر وارثی، صادق نقوی، رحمان جامی، ساجد رضوی، محمد علی اثر، سراج میتر، ماجد علیم، ہمدم اور حمید اللہ صدیقی نے کلام سنایا۔

۲۳/اگست: نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف رورل ڈیولپمنٹ راجندر نگر میں مسٹر دتا، پادھیر کی صدارت میں محفل مشاعرہ ہوا۔ جہاں عہدہ دار سخنور جناب کالیہ ہمدم کے علاوہ حیدرآباد کے شعراء مسرز امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر مغنی تبسم، خیرات ندیم، مصحف اقبال توصیفی، وقار خلیل، صلاح الدین نیّر، رحمٰن جامی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، محمد منظور احمد، علی احمد جلیلی، ساجد رضوی، صادق نقوی نے کلام سنایا۔

۲۶/اگست: اردو مجلس کے زیر اہتمام پریم چند صدی تقاریب کے سلسلے میں بصدارت ڈاکٹر زینت ساجدہ ادبی اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر دھرمی لال شرما اور ڈاکٹر یوسف سرمست نے پریم چند کے فن پر مقالے پڑھے۔ آخر میں شعراء نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیّر نے شکریہ ادا کیا۔



بڑوں کا بچپن

ایم۔ اے۔ قاسم

مرزا سلامت علی دبیر (امام مرثیہ) دبیر کا پورا نام مرزا سلامت علی تھا۔ وہ دہلی کے محلہ بلی ماران میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کم عمری سے ہی بہت ذہین اور زبردست حافظہ کے مالک تھے۔ بارہ سال کی عمر میں جب میر ضمیر کی خدمت میں حاضری دی اور ضمیر نے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ تو دبیر نے فی البدیہہ یہ قطعہ سنایا ۔

کسی کے کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے ؛ کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر ؛ کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سنایا تھا کہ محفل تحسین آفرین سے پھڑک اٹھی۔ اسی محفل میں میر ضمیر نے مرزا سلامت علی کو دبیر کا تخلص دیا۔

جگدیش چندر بوس (ایک عظیم سائنسداں) اچاریہ جگدیش ۳۰/نومبر ۱۸۵۸ء کو بکرام پور (داری کھال) ضلع ڈھاکہ میں پیدا ہوئے ان کے والد بھگوان چندر بوس فرید پور میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ اچاریہ کو دور دراز کے ایک گاؤں میں ایک محافظ کے ساتھ بھیجا کرتے تھے جو کبھی، ڈاکوؤں کا سردار رہ چکا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر اچاریہ کچھ زیادہ ہی نڈر ہو گئے تھے۔ بچپن میں جب اچاریہ پر ڈانٹ ڈپٹ پڑتی، تو وہ بجائے کسی اور جگہ جانے کے، ایک قریبی جنگل میں چلے جاتے اور وہاں گھنٹوں گزار دیتے۔ یہیں سے ان کی طبیعت، علم نباتات کی طرف مائل ہوئی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) بچپن میں ذاکر حسین اپنے والد کے پیار و محبت کی بخششوں کے علاوہ اپنے بڑوں سے کچھ کام اجرت پانے کے شوق سے کیا کرتے تھے ان کے اردو اور انگریزی کے سب خط بہت اچھے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو بزرگوں کی تحریروں کی نقل سے جو آمدنی ہوتی اس کو پائی پائی جوڑ

کر سکتے تھے۔ پاس پڑوس میں کسی دکھی کی خبر پاتے تو اپنی محنت و مشقت کی ساری کمائی اور جوڑی ہوئی پونجی اس کے سپرد کر آتے وہ بھی اس طرح کہ ایک ہاتھ سے دیا تو دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہ ہوئی۔

کرشن چندر (ایشیا کا عظیم افسانہ نگار)

کرشن چندر جب پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ صبح کے وقت نوکر نے ان کو اسکول بھیجا دیا۔ لیکن جب چار بجے واپس لینے اسکول گیا تو کرشن چندر غائب تھے۔ سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ چپہ چپہ چھان ڈالا گیا۔ لیکن کرشن کا کہیں پتہ نہ چلا۔ جب رات ہونے کو آئی گھر کا نوکر چیرا باڑی میں مویشی باندھنے آیا تو اندر سے دروازہ بند تھا۔ کافی آواز دینے کے بعد کرشن چندر نے کنڈا کھولا معلوم ہوا کہ اندر چھپ کر الف لیلیٰ کی کہانیاں پڑھ رہے تھے۔

اطہر پرویز

جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

ایک حبشی تھا۔ وہ کھیتی باڑی کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتا تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا کھیت خریدا اس کھیت میں کنکر پتھر بہت تھے۔ اس نے سوچا پہلے کنکر پتھر نکال لوں پھر ہل چلاؤں گا۔ اور گیہوں بوؤں گا۔ پھر اس کھیت بہت گیہوں اگے گا، اور میں بہت دولت مند ہو جاؤں گا۔ اس نے کنکر پتھر نکالنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں وہاں پرندوں کا بادشاہ آیا۔ پرندوں کے بادشاہ نے کہا "اے بھائی حبشی کسان! تم اتنی محنت کیوں کر رہے ہو۔ میں سو پرندے بھیج دوں گا۔ وہ سارا کھیت صاف کر دیں گے۔

پرندوں کا بادشاہ وعدے کا پکا تھا۔ اگلے دن سو پرندے آ گئے انہوں نے اپنی چونچ سے سارے کنکر پتھر نکال کر پھینک دیئے اور چلے گئے۔ کسان نے جو دیکھا کہ کھیت صاف ہو گیا تو اس نے ہل چلانا شروع کر دیا۔ پرندوں کا بادشاہ پھر آیا اور بولا۔ بھائی حبشی کسان! تم کیوں محنت کر رہے ہو۔ میں دو سو بڑے پرندے بھیج دوں گا۔ وہ ذرا سی دیر میں تمہارا کام کر دیں گے۔ تم اپنے گھر میں آرام کرو"۔ کسان خوشی خوشی اپنے گھر چلا گیا۔ کیونکہ اگلے پرندوں کے بادشاہ نے سچ مچ دو سو بڑے پرندے بھیج دیئے۔ ان پرندوں نے ذرا سی دیر میں کھیت کو ایسا کر دیا جیسے کسی نے اس پر ہل جوتا ہو۔

اگلے دن جب کسان اس کھیت میں گیہوں کے بیج بو رہا تھا۔ تو پھر پرندوں کا بادشاہ آیا اور اس نے کہا "بھائی حبشی کسان! تم کیوں تکلیف کرتے ہو۔ میں کل تین سو پرندے بھیج دوں گا۔ وہ ذرا سی دیر میں تمہارا یہ کام بھی کر دیں گے۔ کھیت کی صفائی ہو گئی اس کی جتائی بھی ہو گئی۔ اب صرف بونے کا کام رہ گیا ہے۔ یہ بھی کام ہو جائے گا۔

اگلے دن پرندوں کے بادشاہ نے تین سو پرندے بھیج دیئے۔ ان پرندوں نے ذرا سی دیر میں سارے کھیت میں گیہوں بو دیا۔ اب تو کسان بہت خوش ہوا۔ سارا کام ختم ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد بارش ہوئی۔ کسان کو اپنے کھیت میں پانی دینے کا کام نہیں کرنا پڑا اور کچھ ہفتوں کے بعد کھیت میں گیہوں کے پودے بڑے ہو گئے۔ ان کے خوشے گیہوں کے دانوں سے بھر گئے۔ کسان بڑا خوش ہوا۔ اب

تو وہ اس گیہوں کو لے جاکر بازار میں بیچے گا۔ اس کو خوب روپیہ ملے گا، اور بہت مالدار ہو جائے گا۔ جب گیہوں کی فصل پک کر تیار ہو گئی تو کسان کاٹنے لگا۔ پرندوں کا بادشاہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے کسان سے پوچھا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" کسان نے کہا آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی مدد سے میری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ اب میں اسے کاٹنے جا رہا ہوں۔"

پرندوں کے بادشاہ نے کہا۔ "آپ آرام کریں۔ میں دو ہزار پرندوں کو دوں گا۔ وہ یہ کام کر دیں گے آپ آرام کریں۔ اگلے دن دو ہزار پرندے آ گئے، اور انہوں نے ذرا سی دیر میں سارا کھیت کاٹ ڈالا اور پھر خوشوں میں سے دانے نکال کر پھر سے اُڑ گئے۔ وہاں صرف بھوسا رہ گیا۔ کسان دیکھتا رہ گیا۔ اسے بہت افسوس ہوا۔ روتا ہوا گھر پہنچا۔ اس کی بیوی بولی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اب پچھتائے کیا ہوت۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اب تم میری بات مان لو اپنا کام، اپنے ہاتھ سے کرنا چاہیئے۔ آئندہ کبھی گھر بیٹھ کر دوسروں سے کام کرانا۔"

کسان نے بیوی کی بات مان لی اگلی مرتبہ اس نے اپنے کھیت کا سارا کام خود کیا اس مرتبہ اس نے پرندوں کے بادشاہ کی بات نہیں مانی۔ اس کے کھیت میں بہت گیہوں پیدا ہوا اور کسان خوب مالدار ہو گیا۔ ●●

(افریقہ کی قدیم کہانی)

احمد کلیم فیض پوری

پڑھنے میں لگ جاؤ جی

روز مدرسے جاؤ جی — پڑھ لکھ کر دکھلاؤ جی
دیر تلک کیوں سوتے ہو — جلدی سے اُٹھ جاؤ جی
اُٹھ بیٹھو اب منہ دھو لو — دانتوں کو چمکاؤ جی
اُجلے اُجلے یہ موتی ! — شیشے کو دکھلاؤ جی
ضد کرنا تو ٹھیک نہیں — بستہ لے کر جاؤ جی
علم نہیں تو کچھ بھی نہیں — پڑھنے میں لگ جاؤ جی
ہر انساں کی عزت کرنا — سیکھو اور سکھلاؤ جی
چھٹی ہے اب باغ میں جاؤ — من اپنا بہلاؤ جی

رنگ برنگی تتلی پکڑو — ہم کو بھی دکھلاؤ جی
شام ہوئی آنگن میں کھیلو — منی کو لے جاؤ جی
سورج بھی اب ڈوب چکا — دور تلک مت جاؤ جی
طوطا مینا لوٹ آئے — اب نہ دیر لگاؤ جی
کھیل کود کا وقت نہیں — واپس گھر آ جاؤ جی
ہوم ورک جو کرنا ہے — کاپی، پنسل لاؤ جی

صبح سویرے اُٹھنا ہے
اب جا کر سو جاؤ جی

سب رس برادری

میں اردو لکھ، پڑھ کر دوسروں کو بھی اردو زبان سکھانے کا عہد کرتا ہوں مجھے "سب رس برادری" کا رکن بنا لیجئے۔

نام .... جماعت ......

گھر یا اسکول کا پتہ ....

دستخط ....

چھوٹے کسانوں کیلئے بڑے پیمانہ پر امداد

اسمال فارمرس ترقیاتی ایجنسیوں نے جو آندھرا پردیش میں گذشتہ چھ سال سے سرگرم عمل ہیں۔ تقریباً ۱۳۱ کروڑ روپیوں کا ادارہ جاتی قرضہ فراہم کرکے قریب قریب ۲۰ لاکھ چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو۔۔ فائدہ پہنچایا ہے۔

یہ ایجنسیاں چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو خصوصاً کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے کسانوں کی تیز رفتار ترقی کی ممد و معاون کی حیثیت سے بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

مشترکہ دیہی ترقیاتی پروگرام جو آندھرا پردیش میں (۱۷۴) بلاکوں پر محیط ہے۔ شناخت کردہ۔۔ خاندانوں کی اس وقت تک امداد جاری رکھے گا، جب تک کہ خود کفالت کی سطح تک نہ پہنچ جائیں۔

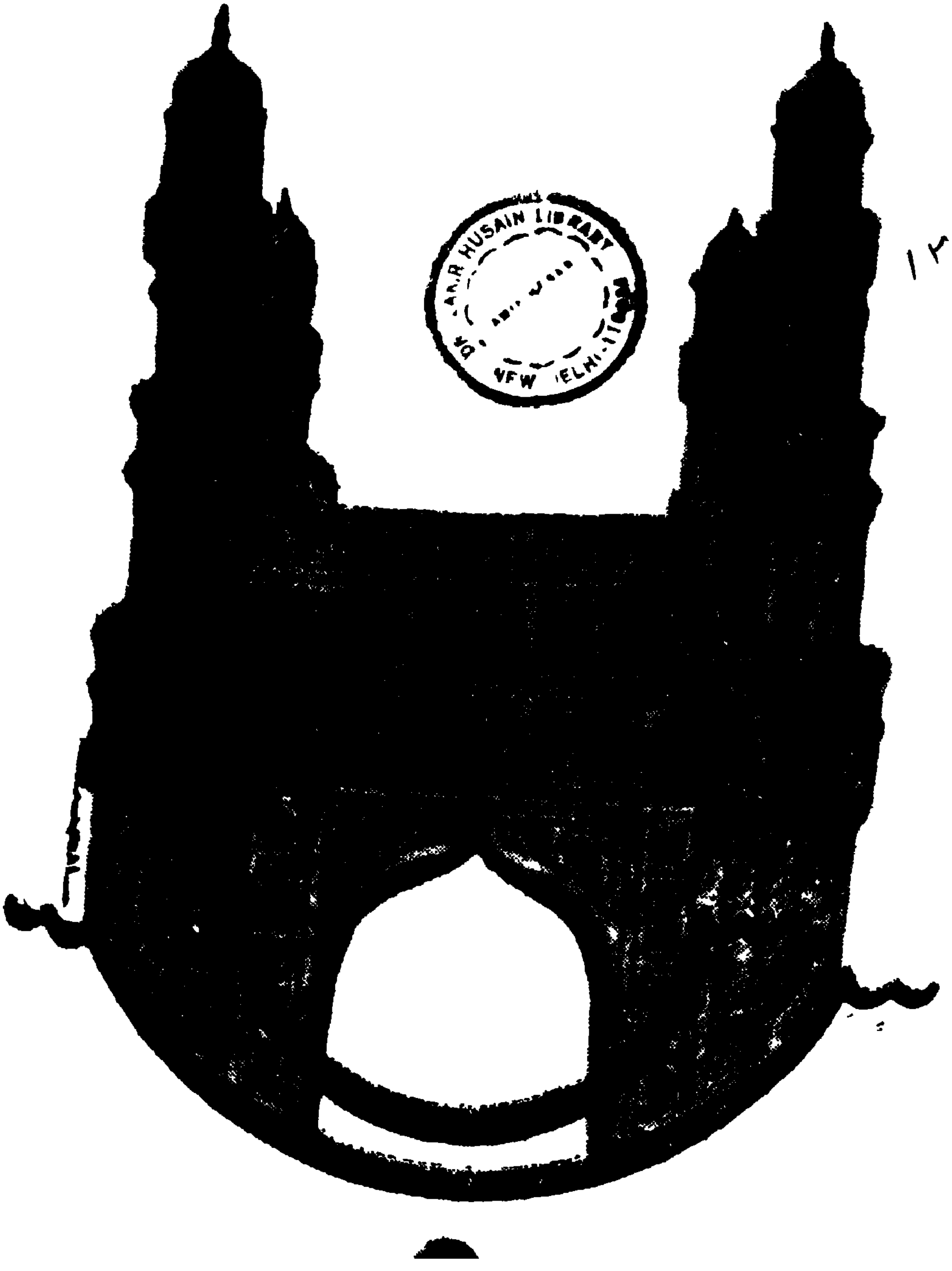
چھوٹے کسان

ہماری زرعی معیشت کے فروغ میں

ایک عظیم کردار ادا کرتے ہیں

D.I.P.R. 56/662/ADVT/C4/79ST/24.5.79

سب رس



سنِ اجراء ۱۹۳۸ء
فون: ۳۸۴۶۹
بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد ۴۲ — شمارہ ۱۰ تا ۱۲ — اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۹ء — قیمت فی شمارہ ایک روپیہ پچیس پیسے

زرسالانہ ۱۲ روپے — ششماہی ۱۰ روپے

— بیرونی ممالک سے —

مشرقِ وسطیٰ ۱۰ ڈالر، پاکستان ۱۰۰ روپے، سیلون ۸ ڈالر، امریکہ ۱۶ ڈالر

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد
مقامِ اشاعت: ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ پنجہ گٹہ۔ حیدرآباد ۴

ترتیب

غلام محمد عمر خاں

اشفاق صاحب

۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں نے جامعہ عثمانیہ کے سال اول میں داخلہ لیا تو اشفاق حسین ایم ۔ اے کر چکے تھے ۔ اور علامہ اقبال پر ریسرچ کر رہے تھے ۔ جامعہ میں ان سے متعارف ہونے یا ان سے ملنے جلنے کا موقع نہیں ملا ۔ ویسے "اختر کی ڈائری" لکھنے والے کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی خواہش میرے دل میں تھی ۔ جب میں جامعہ چھوڑ رہا تھا تو اتفاقاً میرے دوست شہاب الدین کے ہمراہ (جو بہت سینیر کہلاتے تھے) خیریت آباد ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک مکان میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اشفاق حسین رہا کرتے تھے ۔ شہاب سے ان کی پرانی دوستی تھی ۔ تمام وقت وہ شہاب سے باتیں کرتے رہے واپسی پر میں نے شہاب سے کہا کہ یہی اشفاق ہیں جن کی ڈائری کی دھوم جامعہ میں مچی ہوئی تھی ۔ شہاب نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر ہم نے اشفاق حسین کے بارے میں کوئی بات نہیں کی ۔

جانے کتنے سال گزر گئے ۱۹۵۲ء میں میرے دوست سعادت علی خاں کے الیکشن کا کام شروع ہوا زندگی بڑی مصروف اور چلبلی سے ہو رہی تھی ، میں ابراہیم پٹن سے واپس ہوا تھا اور سعادت میری تلاش میں آ رہا تھا راستہ میں مٹ بھیڑ ہو گئی دونوں موٹریں رکیں ۔ میں موٹر سے اترا تو سعادت نے گلے ملتے ہوئے کہا کہ پیارے سب تمہارے انتظار میں تھے کہو کیا خبر لائے ہو میں نے کہا کام اچھا ہو رہا ہے امید ہے کہ تم ضرور ٹکٹ ہو جاؤ گے سعادت کے ساتھ ایک سیاہ فام قلندر صفت شخص نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا اور سعادت نے کہا یہ اشفاق ہیں اشفاق نے اپنی مخصوص مسکراہٹ اور قلندرانہ انداز میں کہا کہ اے عمر خاں تو خالد جانباز کی طرح برسرپیکار ہے ہماری بھی دعائیں تیرے ساتھ ہیں ۔ مگر ہم کو تعجب ہے کہ تو آج تک ہماری نظروں سے پوشیدہ کیسے رہا حالانکہ کوئی شئے قلندروں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتی ۔ مجھے لہجہ اور تخاطب میں بڑا پیار بڑی محبت بڑا خلوص محسوس ہوا ۔ پہلی ملاقات میں اس قدر بے تکلفانہ طرز تخاطب نے سیاہ چمڑی میں چھپے ہوئے اشفاق حسین کو خلوص و پیار کے حسین پیکر میں آشکار کر دیا ۔ اور یہی ادائے بے تکلفانہ جو پہلی ملاقات سے میرے حصہ میں آئی تھی تادم زیست باقی رہی اور محبتوں میں اضافہ ہوتا رہا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اشفاق حسین آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے ان ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا ہی رہا اور ہم نے ایک دوسرے کے لیے ایک ہم آہنگی محسوس کی ۔ زیادہ تر بے تکلف ملاقاتوں کا موقع سعادت کی محفلوں میں میسر آتا جہاں حال و قال کے دلدادگان میں بحث و تکرار کے مواقع

عالم سکر میں جب دانائی کی باتیں بے ساختہ آشکار ہونے لگتیں تو اشفاق منصور حلاج کی طرح ہر مخفی کو فاش کرنے پر تل جاتے اور جب عالم سرخوشی میں عرش و کرسی پر متمکن ہونے کی کوشش کرتے تو میں گھبرا جاتا اور انھیں تھامنے کی کوشش کرتا کبھی انھیں کفر نہ بکو کہہ کر چپ کروانے کی کوشش کرتا تو کبھی ان پر حد شرعی کو قائم کرنے پر تل جاتا مگر سب بے سود۔ سعادت ہماری اس کشمکش کفر و ایمان کی نبرد آزمائی میں ایک سید ذی وقار کی طرح مصالحت کرانے کی کوشش کرتا حالانکہ بات یوں شروع ہوتی تھی کہ اشفاق پر جب جذبہ شوق کی دانشگی طاری ہونے لگتی تو وہ تکوین کی زبردستیوں کے خلاف نعرہ قلندرانہ بلند کرتا شکوہ و شکایت سے گزر کر وہ لاڈ و پیار کی زبان میں دامن یزداں کو تار تار کرنا شروع کر دیتا اول اول تو یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ میری سراسیمگی کو سعادت کی چلبلی فطرت اور ہوا دیتی اور میں اشفاق کو ڈانٹتا احتجاج کرتا کہ خدا کی شان میں ایسی گستاخیاں نہ کرو ورنہ شاید ابھی آسمان گر پڑے یا زمین ہی پھٹ جائے اور ہم سب بھسم ہو جائیں۔ اشفاق کا ایک اور شدید قہقہہ بلند ہوتا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں گرجتا کہ اے جاہل انسان چپ رہ تو ہمارے اور خدا کے درمیان جو راز و نیاز ہیں ابھی ان سے واقف نہیں ہوا ہے اور پھر تول تول کر علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھنے لگتا ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

ہماری محفلوں میں اشفاق کی موجودگی لازمی تھی ورنہ محفل سونی رہتی۔ میر حسن، مخدوم اور اشفاق جب جمع ہو جاتے تو رنگ محفل نورانی ہو جاتا قہقہوں، چہچہوں، لطیفوں اور جملہ بازیوں کے ساتھ ساتھ اشفاق کے مخصوص نمک پارے خلوص و پیار کی گزک بن کر سینے میں نہیں قلب و نظر میں اترنے لگتے۔ سعادت اکثر اشفاق کو اکساتا اور اشاروں اشاروں میں حاتم عطاری صاحب کی طرف دیکھتا۔ حاتم عطاری صاحب سعادت کے ہم زلف ہیں اور انتہائی مہذب اور مغربی آداب کے پابند۔ اشفاق کی عینک سے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک خاص زاویہ سے گھومتیں اور نگاہیں بیٹھی ہوئی خواتین کا جائزہ لینے لگتیں۔ مسز عطاری اور مسز سعادت سمجھ جاتیں اور کسی بہانے محفل سے کچھ دیر کے لیے کھسک جاتیں اور پھر اشفاق کی آواز بڑے متوازن گمبھیر سروں میں ڈوبے ہوئے سروں میں نکلتی ارے حاتم۔ پیارے حاتم [illegible] سور تو کتنا پیارا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حاتم کانوں میں انگلیاں [illegible] ہاتھ دھرے اپنی کرسی سے کھڑے ہو جاتے [illegible] ہوتے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتے [illegible] اور پھر ایک مشترکہ قہقہہ گونجتا ہوا کمرے سے بجلی کی پھلجھڑیاں چھوڑتی سنائی دیتیں۔ اشفاق [illegible] ایک ایسے غلط [illegible] دوست کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی جس کو [illegible] مشترکہ خوشیاں ہیں ان کے بغیر زندگی دیوانے کا خواب ہے۔ [illegible] جس قدر شدت سے پیار کرتا تھا [illegible] ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگا وہ داڑھی والے ایک رکشا میں سفر کر رہا تھا [illegible] بلند قہقہہ بھائی تو نے کشادہ

سیکھ رہے ہو اتنے میں ایک صاحب آگیا اور بولا صاحب گالی کیوں دیتے ہو اشفاق حیران ہو گیا اور بولا بھائی کیا تم کو آردو آتی ہے تو بولا جی ہاں اور اشفاق نے فوراً معافی مانگ لی ۔

ایک شام دیکاجی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہنے لگا کاش وہ یار دلنواز یہاں مل جاتے اور پھر یار دلنواز مل گیا تازہ تازہ غزلیں سنانے لگا ، گالیاں بھی تھیں اور تحسین و آفریں بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان سے محبت برس رہی ہے اور زمین سے خلوص ابل رہا ہے گھر پہنچے تو کہنے لگا مخدوم ہر تازہ غزل مجھے سنانے کے لیے تڑپتا ہے ایک دفعہ مخدوم اور اشفاق میرے باغ میں بیٹھے عبادت میں مشغول تھے مخدوم نے اشفاق کو یوں چھیڑنا شروع کیا کہ اشفاق حسین تم بے حد غیر متمدن اور فحش سماج کے فرد ہو دراصل تمدن و تہذیب شائستگی و آداب تو شمالی ہند سے آئے ہیں اور ان میں آج بھی موجود ہیں اشفاق نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ زندگی کی حقیقت تو صرف بے باکی ، سرمستی اور حق گوئی میں ہے بقیہ سب ریاکاری ہے کتنے لوگ اپنی روایاتی تہذیب اور شائستگی میں اپنی ریاکاریوں کو چھپائے رکھتے ہیں ۔ ایسے شاعر سن لے کہ جب محبتوں کے سوتے پھوٹتے ہیں تو من و تو کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور روح انسانی پر اخلاص کی بے پناہ تجلیاں وارد ہونے لگتی ہیں ۔ مخدوم کے چہرے پر سنجیدگی آگئی اور پھر دوسرے موضوع پر گفتگو نے اپنا رخ موڑ لیا ۔

ایک دن عالم سرخوشی میں کہنے لگا عمر جوش کو ہندوستان میں کس بات کی کمی تھی افسوس یہ کمبخت شاعر پاکستان چلا گیا میں نے کہا ہاں جانے دو اسے تم کیوں غم کھا رہے ہو ایک گالی دے کر چپ ہو گیا کئی دنوں بعد جوش صاحب حیدرآباد تشریف لائے علامہ حیرت کے گھر مشاعرہ تھا کوئی ۱۰ بجے میں اور اشفاق پہنچے تو جوش صاحب نظم سنا رہے تھے ساری محفل گوش بر آواز تھی کہ یکایک پچھلی سمت سے ایک کڑکا ہوا دغا باز سور دلمن ، اے بے وفا شاعر ۔ اور پھر خاموشی محفل میں کچھ دیر کے لیے سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی لوگ منہ پھیر پھیر دیکھنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آئی جوش صاحب بھی تھم گئے اور کہا کہ معاملہ کیا ہے ۔ کچھ لوگ زیر لب مسکرائے اور پھر محفل شروع ہو گئی ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ پھر ایک نعرہ قلندرانہ بلند ہوا اور لوگوں نے اشفاق کو دیکھ لیا جوش صاحب سے تعارف کروایا گیا انھوں نے اپنے پہلو میں جگہ دی مگر اشفاق کا غصہ کم نہیں ہوا ۔ زور صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے اشفاق کو اس رنگ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ مقام سلوک ہے جہاں تو من شدی من تو شدی والا معاملہ درپیش ہوتا ہے مسکرا کر چپ ہو گئے دوسرے روز جوش صاحب سے دن میں ملاقات ہوئی تو بڑی محبت سے اشفاق کو پہلو میں بٹھالیا اور فرمانے لگے گالیاں دینے والے اشفاق حسین آپ نے میرے درد کو بانٹ لیا آپ کی گالی نے میرے زخم دل پر پھاہے کا کام کیا ہے کاش کچھ اور پھائے آپ میرے اس زخم ناگہاں پہ رکھتے ۔ پاکستان سے جوش صاحب نے علامہ حیرت کو خط لکھا تو اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ گالیاں دینے والے اشفاق حسین کو میرا اسلام ۔ معلوم ہوا ہے کہ جوش صاحب نے حکومت پاکستان کو عرضی لکھی ہے کہ اب وہ ہندوستان منتقل ہونا چاہتے ہیں اسی خبر

سنکر مجھ پر اشفاق کے غم وغصہ اور گالیوں کا راز فاش ہو گیا ہے اس کا دل آئینہ کی طرح شفاف تھا جس میں اسے ہر اپنے چاہنے والے کے مستقبل کی المناکیوں کی تصویر نظر آجاتی تھی اور اسی کرب کی حسرتناکیوں سے متاثر ہو کر وہ ایک نالہ قلندرانہ بلند کرتا تھا جس کو شاید لوگ گالی کہہ لیتے ہیں۔ اشفاق کا تبادلہ جالندھر ہو گیا وہاں سے دوستوں کے نام خطوط آتے ایک خط میں لکھا کہ " اے یاران وطن کیسے ہو میں تو سرد جہنم میں بسر کر رہا ہوں موسم کی ستم ظریفیاں کیا لکھوں ہم جنبوں کے نقداں پر کڑھ کڑھ کر اپنے آپ کو گالیاں دینے لگا ہوں ہر وقت ڈرتا ہوں اپنے چپراسی سے اور اس کی لال لال خونی آنکھوں سے کمبخت چودہ خون کر چکا ہے اور اب ہر وقت مجھ سے قریب بیٹھا رہتا ہے ؎

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا		کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے

فیض احمد فیض دہلی تشریف لائے ایک مخصوص محفل میں اشفاق اور میں بھی شریک تھے اشفاق نے فیض صاحب سے کہا کہ فیض صاحب آپ کی مشہور زمانہ نظم " اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا " پر دکنی زبان میں، میں نے ایک پیروڈی لکھی ہے۔ فیض صاحب نے کہا ارشاد، تو دکنی زبان کی فراہمی و صدر دوم میں اشفاق نے پیروڈی سنائی تو فیض صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر یہ مسکراہٹ ان کے چہرہ پر جم کر رہ گئی پھر ان کے چہرے پر میں نے کسی اور تاثر کو نہیں پایا۔ حال ہی میں جب فیض صاحب حیدرآباد آئے تھے اور مجھے ان کے ساتھ کچھ وقت بسر کرنے کا موقع ملا تھا تو میں نے انہیں وہ بات یاد دلائی تو ان کے چہرے پر پھر وہی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر قائم ہو گئی۔

ایک دفعہ دلی میں ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا کئی دنوں میں اور اشفاق ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں بسر کر رہے تھے۔ ہر صبح قہقہوں سے شروع ہوتی اور ہر شام گالیوں پر ختم ہو جاتی ان ہی دنوں سری رام والوں کا انڈو پاک مشاعرہ آ گیا۔ میر حسن صاحب اور مخدوم بھی آ گئے شام گویا شام بہاراں بن گئی اسی خوشی میں اشفاق نے ایک نیا بش شرٹ خریدا اور بولا کہ یہ بش شرٹ صرف ۷ روپیوں میں ملا ہے اس قدر خوبصورت بش شرٹ اور صرف ۷ روپیہ میں۔ اشفاق حسین اپنے اس کارنامہ پر پھولے نہیں سما رہے تھے اور بار بار مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بھائی تو بھی ایک خرید لے اتنے اچھے اور سستے کہاں ملتے ہیں میں نے کہا کہ جناب پہلے آپ اس کو پہن کر مجھے دکھائیے تو فوراً [illegible] اور بش شرٹ پہن کر [illegible] دیکھو کیسا لگ رہا ہے۔ میں نے کہا بہت اچھا ہے مگر آپ بھی تو دیکھئے معلوم کیسا لگ رہا ہے ذرا آئینہ کے ساتھ آئینہ تک آیا تو قہقہہ میں ہی کا [illegible] کہا کیوں بیٹا ہم کو دھوکہ دیتا ہے۔ میں بے اختیار ہنسنے لگا تو وہ بھی میری ہنسی میں شامل ہو گیا اور پھر یہ مصرعہ پڑھا ؎

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سوئی چبھو دی ہو۔ اشفاق اور مردم گزیدہ؟ مگر ہاں صحیح ہی کہا تھا

اس نے جس طرح سقراط نے ہنسی خوشی زہر پی لیا تھا اسی طرح اشفاق نے بھی زمانہ کی ناقدر شناسیوں اور وقت کی گرم جوشیوں پر قہقہوں اور گالیوں کے تریاق سے فتح حاصل کرلی تھی۔ ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشک باری کی والا معاملہ ہر وقت اشفاق کے در پیش رہا۔ دوستوں کی خوشیوں میں وہ اس درجہ مسترور ہوتا کہ دیکھنے والے اس کی ہر ادائے دلبرانہ سے مالا مال ہو جاتے اور اسی طرح دوستوں کی مصیبتوں میں بھی وہ اس قدر درد و کرب سے دوچار رہتا کہ مصیبت زدہ دوست اپنا غم بھول جاتا۔ اکثر رمضان کی عید سے دو چار روز قبل اشفاق حیدرآباد آجاتے اور اکثر میرے ساتھ ہی قیام کرتے جمعتہ الوداع کی نماز پڑھنے میرے ساتھ مکہ مسجد آئے جس طرح کسی ضدی بچے کو کڑوی دوائی پلانے کے لیے بہلایا پھسلایا جاتا ہے کچھ ایسا ہی معاملہ اشفاق حسین کے ساتھ مجھے کرنا پڑتا بہت بن ٹھن کر مکہ مسجد پہنچے کثرت اژدحام دیکھا تو حسب عادت چڑچڑانے لگے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور چپکے چپکے مجھے گالیاں دیں کہ ظالم کہاں کھینچ لایا ہے۔ میں نے کہا بیٹھ جایئے اور درود پڑھتے رہیے تو بولا ہاں آج تو تیرے ہاتھوں پھنس گیا ہوں جو تو کہے وہی کروں گا مجھے موقع خوب ملا تھا، میں نے خوب خوب ہی انھیں چھیڑا کبھی یہ کہہ کر کہ میرے بھائی نماز کی نیت یاد ہے؟ رکوع میں کیا پڑھتے ہیں سجدہ میں کیا پڑھا جاتا ہے؟ تو اشفاق کے چہرے پر عجیب سی غصہ ملی مسکراہٹ پھیل جاتی اور وہ آنکھیں دکھا کر مجھ سے سرگوشی میں کہتے کہ چپ رہ لوگ سن لینگے اور میں ہنس دیتا۔ اذاں کی آواز آئی اور پھر لوگ قیام کے لیے کھڑے ہو گئے مجھ سے کندھا ملاتے اشفاق حسین نے بھی رکعت باندھ لی اور نماز شروع ہو گئی۔ معاً میں نے دیکھا کہ اشفاق حسین سر و قد لرزہ براندام ہیں اور ان کا پورا جسم بید کی طرح کانپ رہا ہے ان کی اس حالت کو میں دیکھ بھی رہا تھا اور محسوس بھی کر رہا تھا۔ میرے دل میں کئی خیالات پیدا ہو رہے تھے کیا یہ کوئی اچانک بیماری کا شکار ہو گیا ہے کیا قلب پر کوئی حملہ ہوا ہے کیا اب یہ دوران نماز گر پڑیگا۔ کیا مجھے نماز توڑ کر اس کو سہارا دینا ہوگا۔ میری ساری نماز خراب ہوئی اور میں دعا کرنے لگا کہ ' اے خدا اشفاق پر رحم فرما۔

جوں توں اسی کیفیت میں نماز ختم ہوئی سلام پھیرتے ہی میں نے کہا بھئی کیسی طبیعت ہے تمہاری۔ کیا ہو گیا ہے تم کو۔ کیا باہر چلیں۔ اشفاق رومال سے پسینہ پونچھ رہا تھا اور پھر آہستہ سے بولا " میں بالکل اچھا ہوں تم پریشان مت ہو "، میرے بازو عبدالستار رجا بھی تھے انھوں نے مجھ سے کہا اشفاق کو کیا ہو گیا ہے وہ کانپ رہے تھے میں نے کہا جی ہاں مومن اپنے خدا کے حضور جب حاضر ہوتا ہے تو ایسے ہی کانپتا ہے آج خدا اور اشفاق کے درمیان جو راز و نیاز تھا اس کا راز بھی مجھے معلوم ہو گیا تھا گالیاں دینے والا اشفاق حسین مرد قلندر خلوص و محبت کا پیکر کچھ دن ہوئے ہماری محفل سے اٹھکر چلا گیا ہے ؂

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

دکنی کا ایک دیوانہ!

ناامپلی اسٹیشن سے رائل سیما ایکسپرس ابھی ابھی روانہ ہوئی ہے، کوئی تین منٹ ہوئے ہوں گے۔ اب چھ بج کر تین کا عمل ہے۔ حیدرآباد، مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یوں بوجھیے تو ناامپلی اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی حیدرآباد کی رونقیں اور رعنائیاں کہیں دور چھپ جاتی ہیں لیکن اب تو رہی سہی جھلکیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو رہی ہیں۔ باغ عام، خیریت آباد اور ادھر لیک ویو گسٹ ہاؤز، راج بھون اور دلکشا اور حسین ساگر کے اس پار، سکندرآباد کی روشنیاں مجھے الوداع کہہ رہی ہیں۔ شام کے دھندلکے گہرے ہوتے جا رہے ہیں ـــــ بیگم پیٹ پر ٹرین، دو ایک لمحوں کے لیے رکی ہے اور پھر چل پڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے، حیدرآباد ہی نہیں، میں اپنے آپ سے بھی دور ہوتا جا رہا ہوں، اپنی شخصیت سے، اپنے وجود سے، اپنے آپ سے! بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے ان چار چھ دنوں میں خاصی ملاقاتیں رہیں۔ آج بھی کئی ایک سے ملنا ہوا۔ سب ہی یاد آ رہے ہیں۔ وہ بھی جن سے ملاقات نہ ہو سکی ـــــ لیکن ایک نام ہے کہ مسلسل یاد آ رہا ہے۔ ایک چہرہ ہے کہ نگاہوں سے اوجھل ہونے کا نام نہیں لیتا اور اسی سے وابستہ بے پناہ یادوں کا ہجوم۔ کون جانے کہاں کہاں کی یادیں۔ ذہن کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میں سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں، بھول چکا ہوں۔ پتہ نہیں ٹرین کہاں کہاں ٹھہری بھی یا نہیں ـــــ وقارآباد آ چکا ہے۔ وقارآباد رائل سیما کے لیے MEAL STATION ہے۔ اس ڈبے میں کوئی چہرہ جانا پہچانا نہیں ـــــ سب کھانا کھانے میں مصروف ہیں۔ میری ماں نے بھی بڑے شوق سے، بڑی چاہ سے اپنے ہاتھوں سے پکائی روٹیاں اور سالن ساتھ دے دیا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ ضرور کھانا۔ لیکن کیا کروں، بھوک نہیں لگی اور نہ ایسا کہ سیری کا احساس ہو، بس وہ چہرہ میرے سامنے ہے۔ سلیمان خطیب کا چہرہ! ـــــ

ـــــ لیکن خطیب صاحب یہ کیا؟ آپ تو کچھ بات ہی نہیں کر رہے ہیں۔ آپ جیسی مجلسی اور باغ و بہار شخصیت یوں خاموش! یوں چپ چاپ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں آپ خفا تو نہیں؟ ممکن آپ مجھ سے خفا ہوں گے۔ ... ہو ناں؟ ... [illegible] اور میں آپ کی عیادت کے لیے نہیں آیا۔ صوفی [illegible] سے آپ کا [illegible] [illegible] سے کیا۔ وہ بھی آپ کی عیادت کے لیے آمادہ ہو گئے لیکن [illegible] اب صحت بہتر بھی ہے [illegible] ... تو اب آپ کی [illegible] میں کبھی [illegible] نہیں آئے گا۔ کوئی [illegible] نہیں آئے گا۔ کل [illegible] تو آپ کہیں [illegible] چکے ہوں گے [illegible] حال

جا کے لوگ واپس نہیں آتے۔ مجھے اور مجھ جیسے کئی ایک کو شرمندہ کرتے ہوئے کہ آپ کی مزاج پرسی کو نہ آسکے۔ آپ کی خودداری نے گوارا نہ کیا کہ احباب کی عیادت کا احسان بھی نہ اٹھائیں۔ آپ تو چلے گئے لیکن ہم سب یہ شرمندگی کب تک برداشت کرتے رہیں۔ آپ سے بھی شرمندہ، اپنے آپ سے بھی شرمندہ!

اتوار، ۲۲ اکتوبر کی صبح بستر سے اٹھا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا: آپ کے سلیمان خطیب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جیسے کسی نے دل کو نچوڑ دیا ہو ——— خطیب صاحب، آپ اپنی منظومات میں بھی تو یہی کرتے تھے۔ تقریباً نصف نظم تک ہنساتے اور سامعین کو بے تحاشا قہقہے لگانے پر مجبور کرتے اور پھر لوگوں کو مغموم بنا دیتے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ——— اب بھی ایک عرصہ تک ہنساتے رہے۔ آپ تو اب بھی ہنس رہے ہوں گے۔ لیکن بھلا بتائیے، ہم کب تک روتے رہیں ——— گھر سے نکلا ہی تھا کہ حیرت بدایونی روڈ پر لوگس حیدرآباد ہی سے ملاقات ہوئی آپ کی زندگی کی آخری شام تھی، وہ آپ کی عیادت کے لیے دواخانہ پہنچے تھے۔ انھوں نے آپ کی آخری حالت کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ (کاش میں بھی آپ کی آخری حالت کا شاہد ہوتا) آپ ہی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ ان ہی سے نہیں، ان ایک دو، دنوں میں جن جن سے ملنا ہوا، ہر ایک غمزدہ ملا، آپ کا ذکر کرتا رہا۔ آپ کی عیادت کو نہ آنے کا افسوس سب کو تھا ہی، اس سے زیادہ افسوس اس امر کا تھا کہ ہم آپ کا دیدار نہ کرسکے۔ کیا کم نصیبی ہے! اہل حیدرآباد کو یہ حق ملنا چاہیے تھا۔

محترم عابد علی خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے آپ کی علالت اور مرض کے پیچیدہ صورت اختیار کر جانے کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور یہ بھی کہ ۲۳ اکتوبر کی اولین ساعتوں میں آپ کی میت (خطیب صاحب! کیا بتاؤں، یہاں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے دل پر کس قدر جبر کرنا پڑ رہا ہے) گلبرگہ شریف لے جائی گئی۔

واڑی جنکشن آچکا ہے۔ رائل سیما، واڑی سے گنتکل کی سمت روانہ ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ گلبرگہ کی سمت چلنے لگے، کاش ایسا ہوتا؛ گلبرگہ شریف تو یہاں سے بے حد قریب ہے۔ غالباً دوسرا ہی اسٹیشن، زیادہ سے زیادہ (۴۰) میل! آپ تو یہاں، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ گیسو درازؒ کے قدموں میں کہیں ابدی نیند لے رہے ہوں گے۔ گلبرگہ شریف اور حضرت خواجہ بندہ نواز سے آپ کی وابستگی کا میں بھی گواہ ہوں ——— میں اور خطیب صاحب ایک وقت درگاہ شریف کی زیارت کے لیے جا رہے تھے گنبد مبارک سے کچھ ہی دور تھے کہ قوالی کی آواز آئی۔ درگاہ شریف کے پاس کھلے حصے میں چند قوال، خطیب صاحب کی وہ نظم گا رہے تھے جس میں انھوں نے حضرت بندہ نوازؒ کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ خطیب صاحب نے میری طرف دیکھا، ان پر کچھ محویت کا عالم طاری ہو گیا ——— جیسے دور سے، بہت دور سے، نہیں، قریب سے، بے حد قریب سے، اپنے ہی دل کی گہرائیوں سے آواز آ رہی تھی۔

بندہ نواز تیری کشتی بھرانے آئیوں
کشتی بھرانے آئیوں، چھیلہ چڑھانے آئیوں
میں خالی ہاتھ آئی دربار میں تمارے
پلکاں سے جھاڑو دے کر، آنسو چڑھانے آئیوں
بندہ نواز تیری کشتی بھرانے آئیوں

چاندی کا پورا گنبد، کوئی بنالے تیرا
میں تو دیوانی تیری، اپنا بسانے آئیوں
تیری لگن میں خواجہ، خود آپ جل رہی ہوں
پھر بھی چراغ تیرے در پہ جلانے آئیوں
بندہ نواز تیری کشتی بھرانے آئیوں

اس موقع پر گلبرگہ شریف آنے سے قبل، میں نے یوں ہی، آپ کو ایک خط لکھا۔ آپ کا خط آیا اصرار کے ساتھ آپ نے تحریر کیا تھا۔ آپ کے ہاں یا نئی محل میں قیام کروں ــــــ میں اسٹیشن سے سیدھا، یانی محل پہنچا۔ آپ نے جس اپنائیت کے ساتھ پذیرائی کی، میں اس کو کبھی بھول نہیں سکوں گا۔ وہ میرے آرام کا ہر لحظہ خیال، وہ پُر تکلف دسترخوان، وہ ہر وقت اپنے بچوں کو تاکید کہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہو ــــــ نہ تو آپ کے دفتر کی مصروفیات میں کمی آئی نہ دیگر سماجی خدمات میں اس موقع پر تین، چار روز گلبرگہ شریف میں رہنا ہوا خطیب صاحب اپنے اسکوٹر پر مجھے ساتھ ساتھ لیے ہوتے۔ چاہے درگاہ شریف کی زیارت کے لیے جانا ہو، چاہے سجادہ صاحب قبلہ سے نیاز حاصل کرنے، بلدیہ کے دفاتر جانا ہو، یا کسی اور دفتر کو محض اپنے کسی کام کے لیے۔ بلقیس الفیاری سے ملنا ہو یا منیر پاشاہ صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ سے۔ اسکوٹر اس لیے استعمال کی جاتی ہے کہ کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے ہو لیکن خطیب صاحب کے وقت پر اسکوٹر کا کوئی اثر نہ پڑتا۔ کہیں سے کہیں جانا ہو، راستے میں چار چھ دفعہ، پر خطیب صاحب کو کوئی نہ کوئی روک لیتا۔ وہ ٹھہرتے اپنے لیے نہیں اوروں کے لیے، کوئی بے روزگار ہے، کوئی ترقی کا خواہاں ہے، کوئی تبادلہ چاہتا ہے۔ بلدیہ کے دفاتر میں کسی کے گھر یا جائداد کا کوئی مسئلہ ہے یا کسی اور دفتر میں کسی کا کوئی کام ــــــ ہر ایک خطیب صاحب کی سماجی حیثیت سے استفادہ کرنا چاہتا، اور خطیب صاحب کہ اُن کے مسائل اور شکایات کی شنوائی یوں کرتے جیسے خود ہی عہدہ دار متعلقہ ہوں اور ابھی احکام صادر کر دیں گے۔ متعلقہ فرد مطمئن ہو جاتا، گویا اس کی حاجت روا ہو چکی ہو۔ ایسی دل آسائی اسی شخص سے ممکن ہے جس کا اپنا دل بھی مطمئن ہو۔ اس کا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ اپنی شاعری کی وجہ ہی سے نہیں بلکہ لوگوں کے معاملات میں اپنے طور پر اعانت کے باعث بھی خطیب صاحب ان سب کے دلوں میں گھر کر چکے۔ ان کی رہائش پر بھی دو چار اہل غرض موجود ہوتے اور خطیب صاحب برآمدے میں بیٹھے اُن کی پریشانیاں سنتے اور خود بھی پریشان ہوتے ــــــ یوں وہ گلبرگہ کے عوام پر بے تاج کی حکمرانی کرتے رہے، وزراء اور اعلیٰ عہدیداروں سے اپنے مراسم کو انھوں نے اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے بہت زیادہ استعمال کیا۔ محمد علی صاحب، سابق وزیر ٹرانسپورٹ، ریاست کرناٹک سے خطیب صاحب کے بے حد گہرے مراسم تھے، اس کا اندازہ ہر کسی نے کیا ہوگا جو محمد علی صاحب اور خطیب صاحب کو قریب سے جانتا ہو، تھوڑا بہت اندازہ مجھے بھی ہوا۔ خطیب صاحب سے زیادہ محمد علی صاحب کو ناز تھا کہ وہ ان کا دوست ہے، گہرا دوست، شاعر! یہی نہیں اور کئی ارباب بست وکشاد ہوں گے جن سے خطیب صاحب کے توسط سے کئی ایک نے استفادہ کیا ہوگا۔ خطیب صاحب کا لوگوں سے غمخواری، ہمدردی، دلنوازی اور اپنائیت کا یہی رویہ تھا کہ لوگ ان کو اپنا سمجھتے، اپنا قریب ترین عزیز، اپنا بھائی! اور خطیب صاحب تھے کہ ہر کسی کے لیے بچھے بچھے جاتے۔ نہ اپنی صحت کا خیال رکھتے نہ اپنی مصروفیات کا۔ اپنے اہل و عیال

کے بارے میں بھی، میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے غیر معمولی دلچسپی لی ہو جیسا کہ عام دنیا داروں کا رویہ ہوتا ہے۔

میں، اس موقع پر گلبرگہ شریف سے حیدرآباد واپس ہو رہا تھا۔ تین چار روز تک خطیب صاحب کی مصروفیات میں مخل رہا۔ وہ لگ بھگ ہر وقت میرے ساتھ ہوتے۔ مجھے اس کا احساس تھا لیکن کیا کرتا۔ کہنے کے باوجود بھی خطیب صاحب خود کو میرے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ حیدرآباد بس سے آنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ خطیب صاحب کو بس اسٹانڈ تک زحمت نہ دوں۔ بھلا وہ کہاں مانتے۔ اپنے اسکوٹر ہی پر انھوں نے بس اسٹانڈ پر چھوڑا۔ گھر سے کھانا کر نکلے تھے۔ پھر بھی قریب ہی کسی ہوٹل میں چائے پی اور بس جب تک روانہ نہیں ہوئی وہ ٹھہرے رہے۔

شاعر کی حیثیت سے دنیائے شعر و ادب میں خطیب صاحب کا جو بھی مقام ہو بہت کم شاعرے ایسے ہوں گے جن کو انھوں نے لوٹ نہ لیا ہو۔ ان کی مخصوص وضع قطع، مائیک کے سامنے آنے کا اُن کا اپنا انداز، چند لمحے یوں ہی کھڑے رہنا، گویا سامعین کا مطالعہ کر رہے ہوں یا شعر فی البدیہہ کہنے والے ہوں۔ نظم سنانے سے قبل، دو ایک چلتے چلانے جملے، سامعین کی فقرہ بازی کا تیر بہ ہدف جواب، نظم کے مفہوم سے ہم آہنگ اُن کا لب و لہجہ ——— آپ کہیں گے یہ ساری چیزیں شاعری نہیں، میں بھی مانتا ہوں لیکن بہت سے شاعروں کی شاعروں میں مقبولیت میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے اور خطیب صاحب، جیسا کہ ان کے کلام کا معتد حصہ دکنی اردو میں ہوتا اور ان کی بیشتر منظومات ڈرامائی نوعیت کی حامل ہوتیں، ان کے لیے شاعروں میں یہ ساری چیزیں کچھ ضروری سی تھیں، لوازمات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ خطیب صاحب ان کا پورا پورا لحاظ رکھتے، ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔

دکنی، اِدھر جنوبی ہند میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہی سہی لیکن خطیب صاحب کے کلام کو ملک گیر مقبولیت حاصل تھی۔ وہ ملک کے ہر علاقے کے شاعرے میں مدعو کیے جاتے تھے اور بعض اوقات بیک وقت! اُن کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کو سوچنا پڑتا کہاں جائیں اور کہاں نہیں۔ ظاہر ہے اس کے لیے انھوں نے چند اصول وضع کر لیے تھے۔ ایسا ضروری بھی تھا۔ جب بھی ملاقات ہوتی وہ اپنے شاعروں کا حال سناتے۔ مزے لیتے ہوئے، جھومتے اور ٹھیکتے ہوئے ان کو ناز تھا کہ دکن ہی نہیں، کشمیر، پٹنہ، بمبئی، پونے اور شمالی ہند کے کئی علاقوں میں ان کی شاعری یکساں مقبول تھی۔

میں نے انھیں حیدرآباد ہی کے نہیں ادھر جنوب کے کئی شاعروں میں دیکھا ہے۔ آمبور اور چنامنی وغیرہ میں۔ ہر جگہ وہی حاصل مشاعرہ ہوتے لیکن خطیب صاحب کی مقبولیت کا اندازہ مجھے ایک اور واقعہ سے بھی ہوا۔ گلبرگہ شریف میں ایک روز صبح کے وقت محترم منیر پاشاہ صاحب کے مکان پر ہم سب یعنی میں، منیر پاشاہ صاحب ان کی اہلیہ، بچے، خطیب صاحب اور دو ایک افراد بیٹھے باتیں کر رہے تھے میں چاہتا تھا کہ خطیب صاحب اپنا سنجیدہ کلام سنائیں۔ وہ سنائے بھی۔ لیکن رنگِ محفل کچھ اور چاہتا تھا۔ خطیب صاحب کے عام انداز کی نظموں کی فرمائش کی جانے لگی، وہ سنانے لگے۔ اتنے میں گھر کے دو ایک ملازمین، ماما وغیرہ دروازے کے قریب آ کر سننے لگے۔ صاحبِ خانہ یا اُن کی اہلیہ کسی نے کچھ دیر بعد ماما سے کسی کام کے لیے کہا لیکن وہ خطیب صاحب کو سننے میں محو رہی۔ ایک دو بار یہی ہوتا رہا۔ جب ماما متوجہ ہوئی تو اس کا تاثر کچھ ایسا تھا۔ گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہو۔ واہ اتنا اچھا کلام ہو رہا ہے اور ہم ذوق و شوق سے سن رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ یوں مداخلت کر دی گئی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ خطیب صاحب معاشرے کے کمزور اور پست طبقات کے جذبات کی ترجمانی اور

اپنی کی زبان میں کچھ ایسی عمدگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ کرتے کہ ان طبقات کے افراد کے دلوں میں اُن کی جگہ بن چکی تھی وہ دکنی ہی کے نہیں، دکنیوں کے بھی محبوب شاعر تھے۔

سنجیدہ شاعری کے ذکر پر یاد آیا۔ خطیب صاحب کو لوگ عام طور پر دکنی اردو کے مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر بھی ان کا انداز بڑا معتبر تھا۔ دکنی مزاحیہ شاعری سے قبل وہ اس طور اور اس رنگ کی شاعری کر چکے تھے اور اب بھی کبھی کبھی ان سے ایسے اشعار ہو ہی جاتے تھے۔ خطیب صاحب کی شاعری کے اس رنگ سے اُن کے قریبی احباب اور ایک محدود حلقہ کے علاوہ بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ اُن کے اس رنگ کی شاعری میں بھی طرحداری تھی، ایک آن بان، لطافت، ندرت اور نکھار! جس شاعر سے آپ نے "ساس بہو" "پہلی تاریخ" "یتیم کے پیٹے"، اور "ٹیڈی بوائے" جیسی منظومات کی سماعت کی ہو آیا آپ اس سے اس قسم کی منظومات اور ایسے اشعار کی توقع رکھ سکتے ہیں گلبرگہ شریف ہی میں خطیب صاحب سے سُنے گئے اُن کے یہ اشعار آج بے طرح یاد آتے ہیں۔ کتنے خوبصورت شعر ہیں ـــــ

میں ظلمتوں کا دشمن، ماہِ تمام جیسے ؛ لڑتا ہوں ہر بدی سے، ان میں امام جیسے
کس سے کہوں میں دل کی اب کون بات سنے گا ؛ جھوٹوں میں یوں گھرا ہوں لنکا میں رام جیسے
ہر تیغ پر، تبر پر، زندان پہ نام میرا ؛ قاتل کو یاد ہے بس میرا ہی نام جیسے
ہر نبض ڈوبی ڈوبی، ہر شئے بجھی بجھی سی ؛ دن ڈھلے آگئی ہے مقتل کی شام جیسے

اس روز خطیب صاحب نے اس رنگ کی چند اور غزلیں اور اشعار سنائے۔ وہ ایسے اشعار کبھی کبھی کہہ لیتے ہوں لیکن عام شاعروں میں، میں نے انھیں ایسے اشعار سناتے کبھی نہیں پایا۔ ممکن ہے اس طرح اُن کی مقبولیت متاثر ہو جاتی لیکن مرتبت میں بلاشبہ اضافہ ہوتا۔ ہمارے بیشتر شاعروں کا رویہ یہی ہے۔ وہ اپنی مقبولیت اور خاص طور پر مشاعروں میں مقبولیت کی خاطر ایک خاص طرح کی شاعری کرتے اور اپنی شاعرانہ اور ادبی مرتبت کی قربانی کر جاتے ہیں۔

نصف شب بیت چکی ہے۔ ڈیڑھ، دو کا عمل ہے۔ گنتکل جنکشن آچکا ہے۔ یہاں ٹرین نسبتاً زیادہ دیر ٹھہرے گی میں اپنی برتھ پر لیٹا ہوا ہوں۔ ریلوے انجنوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ اسٹیشن پر ٹرینیں آتی جاتی محسوس ہوتی ہیں۔ پلیٹ فارم پر ویسے کچھ زیادہ گڑبڑ نہیں لیکن میرا ذہن تو بالکل خالی ہے، کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کچھ ہی دیر میں ٹرین چل پڑتی ہے اور خیالات کا سلسلہ بھی خطیب صاحب پھر آپ ہی کا خیال ہے۔ آپ کی باغ و بہار شخصیت کا۔ آپ کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا۔ لطیفے تو آپ گھڑ لیا کرتے تھے۔ کسی نہ کسی شخصیت کو نشانہ بنانا اور اس سے کسی نہ کسی لطیفے کو منسوب کر دینا آپ کے لیے بات ہی کیا تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک ہفت روزہ اخبار کے مدیر، جو بدلتے فیشنوں کے ساتھ بدلتے جا رہے تھے (اور اب بھی بدلتے ہیں)ـــ کبھی بال بڑھا لیتے، کبھی خط، کبھی مونچھ، کبھی داڑھی، کبھی ان کا عجیب کٹ ہیلوں تو کبھی ان کا مجموعہ روزگار بیلٹ ـــ غرض اُن کی ہیئت بدلتی ہوتی اور وہ ہر وقت ایک نئی ہیئت میں ہوتے ـــ ایک مرتبہ میں اور آپ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ موصوف آگئے۔ نئی ہیئت میں۔ چند ثانیوں کے لیے آپ نے توقف کیا اور کہنے لگے: "بھئی تم اپنے ساتھ IDENTY CARD رکھا کرو کہ ہم کو فوراً پہچاننے میں آسانی ہو" ـــ اور پھر وہ صاحب اکثر آپ کے بلیغ طنز اور لطیفوں کا شکار ہوتے جو ہر نئے موسم میں کسی نئے

معشوق کی چاہت میں جانے کتنی شادیاں کر چکے تھے اور کرنے والے ہیں ـــــ یہاں بھی خطیب صاحب کا مقصد اُن صاحب کی تضحیک نہیں، معاشرے کی بے بسی کی طرف توجہ دلانا تھا۔ خطیب صاحب کی منظومات "چھورا چھوری" "ساتپ" "پہلی تاریخ" "شامت ہو" اور "مجبوب صاحب اور محبوب بی" کی روشنی میں سوچیے تو اندازہ ہوگا کہ خطیب صاحب معاشرے کی اس بے چارگی کو اُجاگر کرنا چاہتے تھے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ اپنی بہن اپنی بیٹی کو اُن کے پلّے باندھنا گوارا کر لیتے تھے کہ اُن کے نزدیک اپنی بہن یا بیٹی کا مستقبل نہیں تھا۔ اقدار کا افلاس اور ان کی خستگی اس سے فزوں کیا ہوگی؟ یہ خطیب صاحب کی شخصیت کا بھی خاصہ تھا اور اُن کی شاعری کا بھی۔ یہ معاشرے کی دکھتی رگوں پر اُن کی انگلیاں تھیں کہنے کو تو وہ ہنساتے تھے اور مزاحیہ شاعروں کی کامیابی کا سہرا اُن کے سر ہوتا تھا لیکن درحقیقت وہ معاشرے کی صحیح تصویر پیش کرتے ہوئے لوگوں کے احساسات کو بیدار کرنا، اُن کو غیرت دلانا اور لڑکھڑاتے پیکروں، ٹوٹتے ہیروں، لرزتی آوازوں اور حسین روحوں کی جانب اُن کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ ظرافت تو خطیب صاحب کے لیے بس ایک نقاب تھی اور انھوں نے اس نقاب سے خوب خوب کام لیا۔ سنجیدہ شاعری کے اُن کے موضوعات کچھ اور ہوتے لیکن جن موضوعات اور مسائل پر انھوں نے مزاحیہ انداز میں توجہ دلائی یہ وہاں ممکن نہ تھا۔ خطیب صاحب صرف مزاحیہ شاعر ہی نہیں تھے، اُن کے پیش نظر ایک مقصد بھی تھا، اپنے ماحول کی صلاح، فلاح کا مقصد!

خطیب صاحب کو میں نے ہمیشہ مسرور اور مطمئن پایا۔ گلبرگہ شریف میں "جشنِ سلیمان خطیب" تھا۔ خطیب صاحب کی ایما پر مقالہ پڑھنے کے لیے میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ خطیب صاحب اس موقع پر بے حد شاداب اور شادماں تھے۔ ہم سب کی میزبانی تو ایک کمیٹی تھی لیکن منیر پاشاہ صاحب نے مجھے اپنی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا شرف عطا کیا اور مجھے اپنے ہمراہ لے گئے۔ خطیب صاحب کو مہمانوں کی فکر تھی، یہ سب اُن کے اپنے مہمانوں جیسے تھے۔ اس بات کا وہ بہرکیف خیال رکھتے کہ کسی کو کہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ میں دوسرے روز واپس ہوا لیکن انھیں آخری وقت تک جشن کے مہمانوں کے لیے متردد پایا۔ (بس خطیب صاحب ایسے ہی مواقع پر متردد ہوا کرتے تھے) انتظامات خوب تھے تاہم خطیب صاحب کو افسوس تھا کہ وہ جیسا چاہتے تھے ویسا انتظام نہ ہو سکا۔ "جشن سلیمان خطیب"، خطیب صاحب کے شایانِ شان تو نہیں تھا لیکن اس زاویے سے غنیمت تھا کہ خطیب صاحب کی حیات ہی میں انھیں پہچاننے کی کوشش کی گئی۔ "کیوڑے کا بن" کی اشاعت اسی موقع پر عمل میں آئی۔ یہ "دھنک" سے ضخیم سہی لیکن خطیب صاحب کی شاعری کا محض انتخاب ہے۔ گلبرگہ یا حیدرآباد، کہیں سے خطیب صاحب کی شاعری کا مجموعہ شائع ہونا چاہیے ایسے وقت جب کہ دکنی کی ادبی حیثیت برائے نام ہو چکی ہے۔ اس کی اشاعت گراں قدر ہوگی ـــــ

چھ بجنے والے ہیں، ٹرین کٹڑپا اسٹیشن پر پہنچ چکی ہے، کئی لوگ اتر چکے ہیں، صبح ہونے والی ہے، ہو رہی ہے۔ یہاں سے تروپتی صرف ڈھائی گھنٹہ کا راستہ ہے، سوچا تھا ایسے ہی کسی علاقے کے مشاعرے میں خطیب صاحب آئیں تو کبھی انھیں اپنے ہمراہ تروپتی لے جاؤں گا، تروپتی جیسے علاقے میں مشاعرے کی فضا تو خیر کیا پیدا ہوتی اور نہ میں مشاعرے کے انعقاد کی کوئی نیت رکھتا تھا۔ بس چاہتا تھا کہ ایک دو روز خطیب صاحب کا ساتھ رہے، لیکن کس انسان کی ایسی ساری خواہش پوری ہوئی ہیں اور خود میری بھی ـــــ جیاں چہ یہ خواہش بھی دل ہی دل میں رہی لیکن جب بھی خطیب صاحب سے ملنا ہوتا وہ بہت کھل کر ملتے۔ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اُن سے عرصے کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے

(باقی صفحہ پر)

ڈاکٹر احسن رضوی

خون آلودہ ہوئے پاؤں کے تلوے کتنے
اب کے موسم میں اُگے راہ میں کانٹے کتنے

میں کڑی دھوپ کا راہی تھا ٹھہرتا کیسے
گو کہ رستے میں ملے زلف کے سائے کتنے

کچی نیندوں سے جگایا گیا مجھ کو اکثر
میری آنکھوں میں رہے خواب ادھورے کتنے

اب تو غیروں سے مراسم ہی مجھے راس آئیں
کام آتے ہیں مرے خون کے رشتے کتنے

رات ماضی کے دریچوں سے ہوا آئی تھی
دل کی دیوار پہ لرزاں رہے سائے کتنے

آج اک عمر گذر جانے پہ یہ سوچتا ہوں
میں نے پورے کئے جیون کے تقاضے کتنے

دیکھنا تھا جو نہیں دیکھ سکا آج تلک
گو کہ نظروں سے ہٹائے گئے پردے کتنے

غیاث متین

خواب آنکھوں کی گلی چھوڑ کے جانے نکلے
ہم ادھر نیند کی دیوار گرانے نکلے

آسماں جس کی زمیں ہے وہ پرندہ ہوں میں
جانے کیوں لوگ یہاں دام بچھانے نکلے

رنگ سے رنگ جدا ہونے کا منظر دیکھا
تیرگی اور شفق صرف بہانے نکلے

جب سمندر پہ چلے ہم تو یہ صحرا چپ تھے
اب پہاڑی پہ کھڑے ہیں تو بلانے نکلے

جب پہاڑوں سے ملی داد ہنر کی اپنے
داستاں ہم بھی سمندر کو سنانے نکلے

کوئی چہرہ نہ دے آواز کسی لو سے متینؔ
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھانے نکلے

●

کوئی صورت آشنا ملتا نہیں ہے کیا کریں
چلتے چلتے بھیڑ میں کھو جائیں اب ایسا کریں

دیکھنا باہر کوئی سائل کھڑا ہے دیر سے
یہ مکاں خالی ہے کہہ دیں اور اسے چلتا کریں

پہلے خود کو اک پہاڑی سے گرالیں اس کے بعد
نیچے آکر لاش کا اپنی ہی نظارہ کریں

خود تعاقب میں رہیں اپنے تو پھر کچھ غم نہیں
یہ زمیں پیچھا کرے یا آسماں پیچھا کریں

اپنے خاکے میں خود اپنا رنگ بھرنے کو متینؔ
آؤ خود کو اب سرِ بازار ہم رسوا کریں

○

ڈاکٹر ابوالفضل سید محمود قادری

فی الحال کرنولی —— ایک دکنی شاعر

حضرت فی الحال دکن میں بارھویں صدی ہجری کے ایک باکمال اور صاحب طرز شاعر گذرے ہیں۔ اُردو ادب کے محققین اور تذکرہ نگار حضرات نے ان کے بارے میں مختلف اور متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ "تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اُردو جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ ——

"فی الحال تخلص کے کوئی صوفی بزرگ غالباً میسور کے علاقے میں گذرے ہیں، جو کسی اور بزرگ سید قدرت اللہ قادری کے خلیفہ اور مرید تھے، چناں چہ ان کے دیوان کی اکثر غزلوں کے مقطعوں میں، ان قدرت اللہ عارف باللہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض بعض جگہ شعر تقطیع سے گر بھی گئے ہیں۔ پورا دیوان معمولی نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے اور غالباً یہ نسخہ ۱۲۶۳ ہجری میں مقالۂ پارسی کے ساتھ لکھا گیا" ایک اور جگہ "مقالۂ پارسی" کے بارے میں ڈاکٹر زورؔ نے تحریر فرمایا ہے کہ ——

"مقالۂ پارسی مصنفۂ محمد سعید ہمند المتخلص بہ تمنؔد قواعد فارسی کا یہ رسالہ معمولی نستعلیق خط میں ۱۲۶۳ ہجری میں نقل کیا گیا۔ یہ نسخہ اور اس کے ساتھ چند اور قلمی اور مطبوعہ کتب، محمد آپا سیٹھ صاحب میسور کی عطبہ ہیں۔"

شاید ان خارجی شواہد کی بنا پر ڈاکٹر زورؔ نے حضرت فی الحال کو میسور کے علاقے کا شاعر قرار دیا۔ ڈاکٹر زورؔ کے تسامح کی ایک اور وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت فی الحال کا دیوان انھیں ایک ایسے صاحب سے دستیاب ہوا جن کا تعلق میسور سے تھا۔

جناب نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ۔

"جنگی نامہ اور شادی نامہ کے مصنف غوثی، تاریخ تصنیف مابعد ۱۱۰۰ ہجری۔

"اُن تصانیف کے مصنف کا نام غوثیؔ، معلوم ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید قدرت اللہ ان کے مرشد تھے، لیکن تذکرۂ اولیائے دکن میں کسی قدرت اللہ کا ذکر نہیں۔"

جناب نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کی داخلی شہادتوں کے باوجود بھی شاید سہو نظری کی وجہ سے اس کے مصنف کا نام غوثیؔ قرار دے دیا اور یہ بھی کہ انھوں نے "چکی نامہ" اور "غوثی نامہ" کو دو الگ الگ تصانیف سمجھ لیا، جب کہ خود حضرت فی الحال نے اپنی اس مثنوی "چکی نامہ" کا ایک اور نام "غوثی نامہ" تحریر کیا ہے، اور خود مصنف نے اس بات کی صاف وضاحت بھی کر دی ہے کہ یہ دو الگ الگ مثنویاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی مثنوی کے دو نام ہیں اور اس مثنوی کے اختتام پر یہ شعر موجود ہیں جن میں شاعر کا تخلص بھی واضح ہے کہ ؎

فی الحال صاحب قادری، غلام ہو کر آیا
کامل پیر کے کونشیاں، سر پو آنچے لایا
قدرت اللہ کامل، پیر مرشد میرا
وحدت کے پھولاں کا، جس کے ہے سر سہرا

اسی طرح حضرت فی الحال کی ایک اور مثنوی "شادی نامہ" کے اختتام پر بھی شاعر کے تخلص فی الحال کا صاف پتہ چلتا ہے اور حسن اتفاق سے اس دوسری مثنوی کا بھی ایک مخطوطہ کتب خانۂ سالار جنگ میں موجود ہے، ان وضاحتوں کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مصنف کا تخلص بجائے فی الحال کے، غوثیؔ قرار دیا جائے۔

جناب سید غوث محی الدین رضوی شرفی، مولف "شرف الانساب" حضرت فی الحال کے بارے میں اپنی اس تالیف میں یوں تحریر فرماتے ہیں ؎

"غلام عبد القادر عرف فی الحال شاہ فاروقی قادری کرنولی کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید الدین فاروقی گنج شکر سے مل کر، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پہنچتا ہے۔"

"شرف الانساب" کی تالیف ۱۳۳۲ھ ہجری میں ہوئی، جو ایک طرح سے حال کا زمانہ ہے۔ اس کے مولف کا نظر سے شاید تاریخ اولیائے کرنول اور بیجاپور کے اولیائے کرام کے حالات نہیں گذرے، دوسرے یہ کہ خود سید غوث محی الدین رضوی شرفی کا وطن مالوف کرنول رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مسلم ہے کہ حضرت فی الحال کرنول کی کوئی گمنام اور غیر معروف شخصیت نہیں رہے۔ ان کا خاندان آج بھی کرنول کے باوقار سادات میں گنا جاتا۔

مولف شرف الانساب کی غلط فہمی کی ایک وجہ شاید حضرت فی الحال کی اُس دور کے ایک صوفی بزرگ حضرت نور الدین چشتی بیجاپوری سے بیعت و ارادت، اُن کے ہاں سکونت و قیام اور کچھ عرصہ تک اپنے والد کے ترک وطن کے بعد بھی بیجاپور میں فروکشی ہو سکتی ہے۔ حضرت نور الدین چشتی کا سلسلۂ نسب ضرور حضرت شیخ فرید گنج شکر فاروقی سے ملتا جب کہ حضرت فی الحال کا سلسلۂ نسب بیجاپور کے سادات سے ملتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معـ

ہوتی ہے کہ حضرت فی الحال اپنے خاندانی سلسلۂ قادریہ میں بیعت و خلافت رکھنے کے باوجود حضرت نورالدین چشتی رحمۃ اللہ کے سلسلۂ چشتیہ سے بھی منسلک ہو گئے تھے اور شاید اس کی وجہ سے بات اس حد تک پیچیدہ ہو گئی کہ مؤلف "شرف الانساب" نے سلسلۂ ارادت کو سلسلۂ نسب قرار دے دیا۔

حضرت فی الحال کا نام سید شاہ عبدالقادر قادری ہے، اور یہ حسنی سادات سے ہیں۔ ان کا خاندان بارہویں صدی ہجری سے آج تک کرنول میں موجود اور آباد ہے۔ حضرت فی الحال کے والد بزرگوار اور پیر طریقت حضرت سید شاہ قدرت اللہ قادری المعروف بہ کنگال شاہ کا شمار کرنول کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے، ان کا مزار کرنول کے شمال مغرب میں سات میل کے فاصلہ پر دریائے تنگبھدرا کے کنارے موضع "بام پور" میں واقع ہے جو آج بھی مرجع خلائق ہے اور جن کا سالانہ عرس بڑے اہتمام سے ۲ جمادی الثانی کو ہوتا ہے۔

حضرت سید شاہ قدرت اللہ قادریؒ کنکال میں پیدا ہوئے، یہ مقام بیجاپور سے چودہ ۱۴ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب و ارادت حضرت سید شاہ ظہیرالدین قادری بیجاپوری سے ملتا ہے۔ یہ ایک صاحب عرفان بزرگ تھے اور بیجاپور کے صوفی بزرگ حضرت سید شاہ امین الدین اعلیٰ کے ہم عصر بھی تھے۔ سید شاہ قدرت اللہ قادری کو اپنے سلسلۂ قادریہ کے علاوہ چشتیہ سلسلے میں بھی بیجاپور ہی کے ایک صوفی بزرگ حضرت نورالدین چشتی سے بیعت و خلافت حاصل تھی۔ حضرت کنگال شاہ اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد ترک وطن کر کے تنہا کنکال سے وارد کرنول ہوئے اور موضع بام پور میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنے روحانی اور باطنی فیوض سے اہل کرنول کو فیض یاب فرماتے رہے۔ انھوں نے ۱۱۸۰ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ کتبۂ مزار سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے:

قدرت اللہ قادری رحلت نمود ؛ عرف او کنگال شاہ مشہور بود
عارف حق واقف عین الیقیں ؛ کاشف اسرار آں رب الودود
سال فوتش صوری و معنوی از حساب ؛ سن ہزار یکصد بجو ہشتاد بود

حضرت سید شاہ عبدالقادر قادری فی الحال بھی کنکال، بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ سلطان سکندر عادل شاہ بیجاپور پر حکمراں تھا، اور یہ کم و بیش وہی دور ہے جب کہ گولکنڈہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ مسند آرائے سریر حکومت تھا۔ جب ان کے والد بزرگوار نے اشاعت و تبلیغ دین مبین کی خاطر ترک وطن فرمایا تو یہ اپنے چشتیہ پیر طریقت حضرت نورالدین چشتی کے ہاں کچھ عرصہ ٹھہر گئے، اور بعد کو اپنے والد کی ایما پر کرنول چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اپنے خاندانی سلسلۂ رشد و ہدایت اور تعلیم و تعلّم کو باقی رکھا۔ اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے سلسلۂ بیعت کے فیضان کو جاری رہنے دیا۔ حضرت فی الحال کا انتقال ۱۲۱۲ ہجری میں، کرنول میں ہوا۔ ان کا مزار اپنے والد کے مزار سے پانچ میل کے فاصلہ پر کرنول کے شمال مغرب ہی میں، دریائے تنگبھدرا کے کنارے، ماں صاحبہ مسجد کے قریب واقع ہے۔ ان کا سالانہ عرس ۱۰ شوال کو ہوتا ہے۔

حضرت فی الحال ایک بلند مرتبہ صوفی اور صاحب طرز شاعر گذرے ہیں۔ ہمیں ان کے دو دیوان دستیاب ہوئے ہیں،

جن میں ایک فارسی ہے اور دوسرا اردو، جو ان کے صوفیانہ اور مذہبی اندازِ فکر کے ترجمان ہیں۔ ان کی چار مثنویاں بھی ملتی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ چکّی نامہ یا غوثی نامہ۔
۲۔ شادی نامہ۔
۳۔ بیت نامہ۔
۴۔ ارشاد نامہ۔

ان کے علاوہ مخمس کے طرز میں ایک طویل نظم جو اٹھارہ بند پر مشتمل ہے ہر بند کے تین مصرعوں کے بعد اس شعر کی تکرار ہوئی ہے

جاگیو جاگتا بھلا ہے گا ٭ جاگتے سے، خدا ملا ہے گا

حضرت فی الحال کی تصانیف کے قلمی نسخے کرنول میں ان کے خاندانی کتب خانے میں محفوظ حالت میں موجود ہیں، اس کے علاوہ کتب خانۂ سالار جنگ، ادارۂ ادبیات اردو، اور کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ میں بھی ان کے نسخے موجود ہیں۔

حضرت فی الحال اپنے والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھے۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ انھیں بھی ایک ہی نرینہ اولاد تھی جن کا نام سیدشاہ قدرت اللہ قادری ثانی تھا۔ یہ بھی ایک خوش گو صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ ان کا تخلص فی الفور تھا۔ ہمیں ان کے ایک دیوان کے علاوہ ایک مثنوی "چھو چھو نامہ" بھی ملتی ہے، جو تصوف کے موضوع پر ہے۔ ان کا مزار حیدرآباد کے محلہ حسینی علم میں بھونرے کی کھڑکی کے قریب موجود ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے سلسلے میں بہت سے ایسے شعرا ملتے ہیں جو نسلاً بعد نسل علم و ادب کی بھی خدمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت فی الفور کے ایک فرزند سید شاہ عطاء اللہ قادری تھے جو عطاؔ تخلص کرتے تھے۔ ہمیں ان کا بھی ایک دیوان دستیاب ہوتا ہے۔

غرض اس خاندان کے سارے شعرا کا کلام اور ان کی تصانیف کے قلمی نسخے اس خاندان کا ادبی ورثہ ہیں۔ اب یہ کام نہ صرف اس خاندان کا ہے بلکہ ان حضرات کا بھی ہے جو اردو زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہیں کہ دورِ قدیم کے ان شعرا پر ریسرچ کریں اور ان کی علمی اور ادبی کارناموں کو بعد تحقیق شائع کریں تاکہ دکنی زبان کے یہ شہ پارے اپنا صحیح ادبی مقام حاصل کرلیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۲ سے آگے)

اور افراد ہوں کہ ادارے، سب کے بارے میں اپنی آراء کا دو ٹوک اظہار کرتے، دوست احباب کو یاد کرتے اور اُن کے واقعات سناتے رہتے۔ خاص طور پر اُن احباب کو جن کا نام لفظ "سلیمان" سے شروع ہوتے ہیں جیسا کہ سلیمان اریب مرحوم اور سلیمان سکندر صاحب کا ذکر ضرور رہتا ـــــ مزاج کی شگفتگی اور شادابی ساتھ یہ چھوٹی، لطیفے سناتے، خوب سناتے۔ لیکن ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے بعد اپنے احباب کو، عزیزوں کو، چاہنے والوں کو، پرستاروں کو آزردگی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیتے، رُلاتے رہتے ہیں۔ خطیب صاحب نے بھی یہی کیا اور یہی کریں گے۔ اُن کو گلبرگہ روئے گا، حیدرآباد روئے گا، گلبرگہ اور حیدرآباد ہی کیا اور ہر وہ شخص جو دکن، دکنی اور دکنی تہذیب کا پرستار ہے، خطیب صاحب دکن کے دیوانے تھے، دکنی زبان اور تہذیب کی آبرو تھے۔

اوج یعقوبی

اس قدر رات گئے کون گھر آیا ہو گا
مجھ کو شاید اپنا ہی سایہ نظر آیا ہو گا

دلِ ویراں میں یہ خوشبو کی لپٹیں کیسی؟
ہو نہ ہو کوئی یقیناً اِدھر آیا ہو گا

سننے کے بھی کہیں نقشِ قدم ہوتے ہیں
آنکھ ملتے ہی وہ دل میں اُتر آیا ہو گا

سلسلہ آپ کے غم سے نہیں چشمِ نم کا
یادِ ماضی کا کوئی زخم اُبھر آیا ہو گا

روشنی رینگتی ہے یادوں کے تہہ خانے میں
پھر کرن چہرہ کوئی بام پہ آیا ہو گا

تیز ہے شمعِ تبسم کی جو لو آخرِ شب
کوششِ ضبط میں جی اور بھر آیا ہو گا

صبر کر روحِ تغزل کہ تری دنیا میں
اوج جیسا نہ کوئی بے ہنر آیا ہو گا

غزلیں

...مہجور

...ہم کی منزل ہے یا خواب کی وادی ہے
...آشنا لہجے نے پھر دل کو صدا دی ہے
...لمہ نہیں بن جاتی یوں ہی کوئی چنگاری
...ہے کہیں تم نے آنچل کی ہوا دی ہے
...خواب سے بوسے تھے آنکھوں کے جزیروں میں
...ٹی ہوئی نیندوں نے وہ فصل جلا دی ہے
...ڈھونگ سی لگتی ہے آپس کی پذیرائی
...ت نے بہت سوں کو جینے کی سزا دی ہے
...دل سے وفا کرنا، چہروں سے دغا کرنا
...پہلی ہی دھڑکن سے اس کھیل کا عادی ہے
...نے بھی جلا ڈالے کچھ عطر میں ڈوبے خط
...و یہ مری اس نے کمرے سے ہٹا دی ہے

صاحب حیدرآبادی

گھٹن کے دور سے باہر نکل تو سکتے ہیں
ہم اپنا راستہ خود بھی بدل تو سکتے ہیں

غموں کی بھیڑ سہی، ہم بہل تو سکتے ہیں
وہ اجنبی کی طرح ساتھ چل تو سکتے ہیں

لرزتے جسم ہمارے یہ لڑکھڑاتے قدم
سہارا آپ کا پا کر سنبھل تو سکتے ہیں

یہ مانتا ہوں کہ سوکھے درخت ہیں ہم لوگ
تمہارے لمس کے جادو سے پھل تو سکتے ہیں

خراب لاکھ ہو قسمت بڑی ہزار سہی
جب آپ چاہیں گے اس کو بدل تو سکتے ہیں

جو پھول تھے وہ گلستاں کے خار ہیں لیکن
عدو کے سینے میں ہر وقت کھل تو سکتے ہیں

ہوا کے رُخ کو بدلنا محال ہے صاحب
وگرنہ ساتھ زمانہ کے چل تو سکتے ہیں

[illegible]
فاطمہ مجید

بے گھر

وہ پہلے ہی سے آکر اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی، دیر ہو چکی تھی مجھے۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک دلآویز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔ مجھے اچھا لگا۔ انتظار کرنے کی عادت کے باوجود انتظار کرتے ہوئے اس کے چہرے پر جو اوب جھلکی ہوتی ہے اس کے چہرے پر بھی تھی، لیکن اس چھوٹی سی ہنسی نے اس اوب کو کافی حد تک کاٹ دیا۔ اس کے نزدیک کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری نظر سامنے رکھی پیالی پر گئی۔ چائے۔ اس کی بڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"آج کافی دیر کر آئے!"

"ہاں، ایک جگہ پھنس گیا تھا۔ تمہارے لیے ایک چائے۔ اور منگواؤں۔ یہ تو پینے کے لائق رہی نہیں ہوگی۔"

"نہیں، تم اپنے لیے منگا لو، مجھے پینے کی خواہش نہیں [illegible] یہی ٹھنڈی کو ہی پی لوں گی۔"

"تم شاید بہت پہلے ہی آ گئی تھیں؟"

"ہاں!... کچھ خاص نہیں!.... اور اب تو عادت ہو گئی ہے چپ چاپ اکیلے بھی یہاں بیٹھ لیتی ہوں۔"

"ہاں! ایک زمانے سے ہم لوگ آ رہے ہیں نا۔ . . پھر یہ رہے تو ہمیں اچھی طرح پہچاننے لگے ہیں۔"

"ہاں، چار سال ہو گئے یہاں آتے۔ کبھی ایک ہی مقام پر [illegible] زندگی [illegible]..."

"نہیں" یہ بات نہیں ہے [illegible] ہم لوگ دوسری جگہ بھی تو بیٹھتے ہی ہیں۔ [illegible] یہاں کی بات ہی کچھ اور ہے!"

"اطمینان بخش ہے، بس [illegible] ہے!... پھر کب تک؟"

اس کا سوال اچھل کر میرے [illegible] جب [illegible] مجھے [illegible] پڑا [illegible] اس [illegible] کچھ دن کی اور بات ہے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا، مگر [illegible] ہوں۔ انجانی بات کی بے معنویت کا احساس ہے۔

وہ سامنے رکھی ٹھنڈی [illegible] دیکھا تو اس نے زیادہ دیر تک دیکھ نہیں پایا۔ کبھی اس کے چہرے پر سے نظر [illegible]

"نا"

چہرے پر [illegible] نہیں [illegible] یاد کیجیے [illegible] اس ریستوران

میں اب دیکھنے لائق کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ چار سال! ہم اس وقت آتے ہیں اور اکثر یہ ٹیبل ہمیں خالی ہی مل جاتی ہے، بیرہ آتا ہے مسکراتا ہے۔ چائے ساب؟ اور بغیر ہاں نا کے کسی جواب کا انتظار کیے ہی وہ دو کپ چائے لاکر سامنے رکھ دیتا ہے۔ بیرے کو ہم جانتے ہیں۔ عبدل نام ہے! بیرہ ہمیں جانتا ہے۔ یہ لوگ روز روز یہاں آتا ہے اسی وکت چائے پینے۔

"تم نے کسی اور سے بھی کہا؟"

"نہیں! بے کار لگتا ہے۔ لوگ سنتے ہیں پر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"کوئی دلال....؟"

"روپیے؟ ..... دلال جہاں بھی لے جاتا ہے، دس پندرہ سے نیچے بات نہیں ہوتی! کتنی کے ساتھ تو جا تا رہا ہوں۔"

"ہاں! .... پھر؟"

"دیکھو نیرو میں تمھیں یہ مشورہ دوں گا اگر کہیں کوئی اچھا سودا ہو تو ٹے تو تم اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لو! اس طرح تو نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔"

نیرو نے اس بار مجھے جن آنکھوں سے دیکھا ہے اس میں بھی نیا پن نہیں ہے۔ جب بھی اس طرح کی بات میں نے کی ہے نیرو کی آنکھوں کا رنگ، چہرے کا بھاؤ اسی طرح بدلتا رہا ہے! پہلے اس طرح کا تاثر اس کے چہرے پر اچھا معلوم ہوتا مجھے اپنے آپ اس کے اس لگاؤ کو محسوس کرتے ہوئے خوشی ہوتی تھی! اب.....!"

اب جو ہوتا ہے اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔

"تمھارے اسکول والے کیا کہتے ہیں؟ تین چار ہزار روپے ایڈوانس نہیں دے سکتے؟"

"نا" چھوٹا سا اسکول ہے وہ بھی پرائیویٹ.... وہ بھلا اتنی رقم ایک ساتھ کیوں دینے لگے؟"

"میں سوچ رہا ہوں ماڈل فوٹوگرافی چھوڑ کر کوئی ڈاکومنٹری وغیرہ پکڑ لوں، کوئی ایسا آدمی ابھی مل ہی نہیں رہا۔

تمھارے پاس تو کچھ جمع ہے نا؟"

"ہاں، پر اس سے تو کوئی رسوئی گھر بھی نہیں دے گا۔"

میری چائے ابھی گرم ہے اس کی چائے کے اوپر ایک موٹی چھالی پڑ چکی ہے جسے وہ انگلی سے اِدھر اُدھر کرکے چائے کا ایک گھونٹ بھر لیتی ہے۔ چائے کا کوئی مزہ نہیں ہے ظاہر ہے، لیکن اس نے جیسے اس پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا ہو۔ پچھلے چار برسوں کے دوران ہم میں کتنا کچھ بدل گیا ہے ممکن ہے یہ ہم بھی نہ سمجھ پا رہے ہوں۔ پہلے ہماری ملاقاتیں رنگین ہوا کرتی تھیں۔ سپنوں کے ساتھ ہم چلتے تھے۔ اب ایسا سوچتے سے کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ چیزیں کتنی تیزی سے بدل جاتی ہیں! میں اپنے جس دوست کے ساتھ رہتا ہوں۔ ایک ہی کمرے میں دو دو چار پائیاں ڈال کر وہ اکثر کہتا ہے' ہم غور نہیں کرتے ورنہ ہر صبح ہمارا چہرہ بدلا ہوتا ہے۔

میری روم میٹ آج ہوسٹل چھوڑ رہی ہے! نیرو نہ جانے کیا سوچتی ہے پھر کہتی ہے

"پرسوں وہ کسی کے ساتھ کورٹ میریج کر رہی ہے۔"

"لڑکا امیر ہے؟ .... اس کا اپنا گھر ہوگا۔"

"میں نے ایک بار دیکھا ہے! چہرہ مُہرہ اچھا ہے۔ اکسپورٹ کرتا ہے پیسہ کافی ہے۔

"اسمگل کرتا ہوگا !"

"اونرشپ میں اس کا اپنا فلیٹ ہے"

تمھاری روم میٹ چالاک ہے ۔ ایک بڑے سنگ سے چھٹکارا پاگئی ۔

نیرو چپ ہے اس کا چہرہ پھر کسی سوچ میں ڈوبا ہے ۔ پہلے جب کسی کے شادی بیاہ کی بات چلتی ہم دونوں کچھ سوچ کر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ۔ ہم دونوں کے چہرے پر ایک ہی بات لکھی ہوتی ۔ کچھ دنوں بعد لوگ ہمارے بارے میں بھی یہی کہیں گے ۔ دونوں نے لو میرج کر لی ہے ، اب جب بھی اس طرح کی بات آتی ہے ہم دونوں کچھ اور باتیں کرنے لگتے ہیں ۔ مجھ سے اتنا بھی اب نہیں ہوتا کہ کہوں ۔

"گھبراؤ مت"

کچھ دنوں کی بات ہے پھر تم بھی اس ورکنگ ویمنس ہوسٹل سے باہر آجاؤ گی ۔ اپنے گھر میں ! پہلے میں کہتا تھا ! سچ لگتا تھا یہ سب کہنا اب ...... میں پریشان ہو کر چاٹ کا کپ ایک ہی بار میں خالی کر دیتا ہوں ۔ چلو اٹھیں اب ،

باہر اندھیرا پھیلنے لگا ہے ۔

اسے اس کے ہوسٹل کے پاس چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آگیا ہوں ۔ ہریش ابھی نہیں آیا ! اسے روز ہی آنے میں دس بج جاتے ہیں ! ٹیوشن کرتا ہے اور ایک پرائمری اسکول میں پڑھاتا ہے ۔ ہر وقت وہ جیسے کسی کی تیاری میں رہتا ہے ۔ ادھر سے آیا ادھر چل دیا ! بیوی اور بچوں کو گاؤں میں چھوڑا ہوا ہے ! کئی بار سوچتا ہے ، بیوی کو لے آئے ، مگر نہیں لاتا ۔ رکھوں گا کہاں ! اس گودام گھر میں ؟ جہاں حاجت کے لیے بھی تین فرلانگ دور جانا پڑتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پریشانی صرف اتنی ہی نہیں ہے ! اس کی بیوی آئے گی تو مجھے ہٹ جانا ہوگا یہاں سے اور اس طرح پورے کمرے کا کرایہ اس پہ آپڑے گا ! بیوی کے رہتے کوئی دوسرا یہاں رہ نہیں سکتا ۔

ڈاکیہ کوئی خط ڈال گیا ہے ! دروازے کے ایک کنارے فرش پر پڑا ہے ۔ میرا ہی ہے ! گاؤں سے ! پڑھ کر میں چونکتا ہوں ! بابوجی نے لکھا ہے ۔۔ پاٹھک جی بہت اچھے اور خاندانی آدمی ہیں ! ان کی لڑکی کو میں نے دیکھا ہے ! خوبصورت اور خوب سلیقہ ہے ! یہ تم سے بات کرنے کے لیے تمھارے پاس آئیں گے ! ہاں کر دینا ۔ ایسے رشتے بار بار نہیں آتے ۔ دان دہیز بھی اچھا مل جائے گا ۔ میں خط کئی مرتبہ پڑھ جاتا ہوں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہے ۔ میں نے بابوجی سے صاف ہی کہہ دیا تھا اس جھمیلے میں وہ نہ پڑیں ! اب اتنی دور پاٹھک جی کو بھیجا ہے ! نیرو کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے ! چار برس سے میرے انتظار میں ہے ۔ چار سال سے ہم دونوں [illegible] بابوجی کو یہ سب [illegible] کیا ضرورت تھی ؟

پاٹھک جی سنتے ہی ابل پڑے ۔ آج کل کے چھوکروں کی تو کچھ [illegible] سمجھ میں نہیں آتی ۔ باپ [illegible] آخر ہم لوگوں نے بھی تو شادی بیاہ کیے ، کون کس سے پوچھنے گیا تھا ! جو باپ نے کہا مان [illegible] !

"تب آپ کا گھر ہوتا تھا نا ، میرے پاس نہیں ہے"

"کیا مطلب ؟" بچھو نے ڈنک مارا ہو اس طرح وہ چونک اچھلے ہیں ۔ "کیا باپ سے الگ ہو گئے ہو ؟"

"نہیں"

"پھر گاؤں کا اتنا مکان"

میں یہاں کی بات کر رہا ہوں! مجھے یہیں رہنا ہے۔

پاٹھک جی نے ان سب باتوں پر کبھی سوچا نہیں ہوگا۔ سوچ کر کچھ دیر چپ رہے پھر چپ رہ کر بولے، اگر تم شادی کے لیے تیار ہو تو میں تمہارے لیے۔۔۔' 'شادی کے لیے تو چار سال سے میرے ساتھ ایک لڑکی بھی انتظار کر رہی ہے' 'اگر گھر مل جائے تو۔۔۔' پاٹھک جی پھر لال ہو اٹھے۔ سامنے رکھی ناشتے کی پلیٹ کو الگ ہٹاتے ہوئے بولے، 'بچی بچی! ایچ رچ کلیمکس آگیا ہے'

انہیں چلے! وہ سب سے ہنستے ہوئے بولا۔ مکان نیرو کے لیے چاہیے

نیرو سب سن کر کافی اداس ہو گئی۔ نجانے خالی آسمان پر وہ دیر تک کیا ٹٹولتی رہی!

اس شام کتنی دیر ہم ساتھ رہے! وہ خاموشی جو ہمارے بیچ گھر آئی تھی اس دن نہ ٹوٹی۔ ماڈل کا کام کرتے کرتے میں اوب گیا تھا! وہی لڑکیاں، وہی تھوڑا سا ادھر ادھر کرکے اینگلس۔ مسکراؤ ذرا! ذرا ہونٹوں کو نہیں، نہیں، آنکھوں کو ادھر نیچے جھکاؤ! بس ڈیڈ از آل رائٹ! لُک نیچرل! آگے بڑھو، پیچھے ہٹو، ... آؤ! وہی بندھی بندھائی مزدوری!

کبھی کبھی بیچ میں کوئی پبلسٹی فلم بھی مل جاتی تو سوچتا اس بار کچھ پیسے ضرور بچ جائیں گے! نہ ہوگا تو کہیں کسی کھولاباڑی میں ہی تب تک کوئی انتظام کر لوں گا۔ نیرو تیار نہیں ہوگی۔ زندگی کتنی تلخ ہوتی جا رہی ہے!

کھولاباڑی! سن کر نیرو سچ مچ چونک پڑی! تعجب سے میری طرف دیکھتی رہی! پہلے اس نے اسے میرا مذاق سمجھا! میری سنجیدگی سے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ کیا واقعی؟ میں نے اپنی گردن ہلا دی۔ ایک جگہ بات کی ہے۔ نیرو چپ بیٹھی رہی!

نیرو میرے ساتھ ہی تھی۔ کھولاباڑی کا مالک ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ چھوٹے چھوٹے کمروں سے بنا یہ بہت بڑا مکان تھا، جس میں عورتوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی چل پوں مچی ہوئی تھی۔ ہم جسے دیکھنے آئے تھے وہ کمرہ باہر کی طرف تھا! مالکِ مکان ہمیں دکھاتے ہوئے بولا۔

"صاحب ایک آدمی کے لیے بہت ہی اچھا گھر ہے!"

"ایک آدمی؟ میں تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ 'لیکن مجھے تو رہنے کے لیے چاہیے۔'

ہم دونوں رہیں گے

"عورت! عورت رکھنا تو آپ کے لیے مشکل ہوگا۔ کھولاباڑی میں نہ پاخانہ ہے نہ پانی! کارپوریشن کا نل اور پاخانہ ہی سہارا ہے! یہاں رہنے والے سب وہیں جاتے ہیں! اگر آپ بھی۔۔۔'

میں نے نیرو کو دیکھا نیرو نے مجھے۔ نہ جانے کیوں ایک ساتھ ہم دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی! تو؟ جواب دینے کی ضرورت تھی ہی نہیں! ہم واپس مڑ گئے!

روز شام کی طرح نیرو پہلے سے ہی ریستوران میں بیٹھی تھی! میں پاس آکر بیٹھ گیا! نیرو کافی دیر تک انتظار کر لیتی ہے۔ مجھ سے پانچ منٹ کا انتظار بھی نہیں ہوتا! اکیلے اکیلے بیٹھے بیٹھے خالی ٹیبلوں، باتیں کرتے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھتے رہنا، چائے کو رہ رہ کر سڑکتے رہنا۔ لوگوں کی کھلکھلاہٹوں کی طرف خواہ مخواہ متوجہ ہونا مجھ سے نہیں ہوتا! اچھا ہی نہیں لگتا! نیرو عادی ہے

تو گھنٹوں ساتھ بیٹھ لیتا ہوں اکثر بیزاری تب بھی کئی بار ہو جاتی ہے! یہ دوسری طرح کی بیزاری ہوتی ہے جیسے توڑنے کے لیے ہم ریستوران سے باہر بھی آجاتے ہیں! کوئی ساتھ ہے، یہ احساس خود بہت بڑا آسرا ہے۔

ان چار سالوں میں حالانکہ ہم اس عجیب و غریب ماحول سے گذر چکے ہیں مگر پھر وہی ہم دہراتے ہیں

"آج چائے نہیں لی؟"

"نہیں" "سوچ رہی تھی آجاؤ تو ساتھ ہی لوں!... اسکول سے نکلتے وقت ہی مسز ملہوترہ نے چائے منگا کر پلائی تھی آج! انہوں نے اپنے گھر کے لیے ٹی۔ وی کا آرڈر دیا ہے آج۔"

"اوہ! تب ہی!"

میں خاموش ہو کر عبدل کو کھوجنے لگا۔ وہ شاید اسی لمحہ کا منتظر تھا۔ میری نظر پڑتے ہی دوڑا سا آیا۔ "چائے صاب!"

"ہاں، دو! اور سنو دو آملیٹ بھی لیتے آنا۔"

"اچھا صاب! عبدل چلا گیا!"

"آج ایکدم بور ہو گیا میں! ایک پبلسٹی فلم کی شوٹنگ تھی! لڑکی بالکل واہیات تھی۔ ایک موو MOVE بھی صحیح نہیں! منیجر صاحب کی لڑکی، اس کو لے کر کام کرنا ہی پڑا۔"

بیرا آملیٹ رکھ کر چلا گیا! میں تیزی سے کھا رہا تھا! نیرو ایک ایک ٹکڑے کو کافی سوچ سوچ کر منہ میں رکھ رہی تھی! میں سمجھ رہا تھا وہ کہیں اور کھوئی ہوئی ہے۔

"بات کیا ہے؟"

"ایں؟ نا کچھ نہیں!"

"......؟"

"آج ماں کا پھر خط آیا ہے وہ کافی کمزور ہو چلی ہیں۔ بیمار پہلے ہی سے رہتی تھیں۔ انھیں اب یہ تاخیر کسی طرح بھی پسند نہیں"

میں چائے کا ایک گھونٹ بھرتا ہوں۔ کپ نیچے رکھ کر چاہتا ہوں کچھ کہوں! کہہ نہیں ہوتا۔ کپ اٹھا کر دوبارہ چائے ہونٹوں سے لگا لیتا ہوں۔ چائے کا مزہ آج کچھ بدلا ہوا ہے کڑواہٹ زیادہ ہے ـــــ آدھا گھنٹہ یوں ہی بیت جاتا ہے۔ اکثر اسی طرح بیت جاتا ہے۔ خاموش مکالمات! ایک دوسرے کی طرف اٹھتی گرتی پلکیں! چٹپٹاتے ہونٹ!! کھلتی بند ہوتی مٹھیاں! ریستوران سے باہر نکل کر سامنے والے چھوٹے سے میدان میں ہم بیٹھ [illegible] میدان کی گھانس پہ بیٹھنے کے [illegible] دیکھ [illegible] رہتا ہے [illegible] اور [illegible] چاہ [illegible] ایک ہتھیلی کو [illegible] اپنے ہاتھوں میں دباتا ہوں! نیرو پھر بھی [illegible] ـــ ماں کو کیا جواب دوں [illegible] کچھ [illegible] چار سال ہو گئے۔ [illegible] آج میں نے بات کی ہے ایک [illegible] کچھ [illegible] ہاتھ الگ ہٹا لیتی ہے [illegible] ایسا نہیں ہوتا تھا! پھر [illegible] جیسے مر گئی ہے اور یہ کچھ پانا اب مشکل نہیں ہے [illegible] اچھا [illegible] ہو گئی۔ ــــ

([illegible] ۲۹ [illegible])

غزلیں

امتیاز

مژدۂ دیدارِ یار آنے کے بعد
مچ گئی ہلچل بہار آنے کے بعد
پڑ گئے پھیکے سبھی پھولوں کے رنگ
چشمِ نرگس پر نکھار آنے کے بعد
بڑھ گئیں تابانیاں رخسار کی!
رُخ پہ زلفِ تابدار آنے کے بعد
عطر سے لبریز تھی بادِ صبا!
آپ کی زلفیں سنور آنے کے بعد
دیکھتے ہی رہ گئے بے خود بنے
ہاتھ میں زہرہ نگار آنے کے بعد
ہم سرورِ زندگی میں کھو گئے!
وصل کے لیل و نہار آنے کے بعد
بن گئے کتنے فسانے امتیاز
ان پہ دل بے اختیار آنے کے بعد

فضل افضلؔ

شعور و فکر کو ہم تازہ دم عزمِ جواں دیں گے
شکستہ دل مغنیّ کو کبھی پھر کی زباں دیں گے
ابھی ہم نے زمانے کو بہت کم نعمتیں دی ہیں
زمانہ دیکھ لے گا ہم اسے اک دن یہ جاں دیں گے
یہ مانا جرمِ اُلفت ہو گیا تھا ہم سے دانستہ
کِسے معلوم تھا وہ آنسوؤں کی داستاں دیں گے
پریشاں پھر رہی ہیں بجلیاں کیوں کوچے کوچے میں
ضرورت ہو تو آجائیں ہم اپنا آشیاں دیں گے
فضل افضلؔ چند ایسی ہستیاں اب بھی غنیمت ہیں
جو مر کر بھی زمانے کو حیاتِ جاوداں دیں گے

عزمؔ انصاری

کام آئی نہ کچھ اپنی دنیا سے شناسائی
جب تارِ نفس ٹوٹا، میں تھا مری تنہائی
اظہارِ حقیقت پہ تحدید کے پہرے ہیں
بیٹھا ہوں سرِ محفل، خاموش تماشائی
آلام کی یورش یاں، اعمال کی پرسش واں
جینے میں بھی رسوائی، مرنے میں بھی رسوائی
یہ لوگ بھلا کیسے امید پہ جیتے ہیں!
ہم نے تو محبت میں جینے کی سزا پائی
یوں رات کے ماتم میں، بیٹھو گے بھلا کب تک
اُٹھو کہ وہ بجتی ہے، اب صبح کی شہنائی
احباب کی محفل میں پھر عزمؔ غزل خواں ہے
اشعار سے چھلکے ہے، افکار کی رعنائی

چندر سری واستو
ڈائرکٹر و سکریٹری

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش

۱۰ ماہ کی کارکردگی

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی تشکیل جدید اور سکریٹری / ڈائرکٹر کی حیثیت سے میرے انتخاب اور حصول جائزہ کے دس مہینے ۱۳/ دسمبر ۱۹۷۹ء کو مکمل ہو رہے ہیں۔ اس پورے عرصہ میں اکیڈیمی کی سرگرمیوں سے میں نے وقتاً فوقتاً تمام معزز ارکان کو واقف اور باخبر رکھا ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ بحیثیت مجموعی ہمارے کام کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس مدت میں اکیڈیمی کے توسط سے جو بھی خدمات انجام دی گئی ہیں۔ وہ دراصل صدر اکیڈیمی جناب ایم باگا ریڈی صدر نشین عاملہ، مولانا حافظ ابو یوسف اور نائب صدر اکیڈیمی جناب محمد ابراہیم خاں اور تمام ارکان کے اعتماد و محبت اور تعاون کا نتیجہ ہیں۔ اکیڈیمی نے اپنی سرگرمیوں کی مقررہ حدود سے متجاوز ہو کر سرکاری انتظامیہ کو بعض ایسے امور و مسائل کی یکسوئی کے لئے بھی مجبور کیا جو پچھلے کئی برسوں سے دفتریت اور سرخ فیتہ کی نذر تھے۔ اردو مدارس میں اساتذہ کی قلت ایک انتہائی سنگین مسئلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اضلاع کی ضروریات کی تکمیل میں ہم نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ناظم تعلیمات نے ہماری تجویز اور وزیر تعلیم کی ہدایات کے مطابق مقررہ طریقہ کار سے انحراف کرتے ہوئے ضلع چتور اور ضلع کرشنا کے اردو مدارس میں مخلوعہ اردو ٹیچرس کی جائدادوں کو غیر تربیت یافتہ UN-TRAINED امیدواروں سے پرکرنے کے احکامات کے اجراء کئے۔ جس کے نتیجہ میں ان دونوں اضلاع میں اس دیرینہ مسئلہ کے حل کا راستہ ہموار ہوا۔ خود شہر حیدرآباد و سکندرآباد کے اردو مدارس میں ۱۷۵ ایس جی بی ٹی ٹرینڈ اردو اساتذہ اور ۲۵ لاینڈ ٹرینگ اساتذہ کا تقرر اکیڈیمی کی مسلسل اور موثر نمائندگی کا نتیجہ ثابت ہوا۔ ضلع پریشد اور پنچایت سمیتیوں کو وقتاً فوقتاً موصول ہونے والی عرضداشتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئی اور متوازی اردو جماعتوں کے قیام اور اساتذہ کے انتظام کی کامیاب ترغیب دی گئی۔ اضلاع میدک، محبوب نگر، ورنگل اور کریم نگر اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ اکیڈیمی کی طرف سے اس محاذ پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کے اڈمنسٹریشن پر خوشگوار اور ناگوار دونوں قسم کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن ناموافق انتظامی رویہ کو خاطر میں نہیں لایا گیا۔ اور اکثر صورتوں میں اردو تعلیم کے ساتھ انصاف کرانے میں ہمیں کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ریاست میں اردو کو جو قانونی موقف حاصل ہے۔ اور اس سلسلے میں حکومت نے جو احکامات جاری کئے ہیں۔ اور ان کو روبہ عمل لانے کی طمانیت حاصل کی جا رہی ہے۔ یہ کام خود اس حد تک اہم اور غیر معمولی ہے کہ جس کے لئے ہمیں آئندہ سال مختلف نوعیت کے انتظامات پر دھیان دینا ہوگا۔ نو تشکیل شدہ اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کا پہلا اجلاس ۱۵/ مارچ اور بورڈ آف گورنرس ۱۴/ اپریل کو منعقد ہوا۔ جن میں کئے گئے تمام فیصلوں کو اس مدت میں تقریباً روبہ عمل لایا جا چکا ہے۔ اس خصوص میں نائب صدر

جناب محمد ابراہیم خان اور معزز رکن جناب سید احمد علی کی اسی تجویز کو پوری کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا جس کے ذریعہ انہوں نے وجئے واڑہ، کرنول اور نظام آباد میں اکیڈیمی کے علاقائی مراکز کھولنے کی تحریک کی تھی۔ وجئے واڑہ میں ۱۰/ اگست کو ہمارے وزیر تعلیم جناب ٹی رنگناتھ رام ریڈی اور کرنول میں ۸/ ستمبر کو محترمہ اندرا ماجی کے ہاتھوں ان مراکز کا افتتاح ہو چکا ہے۔ جس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ دونوں مراکز پوری کامیابی اور اردو بولنے والوں کے تعاون کے ساتھ زور و شور سے خدمت اردو کرنے والے مراکز میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ جنوری ۱۹۸۰ء کے دوران نظام آباد میں ہمارا تیسرا مرکز قائم ہوگا جس کی تجویز جناب سلطان صلاح الدین اویسی نے کی تھی۔ جناب ایم باگا ریڈی کی تحریر کردہ اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹس ویلفیر فنڈ کو ایک حقیقت میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ اور اکیڈیمی کے عطیہ پچاس ہزار روپیے کی رقم سے یہ فنڈ اپنا کام شروع کر چکا ہے۔ اس فنڈ کی افتتاحی تقریب ۱۸/ نومبر کو منعقد ہوئی۔ جس میں اردو کے ایک صحیفہ نگار جناب خسرو انصاری کو آنکھوں کے آپریشن کیلئے اور دیگر مصارف کیلئے ایک ہزار روپیے کی رقم پیش کی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۵/ اس گنجائش سے حاصل ہونے والے ماہانہ منافع سے نادار مرحوم شاعروں یا ان کے لواحقین وظیفہ دینگے۔ کیلئے ماہانہ پچاس پچاس روپیے کا منظوری دی گئی اور اس کی تقسیم اسی مہینے کی ۵/ تاریخ کو عمل میں لائی جا چکی ہے۔ انتخابات کے ختم ہونے کے بعد پانچ لاکھ کے مقررہ نشانہ کی تکمیل پر سبھی لوگ توجہ کریں گے۔ اس ویلفیر فنڈ کو دوسری ریاستوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے انڈر سکریٹری جناب صدیق عثمانی نے گذشتہ مہینے حیدرآباد آکر اس اسکیم سے متعلق مکمل معلومات حاصل کیں۔ جیسے جلد ہی رائج کیا جانے والا ہے۔ اتر پردیش اور بہار کی اردو اکیڈیمیوں کی طرف سے بھی اس اسکیم سے دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی اشاعت کے لئے، البتہ مجلس عاملہ نے جو فیصلہ کیا اسے روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ چنانچہ آج تک ۶۰ ہزار روپیے پہلی اور دوسری قسط کے طور پر جاری کئے جا چکے ہیں۔ ۳۱/ دسمبر کی مقررہ آخری تاریخ تک جو کتابت شدہ مسودات اور [illegible] پیش ہونگیں۔ ان کا تخمینہ بعد ہی کرنا ممکن ہوگا۔ حکومت آندھرا پردیش نے چیف منسٹر آندھرا پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کی ہدایت کے مطابق اردو اکیڈیمی کو ایس۔ ایس۔ سی تک اردو میڈیم کی کتابوں کی ترتیب و تدوین کی جو ذمہ داری حوالے کی ہے۔ اسے ایک چیلنج کی حیثیت سے پورا کیا جا رہا ہے۔ گورنمنٹ ٹکسٹ بک پریس اب تک تیسری چوتھی اور پانچویں کی اردو ریڈرس شائع کر چکا ہے۔ جو اس سال حکومت کے ماڈل اسکول میں پڑھائی جا رہی ہیں۔ اور جون ۱۹۸۰ء کے نئے تعلیمی سال سے تمام مدارس کے لئے رائج ہوگا۔ اکیڈیمی نے ان تمام کتابوں کی کتابت کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے۔ اور اسے شہر کے اچھے خوشنویسوں کے ذریعہ یہ کام مسلسل انجام پا رہا ہے۔ اس وقت تک اکیڈیمی آٹھ ٹیچرس ہینڈ بکس کی انگریزی اور تلگو سے اردو میں منتقلی اور کتابت کے بعد انہیں ٹکسٹ بک پریس کے حوالے کر چکی ہے۔ تیسری جماعت کی سماجی علم بھی پرنٹنگ کے آخری مراحل میں ہے۔ ۱۵/ جنوری ۱۹۸۰ء تک پہلی تا پانچویں تک کی نان لنگوسٹکس کی چند کتابیں کتابت کے بعد چھپوائی کیلئے حکومت کے حوالے کردی جائیں گی۔ ان کتابوں کے مصنفین، مولفین کا معاوضہ خود حکومت ادا کرتی ہے۔ اور اکیڈیمی پر ان کتابوں کی مصارف کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ حکومت کی اسی تجویز کے باوجود ہم۔ ابھی یہ طے نہیں کیا کہ اردو کی درسی کتابوں کی پرنٹنگ کا کام بھی اکیڈیمی کو حاصل کر لینا چاہیئے۔ بورڈ آف گورنرس کے آئندہ اجلاس میں اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا جائے گا [illegible] کو حاصل کر [illegible] تعداد کو کام فراہم کر- کے مقصد کا [illegible] ہوگی۔ آئندہ تعلیمی سال [illegible] نان لنگوسٹکس اور ٹیچرس ہینڈ بک

تیار کرلی ہوگی۔ اور S.C.E.R.T کی طرف سے اس سلسلہ میں مکتوب کا انتظار ہے۔ حکومت نے مجھے بہ اعتبار عہدہ شکس بجس کمیٹی کا رکن مقرر کیا جس کے نتیجہ ہی میں اکیڈیمی کا یہ سارا کام حاصل کرنے اور اسے انجام دینے کے قابل ہوئی اس کے علاوہ حکومت کی طرف سے تعلیقات کی اشاعت اور مطبوعہ کتابوں کی بڑی تعداد میں خریدی سے متعلق جو اکیڈیمی کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس میں میری شمولیت کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اردو کے لکھنے والوں کو پہلی مرتبہ بحیثیت مجموعی ۲۵ ہزار روپے کی رقم اجرا کی گئی۔ دس ماہ کی اس مختصر ترین مدت میں کئی اہم ترین شخصیتوں جن میں خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی اور طالب الفاری جیسی قد آور شخصیتیں شامل ہیں۔ جنہوں نے اردو اکیڈیمی کا معائنہ کیا اور اس کی کارکردگی سے آگاہی حاصل کی۔ اردو اکیڈیمی کو بالکل پہلی مرتبہ انگریزی اور تلگو اخبارات کی توجہ بھی حاصل ہوئی اور اکیڈیمی کی خبران اخبارات میں پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ تقریباً تمام اردو روزناموں نے اردو اکیڈیمی کے مختلف پراجکٹس کے بارے میں کئی اداریے سپرد قلم کئے اور ہمارے حوصلوں و عزائم کو تقویت عطا کی۔ دکن کرانیکل (انگریزی) اور انیاڈو نے اکیڈیمی کی سرگرمیوں کے بارے میں مضامین کی اشاعت عمل میں لائی۔

اردو اکیڈیمی کے متعلق مالیاتی سال ۸۰-۱۹۷۹ء کی پانچ لاکھ گرانٹ تا حال وصول نہیں ہوئی ہے۔ اس کے باوجود اکیڈیمی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور نئے پراجکٹس کو روبہ عمل لانے میں محض اس لئے کامیاب رہی ہے کہ اس کے پاس چار لاکھ روپیے کا مد محفوظ ذیر ریزرو فنڈ موجود تھا۔ گرانٹ کی اجرائی میں غیر معمولی تاخیر محکمہ تعلیمات کے مالیاتی اندیشہ اینڈ منسٹریشن کی غیر ذمہ دارانہ روش کا نتیجہ ہے۔ جس کا احساس ہم وزیر تعلیم اور فینانس سکریٹری کو دلا چکے ہیں۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کی [illegible] مداخلت کے نتیجہ میں یہ مسئلہ اب یکسوئی کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہوگا کہ حکومت نے ۲۰/اپریل ۱۹۷۹ء کو ایک جی او کے ذریعہ اردو اکیڈیمی کے ریزرو فنڈ کی مد کو ایک لاکھ سے بڑھا کر چار لاکھ کر دینے کی منظوری دی تھی کہ اگر اس امانت سے کوئی رقم حاصل کی جائے تو نئی گرانٹ کی وصولی کے ساتھ ہی خالی ہونے والی رقم ریزرو فنڈ میں واپس جمع کروا دی جائے۔ وزیر تعلیم نے اواخر مارچ میں اسمبلی میں پیش کردہ اپنے محکمہ کے مطالبات زر میں اکیڈیمی کیلئے پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ شامل رکھی تھی۔ لیکن تفصیلی مالیاتی منظوری کے تحت میں ایسے اضافہ کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی جس کے نتیجہ میں موجودہ صورتحال پیدا ہوئی۔ اس غلطی کا پہلے تو محکمہ نے اعتراف نہیں کیا پھر ہمارے اختیار کردہ مائل موقف کے نتیجہ میں بڑی تاخیر سے انہوں نے بالواسطہ اس بات کو تسلیم کر لیا۔ ایک مرحلہ پر ناظم تعلیمات اور معتمد تعلیمات نے یہ تجویز بھی پیش کر دی تھی کہ چونکہ اکیڈیمی کے پاس پہلے ہی صرف شدہ ساڑھے تین لاکھ کی رقم محفوظ ہے اس لئے اسے اس سال صرف ڈیڑھ لاکھ کی اجرائی عمل میں لائی جائے۔ لیکن صدر اکیڈیمی جناب ایم باگا ریڈی کی دلچسپی، وزیر تعلیم سے میری بات چیت بعد اس سے پہلے چیف منسٹر کے نام ہمارے ایک مکتوب کے نتیجہ میں محکمہ تعلیم تاخیر ہی سے سہی راہ راست پر لایا گیا۔ جناب باگا ریڈی صاحب کا یہ خیال ہے کہ بورڈ آف گورنرس کا آئندہ اجلاس تمام آبادی میں ریجنل منسٹر کی افتتاحی تقریب کے دن ہی منعقد کیا جائے جہاں ارکان کی آمد و رفت کے تمام انتظامات اکیڈیمی خود کرے گی۔ ہمیں اب صرف گرانٹ کی اجرائی کا انتظار ہے۔ اور جوں ہی وہ رقم حا[illegible] ہو جائے اس ریجنل سنٹر کا افتتاح اور بورڈ آف گورنرس کے اجلاس کے انعقاد کی تاریخ کو قطعیت دی جائے گی۔ میری تمام آپ تمام معزز ارکان سے یہ درخواست ہے کہ آئندہ سال کیلئے اکیڈیمی کیلئے قابل قبول و غور تجاویز پیش فرمائیں تاکہ ان کا جائزہ لیا جائے اکیڈیمی کی

طرف سے مطبوعہ کتابوں پر ایوارڈس اور کتب خانوں کی امداد کے سلسلے میں آئندہ چند دنوں میں اعلانات ہوں گے۔ اور اس سے پہلے متعلقہ سب کمیٹیاں قائم ہونگی اور اپنا کام شروع کردہ کام مکمل کر لیں گی۔ صدر نشین سابق مولانا حافظ ابو یوسف کی تجاویز کے مطابق اکیڈیمی نے کل ہند اساس پر مخدوم ادبی ایوارڈس دینے کا جو فیصلہ کیا ہے۔ اسے بجائے سال میں روبہ عمل لایا جائے گا۔

جناب باگا ریڈی صاحب نے اردو اکیڈیمی کے زیر نگرانی سنٹرل اردو ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور اردو گریجویٹس کو روزگار فراہمی سے متعلق چیف منسٹر کی خدمت میں جو تجاویز پیش کی تھیں اور چیف منسٹر کا جواب میں اس سے قبل ایک مراسلہ کی شکل میں آپ تک پہنچا چکا ہوں ان امور پر بورڈ آف گورنرس غور کرے گا۔ البتہ متعلقہ تمام تفصیلات اور اسکیم مرتب کرنے میں مسلسل مصروف ہوں۔ بورڈ آف گورنرس کے پہلے اجلاس کا صرف ایک ہی فیصلہ جو ہم تا حال عمل کرنے سے قاصر رہے ہیں وہ اکیڈیمی کے دفتر کو پرانا شہر میں منتقلی سے متعلق تھا۔ اس ضمن میں ہم نے اکاموڈیشن کنٹرولر سے موزوں عمارت کی نشاندہی کی تھی۔ لیکن وہ اس موقف میں نہیں ہیں کیونکہ پرانا شہر میں کوئی اچھی اور وسیع عمارت ان کے دائرہ اختیار میں موجود نہیں ہوتی۔ اکیڈیمی کی طرف سے جو تین کتابیں (۱) آندھرا پردیش (۲) نوائے طالب اور (۳) چاند تارے چھاپی گئی تھیں ان کی نکاسی کا سی استطاع کیا جا رہا ہے۔ اور یہ یقین ہے کہ آئندہ چند مہینوں میں تمام کتابیں فروخت ہو جائیں گی۔

اردو اکیڈیمی کے بک ڈپو کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوششوں کو بھی بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور آئندہ دنوں ہمارا یہ یونٹ ہر اعتبار سے خود کفیل بنا دیا جائے گا۔

میری یہ خواہش ہے کہ آپ اپنی رائے تنقید یا تجویز سے سرفراز فرمائیں ——— ••

(باقی صفحہ (۴۰) کا)

اور کس طرح وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر کوشش کرنے لگا۔ اس جدو جہد میں اُسے ہر قدم پر کامیابی کی دیوی نے پھول مالا پہنایا اور آج یہی انسان جو کل تک جنگلوں میں مارا مارا پھیرتا رہا۔ کس جاہ و حشمت کے ساتھ دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ نئی نئی دریافتیں ہو رہی ہیں سائنس اور علم بڑھ رہا ہے۔ جیسے جیسے انسان کی ضرورتیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے اُس کی سادہ زندگی پیچیدہ اور گنجلک ہوتی گئی اور ہم دیکھتے ہیں یہ زندگی آج جنگ اور اس کے دوراہے پر پہنچ گئی ہے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکیں گے کہ جب تک انسان زندہ ہے۔ بھلائی اور زندگی زندہ اور انسان کبھی نہیں مر سکتا ——

نقد و نظر

(تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔
(ادارہ)

(۱) نام کتاب:۔ سوزِ وطن : مصنف ڈاکٹر کنول ڈبائیوی (قومی شاعری) (صفحات: ۲۷۲ (مجلد) قیمت: ۱۵ روپے
ملنے کا پتہ : ڈاکٹر ڈبائیوی گنور ۔ ضلع بدایوں ۔ یوپی

" سوزِ وطن " کو ڈاکٹر کنول نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ 1۔ میرا ہندوستان وطن ۲۔ کاروانِ وطن ۳۔ پاسبانِ وطن ۴۔ رودادِ وطن

" میرا ہندوستان میرا وطن " جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ اس حصہ والی نظمیں، زیادہ تر " حب الوطنی " اور " ایک جہتی " کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہر شخص کو اپنے وطن سے لگاؤ زیادہ رہتا ہے۔ کنول صاحب کو بھی اپنے وطن سے بے حد محبت ہے۔ " میرا دیوتا "، " میرا دیش " " میرا وطن " اور " میرا ہندوستان " میں جہاں وطن کی عظمت کو ظاہر کیا ہے وہیں وہ فرقہ واریت کو ختم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس حصے کی سب سے خوبصورت نظم " مورتی روتی رہی " ہے یہ نظم گاندھی جی کے مجسمے پر لکھی گئی ہے، جو مینی تال میں نصب ہے۔ گاندھیائی فلسفہ کا زور و شور اب تک باقی ہے۔ لیکن گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر کوئی گامزن نہیں۔ ڈاکٹر کنول کا کہنا ہے کہ مورتی اپنی قوم کی بے عملی کو دیکھ کر شرم سے سرنگوں ہو گئی ہے وہ اس کا اظہار اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں ؎

اسی سے شرم ہے مجھ کو اسی سے سرنگوں ہوں		کہ میرے خواب کی تعبیر آج الٹی ہے
کبھی نہ ذہن و تصور میں آئی تھی میرے		جو بات چند ہی برسوں سے میں نے دیکھی ہے

" پاسبانِ وطن " ڈاکٹر کنول کے اس مجموعے کا رزمیہ حصہ ہے۔ جس میں وہ سپاہیوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

" رودادِ وطن " میں موضوعات مختلف ہیں۔ " غالب کا مکان " اور " اردو کی کہانی اردو کی زبانی " میں ایک تہذیب کے المیہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو زبان جو قومی یکجہتی کی آئینہ دار تھی وہی آج فرقہ پرستی کا شکار بن گئی ہے۔ جب زبان ہی سے دلچسپی ختم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے شاعر اور ادیب بھی صفحہ ہستی سے مٹ سکتے ہیں۔ اردو کی زبان حالی کو دیکھتے ہوئے وہ بڑی بے باکی اور جرات سے کہتے ہیں ؎

تھا ملک میں ہمیشہ اُردو کا بول بالا — مسلم تھے اس کے فوگر ہندو تھے اس کے شیدا
اس تنگ ذہنیت کا کس سے گلا کریں ہم — اپنے ہی کر رہے ہیں اب کام دشمنی کا
اترے ہیں دشمنی پہ خود باغباں ہمارے — اُردو زباں کے ہم ہیں، اُردو زبان ہماری

ڈاکٹر کنول کی زبان، سادہ اور سلیس ہے کلام میں روانی پائی جاتی ہے۔ فرقہ داریت اور تعصب موضوعات پہ اظہار خیال کرتے ہوئے وہ جذبات کی رَو میں بہتے نہیں۔ اس کی بجائے نرمی اور آہنگی اپنے نظموں کو دلوں میں جاگزیں کرتے ہیں۔ ایسے کوئی شعر نہیں کہ سنتے ہی بھڑک اٹھیں۔ بعض بعض جگہ زوری طوالت گراں گزرتی ہے۔

بحیثیت مجموعی "سوزِ وطن" ڈاکٹر کنول ڈبائیوی کی نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جو اردو ادب قومی شاعری کے موضوع پہ اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ (لئیق صلاح)

نام کتاب :۔ رہ نوردِ شوق (سفرنامہ)، سفر: ڈاکٹر سید عابد حسین، مرتبہ: صالحہ عابد حسین
صفحات : ۱۴۴، قیمت : ۱۴/۵۰ روپیے۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 110025

ڈاکٹر سید عابد حسین، خدا انہیں جوارِ رحمت میں رکھے، اردو کے ان معیاری ادیبوں میں سے ہیں جو تصنیف لی خلوص اور ریاض کے قائل ہوتے ہیں۔ عابد صاحب کا اسم گرامی جامعہ ملیہ سے اتنا قریں تھا کہ ایک سے سرے کا خیال آجاتا۔ بلا کے محنتی، چست اور ذہین عابد صاحب نے گراں قدر مضامین اور تحریروں بلکہ مں ہوکر اردو ادب، کی طرح ہمارے عہد کو بہت دیا ہے۔ زندگی کے آخری حصہ میں "اسلام اور عصرِ جدید" انقلابی رسالہ کی اشاعت کے لیے جس لگن اور جس معیار پہ انھوں نے کام کیا وہ "رہِ نوردِ شوق" کے لعہ سے کھلتا ہے۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں، ایک تو وہ جس میں صالحہ عابد حسین اپنی خوبصورت نثر میں ان مسافرتوں کا ہ کرتی ہیں، جن میں یا تو دونوں، یا صرف عابد صاحب نے حصہ لیا، عابد صاحب کا مزاج، ان کے اہتمام، ان کے ن، ان کی اصول پسندی کی جھلک، اس حصہ میں ملتی ہے۔ یہ حصہ اس نفاست پسند اور محنتی ادیب کے طرزِ نثرت کو بھی پیش کرتا ہے اور اس PREOCCUPATION کو بھی نمایاں کرتا ہے جو تکمیلِ شوق کے عابد صاحب کو تھا۔

واہ۔ کتاب کا نام بھی کس خوبصورتی سے اسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے ؎

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

دوسرا حصہ عابد صاحب کے ان خطوط پہ مبنی ہے جو سفر کے دوران ان کی بیگم صالحہ عابد حسین کو لکھے گئے تھے۔ بلاجھی بالکل سے جذباتی نثر یا لفاظی سے جدا ہیں، غالباً عابد صاحب نے معلومات اور تجربات سے اخلاص کی

گرمی کا اظہار کیا ہے۔ یہ خط اس پابندی، اس ذمہ داری سے لکھے گئے ہیں کہ عابد صاحب کے رکھ رکھاؤ کی داد دینی پڑتی ہے۔

تیسرا حصہ "اسلام اور عصر جدید" جو کہ ایک مشن تھا، اس کی غرض و غایت پر عابد صاحب کی تحریر ہے۔ صالحہ عابد حسین نے جس طریقے سے عابد صاحب کی زندگی کے مسافرانہ پہلو پر نظر ڈالی ہے وہ تعریف کی حد تک غیر شخصی ہے، ہاں اتنی اچھی ادیبہ کے قلم سے اتنی سادہ اور غیر جیاتی زبان کی امید نہ تھی، زبان صحافتی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ پھر بھی چند مقامات پر لطف آ ہی جاتا ہے۔

عابد صاحب کے انداز نگارش کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"میں قمر کے دولھا احمد عباس کو ساتھ لے کر پہنچا۔ پہلے بادس بولڈ منسٹر اسحاق صاحب سے ملاقات ہوئی پھر "مرشد" کی زیارت ہوئی۔ میں نے کہا۔

بہ خرابات مغاں نورِ خدا می بینم　　　　دیں عجب بیں کہ چہ نورے ز کجا می بینم

خدا کے فضل سے صحت اچھی معلوم ہو رہی تھی اور موڈ بھی اچھا تھا۔ خوب باتیں رہیں۔ اب خدا نے چاہا تو انہیں صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے دیکھوں گا۔" عابد صاحب نے "اسلام اور عصر جدید" کے عنوان پر جو کام شروع کیا تھا وہ بلاشبہ بین الاقوامی حیطہ کو COVER کرتا ہے۔ اس کام کے مقاصد ان مذہبی شعبوں کی شناخت کرتا تھا، جو نئے ماحول کے لحاظ سے تجدد سے روشناس کئے جا سکتے ہیں اور جس شعبوں میں نئی روشنی کے آنے کی سخت ضرورت ہے اور اس کے مذہبی عقائد پر آنچ آنے کا اندیشہ نہیں۔ یہ کام بڑا ہے اور اسے جاری رہنا چاہیئے۔

۔ کتاب کی طباعت اور گٹ اپ اچھے ہیں۔ کتابت میں خامیاں ہیں۔　　　(اسلم عمادی)

مجموعۂ کلام : خلش : شاعر : خار دہلوی : ضخامت : ۲۴۸ صفحات : قیمت پچیس ۲۵ روپے

ناشر: خیبر پبلشرز، لال دروازہ، سرکی والان، دہلی ۱۱۰۰۰۶

خار دہلوی دبستانِ داغ کے شاعر ہیں اور غزل ان کا میدان ہے، سائل دہلوی کے شاگرد ہونے کے علاوہ فصیح اور سلیس اردو کے شاعر خاندانوں میں سے ایک فرد ہیں۔

اس مجموعہ میں دو سو دس غزلیں ہیں اور ہر غزل خار دہلوی کے استادانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ مجموعہ کی ابتدا میں شاعر کے خاندان، ان کے شعری سلوک اور آپ بیتی کے کچھ اوراق ہیں۔ "ادب برائے ادب" "ادب برائے زندگی" ان دونوں مکتبوں کے مباحث اب کچھ کمزور پڑ گئے ہیں شعرا کچھ حد تک اس بات کو محسوس کرنے لگے ہیں کہ ادب برائے ادب و زندگی کا دور آ چکا ہے جہاں نہ محض فنکارانہ کرافٹنگ سے کام چل سکتا ہے، نہ ہی پروپگنڈہ ہی قدم جما کر کچھ کہہ سکتا ہے۔ ادب پارے زندگی اور ادب دونوں کے بیچ رنگوں کے نادر امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ امتزاج کسی طبعی یا کیمیائی عمل کی طرح صاف اصول میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خار دہلوی کا مجموعہ "خلش" ربع صدی) دیر سے سامنے آیا ہے۔ اس کی آواز لب و لہجہ اور زبان سب ایک ایسے دور کی کہانی کہتے ہیں جب کہ "آتش جوان تھا" لیکن فن لطیف کی اہم ترین خصوصیت تو یہ ہے کہ گرچہ دور ہی کی آواز کیوں نہ لگے، اس میں اگر تیر [illegible] ہو تو اس کا عہد [illegible] دونوں ہی جھلکا دیتے ہیں۔ خار دہلوی کا یہ مجموعہ پر کیف اشعار سے بھرا ہوا ہے ہر صفحہ پر [illegible]

اردو نامہ

اُردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم ستمبر: محفل خواتین کا ماہانہ، ادبی اجلاس و مشاعرہ محترمہ دیا دیوی کی صدارت میں ہوا۔ محترمہ لیئق صلاح ریسرچ اسکالر نے ادبی مضمون اور ڈاکٹر ناصرہ نے کہانی سنائی عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر اندرہ وششٹ، مظفر النساء ناز، آمنہ ضیاء اور ملیّا دیوی سنکلا نے کلام پیش کیا۔

۷/ستمبر: جناب اقبال حسین اقبالؔ کے دوسرے شعری مجموعہ "بہار غزل" کی ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے رسم اجراء انجام دی۔ جناب عبدالمحمود، ڈائرکٹر نیلاس اردو ٹرسٹ نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی نے اقبال کی شاعری پر مخاطب کیا۔ جناب صلاح الدین نیّر نے شکریہ ادا کیا۔

۸/ستمبر: سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے ریجنل سنٹر کرنول کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ "ہماری سابق حکومت ہی نے ایک کروڑ روپئے کے سرمایہ سے ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں لایا تھا۔ اور مختلف ریاستوں میں اُردو اکیڈیمیوں کی تشکیل کی ذمہ داری کے فرض کو پورا کیا ہے۔ مسز گاندھی نے کہا کہ ہماری یہ خواہش تھی ہے اور مستقبل قریب میں رہیگی کہ اردو زبان ترقی کرے، پروان چڑھے اور اس کے ساتھ کسی ناانصافی کو برداشت نہ کیا جائے انہوں نے اس سلسلے میں آندھرا پردیش میں ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کی رہنمائی میں اردو زبان کے ساتھ روادارانہ طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے ستائش کی۔ اِس جلسہ کو، چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے بھی مخاطب کیا اور اردو اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر اظہار مسرت کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے بھرپور اور ممکنہ تعاون و اعانت کا تیقن دیا۔ جناب بم باگا ریڈی ریاستی وزیر پنچایت راج جو اردو اکیڈیمی کے صدر بھی ہیں۔ مولانا حافظ آلو یوسف صدر نشین مجلس انتظامی اکیڈیمی کے علاوہ پروفیسر فقیر پاشاہ قادری پرنسپل عثمانیہ کالج کرنول نے بھی مخاطب کیا اور محترمہ اندرا گاندھی کی اردو دوستی کے خدمات کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔

—— پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن ترقی اُردو نے اُردو تعلیمی ٹرسٹ کے زیر انتظام مدرسہ آصفیہ میں کارگزار "ایچ ایس سی کوچنگ سنٹر" کے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو مادری زبان والے بچوں کا فرض ہیکہ وہ اپنی زبان کے ذریعہ علم حاصل کریں۔ مسٹر سرنیواس لاہوٹی معتمد تنظیم انجمن ترقی اُردو نے کوچنگ سنٹر کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ پرنسپل سنٹر جناب علی احمد جلیلی نے بھی مخاطب کیا۔

۹/ستمبر: نواب میر یوسف علی خاں بانی سالار جنگ میوزیم کی ۹۰ویں سالگرہ تقاریب کے سلسلے میں سہ لسانی محفل شعر ڈاکٹر راج کشور پانڈے کی صدارت میں منعقد ہوئی اردو شعراء مسز غیاث صدیقی، سعید شہیدی، بانو طاہرہ سعید، اختر تابش نے تلگو اور ہندی شعراء کے ساتھ کلام سنایا۔ اور داد حاصل کی۔

۱۱/ستمبر: حیدرآباد کے جوانمرگ غریب الوطن افسانہ نگار اور صحافی نصیر اختر صدیقی کے لندن میں انتقال کے بعد نوابی ادبی سوسائٹی اور صفی سوسائٹی کی جانب سے ایک جلسہ "یاد نصیر" جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اُردو شہر حیدرآباد کی صدارت میں منعقد ہوا جناب اکرام جاوید، جناب احسن علی مرزا، جناب وقار خلیل، جناب جہاندار افسر اور امجد باجی کے علاوہ نصیر مرحوم کے بھائی جناب،

عابد صدیقی ریسرچ اسسٹنٹ ترقی اردو بورڈ، دہلی نے نیر مرحوم کی شخصیت اور ان کی علمی وادبی نیز تخلیقی صلاحیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جمیل اظہر نے نظارت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۶/ستمبر: جناب رشید الدین مددگار مترجم دفتر نظامت ترجمہ آندھراپردیش کی پہلی کتاب "حسرت بدایونی: حیات اور ادبی کارنامے" کی رسم اجراء انجام دیتے ہوئے جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے رشید صاحب کی ادب اور صحافت سے وابستگی پر اظہارِ مسرت کیا اور مبارکباد دی۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے جلسہ کی صدارت کی۔ محترمہ جیلانی بانو دختر علامہ حیرت نے بھی رشید الدین کی تخلیقی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

۱۸/ستمبر: ریاستی انجمن ترقی اردو کے سالانہ انتخابات میں پروفیسر حبیب الرحمٰن صدر، ڈاکٹر سید عبدالمنان نائب صدر اور جناب عابد علی خان معتمد منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور جناب سرینواس لاہوٹی شریک معتمدین اور اراکین عاملہ میں مسرز منوہر راج سکسینہ، کے ایل مہندرا، غلام یزدانی، اور ڈاکٹر زینت ساجدہ منتخب ہوئے۔

—— عثمانیہ یونیورسٹی نے محترمہ فاطمہ پروین کو اردو میں ایم فل کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ انہوں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی نگرانی میں "ستر ہویں صدی کی دکنی شاعری میں ار منہدا کانی خاص" پہ مقالہ لکھا تھا۔ ریاستی اردو اکیڈیمی کی اعانت سے فاطمہ پروین کا ایم اے کا مقالہ "اختر انصاری کی شاعری، تنقیدی جائزہ" شائع ہو کر منظرِ عام پر آگیا ہے۔ جس کا پیش لفظ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے تحریر کیا ہے۔

۱۹/ستمبر: ریاستی وزیر تعلیم مسٹر وینکٹ رام ریڈی نے اسٹیٹ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن کے ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات کا تیقن دیا کہ حکومت اردو زبان کو تلگو کے بعد ایک دوسری بڑی عوامی زبان کی حیثیت سے اس کے حقوق اور مفادات کے تحفظ وفروغ کی خواہاں ہے۔ جناب چندر سری واستو ڈائرکٹر وسکریٹری اردو اکیڈیمی نے بھی خطاب کیا۔ جناب محمد محبوب علی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر نے اردو اساتذہ کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھرپور تعاون اور یکسوئی کا یقین دلایا۔

۲۳/ستمبر: (اردو ہال میں) ادارۂ شعر وحکمت کے زیر اہتمام جناب صلاح الدین نیر کے چوتھے شعری مجموعہ "درشکن درشکن" کی رسم اجرا ریاستی وزیر وصدر اردو اکیڈیمی جناب ایم باگا ریڈی نے انجام دی۔ جناب عابد علی خاں، ایڈیٹر "سیاست" نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب پی گنگا ریڈی ریاستی وزیر اور جناب سید کمشر شاہ صدر نشین قانون ساز کونسل مہمانانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر زینت ساجدہ، جناب سید ہاشم علی اختر (آئی، اے، ایس) معتمد ادارۂ ادبیاتِ اردو اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے نیر کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی اور مبارکباد دی۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید نے منظوم خراجِ تحسین ادا کیا۔ جناب صادق نقوی نے جلسہ کی نظامت کی۔

۲۴/ستمبر: بچوں کے عالمی سال کے موقع پر محترمہ بانو طاہرہ سعید کی کتاب "سات حدیث" کے نام سے رنگین اور باتصویر شائع ہوئی۔ جس کا پیش لفظ سابق صدر جمہوریہ ہند مرحوم فخرالدین علی احمد کی بیگم عابدہ صاحبہ نے لکھا ہے۔

۲۹/ستمبر: بزم طالب رزاقی کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب جیرات ندیم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ طنز ومزاح کے بزرگ شاعر اسد انصاری مرحوم کے مجموعہ "دھر گھسیٹ" کی اشاعت کے سلسلہ میں گلپوشی کی گئی۔ قدیم مکتب فکر کے کئی شعراء نے کلام سنایا۔

۳۰/ستمبر: اردو مجلس کا ادبی اجلاس ومشاعرہ جناب حسن الدین احمد (آئی، اے، ایس) صدر "ولا اکیڈیمی" کی صدارت میں بمقام "اردو ہال" منعقد ہوا۔ جناب احمد شریف ریاستی وزیر مہمان خصوصی تھے جناب اظہر افسر پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو

"ریڈیائی ادب" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے کہانی سنائی۔ محفل شعر میں علی احمد جلیلی، وقار خلیل، محمد منظور احمد، رحمٰن جامی، مس۔ اے عشرت صادق نقوی، صلاح الدین نیر، حامد مغل، فرید انصاری، اور ماجد علیم نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

۳/اکتوبر: آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ نے اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ ویلفیر فنڈ کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ جس کے محرک اکیڈیمی کے صدر جناب ہم ناگاریڈی ہیں۔ اور اس غرض سے اکیڈیمی نے دو ہزار روپے کی منظوری بھی دی جبکہ کمیٹی کے اجلاس میں ویلفیر فنڈ کے اغراض و مقاصد اور دستور کی تیاری کا فیصلہ کیا گیا۔ مباحث میں اراکین اکیڈیمی مسرس حامد علی عباسی، عابد علی خاں، سید رحمت علی سلطان صلاح الدین اویسی، ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر میر پاشاہ قادری، اعجاز قریشی، مصطفےٰ کمال کے علاوہ مسٹر چندر سری لو اسٹنٹ ڈائرکٹر/سکریٹری اکیڈیمی نے شرکت کی۔

۶/اکتوبر: محفل خواتین کے ماہانہ ادبی اجلاس میں محترمہ بانو طاہرہ سعید کی کتاب "سات دوست" (ادب اطفال) کی مسز سمترا دیا دلوی نے رسم اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر اندو وششٹ لکچرر ہندی آرٹس کالج نے صدارت کی۔ محترمہ بشیر النساء ریڈر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ نے "ہندوستان کی دوسری زبانوں پر فارسی کے اثرات" پر مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر شاکرہ نے ایک مضمون پڑھا۔ مظفر النساء ناز نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔

— بزم نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب سعید شہیدی کی صدارت میں ہوا۔ قدیم مکتب سخن کے شعراء نے کلام سنایا۔

۷/اکتوبر: اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) میں جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے کی صدارت میں سلسلہ پریم چند صدی تقاریب ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر سری رام شرما اور احسن علی مرزا نے پریم چند کے عہد اور ان کی افسانہ نگاری پر مضامین سنائے۔ کالی داس گاشیکر نے جلسہ کو کنڈکٹ کیا۔

۱۳/اکتوبر: خالیار بیلی کینسر کے زیر اہتمام مشہور افسانہ نگار خاتون محترمہ فریدہ زین کی کہانیوں کے مجموعے "سسکتی چاندنی" کی ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبہ اردو حیدرآباد یونیورسٹی کے ہاتھوں تقریب رونمائی انجام پائی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی (جامعہ ملیہ دہلی) جناب مدیر الزماں اور جناب باواکرشن گوپال مغموم (علیگڑھ) نے فریدہ کی کہانیوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید نے نظم سنائی اور جلسہ کی کارروائی انجام دی۔

— حضرت امیر خسرو اور صوفی ازم پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ریڈر شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں عالمانہ مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے صدارت کی۔

— ڈاکٹر عنوان چشتی ریڈر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد یونیورسٹی کے اردو شعبوں کی طرف سے خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر چشتی نے علی الترتیب "شعری آہنگ" اور "اردو شاعری میں تصوف" پر علمی مقالے سنائے۔

— ادارۂ فکر و ادب کی شعری محفل میں داؤد نصیب اور رضوی سروشی صاحبان کے شعری تخلیقات "نقیب" اور "آتش خاموش" کی رسم اجراء صدر محفل رائے محبوب نارائن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پروفیسر عالم خوندمیری، محمود حسین ادیب اور علی احمد جلیلی نے ان کتابوں پر تبصرہ کیا۔ آخر میں کئی شعراء صاحبان نے کلام سنایا۔

— جناب احمد معین الدین برقی صدر حیدرآباد اردو اسوسی ایشن نے ریاستی حکومت سے راشن کارڈ نہ صرف تلگو اور انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی متعلقہ تمام تفصیلات شائع کرنے کی اپیل کی۔

۱۵/اکتوبر: نظامس اردو ٹرسٹ کے زیر اہتمام حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا۔ جناب معین احمد خاں لکچرار سیاسیات جامعہ عثمانیہ نے رشید الدین کی کتاب "حیرت آباد الیکا: حیات اور ادبی خدمات" پر علمی اور سیر حاصل تبصرہ کیا

محترمہ بانو طاہرہ سعید نے ہنستی نظم سنائی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے جلسہ کی کارروائی انجام دی۔

— اردو سبھا کی طرف سے ڈاکٹر علی احمد چشتی اور جناب سید فضل المتین عارف کے خیر مقدم میں شعری نشست جناب منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو چار مینار سٹی کی صدارت میں آراستہ ہوئی، مہمانوں کے علاوہ قدیم و جدید مکتب سخن کے کئی معروف شاعروں نے کلام سنایا۔ اس موقع پر جوہر ہاشمی اور داود نصیب کے شعری مجموعوں کی اشاعت کا مسرت میں گلپوشی کی گئی جناب راجہ رام راجہ، بانی اردو سبھا نے خیر مقدمی تقریر کی۔

۱۷/اکتوبر: علی گڑھ اولڈ بوائز کے زیر اہتمام "یوم سرسید" جناب احمد جنگ کی صدارت میں منایا گیا۔ پروفیسر حبیب الرحمن، پروفیسر مسعود عالم صدر شعبہ جغرافیہ جامعہ عثمانیہ اور جناب آصف پاشاہ صدر مسلم ایجوکیشن سوسائٹی نے سرسید کی تعلیمات اور قومی اتحاد میں سرسید کی خدمات پر مخاطب کیا۔ اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی زیر صدارت ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ادیب المغربی، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، محمد منظور احمد، بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، رحمن جامی، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، جوہر ہاشمی، عزیزہ النساء جمال، ثریا جبیں، منیر لئیقی، سلیمہ، مظہر النساء، فخر الدین ماد

اور اعجاز احمد اعجاز نے کلام سنایا۔ جناب سید عبدالمنان نادری سکریٹری کلب نے شکریہ ادا کیا۔

۱۸/اکتوبر: سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی سالانہ تقریب مسٹر پی ایس ریڈی، سکریٹری وزارت داخلہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مسٹر پی بابا جیبر اس "قدرا" اور مسٹر محمد غوث احمد خاں ایڈیٹر سیلی تصویر" مہمانان خصوصی تھے۔ جناب صادق احمد جوائنٹ سکریٹری مالیات و صدر اسوسی ایشن نے خیر مقدمی تقریر کی۔ معتمد جناب صلاح الدین نیر نے رپورٹ سنائی۔ جناب قادر حاوید، نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ محفل شعر میں سکریٹریٹ کے شعراء کے علاوہ ممتاز شاعروں نے کلام سنایا۔ جناب بشیر الدین مقبول شاعر تھے اس موقع پر محفل موسیقی و رقص کا دلچسپ پروگرام جناب خواجہ بہاؤ الدین کی نگرانی میں منعقد ہوا۔

۱۹/اکتوبر: پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے ایک تعلیمی سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فروغ اردو کے سلسلے میں عثمانیہ یونیورسٹی کی تاریخ ساز خدمات کو ناقابل فراموش قرار دیا اور اردو زبان و ادب کی افادیت پر روشنی ڈالی جناب جلیل پاشا، او ایس ڈی منسٹر پنجائت نے صدارت کی۔

— ریاستی وزیر طب مسٹر جنگا ریڈی نے ڈاکٹر سید غوث الدین کی تصنیف کتاب

کی رسم اجراء انجام دی۔ مسٹر جی گنگا ریڈی، ریاستی وزیر حکیم عبدالوہاب ظہوری ڈائرکٹر سنٹرل یونانی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور حکیم عبدالحق پرنسپل نظامیہ طبی کالج کے علاوہ جناب شاہد سلیم، ہادی رحیل اور عابد سلطان تابش ریسرچ اسکالرس نے ڈاکٹر غوث الدین کی یونانی طب میں مہارت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی۔

— بزم خاصانِ ادب کے انتخابات میں بزرگ شاعر جناب بشیر وارثی صدر، ابوالحسن عابدی نائب صدر اور آغا سروش معتمد منتخب ہوئے۔

۲۰/اکتوبر: پریم چند صد سالہ تقاریب کمیٹی کے زیر اہتمام "اردو ہال" میں جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے کی صدارت میں عظیم الشان اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے چیف منسٹر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے پریم چند کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ آزادی کی جدوجہد میں پریم چند کا رول ناقابل فراموش ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، جناب اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی، ڈاکٹر آئی کرشنا مورتی ڈسا ہتیہ اکیڈیمی نے پریم چند کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ڈاکٹر حسینی شاہد کنوینر تقاریب کمیٹی نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔ اور شکریہ ادا کیا۔

۲۶/اکتوبر: بزم خاصانِ ادب

کی محفلِ شعر جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب بشیر وارثی صدر بزم نے مہمانوں اور شعراء کا خیر مقدم کیا۔ کئی مشہور شعراء نے کلام سنایا۔

۲۷/ اکتوبر: جناب ایم باگا ریڈی صدر ریاستی اردو اکیڈیمی نے مغربی بنگال کے چیف منسٹر مسٹر جیوتی باسو کو اردو اکیڈیمی کے قیام کے فیصلہ پر مبارکباد کا تار روانہ کیا۔ اسی طرح کا ایک پیام جناب چندر سری واستو ڈائرکٹر / سکریٹری ریاستی اردو اکیڈیمی نے بھی روانہ کیا اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

۲۸/ اکتوبر: اردو مجلس کے ماہانہ ادبی اجلاس میں ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے "میر امن" پر ایک مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے صدارت کی۔ مسٹر ایم' اوپندر لکچرار اکنامکس ہندو آرٹس کالج نے مزاحیہ مضمون پڑھا۔ ممتاز شعراء نے اس محفل میں کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

۲۹/ اکتوبر: نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے حلقۂ اربابِ ذوق کی طرف سے رسم اجرائی کے ایک خوشگوار ادبی جلسہ میں ڈاکٹر گیان چند جین، صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی نے نوجوان اسکالر اور ادیب ڈاکٹر افضل الدین اقبال کی تحقیقی تصنیف "مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما" (حصہ اول) پر سیر حاصل اور عالمانہ تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ اور جناب چندر سری واستو، ڈائرکٹر / سکریٹری اردو اکیڈیمی نے بھی ڈاکٹر افضل کی علمی و ادبی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ امریکہ کی ممتاز ادیبہ مسز نصیر انا مری شملاتے نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب محمد منظور احمد نے جلسہ کی کاروائی چلائی۔ اور شکریہ ادا کیا۔ ابتداً جناب عبدالعود ڈائرکٹر نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے لائبریری اور حلقۂ اربابِ ذوق کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا۔

یکم نومبر: تاسیس آندھرا پردیش کے سلسلے میں ریاستی محکمۂ اطلاعات و حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی طرف سے جناب ایم باگا ریڈی ریاستی وزیر و صدر اردو اکیڈیمی کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ایم چنا ریڈی ریاستی چیف منسٹر نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ مسٹر ایم بابیا چیرمین "ہڈا" نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اور تاسیس آندھرا پردیش و عید الضحیٰ کی مبارکباد دی۔ جناب سری کرشنا سنہا (آئی اے ایس) نے حیدرآباد کی قومی یکجہتی کی روایات کو خراج ادا کیا۔ ملک محمد علی خاں ایڈیٹر آندھرا پردیش نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے اس مشاعرہ میں (۳۵) شعراء نے کلام سنایا۔ ہر شاعر کو خدمت میں حکومت کی طرف سے بطور اعزازیہ شال اور نقدی نذر کی گئی۔ مسرزا اوج یعقوبی، شاذ تمکنت، سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، ڈاکٹر مغنی تبسم، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، وقار خلیل، بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر، خواجہ شوق، منوہر لال بہار، خیرات ندیم، ناصر کرنولی، علی الدین نوید، رحمٰن جامی، جوہر ہاشمی، نذیر علی عدیل، علی افسر، راجہ لال راجہ، رانہ عابدی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، شجاع فاروقی، عزیز النساء صبا، انور رشید، کنشیا کرن، معلم جعیدی، بجرنگ سنگھ فقیر، صادق نقوی، بھوپال سنگھ ورما، نور النساء تمکین اور دیگر اصحاب نے کلام سنایا۔

۲/ نومبر: بہار اردو اکیڈیمی کی طرف سے حیدرآباد کے تین مصنفوں ڈاکٹر اختر احمد، محترمہ بانو طاہرہ سعید اور وقار خلیل کے شعری مجموعوں پر ادبی انعامات کا اعلان کیا گیا۔

۴/ نومبر: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اردو ہال میں بصدارت جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے ایک مبسوط مقالہ "فرقہ واریت کے خلاف پریم چند کا جہاد" سنایا۔ مباحثے میں ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد، جناب سرینواس لاہوٹی، جناب صادق نقوی اور احسن علی مرزا نے حصہ لیا۔

— ہوٹل "نیاگرا" کی افتتاحی تقاریب کے سلسلے میں ایک مشاعرہ ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر ایم بابیا چیرمین "ہڈا" مہمان خصوصی تھے۔ مسز سعید شہیدی

شاخ تمکنت، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی سکندر بہشت دکنوی، اختر عادل، رحمٰن جامی فیض الحسن خیال، رئیس اختر، صادق نقوی، محمد منظور احمد، علی الدین نوید، جوہر ہاشمی، وقار خلیل، ثریا جبیں، عزیزہ الیاس صبا، بانو طاہرہ سعید، مظفر النساء ناز اور صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔ نیر نے نظارت کے فرائض انجام دیئے اور ولی تنویر نے غیر مقفی تقریر کی۔

۷/نومبر: محفل خواتین کے ادبی و شعری اجلاس میں محترمہ لئیق صلاح لیکچرار سیف آباد کالج نے پریم چند کی نگارشات میں عورت کے زیر عنوان مضمون اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے نئی کہانی سنائی۔ خواتین شعراء بانو طاہرہ سعید، عظمت عبدالقیوم، زہرہ تحسین، مظفر النساء ناز، اور نور النساء تمکین نے کلام سنایا۔ محترمہ گلشن کور آہلووالیہ نے اس محفل کی صدارت کی۔

۸/نومبر: زندہ دلان حیدرآباد کی بارہویں سالانہ تقاریب کا آغاز "محفل لطیفہ" سے ہوا۔ جناب رام دیو ریاستی وزیر نے صدارت کی۔ مسرز رشید قریشی، اظہر افسر، اسلم فرشوری، خیرات ندیم مجتبیٰ حسین، نکو ونسوی، طالب خوندمیری شریف اسلم، کلیم صدیقی، مصطفیٰ علی بیگ حفیظ خاں مذاق، اور شاہد جلیل نے لطیفے سنا کر محفل کو قہقہہ زار کیا۔

۹/نومبر: زندہ دلان حیدرآباد کا خصوصی اجلاس" جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں ہوا۔ ریاستی وزیر مشری گنگا ریڈی مہمان خصوصی تھے۔ مسرز نکو ونسوی، مجتبیٰ حسین، رشید قریشی، مسیح انجم، ڈاکٹر حبیب ضیاء، برہان حسین اور ارشد علی خاں نے طنز و مزاح سے بھرپور مضامین سنائے۔

۱۰/نومبر: زندہ دلان کی طرف سے طنز و مزاح کے مہمان اور میزبان شعراء کا کل ہند مشاعرہ جناب پی گنگا ریڈی کی صدارت میں ہوا۔ اس موقع پر ماہنامہ "شگوفہ" کا خصوصی فکاہی ادب کا خاص نمبر بھی ریلیز ہوا۔

۱۶/نومبر: حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ افتتاحی اجلاس جناب اختر حسن، مددگار معتمد اردو اکیڈیمی کی صدارت میں ہوا جناب رشید الدین نے مرزا ظفر الحسن کی تصنیف "ذکر یار چلے" پر تبصرہ سنایا۔ ادب دوستوں اور اسکالروں نے شرکت کی۔

۱۸/نومبر: آئینہ ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر زینت ساجدہ کی صدارت میں ہوا۔ جناب مصلح الدین سعدی نے ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، ریڈر حیدرآباد یونیورسٹی سے ادبی انٹرویو لیا۔ جناب رحمت یوسف زئی نے پریم چند پر مضمون سنایا۔ مظفر الدین سعید ملتانی نے "آج کا شاعر سیریز" کے تحت اپنا کلام پیش کیا۔

—— ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام "رائٹرس اینڈ جرنلسٹس ویلفیر فنڈ" کا جناب ایم۔ باگا ریڈی صدر اکیڈیمی نے افتتاح کیا اور اردو کے ایک صحافی خسرو انصاری صاحب کو آنکھ کے آپریشن کی غرض سے بطور مالی امداد ایک ہزار روپے کا چیک نذر کیا۔ مسٹر ونکٹ سوامی ریاستی وزیر لیبر نے اس تقریب کی صدارت کی۔ مسٹر حیدر سیادت اسسٹنٹ ڈائرکٹر/سکریٹری اردو اکیڈیمی نے "ویلفیر فنڈ" کی غرض و غایت اور اسکے مفید اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اکیڈیمی کی طرف سے کیے جانے والے مفید اقدامات پر روشنی ڈالی۔ جناب ایم باگا ریڈی نے کہا کہ ادیبوں، شاعروں، اور صحافیوں کی اعانت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مولانا حافظ ابو یوسف پروفیسر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، بیرسٹر سردار علی خاں، احسن علی مرزا، اور اعجاز قریشی نے بھی اپنی غیر مقفی تقاریر کے ذریعہ ادیبوں اور صحافیوں کی اعانت کیلئے اکیڈیمی کی طرف سے قائم کیے گئے۔ اس ویلفیر فنڈ کو اردو دنیا کیلئے مستحسن اقدام قرار دیا۔ جناب اختر حسن مددگار اکیڈیمی نے شکریہ ادا کیا۔

۲۰/نومبر: جناب جوہر ہاشمی کے مجموعہ کلام "نگارِ سحر" کی مولانا ابو یوسف صدر نشین مجلس انتظامی اردو اکیڈیمی نے رونمائی کی رسم انجام دی۔ جناب حسن الدین احمد صدر اردو اکیڈیمی" نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔ جوہر ہاشمی کی شاعری کے بارے میں مسرز علی احمد جلیلی، صادق نقوی، رحمٰن جامی اور کلیم قریشی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بزرگ شاعر بشیر وارثی صاحب نے جوہر کی منظوم



انسان کی کہانی

عقیل الرحمن عقیل

آپ نے بہت سی کہانیاں پڑھی اور سنی ہوں گی، لیکن ہم آج آپ کو ایک ایسی کہانی سنائیں گے۔ جو دنیا کی سب سے پہلی کہانی ہے۔ یہ کہانی انسان کی ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے جب کہ انسان اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا جتنا کہ آج وہ دنیا کے ہر شعبے پر چھایا ہوا ہے۔ آج کی طرح پہلے نہ ہوائی جہاز، سڑکیں اور نہ ریلیں، خوبصورت شہر تھے نہ ان میں آن بان اور شان سے رہنے والے لوگ، مکانات، سڑکیں، ٹیلی فون، تار، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور سینما گھر وغیرہ کچھ نہ تھے۔ چاروں طرف لق و دق ہی جنگل کھڑے تھے جن میں بھانت بھانت اور قسم قسم کے درندے، پرندے اور زہریلے جانور ادھر ادھر گھوما کرتے۔

ان جانوروں میں ایک ایسا بھی جانور تھا۔ جو دوسرے جانوروں سے بالکل الگ قسم کی طبیعت اور نرالا مزاج رکھتا۔ اس کے دو ہاتھ، دو پیر، دو کان، دو آنکھیں اور ایک ناک تھی۔ اسے دوسرے جانوروں کی طرح پیاس اور بھوک بھی لگتی تھی۔ ایک خاص فرق اس میں یہ تھا کہ وہ کوئی کام کرنے سے پہلے گھڑی دو گھڑی سوچتا اور پھر بڑے ہی غور و فکر کے بعد وہ کام کاج کرتا۔ طرح سوچنے کی عادت دوسرے جانوروں میں نہیں تھی۔ جانتے ہو اس جانور کا نام کیا تھا ـــــ؟ یہ تھا انسان، یعنی ہمارے باوا آدم۔

انسان نے سب سے پہلے جس چیز پر غور کیا وہ اس کا اپنا ہاتھ تھا۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، انگلیوں کو کھولا اور پھر بند کیا آخر کار سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں ان سے ایسے کام لے سکتا ہوں، جیسے دوسرے جانور نہیں کر سکتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ یہ انسان اپنے بیوی بچوں کے لئے کھانے کی چیزوں کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ ایسے میں راستے دور سے ایک کالا ریچھ آتا دکھائی دیا۔ پہلے تو وہ ڈرا اور بھاگنے کی سوچنے لگا۔ جب

گتے اُسے ایک ٹھوکر لگی تو وہ گر پڑا، اتنے میں ریچھ قریب آ گیا۔ اور انسان نے
چنا شروع کیا کہ کیوں نہ میں اپنے ہاتھوں کو استعمال کروں۔ میرے ہاتھ کچھ پکڑ سکتے
ہوا اُس نے قریب ہی پڑے ہوئے ایک بھاری پتھر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے
ٹھایا اور زور سے ریچھ کی طرف پھینک مارا۔ پتھر ریچھ کے سر پر جا لگا اور وہ
ل کر لڑکھڑاتے ہوئے نیچے گر پڑا اور پھر تڑپ تڑپ کر مر گیا ——— جانتے ہو'
نیا کی سب سے پہلی لڑائی تھی اور انسان کی پہلی جیت ———

انسان نے اپنی اس کامیابی پر خوشی سے ناچنے اور گانے لگا، اپنے ساتھیوں
ایا اور پتھر پھینک پھینک کر دکھانے لگا کہ میں نے اس طرح دشمن کو ختم کیا ہے اور دوسروں نے
پتھر پھینکنے میں اس کی نقل کی۔ گویا دنیا میں ان انسانوں نے پہلی دفعہ کرکٹ کھیلا گو پتھروں
۔ ا۔ کیا تھا اس انسان نے پتھر مار مار کر جانوروں کو شکار کرنا شروع کیا اور اس طرح
گلوں میں رہنے والا یہ عجیب و غریب جانور شکاری بن گیا۔

ایک دن انسان جنگل میں دور تک نکل گیا جب چلتے چلتے تھک گیا تو ایک دریا کے
یب جا بیٹھا اور پیاس بجھانے لگا۔ اس نے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیاں دیکھیں سوچنے
ا۔ یہ ہاتھ اور پاؤں کے بغیر کس طرح اس پھرتی سے تیرتی ہیں؟ ابھی وہ مچھلیوں کے بارے
ہی غور کر رہا تھا کہ پاس کے درخت سے لکڑی کا بڑا ٹکڑا پانی میں آ گرا۔ وہ ڈوبا
ں بلکہ تیرنے لگا۔ لکڑی کا ٹکڑا مچھلیوں کی طرح پانی کے اندر نہیں بلکہ اوپر ہی اوپر تیر رہا
۔ آخر کار یہ ٹکڑا کچھ دور جا کر دریا کے کنارے کے قریب رک گیا، ایسے میں ایک
مہ اُڑتا ہوا آیا اور اس لکڑی کے ٹکڑے پر بیٹھ گیا، پرندے کے بیٹھتے ہی ایک
ہلکے ساتھ یہ ٹکڑا پھر آگے بڑھنے لگا۔ جونہی دوسرا کنارہ قریب آ گیا،
رہ پھر سے پھڑپھڑا کر اُڑ گیا اور لکڑی کا ٹکڑا بہتے بہتے ایک طرف کو بڑھ گیا۔ مگر انسان سوچتا رہا کہ کاش! میں بھی اس ٹکڑے
بیٹھ سکتا تو پرندے کی طرح بڑی آسانی کے ساتھ دریا کو پار کر چکا ہوتا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انسان کے دل میں دوسرے ملکوں
سیر کا شوق پیدا ہوا۔ آخر کار وہ ایک بڑی لکڑی کے سہارے دریا پار کرنے میں کامیاب ہوا۔ پھر وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ
۔ وہاں اسے ایک گڑھا نظر آیا۔ پہلے تو انسان جھانکنے لگا پھر وہ اس غار میں گھس گیا۔ جب وہ اندر چلا گیا تو یہ غار گرم معلوم ہوا۔ باہر کی طرح
ردی محسوس نہیں ہوئی۔ اب تک انسان جنگلوں اور درختوں پر بسیرا کرتا تھا۔ اسی طرح یہ غار اس کے لئے پہلا گھر ثابت ہوا
ں میں وہ کسی قسم کے ڈر اور خوف کے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ انسان غار کے پاس بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کی نظر زمین سے نکلی ہوئی ننھی ننھی کونپلوں
پڑی تھی اب اسے ہر چیز کی وجہ کھوج نکالنے کی عادت سی ہو گئی تھی لہٰذا انسان نے کونپل کو جڑ تک کھودنا شروع کیا۔ کھودتے

از شمس الرحمٰن فاروقی

کوئی بات نہیں

دانت بڑے ہوں
تو بھی کوئی بات نہیں
کان کھڑے ہوں
تو بھی کوئی بات نہیں
ڈانٹ بڑی ہو
تو بھی کوئی بات نہیں
دھوپ کڑی ہو
تو بھی کوئی بات نہیں
اودھم بڑا ہو
تو بھی کوئی بات نہیں
کوئی لڑا ہو
تو بھی کوئی بات نہیں
بچوں کو گھر میں آنے دو
دھولیں ان کو جانے دو

کھودتے اس نے دیکھا کہ کونپل ایک بیج کے اندر سے نکلی ہے۔ اس نے بیج کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو پتہ لگا کہ یہ وہی بیج ہے جسے اس نے کچھ دنوں پہلے پھل کے اندر سے نکال پھینکے تھے۔ یہ جان کر کہ یہ بیج دوبارہ اس طرح زمین سے اُگتے ہیں تو اس کو بہت ہی تعجب ہوا اور اب انسان نے ارادہ کر لیا کہ وہ پھل کھا کر بیجوں کو پھینکے گا نہیں بلکہ زمین کھود کر اس میں دبا دے گا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ بیج اُگے، پودے نکل آئے اور پھر لہلہانے لگے۔ ان پر پہلے تو پھول آئے اور پھر پھل پیدا ہوئے۔ اب انسان کاشتکار ہو چکا تھا۔

اردو

مومن خان شوقی

کتنی میٹھی زبان ہے اردو — پیار کا گلستان ہے اردو
پیار کے درمیان ہے اردو — علم کی قدردان ہے اردو
گود ہو ماں کی یا کہ مکتب ہو — ہر جگہ مہربان ہے اردو
دشمنِ جاں بھی دوست ہو جائے — ایسی شیریں بیان ہے اردو
کوئی صوبہ نہ گھر، مگر پھر بھی ! — ہر جگہ حکمران ہے اردو
گھر کا آنگن ہو یا کہ گلشن ہو — اِک مہکتا جہان ہے اردو
ہندو و مسلم ہوں یا کہ عیسائی ! — سب مذاہب کی جان ہے اردو

میر و غالب فراق اور اقبال
شوقی کی داستان ہے اردو

پہلے پہل انسان نے شکار کرنا سیکھا تھا۔ وہ جانوروں کو مار کر ان کا کچا گوشت کھایا کرتا تھا۔ ایک دن روز کی طرح اس نے چند جانوروں کا شکار کیا اور انہیں گھر لایا۔ دیکھا کہ بیوی اور بچے غار سے باہر کہیں دور سیر کو گئے ہوئے ہیں۔ انسان گوشت کو غار کے باہر رکھ کر انہیں تلاش کرنے نکل پڑا ہوا۔ ادھر جنگل کے بعض درختوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور یہ آگ بڑھتے بڑھتے غار کے منہ تک پہنچ گئی۔ آگ کے شعلوں نے گوشت کو جلا دیا اور وہ آگ میں پک گیا۔ کچھ دیر بعد ہوا کے جھونکوں نے آگ کو بجھا دیا اور اسی عرصے میں انسان بیوی بچوں کے ساتھ غار کی طرف واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کچا گوشت آگ میں جل کر بھن گیا ہے۔ سوچا کر پھینک دیں پھر یہ خیال آیا کہ چلو ذرا چکھ تو لیں۔ جب انسان نے اس جلے ہوئے گوشت کو چکھا تو اس کا ذائقہ کچھ اور ہی تھا۔ یہ گوشت اسے بہت ہی لذیذ معلوم ہوا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اسی طرح ہر روز گوشت کو بھون کر کھایا جائے۔ اس طرح انسان نے کھانا پکا کر کھانا بھی سیکھ لیا۔

ہاں تو دوستو، آپ نے پڑھا کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو جانوروں سے افضل بنا سکا اور کیوں کر ان پر قابو پا گیا

بقیہ ص ۲۸ پر دیکھئے